

سوالگرہ منہ

دین

سایہ

سوسائٹی

سوسائٹی

سوسائٹی

سوسائٹی

گیگٹیل

www.paksociety.com





سائیکرہ نمبر

حمد 11
نعت 11

انٹرویو

قارئین کی عدالت 12
دو کا بہاڑہ 23
پیسا کا گھڑ 18
گائیں کچھ معنی بے معنی سی ریکارڈ امجد بخاری 28

مسل ناول

عشق آتش 208
سای اور سوہنی 122
کوئی لمحہ محبت کا 74

ناول

دست کوزہ گر 36
در دل 176
نوریزہ یاسین
نبیلہ عزیز

ناولٹ

شکستہ بی بی 252
گوشہ عافیت

انسان

نگوری پیاز 112
بارت ایک بوندی 162
بھجھو بھنا 202
فاخو وگی 59

ترجمہ سائنس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے

پاکستان (سالانہ) --- 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 5000 روپے

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو 268
یاروں کے دیکھنے 272
مجھے شاعر لپیٹتا ہے 274
مُسکراتی کرنیں 276

شعاع عمیر
بشری محمود
شگفتہ سیلان
ریکارڈ امجد بخاری

کرن کا دسترخوان
حسن و صحت
نہلے یہ دہلا
ناع مبینہ کرنام

279 خالد جیلانی
281 اداری
284 ذوالقرنین
286 مدیرہ کرن

مارچ 2011
جلد 33 شمارہ 12
قیمت 40 روپے

پبلشر آڈر پبلسز ایمن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹائم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com, info@khawateendigest.com

ماہنامہ نوائے دل اور ادارہ نوائے دل انجمن کے تحت شائع ہونے والے رچوں بہتر شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی نوعیت کے ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت میں ڈراما، کارٹون، نقل اور سلسلہ وار آڈیو کے کسی بھی طرح کے استعمال سے ہونے والے خسار سے ادارہ نوائے دل اور ادارہ نوائے دل کا کوئی حصہ ذمہ دار نہیں ہے۔

سنا لگ رہا ہے۔ ہاتھوں میں ہے۔
وقت خوشی اور غم کا احساس لے کر لہو لہو کر کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ اپنے پیچھے تلخ و شیریں لمحوں کا جو کارواں چھوڑ جاتا ہے۔ اس پر بہت سی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ اس سفر میں جس کا لہو لہو صدیوں پر محیط ہے۔ ہم نے اپنے قارئین کے لیے بہت سی محبتیں رقم کی ہیں۔ قارئین کی محبتیں اور اعتماد ہمارے سفر کی صعوبتوں کو آسان بنا تا رہا۔ ہماری محبتیں ہر لمحہ قارئین کی دلچسپی کے لیے سر بہ عمل رہیں۔
میر کا روال محمود بابر فیصل کا لگایا ہوا یہ بودا جتنا آج اپنے آپ پر فخر کر رہا ہوگا کہ اس کی بنیادوں میں ایک ایسے شخص کی محبتیں، مشقیں اور ریاضتیں شامل حال رہی ہیں۔ محبت و خلوص جس کی زندگی کا واحد مشن تھا۔ زندگی کے سارے رنگ محبت و خلوص سے ہی عبارت ہیں۔ اور محمود بابر فیصل نے ان ہی رنگوں سے کرن کی آبداری کی۔
ماشاء اللہ سے آج کرن کا میانی کا ایک اور سال مکمل کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ سب کی محبتیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں اور ہم کرن کو سچا سنوار کر پیش کرتے رہیں۔
سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا۔ ہمیں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

اس شمارے میں

- کرن کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے دلچسپ سروے،
- اداکار "عمران عباس" قارئین کی عدالت میں۔ نازیہ کنول نازی کا کرن کی سالگرہ کے موقع پر نیا سلسلہ،
- اداکار "دانش تیمور" دوسرے پہاڑے کے ساتھ،
- "پیا کا گھر پیارا لگے" میں اداکارہ بشری انصاری سے ان کے پیارے گھر کی باتیں،
- "درد دل" ہیلڈ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "عشق آتش" سعدیہ راجپوت کا مکمل ناول اختتامی مراحل میں،
- نایاب جیلانی اور صدف زیب کے طویل مکمل ناول،
- "گوشہ عافیت" شگفتہ بیٹی کا دلکش ناولٹ اپنے اختتام کی طرف،
- ایم شمارہ "اصفہ عزیزین قاضی، فاخرہ گل اور نادیہ جمال کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- مفت،
- کرن کتاب "کیک اپیشل" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت پیش خدمت ہے۔

زباں پہ مہر لگا دے جہاں ایسا ہے

نظر کی تاب سے باہر جمال ایسا ہے

کہیں دکھائی نہ دے اور ہر طرف ہرگز

گماں یقیں میں بدل دے، جمال ایسا ہے

وہ تو جس کی سماں نہیں کسی دل میں

بشر کی سوچ سے باہر خیال ایسا ہے

ہر اک چیز نظر آتی ہے زیادہ صاف

ہماری روح کے شیشے میں بال ایسا ہے

عروج پر ہے مقدر بفیض جتیم کرم

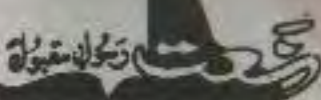
یہ میر عمر رواں کا زوال ایسا ہے

وہ مسکرائیں گے سن کر پلٹ کے دیکھیں گے

ہمارے لب پہ چمکتا سوال ایسا ہے

کوئی بھی وقت ہو امجد یہ پھیلتا رہتا ہے

دلوں میں فضلِ خدا کا نہال ایسا ہے



میں اپنی ذات کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں

مدینہ آنکھ میں تحلیل کرنا چاہتا ہوں

غلام مصطفیٰ کہہ دے زمانہ دیکھ کر مجھ کو

میں خود کو اس قدر تبدیل کرنا چاہتا ہوں

جہاں تک ہو سکے بھروں نظارے بزرگ بند کے

میں اپنی آنکھ کو نہ نبیل کرنا چاہتا ہوں

دعا میں آپ کے میری دعا میں معتبر ہوں گی

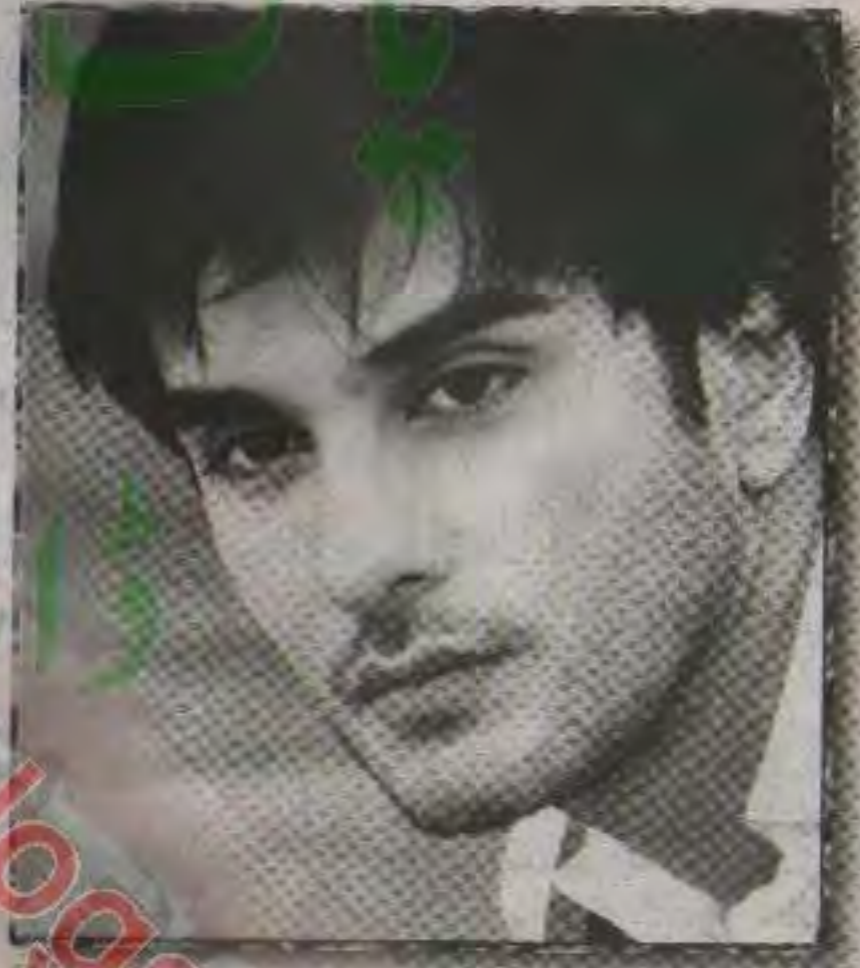
دعا میں آپ کو ترسیل کرنا چاہتا ہوں

میرے الفاظ سے امجد زمانہ روشنی پائے

میں اپنی سوچ کو قدیل کرنا چاہتا ہوں

امجد بخاری

امجد اسلام امجد



کرنل کی ساگرہ نمبر کے موقع پر "قارئین کی عدالت" کے تحت ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ جس میں ہر ماہ شوبز کی کسی ایک معروف شخصیت سے قارئین اپنی پسند کے سوالات کر سکیں گے۔ اس ماہ اس سلسلے میں ہرول عزیز وی آرٹسٹ "عمران عباس" قارئین کے سوالوں کے جوابات دے رہے ہیں۔ آئندہ ماہ کی شخصیت "جلن کاظم" ہوں گی۔ قارئین اپنے سوالات ہندوہ مارچ تک ارسال کروں گے۔ آپ کو اپنی اس سلسلے کا حصہ بن سکیں۔

- (1) کیفیہ خان سے خیر آباد کیسے من گھڑی ذات ڈورہ بے نشان؟
- آپ کو ہست زبردست یادگار سپرل رہا مبارکباد؟
- شکرہ جی... احمد لہد میں بالکل ٹھیک ہوں میری دلچسپی کی پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ
- (2) صدف آرزو تنکانہ صاحب
- ☆ "سال 2010ء تمام پاکستانیوں کے لیے غم اور مصیبت کا سال رہا مگر اس سال نے آپ کو بہت کامیابیاں اور محبتیں دیں آپ نے اس سال کو کیا دیا؟"

☆ "میں نے تو اس سال کو تو کیا دینا تھا" ہاں اپنے چاہنے والوں کو بہت کچھ دیا ہے۔ "ظلال منصب" میری ذات ڈورہ بے نشان اپنی ہفت روزہ سے دل تک پیار کے بعد بارڈر یہ سب گفت ہی تو ہے اس سال کے لیے۔"

(3) انیلا آصف سے دینے

☆ "کئی سالوں سے آپ کو ایسا ہی بیک اسٹارٹ اور ایکٹو دیکھ رہے ہیں کیا آپ کی عمر نہیں بڑھی کچھ بتائیے گا؟"

☆ "بہت شکریہ مگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو ویسے میڈیا میں صرف عورتیں ہی نہیں مرد بھی اپنی عمر چھپاتے ہیں۔ میرے پاس بے بس تو سب بن جاتے ہیں، کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے جب میرا پہلا کمرشل آیا تھا تو میں بالکل اس کو بولنے تھا اور یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔"

(4) سہاس گل سے رحیم ہار خان

☆ "آپ نے اپنی اب تک کی زندگی کے تجربے سے کیا سیکھ لیا ہے؟"

☆ "میں اپنی اب تک کی زندگی سے بہت خوش ہوں۔ یہاں تک مطمئن ہونے کے بات ہے یا زندگی سے کچھ حاصل کرنے کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں اس میں وہی ہے جو لوگوں کا پیار ہے۔ یہ سچ ہے جو ہمیشہ آپ کے پاس نہیں رہتی آج اگر ایک کروڑ لوگ مجھے پیار کر رہے ہیں تو کل ایک ہی نہیں کرے گا۔ لہذا اس پیار میں میری نیلی اور اس کی محبت زیادہ اہم ہے میرے لیے۔"

(5) عاصمہ صدیق سے نورث عباس

☆ "آپ کی کوالیفیکیشن؟"

☆ "میں نے ایم سی کلج لاہور سے انجینئرنگ کی ڈگری لی ہوئی ہے۔"

(6) ذکیہ ابراہیم سے دباڑی

☆ "موجودہ مقام تک پہنچنے کے لیے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟"

☆ "دیکھتے میں ہمیشہ اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر آپ کے اندر فیٹنٹ ہے تو وہ کبھی چھپ نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے کہ آپ کو محنت و جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔"

لیکن اگر آپ فیٹنٹ ہیں تو آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آپ کو کسی کی سفارش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کبھی کسی کا سہارا نہیں لیا۔ اب میں اپنی تعریف نہیں کر رہا مگر یہ سچ ہے کہ میں نے جو کیا اپنے بل بوتے پر پاکستان اور پاکستان سے باہر جتنا کام میں نے کیا ہے لوگوں نے اسے سراہا ہے بھارت میں فلم کے لیے بھی کیا بولے اسی میں ہانگ کی امریکہ میں بھی ہانگ کے لیے بلایا گیا۔ انٹرنیشنل نیٹ پر اگر آپ ویڈیو دیکھیں تو

most good looking man میں میرا نام ہے اگر یہ تمام تر صلاحیتیں آپ میں موجود ہیں اور اللہ آپ پر مہمان ہے تو ضرور کامیابی ملتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ میں بہت بہتر ہوں یقیناً "مجھ سے بھی بہت بہتر لڑکے لڑکیاں اس فیلڈ میں موجود ہیں بس اپنے اللہ پر یقین رکھنا چاہیے اور اپنے فیٹنٹ پر بھروسہ ہونا چاہیے کامیابی ضرور ملتی ہے۔"

(7) فوزیہ احسان رانا سے حاصل پور

☆ "آپ اتنے گڈ لکسنگ اور اسٹارٹ ہیں فلموں میں کالم کیوں نہیں کیا؟"

☆ "ظلم میں نے بہت پہلے کی تھی۔ وہی میں انڈین ڈائریکٹرز نے بنائی تھی۔ وہ بہت برا ایک سپرٹنس تھا اب جو پروجیکٹ ہیں۔ ان کا پتا نہیں کیا ہو گا۔"

(8) عروج فاطمہ سے لاہور





نہی جانتے تھے کہ بہت گلوڑ ہیں۔ میرے تقریباً
 تمام ان بھائی ملک سے باہر ہیں شادی شدہ ہیں اس
 سلسلہ میں انہوں نے رابٹر رہتا ہے۔
 (11) "لو میں اقبال نوشی۔ کھاریاں
 "بھی سوچا تھا کہ اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل
 کریں گے؟"
 "جی نہیں میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا
 اتنی شہرت اور مقبولیت سے لوالہ گا۔ یہی نہیں
 لکھا ہے کہ میں میرا اللہ مجھے دے کر آزات نہیں رہا
 اور اگر میں اس کی آزمائش پر پورا نہ اترتا تو کیا ہوتا؟
 آخر کو ایک عام سا انسان ہی ہوں نا کہ کوئی ولی یا پیغمبر تو
 نہیں۔"

(20) گل صنوبر غزل۔ سرگودھا
 "کھانے پینے کے نئے شوقین ہیں کھانے میں
 شوق سے کیا کھاتے ہیں؟"
 "بالکل شوقین میں ہوں۔ میری صحت دیکھ کر
 اندازہ ہوتا ہو گا۔ کھانے میں چھڑی پاشا جو میری مٹی
 بہت اچھا بناتی ہیں شوق سے کھاتا ہوں۔ اس کے علاوہ
 پوائس کھانے پسند ہیں یہ ہیوی کھانے میں نہیں کھا
 سکتا۔"

(21) حمیرا لطیف۔ لاہور
 "آپ کی کلمت؟"
 "میں سید فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور الحمد للہ
 پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔"
 (22) ام مومین۔ فیصل آباد روڈ بڑا نوالہ
 "عمران صاحب شعر کا جواب شعر میں دیں
 شہرت ملی تو نیند بھی اپنی نہیں رہی
 بے نام زندگی تھی تو کتنا سکون تھا؟"

وہ بچپن کی نیند تو اب خواب ہو گئی
 کیا وقت تھا کہ رات ہوئی اور سو گئے
 وہ نیند تو واقعی اب خواب ہو گئی ہے لیکن میں اب
 بھی سو رہا ہوں تو اطمینان سے سو رہا ہوں کہ میرے دل پر
 کوئی بوجھ نہیں ہے کیونکہ میں نے کس کا دل نہیں
 دکھایا۔"
 (23) شمرین افتخار۔ ڈونگہ بونگہ
 "کوئی عزیز دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتے

شوہر میری منزل ہے۔ میری منزل میری خوشی میری
 دعا نہیں اور ہے اور میں اس کی تلاش میں ہوں شاید
 اور آگے جاؤں کہاں جاؤں یہ مجھے نہیں معلوم۔"
 (14) رخسانہ جاوید محل۔ کورنگی کراچی
 "نی وی اور ماڈرننگ کی طرف کون لایا؟"
 "نی وی کی طرف مجھے سلطانہ صدیقی صاحبہ
 لائیں۔ اس سے پہلے خاور اعظم صاحب نے مجھے
 ماڈرننگ کے لیے آفر کیا تھا۔"
 (15) طاہرہ کنول۔ میرا نول۔ بہاولپور
 "اگر کوئی آپ سے آپ کی ذات کا تعارف مانگے
 تو؟"

"میں مناسب نہیں ہوں۔ میں کسی ویسا ہی
 ہوں جیسا سب کو نظر آ رہا ہے۔ میں کبھی کسی کا برا
 نہیں چاہتا۔ مجھے آج تک جو کامیابی ملی ہے وہ اسی وجہ
 سے ملی ہے کہ بس اپنے کام سے کام رکھتا ہوں اور کبھی
 کسی کا برا نہیں چاہا۔ اللہ کا شکر ہے میں نے ہمیشہ اللہ پر
 یقین رکھ کر صرف اپنے کام سے دلچسپی رکھی ہے
 میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ کسی سے بات
 کروں بس لکھ آتا ہوں اور سو جاتا ہے۔"

(16) ارم گل مہو۔ آزاد کشمیر
 "کس سیریل یا اشتہار سے پہچان ملی؟"
 "امراؤ جان اوا" جسے نواب سلطان صاحب نے
 پیش کیا تھا۔"
 (17) شگفتہ خان۔ بھلول
 "زندگی کو کس نظریہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی زندگی
 سے کتنے مطمئن ہیں؟"
 "زندگی اللہ کی امانت ہے اور میں الحمد للہ 100%
 اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے
 نہیں ہوں جو کہتے ہیں کہ پیچھے چلا جاؤں۔ میں آج جو
 ہوں وہ چند سال پہلے میں تھا۔"

(18) عائشہ اسلم۔ چشتیاں شریف
 "آپ کی فیملی میں کتنے لوگ ہیں اور آپ کی
 سب سے زیادہ انڈر شیڈنگ کس کے ساتھ ہے؟"
 "میری فیملی میں مجھے ملا کرتین بھائی اور تین
 بہنیں ہیں اور ماشاء اللہ ہماری فیملی کی جو باؤنڈریز ہیں وہ
 بہت استریٹنگ ہیں۔ میرے والد انجینئر تھے۔ جہاں
 تک انڈر شیڈنگ کی بات ہے تو ہم سب بہن بھائی

"آپ لی ڈیٹ آف برتھ اور جائے پیدائش؟"
 "پندرہ اکتوبر اور میں اسلام آباد میں پیدا ہوا۔
 اسلام آباد ہی سے پری انجینئرنگ کی اور ایئر فورس میں
 پاکٹ ہوا۔"
 (9) حمیرا لطیف۔ بھلول
 "آپ کا پہلا پی وی ڈرامہ؟"
 "میرا پہلا پی وی ڈرامہ "شاید کہ ہمار آئے"
 حسین معین صاحبہ کا تھا اور رانا شیخ اس کے ڈائریکٹر
 تھے۔"

(10) طاہرہ بانو۔ اسلام آباد
 "کبھی کسی سے محبت ہوئی؟"
 "محبت کسی نہ کسی لیول پر کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ہم
 نے بہت عجیب عجیب سے جذبوں کو محبت کا نام دے
 دیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ "جذیبہ" بہت ہی نام ہو کر رہ
 گیا ہے۔ اب تو جذبوں میں اتنی ملاوٹ ہو گئی ہے کہ
 کچھ سمجھ نہیں آتی۔ پیسے کی عجیب سی ووڈ نے انسان
 کے دل سے ہر خالص جذبہ نکال پھینکا ہے۔ پاکیزگی
 جیسے خم ہو کر رہ گئی ہے۔"

(11) طیبہ ارم۔ بہاول نگر
 "ٹیلی ویژن کی طرف لانے میں کس کا ہاتھ رہا؟"
 "سلطانہ صدیقی صاحبہ کا۔"
 (12) عاصمہ بلاہور
 "عمران صاحب اللہ نے آپ کو اتنی شہرت
 مقبولیت خوب صورتی پیسہ دیا کبھی غرور ہوا اپنے
 مقام پر؟"

"آجی نہیں میں سمجھتا ہوں یہ حسن یہ شہرت یہ
 نام یہ خوب صورتی اور پیسہ ہمیشہ آپ کے پاس رہنے
 والی چیزیں نہیں ہیں۔ پھر ایسی چیز پر غرور کیا کرتا۔ یہ
 چیزیں اس وقت آپ کو بہت تکلیف دیتی ہیں جب یہ
 آپ کے پاس نہیں ہوتیں۔"
 (13) گلن وفا۔ کراچی

"اپنی زندگی کے موجودہ مقام سے کتنے مطمئن ہیں؟"
 "میں اپنی زندگی میں کبھی بھی مطمئن نہیں رہا ہوں
 سکتا ہے ایکٹنگ کے بعد میں کچھ اور شروع کروں
 کیونکہ میں اپنے آپ کو ہمیشہ ڈسکور کرتا رہا ہوں اور
 یہ سفر ہماری زندگی چلتا رہتا ہے۔ شہرت سے پہلے میں
 ایئر فورس میں پاکٹ تھا۔ مگر نہ وہ میری منزل تھی نہ

پس؟"
 "اس معاملے میں میں بہت برا ہوں کہ مجھے منانا
 نہیں آتا جو میرے بہت عزیز دوست ہیں وہ اب میری
 اس بچہ کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے اگر ناراض
 ہوتے ہیں تو پھر خود ہی مان جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے
 ہیں کہ مجھے منانے کے طریقے نہیں آتے۔"
 (24) شازیہ اسلم۔ ہارون آباد
 "زندگی کا کوئی خوب صورت یادگار لمحہ؟"
 "جب میں پہلی بار گھر سے باہر نکلا۔ جب میں نے
 پہلی بار جماڑ اڑایا۔"
 (25) دعائی۔ کوہاٹ
 "آپ صورت اور سیرت دونوں میں بہت اچھے
 ہیں کیا وجہ ہے؟"
 "مسکراتے ہوئے" یہ ساری چیز مطلب ویلیو
 سسٹم ہے جو آپ کی فیملی سے آئی ہے۔ میں یہ نہیں
 کہوں گا کہ میں کوئی بہت دل آف فیملی سے تعلق
 رکھتا ہوں مگر جو قدریں ہوتی ہیں نا اس کا تعلق پیسے
 سے نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق تربیت سے ہوتا ہے۔
 بہت متوسط گھرانے میں بھی آپ کو وہ چیز مل سکتی ہے
 جو پیسے والے گھرانے میں نہیں مل سکتی۔ میں انسان
 کے اخلاق اور اس کے شخصی وقار کو زیادہ اہمیت دیتا
 ہوں۔ یہ شوہر یہ شہرت یہ پیسہ یہ میرے لیے میٹرز
 نہیں کرتا۔"

http://www.hbl.com

ہم ہیں HBL

ہماری پہچان ہوتی کچھ اور اگر نہ ہوتی تو ہم کون سے ہوتے؟
 ہمارے ہاں ایک چہرہ تالیفوں کی طرح ہے ایک آواز،
 جس نے ساری دنیا کو اپنی قیامت سے پہچان
 لکھی اور کوئی اور موقع کو اپنا نہیں بنا سکا۔
 پاکستان کا سب سے بڑا بینکنگ نیٹ ورک۔
 جس نے ساری دنیا کو اپنی قیامت سے پہچان
 لکھی اور کوئی اور موقع کو اپنا نہیں بنا سکا۔
 ہمارا ہیمنگ ہے پاکستان اور ہم ہیں HBL۔

111-111-425 | www.hbl.com



(26) شہینلا مشتاق۔ فقیر والی
 ★ ”عمران عباس صاحب کیا آپ اشارزہ پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں؟“
 * ”جی نہیں میں نے انڈیا میں ایک سیریل کیا تھا جو اے آر والی کی پروڈکشن تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ پاکستانی چینل نے انڈیا میں باؤس ورک کیا۔ انڈین ٹی وی کو میں زیادہ پسند نہیں کرتا میں سمجھتا ہوں ہمارا ٹی وی زیادہ بہتر ہے۔“

(27) اربہ شاہ۔ بہاول پور
 ★ ”ہر انسان کی زندگی میں کوئی آتا ہے اور دل و دماغ پر چھا جاتا ہے آپ کے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ نہیں؟“
 * ”(سکراتے ہوئے) ”ابھی تک تو میں انتظار ہی کر رہا ہوں کہ کوئی آئے اور چھا جائے۔ ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ ہاں کچھ لوگ تھے جو آئے اور چلے گئے۔ شاید ان کا چلے جانا ہی میرے لیے زیادہ خوشی کا باعث ہے۔ کیونکہ جو آپ کے ہوتے ہیں وہ کبھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتے اور جو آپ کے نہیں ہیں وہ جتنی جلدی چھوڑ کر چلے جائیں اتنا ہی اچھا ہے بقول پروین شاکر۔“

تمام عمر کی نا مستبر رفاقت سے
 کہیں بھلا ہے کہ بل بھر ملیں یقین سے ملیں
 (28) آنسہ مریم عباس۔ بلتان
 ★ ”کچھ یاد ہے آپ تک لی وی کے لیے کتنے پروجیکٹ کر چکے ہیں؟“
 * ”سو سے زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔“

(29) لبنی نذیر چوہدری۔ کوٹ رادھا کشن ضلع
 تصور
 ★ ”اپنے بہترین دوستوں میں کسے شمار کرتے ہیں؟“
 * ”وہی جو میرے بچپن کے دوست ہیں۔ عظیمی حنا امتیاز، شعیب یہ سب میرے بہت اچھے دوست ہیں۔“

(30) نگاہ علوی۔ فیصل آباد
 ★ ”اے علاوہ لی وی کے کن اشارزہ سے بے حد متاثر ہیں؟“
 * ”طلعت حسین، عظمی گیلانی، صبا حمید اور بشری انصاری۔۔۔ لوگ ہمارا اسٹیج ہیں خالد حمید اور فیصل قربانی یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ کام کر کے آپ نام صرف بہت انجوائے کرتے ہیں بلکہ بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔“

(31) صائمہ عابد۔ عثمان والا ضلع قصور
 ★ ”عمران صاحب ہمارے دوستوں کے اشارزہ کی طرح

کیا آپ نے بھی انڈیا میں کام کیا کہ نہیں؟“
 * ”جی میں نے انڈیا میں ایک سیریل کیا تھا جو اے آر والی کی پروڈکشن تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ پاکستانی چینل نے انڈیا میں باؤس ورک کیا۔ انڈین ٹی وی کو میں زیادہ پسند نہیں کرتا میں سمجھتا ہوں ہمارا ٹی وی زیادہ بہتر ہے۔“

(32) امید چوہدری۔ سیالکوٹ
 ★ ”عمران صاحب سنا ہے آپ پانچ تاہم نماز بڑی پابندی سے پڑھتے ہیں؟“
 * ”جی ہاں الحمد للہ کمراس کے باوجود میں سمجھتا ہوں شاید میں اپنے رب سے محبت کا صحیح حق ادا نہیں کر پا رہا۔“

(33) شامکہ انجم۔ خانیوال
 ★ ”آپ کی فوج پلاننگ؟“
 * ”بہت اسٹرونک ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ دیکھ لیں گی۔“

(34) مسرت شاہین۔ ملتان
 ★ ”عمران عباس جی! کیا آپ کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں؟“
 * ”دلچسپی ہے۔ میری فیملی میں بھی اس کا رجحان تھا۔ کیونکہ ہمارے گھر مشاعرے ہوتے تھے جن میں پروین شاکر، احمد فراز، جوش ملیح آبادی سب کا آنا جانا تھا۔“

(35) فائزہ خور۔ بہاول نگر
 ★ ”آپ کے بارے سنا ہے کہ آپ نے کسی انڈین ڈرامے میں کام کیا ہے؟“
 * ”جی انڈیا میں ٹی وی پر بہت سے سیریل کیے ہیں ”کستوری“ ”کم کم“ ”گھوڑوں کے چھوڑنے کے میں“ وغیرہ وغیرہ۔“

(36) تابندہ بابر۔ فیصل آباد
 ★ ”عمران صاحب، آپ اتنے مصروف آرٹسٹ ہیں کیا گھر والوں کے لیے تاہم نکال پاتے ہیں کہ نہیں؟“
 * ”بہت مشکل سے بہت کم گھر جاتا ہوں۔“

بہت بہت شکریہ عمران عباس صاحب آپ کے قیمتی تاہم کا۔

بشری انصاری

شاہین رشید

انگل سرگم کے پروگرام کلیاں سے انہوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت ہی اچھی خاتون خانہ بھی ہیں تقریباً "تیس سال ہو گئے ہیں ان کی شادی کو اور آج تک کوئی اسکینڈل کوئی برائی بشری انصاری کے حصے میں نہیں آئی اور اس کی وجہ ان کا بلند کردار ہے۔ اس عظیم فنکار نے پیٹیا کا گھر پیارا کرنے کے لیے قربانیاں بھی دیں اس لحاظ سے کہ عروج کے زمانے میں شادی کی بجٹے بھی پالے اچھی بیوی بہو اور ساتھ ساتھ شوہر میں بھی اپنی خوبیوں کی بدولت ہر دل عزیز رہیں۔ آج "پیٹیا کا گھر پیارا لگے" کے لیے بشری انصاری سے بات ہوئی۔ بشری انصاری بہت زیادہ مصروف رہتی ہیں اس لیے تھوڑی گفتگو کو بھی بہت جانیے گا۔

★ "کیسی ہیں بشری انصاری صاحبہ؟"

✽ "اللہ کا کرم ہے۔"

★ "آپ کے بارے میں لوگ سب جانتے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو ایک شخص ہو۔ آپ کے بارے میں جاننے کی اس لیے ایک مختصر سا انٹرویو لینا چاہوں گی؟"

✽ "ہاں ضرور۔"

★ "کتنا عرصہ ہو گیا شادی کو۔ اور اقبال انصاری صاحبہ سے ملاقات کہاں ہوئی؟"

✽ "شادی کو تو ماشاء اللہ تقریباً "تیس سال ہو گئے ہیں اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں ماشاء اللہ سے اور دونوں شادی شدہ ہیں اور دونوں نے مجھے ثانی کے رتبے سے سرفراز کیا ہے اور اب آج اقبال سے ملاقات کی تو آپ سب کو یہ بھی معلوم ہی ہو

بشری انصاری نئی اور پرانی نسل کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ طویل عرصے سے اس فیلڈ سے وابستہ بشری انصاری کا نعم البدل ابھی تک کوئی سامنے نہیں آیا بے شمار صلاحیتوں کی مالک بشری انصاری شوہر کی ہر فیلڈ میں ٹکینے کی طرح فٹ نظر آتی ہیں ان کے گلے میں سر سے لگنے کی صلاحیت ہے، تحریر میں ان کا ہنر بڑھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تحریر ناکام ہوگی، حال ہی میں ختم ہونے والا سیریل "دل ہے چھوٹا سا" بے انتہا پسند کیا گیا۔ اور کاری میں اپنی مثال آپ، کمپیوٹرنگ میں الفاظ کے استعمال سے لوگوں کو پروگرام دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ پروڈیز کرنے میں لاجواب۔ مطلب یہ کہ کون سی فیلڈ ایسی ہے شوہر کی کہ جس میں بشری انصاری کو ناکامی ہوئی ہو، قسمت کا ستارہ ان پر بچپن سے مہمان ہے۔ بچپن اس لیے کہا کہ بشری انصاری بچپن سے اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔



کا کہ میں بچپن سے ہی اس فیلڈ میں ہوں۔ بچوں کے پروگراموں میں حصہ لیا کرتی تھی تو ہر وقت لی وی آنا ہانا کارہنما تھا۔ تو بس اسی میں سلسلہ چل پڑا۔"

★ "آپ کو کب احساس ہوا کہ اقبال صاحب آپ کو پسند کرتے ہیں؟"

✽ "مجھے کوئی احساس نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے ایسا کچھ سوچا تھا۔ ماحول بھی بہت کھلا نہیں تھا۔ پروگرام کے بعد اکثر گھر تک چھوڑنے جاتے تھے اور مجھے قطعی یہ احساس نہیں تھا کہ یہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ میری تو ہاں سب سے ہی دعا سلام رہتی تھی۔"

★ "پھر کب احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے؟"

✽ "جب انہوں نے مجھے پروپوز کیا۔ ورنہ تو میں ایسی ہی طرح جانتی تھی جس طرح دیگر پروڈیوسرز کو جن کے ساتھ میرا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہنسا بولنا، کھانا پکانا اور ہنسا تھا۔ انہوں نے جب پروپوز کیا تو ظاہر ہے

سوالگرہ خیر



کہ میں حیران تو ہوئی کیونکہ میں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔"

★ "پھر؟"

✽ "پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کتنا چاہیے تھا۔ اقبال گھر والوں سے ملے اور بس "آج اس بات کو ماشاء اللہ تیس سال ہو گئے ہیں۔"

★ "کیسے گزرے یہ تیس سال اور آپ کی مرضی کا کتنا عمل دخل تھا؟"

✽ "بہت اچھے۔۔۔ الحمد للہ بہت اچھے اور اگر میں گھر بے طور پر مطمئن نہ ہوتی تو شاید آج اتنی کامیاب



”اقبال صاحب“

”آپ صاحب ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گھر میں سب اس سے اور خوشی سے ایک دن پہلے گھر والوں نے ہر بات زیادہ خیال رکھا اور سب ہی بہت ادا تھے“

”آپ کے نین نقش بہت تھکے ہیں روپ تھکتے آ رہا ہے؟“

”لوگوں نے تو یہی کہا کہ روپ بہت ادا ہے اور مجھے بھی اپنا روپ اچھا لگا اور گھر پر ہی میں نے میک اپ کیا تھا۔“

”شادی سے پہلے اقبال انصاری صاحب کی الٹریکشن میں کام کرنے کا موقع ملا تھا؟“

”ہاں ایک اور مرتبہ انہوں نے کہا تھا لیکن پتا نہیں کس وجہ سے میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہد اپنی بڑھائی میں مصروف تھی۔ یا پھر زیادہ کام کرنے کی خواہش نہیں تھی۔“

”بچپن میں کچھ بننے کی خواہش تھی۔ بڑھائی کے طے میں یا سوچ لیا تھا کہ اس فیلڈ میں نام کمانا ہے؟“

”اپنی صلاحیتوں کا آہستہ آہستہ ہی پتا چلتا ہے۔ لیکن یہ بات تو میں کم عمری میں ہی سوچا کرتی تھی کہ مجھے کلو کارہ بنانا ہے اور مجھے ڈرامہ رائٹر بھی بنانا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے جو کام یا بیاں دی ہیں اس کے لیے تو میں جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ سہاں بھی لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ میں ایئر ہو سٹس بن کر ساری دنیا کی سیر کروں مگر ایسا ہونہ سکا۔“

”کیوں؟“

”بس جلدی شادی ہو گئی اور پھر ضروری تو نہیں کہ انسان جو سوچے وہ اسے مل بھی جائے اللہ وہ ہی کرتا ہے جو انسان کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اگر میں ایئر ہو سٹس ہوتی تو آج میری پہچان نہ ہوتی عام نواتین کی طرح ہوتی۔“

”یہ بات تو میں بر ملا کہوں گی کہ بے بنا شہرت کے اللہ بھی میں نے آپ میں غرور نہیں دیکھا اور نہ تو

تھوڑی سی شہرت کے بعد ہی خواتین و حضرات آپ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ لوگ پہچان کر ارد گرد ہوتے ہیں آپ کے تو آپ کو برا نہیں لگتا؟“

”نہیں کیوں برا لگے گا شہرت یا کر انسان کے بر تو نہیں نکل آتے بلکہ جب اللہ اتنی نوازشیں کرے تو اس کا زیادہ شکر گزار ہو جانا چاہیے۔ لوگ مجھ سے پیار اور محبت سے ملتے ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ تو لوگوں کی محبت ہے کہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔“

”اقبال صاحب کو مزاج کیا پایا؟“

”اقبال مزاج بہت اچھے ہیں۔ کوئی غلط بات ان سے برداشت نہیں ہوتی وقت کو ضائع کرنا ان کو برداشت نہیں اس لیے غصہ جلدی آجاتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ غصے کے تیز ہیں۔“

”اقبال صاحب کے لیے کوئی دو چار جملے یعنی ان کی شخصیت کو کس طرح واضح کریں گی؟“

”اس طرح کہ اقبال اپنے کام میں مگن رہنے والے ایک سنجیدہ اور بارعب اور انتہائی بڑا دوا اور بہت زیادہ شریف انسان ہیں اور بہت ہی قابل اور بہت ہی ذہین انسان ہیں۔“

”آپ شرارتی ٹٹ کھٹ سی اور اقبال صاحب

”میل ملاقات ہوتی تھی اور شادی ساوگی سے ہوئی یا دھوم دھام سے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ نیوی میں آنا جانا رہتا تھا کام کے سلسلے میں تو ملاقات بھی ہوتی تھی اور بات چیت بھی۔ اور سب کے سامنے ایسی کوئی کہانی نہیں ہوئی جیسی کہ آج کل ہوتی ہے اور شادی بھی دھوم دھام سے ہوئی تھی نیوی کے بہت سے لوگ آئے۔“

”تمام رسمیں ہوئیں اور آپ نے رسمیں انجام دے کیں؟“

”بالکل تمام رسمیں ہوئیں اور انجوائے تو کیں۔ مگر آپ کو پتا ہے اس زمانے میں شرم و حیا بہت زیادہ ہوئی تھی تو بندہ کھل کے اظہار نہیں کر سکتا تھا۔“

”نئے گھر نئے ماحول میں جانے کا کوئی ڈر خوف تھا یا بہت ایزی فیل کر رہی تھیں؟“

”ایزی فیل تو نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی بہت زیادہ ڈر خوف تھا۔ بس وہ خوشی تھی جو کہ عام طور پر لڑکیوں کو ہوتی ہے کہ نئی زندگی ہوگی نیا ماحول ہوگا۔ اس پاس سب پیار کرنے والے لوگ ہوں گے۔“

”پھر ایسا ہوا؟“

”بالکل ہوا۔ مجھے بہت اچھا سسرال ملا۔ سسرال نے بھر پور استقبال کیا۔ بہت پیار دیا اور اقبال کو تو میں بہت قریب سے جانتی تھی۔“

”ذمہ داریاں بڑھیں یا میکے سے زیادہ اچھی زندگی لگی؟“

”میکے کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میکے میں ذمہ داریاں ہوتے ہوئے بھی اس کا احساس نہیں ہوتا اور سسرال میں ذمہ داریاں نہ ہوتے ہوئے بھی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ تو بالکل مختلف ہوتی ہے سسرال کی زندگی اور میں سمجھتی ہوں کہ جب سسرال جا کر ذمہ داریاں پڑتی ہیں تو پھر اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے کہ ہم کچھ ہیں تب ہی تو ہم پر یہ ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں۔“

”آج کل کے ماحول اور گزرے زمانے کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ گھر میں اداسی کی کیفیت ہوتی

بھی نہ ہوتی۔ اقبال کا بھر پور تعاون میرے ساتھ رہا کہ جن کی بدولت آج میں اس فیلڈ میں کامیاب ہوں اور آپ سب مجھے پسند کرتے ہیں اور شادی میں میری پسند بھی پوچھی اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔“

”زندگی میں کبھی ایسا وقت آیا جب آپ نے سوچا ہو کہ مجھے یہ فیلڈ چھوڑ دینی چاہیے گھر کی لائف ڈسٹرب ہو رہی ہے؟“

”نہیں چھوڑنے کا میں نے کبھی نہیں سوچا کیونکہ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور جب میری بچیاں چھوٹی تھیں تو میں نے خود ہی کام کم کر دیا تھا اور ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ کام کی وجہ سے گھر نظر انداز ہوا ہو۔ ماشاء اللہ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔“

”آپ سے تو آپ کی مرضی پوچھی گئی اور یقیناً آپ نے اپنی بیٹیوں سے بھی پوچھا ہوگا۔ یہ بتائیں کہ لڑکیوں کی رضامندی کتنی ضروری ہے؟“

”بہت ضروری ہے۔ زندگی انہوں نے گزارنی ہوتی ہے اس لیے ان کی رائے ضرور پوچھنی چاہیے، چاہے لڑکی ہو یا لڑکا۔ اکثر گھرانوں میں اس بات کو ”میں چاہتا ہوں“ اور والدین اپنی مرضی سے بچوں کی شادیاں کر دیتے تھے اور بعد میں مسائل پیدا ہوتے تھے۔“

”آپ ماشاء اللہ اتنی بولڈ اور بے شمار خوبیوں کی مالک ہیں۔ آپ کی بیٹیاں بھی کچھ کم نہیں ہوں گی وہ کیوں نہیں ہیں اس فیلڈ میں؟“

”میری بیٹیوں کو کبھی بھی شوق نہیں رہا اس فیلڈ میں آنے کا اور نہ ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ماشاء اللہ وہ بھی کافی ٹیلنٹڈ ہیں۔ اب اپنی گھرداری میں بہت خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔“

”آپ کی منگنی ہوئی یا ڈائریکٹ شادی ہوئی؟“

”نہیں ڈائریکٹ شادی نہیں ہوئی۔ منگنی کی رسم تو ہر گھر میں ہوتی ہے اور یہ ایک روایتی شادی تھی کوئی لو میرج نہیں تھی اقبال مجھے پسند کرتے تھے جبکہ میں نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا تھا حالانکہ میں مجھے اچھے لگتے تھے۔ خیر ہماری منگنی تقریباً تین مہینے رہی۔“

سنجیدہ گھر میں پورے توتی ہوگی؟

* ”نہیں ایسی بات نہیں گھر میں تو نارمل ہی حالت میں رہتے ہیں جہاں ماحول نٹ کھٹ سا ہوتا ہے وہاں پر یہ بھی انجوائے کرتے ہیں۔“

* ”مجھے سنو نے کاشوق اب زیادہ ہے یا تو جوانی میں زیادہ تھا؟“

* ”نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ بس اچھا لگتا تو ہر خاتون کی خواہش ہوتی ہے اور میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں کچھ پہنوں تو اچھی لگوں۔ میں بھی سادگی پسند ہوں اور اقبال کو بھی سادگی پسند ہے۔“

* ”پھر تو آپ فضول خرچ بھی نہیں ہوں گی؟“

* ”نہیں۔۔۔ نہیں اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ بڑے زیورات اور بہت مہنگے لباس پر خرچ ہوں۔ مجھے اچھے اچھے کپڑوں کاشوق ہے میری دیگر ضروریات ہیں۔ گھر کو سجانے سنوارنے کاشوق ہے۔“

خرچ کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ فیشن پر ہی خرچ ہو۔ تو میں فضول خرچ نہیں ہوں مگر نجوس بھی نہیں جو چیز پسند آجائے اسے خریدنے سے نہیں گھبراتی۔“

* ”اور اقبال صاحب؟“

* ”وہ بھی ایسے ہی فضول چیزوں کے لیے فضول خرچ نہیں ہیں۔ ہم دونوں ہی کام کی چیزوں پر خرچ کرتے ہیں۔“

* ”میں نے گزشتہ رمضان المبارک میں آپ کو کوکنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو اندازہ ہوا کہ آپ کو کوکنگ کا بھی شوق ہے؟“

* ”بہت زیادہ شوق تو نہیں، لیکن میں اچھا خاصا پکا لیتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ ایک عورت کو گھر کے ہر کام آنے چاہیں اور یہ عورت کے لیے بڑے بھاری بات ہوتی ہے کہ اسے گھر کے ہر کام آتے ہوں۔“

* ”سب سے اچھا کیا پکا لیتی ہیں یا آپ کی بیٹی؟“

دش کیا ہے؟

* ”تقریباً سب ہی کچھ پکا لیتی ہوں مگر مجھے بھنڈی پیاز بہت پسند ہیں۔ مجھے پاو ہے کہ ایک مرتبہ میں بھنڈی پیاز پکانے لکھڑی ہوئی اور پیاز کو بھون کر اس کے اندر بھنڈی ڈالی اور بھون رہی تھی کہ کوئی کام پاؤ آ گیا۔ میں نے آگ بجلی کی اور ہانڈی پی ڈھکن رکھ کر اندر کمرے میں گئی واپس آئی تو بھنڈی سفید سفید ہو رہی تھی اور میں حیران کہ میں نے تو اس میں نہ پانی ڈالا نہ کچھ اور پھر اسے کیا ہو گیا ہے۔ پھر خیال آیا کہ میں تو اس کے اوپر ڈھکن دے کر گئی تھی وہ بھی غائب ہے تب اچانک میں نے اپنا سر پکڑ لیا کہ جو ڈھکن میں ہانڈی کے اوپر دے کر گئی تھی وہ تو پلاسٹک کا تھا جو آج کلنے پر پکھل گیا تھا۔ اف میرے خدا یا اس وقت اپنی حماقت پر بہت ہنسی آئی کہ کبھی کبھی ایسی بے وقوفیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔“

* ”بہت دلچسپ قصہ تھا۔ تمہکن اتارنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟“

* ”سمندر کے کنارے نسل لیتی ہوں، مہالہ کرنا

مجھے بہت اچھا لگتا ہے مطالعہ کر لیتی ہوں۔ اچھی میوزک سے دل بہلائی ہوں یا پھر کچھ لکھنے کا موڈ ہو تو لکھ لیتی ہوں۔ تخلیق کے لیے وقت نکالنا ہی تمہکن اتارنے کے مترادف ہے۔“

* ”چلیں، یہ نام لیا۔ اب بیٹے جلتے یہ بتاؤں کہ دلہن کے روپ میں دیکھ کر اقبال صاحب نے کیا کہا تھا۔ اگر آپ بتانا چاہیں تو؟“

* ”بہت مزے کی بات ہے۔ اقبال کو بہت زیادہ میک اپ پسند نہیں انہوں نے کہا چلو پہلے منہ دھو کر آؤ پھر باتیں کریں گے۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ وہ کتنے سادگی پسند ہیں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے بشری انصاری سے اجازت چاہی

سائلگرہ خیرا



دو کا پہاڑ

کالی شیمو

شاہین رشید

- 1 ”کوئی دو نام جن کے لیے آپ سوچتے ہیں کہ کاش یہ میرے ہوتے؟“
- * ”مجھے تو اپنا نام بہت پارا لگتا ہے بہت پرکت والا نام ہے اور ویسے مجھے عمر بہت اچھا لگتا ہے اور اس بہت پسند ہے۔ ڈرامہ سیریل ”نیمسٹری“ میں میرا نام رامس ہے۔“
- 2 ”آپ کے دو کئی نمبرز؟“
- * ”سات اور آٹھ۔“
- 3 ”دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتے ہیں؟“
- * ”میں آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جانا چاہتا ہوں اور دو سرامغلیہ دور میں

4 ”جانا چاہوں گا۔“

5 ”دوستی ہیں؟“

* ”ہاں اور ابو کے۔“

6 ”دو بری عادتیں جن سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں؟“

* ”رات کو دیر سے سونا اور اس کے علاوہ اور کوئی بری عادت ہی نہیں ہے جیسے کہ آج کل کے نوجوانوں میں ہوتی ہے اور دوسری عادت یہ ہے کہ غصہ خطرناک آتا ہے۔“

7 ”دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟“

* ”میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس لیے دو جھوٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

8 ”اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر غصہ آتا ہے؟“

* ”جھوٹ سن کر اور ایسی تنقید جس کی کوئی بیس ہی نہ ہو۔“

9 ”حالات حاضرہ کے دو اینکوز جو پرچی سے آئے ہیں؟“

* ”ارے نہیں سارے اتنے ذہین ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت دیر میں آئے ہیں۔ انہیں جلدی آنا چاہیے تھا۔ اگر یہ جلدی آجاتے تو ملک اور بھی بہتر





http://www.pakfunda.com

ہو جاتا۔ خالد میر کاشف عباسی اور دیگر بہت ہی اچھے ہیں۔

9 "مارننگ شو کے دو اینکوز جو آپ کی نظر میں بہترین ہیں؟"

* "سوراندیم اور ڈاکٹر شائستہ واحدی۔"

10 "دو دست جن پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟"

* "ایک دوست ضیاء ہے اور دوسری دوست صنم بلوچ ہے۔"

11 "دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟"

* "گرینہ کپور اور دیپیکا۔"

12 "دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر رشک آتا ہے؟"

* "شاہ رخ خان اور عاطف اسلم۔"

13 "دو تہوار جو آپ اہتمام سے مناتے ہیں؟"

* "تمام اسلامی تہوار میں اہتمام سے منانا ہوں۔ لیکن پھر بھی رمضان المبارک نہایت احترام سے گزرتا ہے اور دونوں عیدیں جوش و خروش کے ساتھ منانا ہوں۔"

14 "دن کے چار پہر میں سے کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟"

* "شام کا پہر اور رات مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔"

15 "پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟"

* "سلام کرتا ہوں اور How are you۔"

16 "دو کھانے جنہیں کھا کر کبھی بوری نہیں ہوتے؟"

* "گو بھی گوشت اور کوفتے۔"

17 "دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتے؟"

* "اگر میری غلطی ہوتی ہے تو میں کسی سے بھی معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔"

18 "دو پسندیدہ کھلاڑی جن کی وجہ سے کرکٹ سچ دیکھتے ہیں؟"

* "شعیب اختر، ان کے علاوہ سارے ہی اتنی

خراب برقرار منس دکھاتے ہیں کہ کسی کا نام لینے کو اور اگر کوئی قابل بھروسہ ہے تو پھر شاہد آفریدی ہے کبھی کبھی ٹیم کو جتو اتورتا ہے۔"

19 "کن دو خوب صورت دنوں کے منتظر ہیں؟"

* "گزشتہ ڈیڑھ دو سالوں سے بہت خوب صورت دن چل رہے ہیں اور آگے بھی بہت خوب صورت دن آنے والے ہیں ان شاء اللہ۔"

20 "دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"

* "اپنی گھڑی اور کریڈٹ کارڈ۔"

21 "دو الفاظ یا محاورے جو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"

* "بہت زیادہ تو کوئی لفظ استعمال نہیں کرتا نہ ہی کوئی میرا کلمہ کلام ہے اور کسی جملے کو دوہرانا یا تکرار بالکل بھی نہیں کرتا۔"

22 "دو پسندیدہ صحافی؟"

* "صحافت میں مجھے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اور اس لیے مجھے ان کے بارے میں معلومات بھی نہیں ہے مگر خالد میر اور ڈاکٹر شاہد مسعود پسند ہیں۔"

23 "سات دنوں میں کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟"

* "جمعہ اور ہفتہ۔"

24 "بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟"

* "فروری اور ستمبر۔"

25 "اپنے گھر میں دو پسندیدہ چکنے؟"

* "میرا اپنا روم اور وی لائونج۔"

26 "گھر کے دو کام جو آپ کو کرنا پسند نہیں؟"

* "دو کام۔ ویسے تو کوئی بھی کام کرنا پسند نہیں لیکن اپنا روم صاف کرنا تو بالکل پسند نہیں چیریں اور ہر اوہر بکھیر دیتا ہوں کہ خود ہی ماسی صاف کرنی رہے گی اور بازار سے چیریں لانا بھی پسند نہیں۔"

27 "دو پسندیدہ چکنے پوائنٹس؟"

* "کراچی میں یا پاکستان میں چکنے منا نہیں پاتا۔"

دو نوں ممالک نے بہت ترقی کی ہے۔"

31 "کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟"

* "بلیک اور وائٹ۔"

32 "کسے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟"

* "کراچی۔ لاہور۔"

33 "سال کے چار موسموں میں دو پسندیدہ موسم؟"

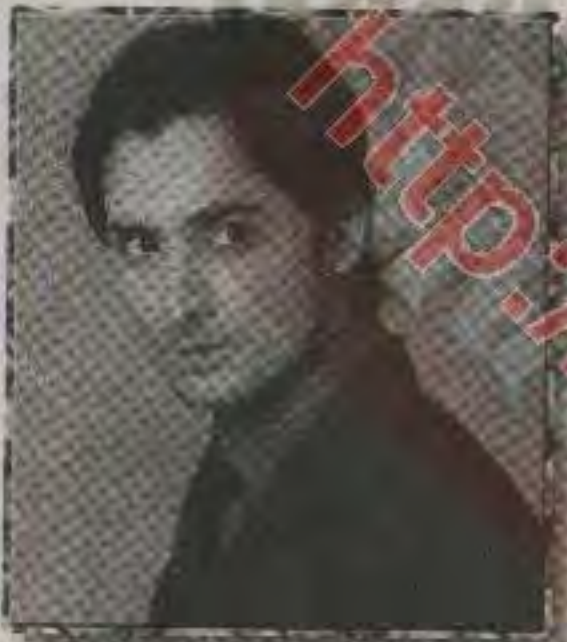
* "مجھے سارے موسم پسند ہیں۔ کیونکہ میرا کام ایسا ہے کہ مجھے ہر موسم کو سہنا پڑتا ہے تو یہ تو چلتا ہی رہتا ہے لیکن میری پسند تو سردیوں اور بہار کا موسم ہے۔"

34 "تینوں کی دو نا پسندیدہ علامتیں؟"

* "جھوٹ بولنا، اللہ معاف کرے بہت جھوٹ بولتی ہیں اور ان کے پاس باتیں کرنے کا بہت فالتو وقت ہوتا ہے۔"

35 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام سب سے زیادہ کرتے ہیں؟"

* "کناک یعنی پورا تھلا لینڈ اور دو سراجین ان



* "شخصیت کو نہیں کلج کے دنوں کو اغوا کروں گا اور ان دنوں کو انجوائے کرنا چاہوں گا۔"

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ذرد موم
راحت جبین

قیمت - 600/- روپے

32715021

54 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟"

* "پائفل صاف ستھرا ہو اور کوئی شکن نہ ہو یعنی بہت اچھی طرح استری ہوئے ہوں۔"

55 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"

* "اکٹلا اور کوئی نہیں۔"

56 "کن دو چیزوں سے ڈر نہیں لگتا ہے؟"

* "کسی سے نہیں چھپیلے کو تو ہاتھ سے پکڑ لیتا ہوں۔ بچپن سے بہت ہمارے ہوں۔"

57 "دو ریستورانٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

* "کارٹس اور نینڈور۔"

58 "دو چینلز جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں؟"

* "AXN اور اسپورٹس چینلز۔"

59 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟"

* "زیادہ تر تو میں ملک سے باہر ہی جا کر شاپنگ کرتا ہوں مگر پھر بھی پارک ٹاور اور فورم۔"

60 "دو تبدیلیاں جو اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟"

"تھوڑا سا بڑا دکھنا چاہتا ہوں اپنی عمر سے۔ اور بس۔"

61 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

* "پانی اور سلاڈ۔"

62 "دو چیزیں جو آپ کے والٹ میں لازمی ہوتی ہیں؟"

* "پیسے اور کریڈٹ کارڈ۔"

63 "کن دو شخصیات کو اغوا کرنا چاہیں گے اور ان میں کیا وصول کریں گے؟"

چھٹی کرنے سے پرہیز کرتا ہوں۔"

45 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"

* "کوشش کرتا ہوں کہ پوری نمازیں پڑھوں لیکن فجر قضا ہو جاتی ہے۔"

46 "بیرون ملک شاپنگ میں کون سی دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"

* "جو تے اور جیکٹ۔"

47 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

* "اپنے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ باقی کسی کے غصے سے ڈر نہیں لگتا۔"

48 "کن دو لوگوں کی تعریف میں بھل سے کام نہیں لیتے؟"

* "جو تعریف کا مستحق ہوتا ہے اس کی تعریف ضرور کرتا ہوں دوسروں کی حوصلہ افزائی کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

49 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

* "گریوں میں تریوز کا جوس اور سردیوں میں اورنج جوس بے حد پسند ہے۔"

50 "ملک میں کون سی دو تبدیلیاں بہت ضروری ہیں؟"

* "دو تبدیلیاں۔ دو کروڑ تبدیلیاں ضروری ہیں۔"

51 "آج کے دور کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

* "عاطف احمد اور سونو نگم۔"

52 "شادی کی دور میں جو انجوائے کرتے ہیں؟"

* "سندی ماہوں پہ ڈھونگی وغیرہ ابھی تو انجوائے کر رہا ہوں دوسروں کی شادیاں۔"

53 "دو باتیں جو آپ کاموڈ خراب کر دیتی ہیں؟"

* "کوئی جھوٹ بولے اور مجھے پتا چل جائے اور ہمارے پرانے لیڈرز جیسے قائد اعظم اور ان کے دور کے لیڈرز کو کوئی برا کہے تو میرا موڈ خراب ہو جاتا۔"

* "ایکسر سائز کرتا ہوں اور پھر ناشتا۔"

36 "دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی بتانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

* "میری امی اور دوسری ابھی زندگی میں آئی نہیں۔"

37 "آپ کے نزدیک دنیا کی دو خوب صورت ترین خواتین؟"

* "انجلینا جولی اور کرینے کپور۔"

38 "دو پسندیدہ پرو فیشن؟"

* "کرکٹ اور شو بزنس۔"

39 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں جو گزر چکے ہیں؟"

* "قائد اعظم اور سر سید احمد خان۔"

40 "والدین کی دلفیبتی جو آپ نے گرہ میں باندھی ہوں؟"

* "جھوٹ کبھی نہ بولنا اور اپنی ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچانا۔"

41 "اپنے دو ڈرامے جو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکتے؟"

* "چودھویں کا چاند اور کیمسٹری۔"

42 "اپنے کیے گئے دو کردار جو بہت پسند ہیں؟"

* "میرے آنے والے ڈراموں میں دو کردار ایسے ہیں جو میرے لیے یادگار ہوں گے۔ لیکن میں ابھی ان کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا اور جو کرچکا ہوں ان میں ڈرامہ سیریل "من چلے" کا جبران کا کردار اور کیمسٹری کا رامس میرے پسندیدہ کردار ہیں۔"

43 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

* "نہیں جی اللہ کا شکر ہے ابھی تک کوئی فیصلہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ آئندہ کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

44 "کن دو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں؟"

* "اور ڈائجسٹ سے پرہیز کرتا ہوں اور ایکسر سائز کی"

گائیں کچھ معنی بے معنی سی

ریحانہ مجید بخاری

مشعل چوہدری۔ شعواہن



1- کرن کے ہر ناول 'ناولٹ انساں' میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو دل کو چھو لیتی ہے اسی لیے تو ہم جیسے دیوانے لوگ دو تین بار پڑھنے کے بعد بھی تسکینی محسوس کرتے ہیں۔

ممتاز مفتی اپنی کتاب 'تلاش' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ 'شیلر نے دیکھنے کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ان کے مضمون کا عنوان تھا 'اوگاسز نے مجھے دیکھنا سکھایا' اوگاسز شیلر کا استاد تھا شیلر لکھتا ہے۔

'جب میں اپنے استاد اوگاسز کی لب میں داخل ہوا تو انہوں نے ایک ٹین کی تھالی میں ایک پھل رکھ دی اور مجھ سے کہا۔ اے دیکھو غور سے دیکھو اس کے بارے میں کسی

انسان کی زندگی سفر سے عبارت ہے۔ ازل سے انسان حالت سفر میں ہے کبھی اس کا سفر اپنی ذات کی تلاش کے گرد۔ رہتا ہے تو کبھی اس کا مقصد سفر کسی ایسی شخصیت کے لیے ہوتا ہے جو اس کی سچ سے دور ہو۔ مگر کبھی اسے جانے اور حاصل کرنے کی لگن و توجہ وہ وقت اسے گردش میں الجھائے رکھتی ہے مگر اس کا سفر ہنوز سفر ہی رہتا ہے اور وقت گزر جاتا ہے کیونکہ اس کا کام ہی گزرتا ہے۔

کرن کی سالگرہ کے موقع پر حسب روایت ہم نے قارئین سے کچھ دلچسپ سوالات کیے ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

سوالات

- (1) 2010ء میں شائع ہونے والے ناول 'ناولٹ اور افسانوں میں آپ کا پسندیدہ اقتباس یا جوتیشن؟
- (2) شاعر کہتا ہے۔

روز اٹھ کر چاند ٹھانکا ہے
فک پر رات کو
اور دن کی روشنی میں
رات تک آیا کیے
ہاتھ بھر کے فاصلے کو
عمر بھر چلنا پڑا

ایسی کوئی شخصیت جس تک پہنچنے کے لیے سفر نے مستقل سفر کیا ہو پھر بھی فاصلہ طے نہ ہوا ہو؟

- (3) اپنے پسندیدہ اداکار اور اداکارہ کی شخصیت کو اس کی سالگرہ کے موقع پر آپ کیا تحفہ دینا پسند کریں گی؟
- (4) اگر آپ کو اپنے ماضی میں جانا یا الوداع اپنے کون سے دور میں جانا چاہیں گی وجہ بھی بتائیں؟

سے بات کرنا نہ ہی کوئی حوالے کی کتاب پڑھنا جب میں پڑھوں کہ تم نے کیا دیکھا اس وقت مجھے بتانا اس سے پہلے اس۔ ایک گھنٹہ میں پھلی کو دیکھا رہا میں سمجھا میں نے پھلی کو پورے طور پر دیکھ لیا ہے۔ اب میں امید لگا بیٹھا کہ اوگاسز مجھ سے پوچھتے گا۔ اوگاسز میرے قریب ہی تھا لیکن اس نے مجھ سے نہ پوچھا ایک دن گزر گیا دو دن گزر گئے پورا ہفتہ گزر گیا لیکن اوگاسز نے میری طرف توجہ نہ دی ویسے رسمی علیک سلیک کرتا رہا کبھی کبھی کافی آنکھ سے مجھے دیکھ لیتا۔ میں مجبوری میں پھلی کو بار بار دیکھتا اور یوں پورے طور پر اس سے واقف ہو گیا۔ آخر اوگاسز میرے پاس آیا اور پوچھا۔

"تو پھلی میں کیا کیا دیکھا؟"

"میں نے ایک ایک کر کے ساری باتیں بتا دیں۔" وہ غور سے سنتا رہا پھر بولا۔

"اوہوں! ابھی مشاعرہ چاہے پھر دیکھو۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا میں نے پھر سے پھلی کو دیکھنا شروع کر دیا اب کی بار مجھے نئی نئی باتیں نظر آئے لیکن ایسی باتیں کہ میں خود حیران رہ گیا ایک ہفتے بعد جب میں نے اوگاسز کو سب کچھ بتایا تو اس نے شاباش نہ دی بلکہ کہا۔

"ہاں کو شش کرو دیکھنا سیکھ جاؤ گے۔"

"اسی طرح ہم بھی رسالوں کو See کی نظر سے نہیں بلکہ Look کی نظر سے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں" گوشت عاقبت "شروع میں ہمیں عام سناولٹ لگا مگر پھر اس تحریر نے آہستہ آہستہ دل میں گھر کر لیا اس کا یہ اقتباس ابھی تک میرا پسندیدہ ہے۔

"جس محبت کو عزت نصیب نہ ہو وہ بہت جلد بوجھین جا یا کرتی ہے۔ راحت دینے کے بجائے باعث عذاب لگنے لگتی ہے۔ حقیقت میں جینے کے لیے عورت کو معاشرے میں عزت اور وقار کی ضرورت محبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد خاندان ہی تو عورت کا مان اور محافظ ہوتا ہے خاندان کی طرف سے ملنے والی محبت اور عزت ہی عورت کو انسانی زندگی کے مسائل اور صعوبتوں میں حوصلہ دیتے ہیں اور اگر سسرال کی طرف سے کسی عورت کو عزت نہ ملے تو شوہر کی محبت بھی بے معنی اور ادھوری لگنے لگتی ہے۔" مجھے یہ اقتباس اس لیے پسند ہے کیونکہ اس میں آئی ہے۔ اگر ہر لڑکی اس پیغام کو سمجھ لے تو میرا خیال ہے کہ اطالائی طور پر ہم بہت سنور سکتے ہیں۔



2-

اک عمر جسے خواب کی مانند دیکھا چھوٹے کو ملا تو پریشان بہت ہوں ابھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں ہاں جی ہماری زندگی میں بھی ایک ایسی شخصیت ہے جسے کھونٹے میں ہم مصروف نکل ہیں۔

کس طرح بیٹھے اپنی شہر یار سے محسن اس کا ہم نشین سلیہ، میرا ہم سفر سورج امید ہے ہم اس سفر میں کامیاب ہوں گے (آپ کی دعاؤں کے ساتھ)

3- اس کا جواب میرے پاس کافی الٹ ہے تو جناب اگر ایسا موقع آیا تو میں اس شخصیت سے گفت لوں گی بجائے دینے کے اگر جاوید چوہدری کی سالگرہ پر موقع ملا تو انہیں کہوں گی سہرا پلیر اپنی ساری زبرد پوائنٹ میری دستخط کے ساتھ مجھے گفت کریں اور اگر ممتاز مفتی کی سالگرہ پر موقع ملا تو کہوں گی۔ سہرا تلاش، نیاز کے چھلکے، لبیک کے علاوہ اپنی ساری کتابیں مجھے گفت کریں اور ہندی کو دعاؤں کا موقع دیں لیکن کہاں کہاں ہم اور کہاں؟

مجھے گفت دینے کا موقع ملے تو میں کتابیں ہی گفت کروں گی بشرطیکہ اگلا بندہ میرا پسندیدہ اور تھوڑا بہت کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتا ہو۔

4- آج سے کچھ سال پہلے کے دور میں جانا پسند کروں گی جب کوئی مستقبل کی پیشین گوئی نہیں تھی پڑھنا۔ پڑھنا اور صرف

پڑھنا ہی کام تھا مزے سے رسالے "میکرین پڑھنا اور بس" لے۔

بڑھا دیتی ہیں عمروں کو نہ جانے یہ کتابیں کیوں میں پھونکا تھا مگر سر پر کئی صدیوں کا سایہ تھا شینہ اکرم۔ ہمارا کالونی لیاری

سب سے پہلے تو دل کی گہرائیوں سے اپنے پیارے دوست محبوب اور تنہائی کے ساٹھی کرن ڈائجسٹ کو سالگرہ مبارک ہو۔ خدا کرے کہ تم (کرن) روز اول کی طرح تاحیات ہر طرف اپنی کمریں کھیرتے رہو اور دن رات چوگنی ترقی کرو (آمین)

پہلا سوال جتنا آسان تھا۔ اس کا جواب اتنا ہی وقت طلب۔ خیر کرن کے لیے اتنی محنت کرنا تو سالگرہ پر اس کا حق بنتا ہے۔ پہلے سوال کا جواب تحریر کرنے کے لیے 2010ء کے تمام ڈائجسٹ کا ذخیرہ نکالا اور لگے از سر نو مطالعہ کرنے۔

1- 2010ء میں ہمیں بہت سی لاٹوال تحاریر پڑھنے کو ملیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جنہوں نے ہمارے دلوں پر انٹ نفوش رقم کیے میں خاص طور پر بات کرناں گی نومبر 2010ء میں شائع ہونے والے لاٹوال اور ناقابل فراموش ناول کی "عشق آتش" (سعدیہ راجپوت) کی طرز تحریر گمانی نکلانہ اور جزئیات نگاری بے مثل اور بے نظیر ہے۔ یہ شاید اس سال کا بہترین ترین ناول قرار پائے گا۔ یہ ایک ایسی تحریر ہے جس نے چار ماہ سے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ میں یہاں اپنے پسندیدہ ترین یادگار ناول "عشق آتش" ہی سے ایک اقتباس تحریر کرتی ہوں۔ (نومبر 2010)۔

"ہم نے تو بس وقت کو جینا سیکھا ہے زندگی کو تو ہم نے کبھی جیا ہی نہیں۔ اور جب یہی وقت ہمارے پاس ختم ہو جاتا ہے تو عمر بھر زندگی کے کتابچے میں نفع و نقصان درج کرتے رہ جاتے ہیں۔"

مارچ 2010ء میں شائع ہونے والا ناول (شہناز صدیق) "پھر کرم ہو گیا" کا ایک اقتباس پیش کرتی ہوں۔ "جب انسان گناہ کرنے کے بعد بھی مطمئن زندگی گزارے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا رب اس سے کتنی دور ہے۔ بے چین اور بے سکونی اسی وقت انسان کے اندر سرایت کرتی ہے جب اس کے اندر کس نہ کس اچھائی

پوشیدہ ہوتی ہے۔"

اب آتے ہیں بہترین افسانہ کی طرف۔ اکتوبر 2010ء میں شائع کردہ افسانہ "زن زہ زمین" میں راشدہ نیازی نے بڑی خوبصورت ہمت لکھی ہے کہ "زمین کتنی ہی زرخیز کیوں نہ ہو محض پانی اور کھاد کے بل بوتے پر فصل نہیں دے سکتی۔"

2- آئیڈل تو میں نے کبھی بنایا نہیں کیونکہ دنیاوی آئیڈل محض سراب ہوتے ہیں۔ سراب جو کبھی ہاتھ نہیں لگتا۔ اس کے میرے ارد گرد تو کوئی ایسی شخصیت نہیں۔ کیونکہ انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔

البتہ بحیثیت مسلمان ہونے کے اگر ہم اپنے پیارے آقا نادر تاجدار حرم سرور کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کی پیروی و اطاعت کریں تو دین و دنیا دونوں میں فلاح اور نجات ہے۔ ہمیں کسی اور شخصیت کے پیچھے بھاگنے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ہمیں صحیح اور مکمل ہدایات مل سکتی ہیں جس کے فی الواقع ہم محتاج ہیں۔ آپ کے ارشادات و احکامات حکم خداوندی کا درجہ رکھتے ہیں اور آپ کی اطاعت خود اللہ کی اطاعت ہے۔ آپ پر نازل کتاب اللہ کی طرح آپ کی سیرت پاک بھی محفوظ ہے۔ اور اس میں آپ کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملی ہیں جو تاریخ کے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملیں۔

اس لیے میں تو ایک مسلمان ہونے کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور آپ کی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ واحد ہستی عظیم ہیں کہ ہم تاحیات بھی آپ کے نقش قدم پر چلیں تب ہی آپ کے پاؤں کی دھول کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ ہم مستقل بھی سفر کریں تب بھی یہ فاصلہ ختم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپ کی براہی آج تک نہ کوئی کر رہا ہے اور نہ ہی کرے گا۔ (ان شاء اللہ)

3- پسندیدہ اداکار اور اداکارہ کوئی نہیں ہے کہ میں فلمیں تو بالکل بھی نہیں دیکھتی البتہ ٹی وی ڈرامے کبھی کبھار دیکھ لیتی ہوں۔ پاکستانی سیاست سے تو اللہ معاف کرے لہذا کوئی سیاست دان بھی پسند ہونے سے رہا۔

البتہ اگر بات ہو پسندیدہ شخصیت کی تو ڈاکٹر خانیہ صدیقی میری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ جو قوم کی بیٹی اور پاکستان کی

مرات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان ہونے کا جھگڑا نہ جھکت رہی ہیں۔ یہ بے گناہ بیٹی امریکہ کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہی ہے۔ اللہ اسے مزید استقامت اور حوصلہ عطا فرمائے۔ (آمین) جس کی رہائی کے لیے پاکستانی شہری جگہ جگہ مظاہرے کر رہے ہیں اس ظلم کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ مگر حکومتی سطح پر ڈاکٹر خانیہ صدیقی کی رہائی کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جا رہی۔ اس لیے میں ڈاکٹر خانیہ صدیقی کو ان کی سالگرہ پر اپنی نیک تمناؤں اور دعاؤں کا ذخیرہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔ یہی قوم کی ہمارے بیٹی کو ان کی سالگرہ پر آنسوؤں کے نذرانہ کے علاوہ ان کی باعزت رہائی کے لیے دعاؤں اور خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گی جو اسلام اور پاکستان کی خاطر اپنی جان پر اتنے ظلم سہہ رہی ہیں اور پھر بھی سرنگوں نہیں ہوئیں ان کے پاس استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ اللہ ان کو جلد رہائی دے کر اپنے بچوں اور والدین سے ملا دے (آمین)

4- اسی میں جانے کا موقع مل جائے تو کہنا ہی کہنے۔ اگر اتفاق سے مجھے بھی کسی میں جانا پڑے تو میں بھائی دوڑتی ہوئی اپنے بچپن کے دور میں جانا پسند کروں گی۔ بچپن کے دور میں جانے کی بہت اہم وجہ ہے۔ یہ دور مصروفیت اور بھولپن کا دور ہوتا ہے۔ جب ہم بچے تھے تو ہر قسم کی ٹینشن اور فکر سے آزاد تھے۔ جب بھوک لگی کھالیا اور جب نیند آئی سو گئے۔

کسی قسم کی کوئی پریشانی اس عمر میں نہیں ہوتی۔ بچپن میں بچے بناوٹ اور تقاضے سے پاک ہوتے ہیں۔ ان میں انا نہیں ہوتی اگر آپس میں جھگڑتے ہیں تو فوراً صلح بھی کر لیتے ہیں یہ ریا کاری، جھوٹ، فریب نام کی کسی چیز کو نہیں جانتے۔ بچپن میں ہم کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے۔ جھوٹ نہیں بولتے ہم ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد اور بے فکر لائف گزارتے ہیں۔ ہر قسم کے تنگنہ سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس دور میں ہمیں نہ فکر معاش ہوتی ہے اور نہ گھریلو پریشانیوں اسی لیے میں دوبارہ سے بچپن کے دور میں جا کر لائف کو انجوائے کرنا چاہوں گی۔ جہاں نہ غم روزگار نہ غم جائنٹ۔ نہ ارد گرد کے جھیلے ایسی پر سکون اور بے فکر زندگی میرا خواب ہے جو کہ بچپن کے دور میں جا کر ہی پورا ہو سکتا ہے۔ میرے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے

ان آج بیٹھے شعلے کیوں یاد آئے



میرے بچپنوں کو مجھ سے ملا دے کوئی میرا بچپن کسی مول لادے کوئی خالدہ شہار۔ بہاول نگر

1- ویسے تو اس رسالے کا ہر ایک سلسلہ اور مکمل ناول ہو یا ناولت کبھی مجھے دل و جان سے بھی پڑھ کر عزیز ہیں لیکن یہاں پر صرف ایک ہی سوال پوچھا گیا ہے تو پھر میری برداشت کے ساتھ ایک ہی اقتباس لکھنا پڑے گا اور وہ ہے سعدیہ راجپوت کے ناول "عشق آتش" کے اقتباس میں کہ "کون کتنا ہے زندگی کبھی اور سمجھائی نہیں جاسکتی جبکہ مرد جسموں سے بھرے ہرستان قدرت کی یونیورسٹیز ہیں اور وہ گزرتی تھیں تہہ بہ تہہ ہر شخص زندگی کا پروفیسر۔"

2- کسی بھی بات پہ اب بھی نہیں آنکھیں کہ اپنا حال بھی سوکھے چناب جیسا ہے کسے سٹائلش اس دل کی داستان واقف شب فراق کا بہرل عذاب جیسا ہے بہت مشکل سوال پوچھا ہے آپ نے دل و دماغ دونوں اچھے گئے ہیں کہ ہم اپنی دلی داستاں کو آنکھوں میں ڈھال دیں یا پھر ایسے ہی چھوڑ دیں سفر تو کیا ہے بہت زیادہ مگر روحانی طور پر اور یہ سفر جسمانی سفر کے مقابلے میں زیادہ روح کو آسودہ کر دینے والا ہوتا ہے کہ انسان اتنی مشقت کے باوجود اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

جہاں بھی رہیں خوش و خرم رہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا و
آخرت میں کامیاب کرے (آمین)

حزرت روادا اکرم۔ ذلولال

ہمیں یہاں نہیں چلتا، لمبے کب ایک دو بے کے پیچھے
بھاگتے منٹ اور منٹوں سے گھنٹے بنتے چلے جاتے ہیں۔ گھنٹے
کب دن اور سالوں میں تبدیل ہوتے صدیوں میں
گزرتے ہیں ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا۔
پورا سال گزر گیا کرن کی سالگرہ پھر سے آن پئی۔
سب سے پہلے کرن کو اپنی سالگرہ بہت مبارک ہو۔
آب آتے ہیں سوالنامے کی جانب جو اس دفعہ بھی
بلاشبہ بہت زیروست ہے۔

1۔ بارہ شماروں میں بہت سی کہانیاں پڑھیں بہت سے
خوبصورت پہلو دیکھنے کو ملے۔ بہت سی اچھی باتیں
سیکھیں، بہت سے حقائق بے نقاب ہوئے۔ پسندیدہ
اقتباس تو مجھے کوئل صبا کا ناول ”بھنور میں“ سے اچھا لگا جو
آپ کے حضور پیش خدمت ہے۔
”زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب زندگی میں
سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہر چیز توازن میں آ جاتی ہے۔
مگر ہم انسان بہت بے صبر ہیں ہم کبھی بھی سب ٹھیک
ہونے کا انتظار نہیں کرتے ہم خواہشات کے پیچھے
بھاگتے ہیں اس کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا مگر بہت
کچھ کھونے کے بعد۔ کتنے ماہ و سال گزرتے تھے اس کو
بے سمت بھاگتے اگر زندگی کا حاصل صرف بہت ہے تو ہم
انسان کیوں یا گلوں کی طرح شہرت اور دولت کے پیچھے
بھاگتے ہیں؟ کیوں ہماری آنکھوں میں ہوس کی پٹی بندھی
ہوتی ہے۔ کیوں ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ جس عروج کے
جنون میں دیوانے ہو رہے ہیں وہ درحقیقت زوال ہے
ہم بھاگتے ہیں۔ اور ہمارے بھاگتے ہیں چاہے جتنی
ٹھوس کریں، کبھی چاہے جتنے بار منہ کے بل کریں۔ پاؤں
چھوٹی ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ہم بھاگتے ہیں اپنے جنون
کے انصوں مجبور ہو کر جب ہم منزل پر پہنچتے ہیں تو احساس
ہو رہا ہے وہ جسے منزل سمجھے جا رہے تھے وہ منزل نہ تھی بلکہ
ایک سراب تھا، مگر جب تک احساس ہوتا ہے ہم کیا کچھ
نہیں گنوا چکے ہوتے؟ اپنے رشتے اپنی محبتیں اپنے دکھ
درد کے ساتھ۔ خالی دل، خالی جھوٹی اور خالی ہاتھ لیے
سوائے ماتم اور بچھتاوے کے ہمارے پاس بچتا ہی کیا ہے۔



3۔ یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیسے لکھوں
تخفہ لینا اور دنیاویسے تو یہ دونوں چیزیں ہی مجھے بے حد پسند
ہیں لیکن سالگرہ میں نے کبھی متالی ہی نہیں کیونکہ سالگرہ
جیسی خرافات فرعون کی ایجاد کردہ ہے اور اسلام میں کسی
جگہ بھی اس کے منانے کا ثبوت نہیں ملتا ابھی لیے میں اپنی
تمام قاری بہنوں سے درخواست کرتی ہوں کہ اپنی زندگی
کے قیمتی لمحات ایسے فضول موقعوں میں مت گنوائیں۔

4۔
کچھ لمبے ایسے ہوتے ہیں
جو ذہنوں میں رک جاتے ہیں
کچھ گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں
جو سادوں جل برساتی ہیں
ماضی کا سفر زیادہ تر لوگوں کے لیے جان لیوا ہی ہوا کرتا
ہے لیکن اس کے باوجود بھی کچھ خوش کن یادیں ہوتی ہیں
جو دلوں کو معطر رکھتی ہیں مجھے اپنے ماضی میں زیادہ دور
جانے کی ضرورت نہیں پچھلے سال ہی کی تو بات ہے جب
ہم فور اسٹار زمین میں پہنچی، راشدہ اور سمیرا ایک ساتھ
تھے ہر وقت ہنس مذاق، چیمنا جیٹی، ایک دوسرے کا خیال
رکھا، ہماری سوچیں، احساسات و جذبات دکھ سکھ سب
مشترک تھے کتنا اثر سنگ دور تھا اکثری میں سوچتی ہوں کہ
اے کاش پچھلا سال ایک دفعہ پھر میری زندگی میں لوٹ
آئے لیکن گزر ہوا وقت واپس نہیں آسکتا اس لیے میں
اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتی ہوں کہ میری یہ سب باتیں



میڈی کیم ڈیٹیل کریم

لوٹنگ نمکیات یوکلپٹس اسپرمنٹ سائلو پلیننگ

کیا آپ کے ٹوتھ پیسٹ میں
یہ پانچ اجزا شامل ہیں؟
احتیاط علاج سے بہتر ہے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی آیت اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی رقیی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے خوشنودی سے محفوظ رکھیں۔

میں خوش قسمت تھی کہ سب متوالے کے بعد بھی میرے پاس ایک محبت تھی۔"

تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کو دن میں بہت سے لوگ ملتے ہیں کچھ لوگ اتنے عام کہ آپ لاکھ ذہن پہ زور دیں وہ یاد نہیں آتے مگر کچھ اتنے خاص کہ آپ کے بڑا رویہ مجھے میں بھی ان کو شناخت کر سکیں۔

میں فطرتاً لاپرواہوں۔ ساتھ ساتھ لیو بھی ہوں تو جس کی طرف دھیان نہ دوں نہ دوں مگر آج تک کوئی انسان ایسا نہیں ملا جس کو میں بلاؤں اور وہ میری بات سنی ان سنی کرے۔

پاپ یہ میری اپنی مرضی ہے کہ میں کتنی کوشش کروں اس شخص کو متوجہ کرنے کے لیے مگر آج تک کسی کا دھیان اپنی طرف کرنے کے لیے مجھے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی۔ مطلب آج تک میں نے جو چاہا مجھے ملا ہے اور جو نہیں ملا اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر بھلا دیا کہ شاید یہی میرے حق میں بہتر میں ہو۔ اور شاید یہی راز زندگی بھی ہے۔

3۔ بہت مزے کا اور خوبصورت سوال ہے۔

جناب بہت سے بندے ہیں میری زندگی میں جنہیں میں ان کی سالگرہ پہ کچھ خاص دینا چاہوں گی۔

میری باہی بلکہ اکلوتی باہی ان کی زندگی میں لاکھوں کروڑوں خوشیاں دینا چاہوں گی میں اپنے اللہ پاک سے گزارش کروں گی کہ وہ میرے حصے کی تمام خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دے۔ اگر خوشیوں کا کوئی وجود ہو تا تو میں وہ اپنی باہی اور بہت بہت بہت پیاری اور حسن سلیم جن سے میرا صرف الفاظ کا رشتہ سے ان دونوں کی جھولی میں ڈال دوں گی کیوں کہ جب آپ کے پیارے جن کو آپ چاہتے ہیں وہ اک مطمئن اور خوش حال زندگی گزارتے ہیں تو آپ کو کتنی خوشی ہوتی ہے ناں؟

ناظمہ باہی جن سے فقط میں چاہیں محبت لی ہوں ان

کی برتھ ڈے پہ کچھ ایسا ہوں کہ ان کی زندگی کی تمام مشکلات ختم ہو جائیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اپنی دوست آسارہ کرن کو اس کی برتھ ڈے پہ اس کے امی ابو لواتی کہ میں جانتی ہوں ماں باپ کے بغیر اولاد کیسے زندگی گزارتی ہے۔ ماں باپ کے مرجانے کے بعد صبر تو آتی جاتا ہے مگر۔ نیورٹ ایکسٹو میرا نروان ندیم ہے کیونکہ مجھے لگتا ہے اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو وہ بالکل اس کی طرح دکھتا۔ اور اس کی برتھ ڈے پر کیا ہوں گی میں کہ بھائیوں اور بھائیوں جیسوں کو فقط لمبی عمر کی دعا میں دی جاتی ہیں۔

یادیں پاگل کر دیتی ہیں

باتیں پاگل کر دیتی ہیں

دن تو خیر گزر جاتا ہے

راتیں پاگل کر دیتی ہیں

میں اس دور میں جانا پسند کروں گی جہاں میرے ابو زندہ تھے جب میرے ماموں حیات تھے۔ کچھ دھندلے دھندلے نقوش تو ہیں زمین میں مگر جو کچھ یاد ہے وہ شاید میرے جیسے ڈیمانڈ تک چائلڈ کے لیے بہت ناکافی ہے۔ چار سال کا بچہ کیا کچھ یاد رکھ پاتا ہے۔

میں اس لمحے میں جینا چاہوں گی جہاں میں اک لاڈلی بیٹی کی طرح اپنے ابو سے لاڈ کر سکوں ان سے اپنے تمام حالات شیئر کر سکوں۔ اک اک بات پھولی بڑی ضد سب منواسکوں۔ مگر شاید یہ ممکن نہیں بلکہ شاید کیا یقیناً، آپ سب کو بھوڑا پریشان کر داتا۔

اک اور بات بتاؤں آپ کو مزے کی۔ میرا اک یہ بھی شوق ہے کہ میں اس دور میں جاؤں جب جنوں بھوتوں کا اس زمین پر راج تھا۔ ہوں ناپاکل۔

کرن کی سالگرہ پہ ہمیں یاد رکھنے کا بہت شکر یہ۔ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو دن دن رات چوٹی ترقی دے (آمین تم آمین)

(سر دے کا باقی حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)



MARHABA ISPAGHOL

مرحباً اسپغول

- تیزابیت، پیش اور قہش کا قدرتی اور سہل علاج ہے۔
- اضافی کالہسزول کی مقدار کو کم کرتا ہے اور بڑھنے سے روکتا ہے۔
- جسم میں قابضی کی کو بڑا کر۔



زندگی کو لذت بخش بنانے کے لیے

دوستی اور کر کے

زوسیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی۔ جبکہ زوسیہ اس سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتا ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زوسیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے۔ وہاں سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔ وہ روح کو بلائے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلا، سنیل اور نعل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نعل ان دونوں کو لہجے کی دت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم ٹوکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب۔۔۔ اب شرط کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انہیں لہجے کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوسیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خفا ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے میزبوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اتارے میں زخمی کر دیتا ہے۔

۱۲

بارہویں قسط



عائشہ اختر جب سے گھر آئی تھیں اسی پریشانی میں مبتلا تھیں کہ بلال اختر کو سب کچھ کیسے بتائیں حالانکہ کئی بار انہیں موقع بھی ملا۔

بلال اختر نے آفس سے گھر آتے ہی عائشہ اختر کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا مگر وہ ان کے استفسار پر کچھ نہ کہہ سکیں یہاں تک کہ بلال اختر نے انہیں کریدا بھی بہت کیونکہ انہیں معلوم تھا وہ آج ڈاکٹر شکیلہ سے ملنے گئی تھیں۔

”کیا کہا ڈاکٹر شکیلہ نے؟“ بلال اختر کے سوال پر عائشہ اختر صرف ان کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

ایک جنگ چل رہی تھی ان کے اندر اگر انہوں نے خود سے نہیں بتایا تو ڈاکٹر شکیلہ خود فون کر کے بتا دیں گی۔

مگر زبان جیسے تلو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

”بویے نا ایسا کیا کہہ دیا ہے ڈاکٹر شکیلہ نے جو چہرے کا رنگ فق ہو گیا ہے۔“ بلال اختر گلے میں بڑی ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولے تو عائشہ اختر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”آپ کیا کریں گے جان کر؟ کون سا آپ کو ان کی ہدایت پر عمل کرنا ہے۔“ عائشہ اختر کے ہنرے ہوئے انداز پر بلال اختر ٹھنک کر انہیں دیکھنے لگے۔

”اب کیا فرمایا انہوں نے؟ کیا زویہ کی شادی فوراً کر دینے کا مشورہ دے رہی ہیں۔“ بلال اختر جتانے والے انداز میں بولے کہ ”مجھے بخوبی یاد ہے کہ ڈاکٹر شکیلہ نے اس کی شادی کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔“

عائشہ اختر کھول کر رہ گئیں۔ ایک تو پہلے ہی ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی بلال اختر کو کچھ بتانے کی اب تو ان کا موڈ بھی آف ہو گیا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا بلال اختر ڈاکٹر شکیلہ کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اسے فوراً ”پاگل خانے بھیج دیں گے۔“

بلال اختر ان کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر سانسیت سے کہنے لگے۔

”آپ کو کیا لگتا ہے عائشہ زویہ کی شادی کر دینا اس کی بیماری کا علاج ہے۔“

”تو پھر اس کی بیماری کا علاج کیا ہے کیا ساری زندگی اسے گھر بٹھا کر رکھنا ہے۔“ عائشہ اختر تڑخ کر بولیں۔

”جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتی اس کی شادی کر دینا اس پر ظلم ہے اور اس سے بھی زیادہ اس کے لئے برے۔“ بلال اختر نے ٹائی ایک جھٹکے سے گردن سے پھینکی تو عائشہ اختر بھی غصے سے کھڑی ہو گئیں۔

”تو زویہ کا ماحول بدلنے کے لیے آپ اپنے کام میں سے دو تین دن کا وقت نکالیں اور اسے یہاں سے کہیں دور لے چلیں۔“

”گلے چھ مہینے تک تو ایسا ممکن نہیں اس کے بعد کوشش کروں گا۔“ بلال اختر نے صاف انکار کر دیا۔

”ان چھ مہینوں میں آپ کی اور اگلے چھ مہینوں کی مصروفیت نکل آئے گی کیونکہ آپ اس کے لیے وقت نکالنا چاہتے ہی نہیں ہیں۔“ عائشہ اختر غصے سے ہمتی کرے سے نکل گئیں۔

مگر ان کا کمرے سے نکل جانا بات تو ختم نہیں کر دیتا۔ اگلے دن مخالف معمول بلال اختر آفس سے جلدی گھر آ گئے ان کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر عائشہ اختر ٹھنک گئیں۔

”جان میں فوراً ڈاکٹر شکیلہ کا خیال آیا تھا تبھی ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔“

”زویہ کہاں ہے؟“ سوال بھی مخالف معمول تھا عائشہ اختر دل کڑا کر کے پوچھنے پر مجبور ہو گئیں۔

”اپنے کمرے میں ہے کہاں کیا ہوا۔“

”ذرا بلو اتا ہے۔“

”مگر بات کیا ہے؟“

”کہوں بتاؤں میں آپ کو جب آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں۔ ڈاکٹر شکیلہ نے فون کیا تھا مجھے اور انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنا بے خبر ہوں وہ سمجھ رہی تھیں میں انجان نظر آنے کی اداکاری کر رہا ہوں۔“ بلال اختر تلملا کر بولے۔

عائشہ اختر بغلیں جھانکنے لگیں بلال اختر انہیں خاموش دیکھ کر زویہ کو آواز دینے لگے کہ عائشہ اختر نے نوک دیا۔

”اسے بلا کر کچھ پوچھنے کا فائدہ نہیں وہ خود بہت ہنس رہی ہے۔“

”تو کیا تمہاری طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں اور وہ نوکوں کو قتل کرتی پھرتی رہے۔“ بلال اختر نے دانت پیسے۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ زویہ نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ نطاشہ کی موت ایک حادثہ تھی پولیس پریس سب کی کہہ رہے ہیں۔“ عائشہ اختر تڑخ کر بولیں۔

”مگر یہ ایک حادثہ تھا تو زویہ کو اس حادثے کے متعلق کیسے پتا چلا۔“

”زویہ کیسے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے اسے بلا کر پوچھنا بے کار ہے۔“ عائشہ اختر منمنائیں۔

”جواب تو آپ کیسے اس کسی سوال کا نہیں ہے آپ سے بھی بات کرنا بے کار ہے۔“

ورنہ جس عورت کی جوان جہان بیٹی گھر سے کالج کا کہہ کر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتی پھر رہی ہو اس عورت کی تو راتوں کی بیٹریں اڑ جائیں۔“ بلال اختر کا زہر میں بچھا جملہ عائشہ اختر کو تیر کی طرح جگا تھا وہ بھی ان ہی کے انداز میں بولیں۔

”مگر کون بر کوئی آوارہ گردی نہیں کر رہی گھر کے پچھلے حصے میں بنے سرونٹ کو ارد میں جا کر بیٹھ جاتی تھی۔“

ڈاکٹر شکیلہ نے یہ نہیں بتایا آپ کو۔“ بلال اختر ان کے تنک کر بولنے پر مزید سختیا ہو کر بولے۔

”اتنی آسانی سے یقین کر لیا آپ نے اس کے فضول بہانے پر جو تبھی آپ خود بتایا کرتی تھیں۔“

ایک زبانی وار تھپڑا تھا عائشہ اختر کے منہ پر اور ان کا سارا غصہ اور کھولن پٹھتی چلی گئی تھی وہ زویہ کے نظروں سے بلال اختر کو دیکھتی چلی گئیں ان کا خاموش ہو جانا بلال اختر بھی محسوس کر گئے تھے۔

خود انہیں بھی کہنے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ ایک غلط بات کہہ گئے ہیں لیکن اس وقت وہ اتنے غصے میں تھے کہ شرمندہ ہونا انہیں گوارا نہ ہوا البتہ اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگے۔

”زویہ کا باگل بن بڑھ رہا ہے پہلے اس نے رخسار پر حملہ کیا تھا اور اب نسا شاپر۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک زویہ پر کوئی پولیس پریس نہیں رہا لیکن اگر کسی حالات رہے تو وہ وقت دور نہیں جب وہ جیل میں ہوگی۔“

”تو کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ جیل کی بجائے مینٹل ہسپتال بھیج دیا جائے۔“ عائشہ اختر کتنی دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تھیں وہ بھی غصے اس لیے کہ وہ جلد از جلد یہ جان لینا چاہتی تھیں کہ بلال اختر کا آگے کیا ارادہ ہے۔

ان کے سوال پر بلال اختر نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”اسے مینٹل ہسپتال بھیج کر مجھے ساری دنیا کو خود پر ہنسانا نہیں ہے۔“ بلال اختر بستر کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

”تو پھر؟“ عائشہ اختر کو ایک طرف جہاں تھوڑا اطمینان ہوا وہیں ایک نئی فکر نے آن گھیرا کہ آخر پھر بلال اختر نے کیا سوچ رکھا ہے۔

ان کے پوچھنے پر بلال اختر فوری طور پر کچھ نہیں بولے بلکہ ایک مہری سانس کھینچ کر کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

عائشہ اختر بدستور انہیں دیکھتی رہیں تو بلا آخر بلال اختر سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد سے لہجے میں بولے۔

”واکٹر شکیلہ نے کہا ہے تاکہ نوسہ کا ماحول تبدیل کریں۔ اس کے لیے وقتی طور پر کہیں جانے کی بجائے مستقل طور پر چلے جاتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ عائشہ اختر کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا جو شخص کچھ دنوں کے لیے بزنس نہیں چھوڑ سکتا وہ مستقل طور پر کہیں جانے کے لیے کیسے رضامند ہو سکتا ہے۔

”مطلب یہ کہ ہم گھر تبدیل کر لیتے ہیں۔“ عائشہ اختر کی آنکھیں حیرانی کی شدت سے پھیل گئیں۔

کتی ہی دیر وہ دونوں بغیر کچھ بولے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے آخر عائشہ اختر اکتاتے ہوئے بولیں۔

”آپ۔۔۔ آپ یہ گھر چھوڑیں گے۔“

”صرف چھوڑیں گے نہیں بلکہ ہم اس گھر کو بیچ دیں گے۔“ بلال اختر سابقہ انداز میں بولے۔

عائشہ اختر کی بے یقینی بڑھتی جا رہی تھی کتی ہی دیر تک وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہ ہو میں ان کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے بلال اختر خود ہی جرح کرنے والے انداز میں بولے۔

”اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں آپ ہماری جوان بیٹی کو پاگل خانے بھیجے کی نوبت آپکی ہے کیا آپ اب بھی اسی گھر میں رہنا چاہتی ہیں۔“ بلال اختر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے مگر عائشہ اختر کچھ بھی بولنے کی بجائے شدید سی کھڑی رہیں۔

پتا نہیں وہ دونوں کب تک بولنے کے قابل نہ ہوتے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر نوسہ کمرے میں داخل ہو گئی اس پر نظر پڑتے ہی بلال اختر تو پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو گئے جبکہ عائشہ اختر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

نوسہ ان کی حالت پاخوبی سمجھ رہی تھی جب بلال اختر نے اسے پکارا تھا وہ کمرے کے سامنے سے ہی گزر رہی تھی اس لیے جیسے ہی اس نے کمرے میں داخل ہونے کے لیے دروازے کا ہینڈل پکڑا اندر سے آتی آوازوں نے اس کا پورا وجود سن کر دیا۔

واکٹر شکیلہ اسے پاگل خانے میں بھرتی کرنا چاہتی تھیں کیونکہ اس نے نطاشہ کو قتل کیا تھا۔

ایک عجیب سا خوف اس کے وجود میں سرایت کر گیا اس کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے نہیں دور بھاگ جائے جہاں کوئی نہ ہو۔ واکٹر شکیلہ اس کے والدین اس کے کالج کا اسٹاف اور اس میں پڑھنے والی لڑکیاں۔

کتی دیر وہ کانپتے وجود کے ساتھ کھڑی ان کی گفتگو سنتی رہی آخر جب بلال اختر نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ سنایا تب نوسہ سے رونا گیا اور وہ دروازہ کھٹکنا کر اندر آئی۔

”پاپا۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ کو اپنا آبائی گھر چھیننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ واوانے کتنے شوق سے یہ گھر بنوایا تھا۔“ نوسہ نے وہ سب دیکھا تو نہیں تھا البتہ سن رہی تھی۔

اس گھر کی تعمیر تو بلال اختر کے بھی پیدا ہونے سے پہلے ہوئی تھی لیکن اس سرورقیر بلال اختر کی شادی کے بعد تک ہوتی رہی تھی۔

بھی اتنے سال گزر جانے کے باوجود یہ گھر بالکل جدید اور نئی طرز پر بنا نظر آتا تھا اتنا خوب صورت اور شاندار گھر کبھی کوئی عقل مند ہی نہیں سمجھی وہ بھی اس صورت میں کہ جس سے ہزاروں یادیں وابستہ ہوں۔

نوسہ کی بات پر بلال اختر تو کچھ نہیں بولے البتہ عائشہ اختر جو اس بحال کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”نوسہ تمیک کہہ رہی ہے گھر چھیننے کی بجائے ہم کرائے پر وہ دیتے ہیں اور کچھ دنوں بعد واپس اس گھر میں۔“

”مجھے اس گھر میں رہنا ہی نہیں سے انا بڑا گھر کرائے پر چھانا آسان نہیں ہے پھر کرائے دار گھر خراب کر کے

اچانک بھوڑ دیتے ہیں تو دوبارہ نئے کرائے واروں کو گھر دینے سے پہلے گھر کی از سر نو مرمت کرانی پڑتی ہے۔

اتنی درد سہی سے ہنترے انسان گھر بیچ دے اور سکون سے رہے۔“ بلال اختر نے بولے۔

تو عائشہ اختر تو خاموش ہو گئیں لیکن نوسہ کو کتنا پڑا۔

”پاپا گھر بیچنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”مجھے بھی معلوم ہے تمہاری شناختہ خالہ کا بھوت تمہارے ساتھ ساتھ اس دوسرے گھر میں بھی چلا جائے گا وہاں بھی تمہاری ذہنی حالت یہی رہے گی۔“

لیکن واکٹر شکیلہ کچھ دنوں کے لیے خاموش ضرور ہو جائیں گی ورنہ اگر میں نے یہ قدم نہیں اٹھایا تو وہ تمہیں پاگل خانے بھیجے پر بعد رہیں گی۔“ بلال اختر کے گڑھے سے بھی کاری ضرب پر مشتمل الفاظ سن کر نوسہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

عائشہ اختر ان کے جارحانہ انداز میں غصے اور بے بسی سے دیکھ کر وہ گئیں وہ نوسہ کی طرف بڑھنا چاہتی تھیں تاکہ اسے تسلیم کر لیں مگر وہ یہ تیزی سے پلٹ کر گھر سے نکل گئی۔

وہ پہلے تو اس کے پیچھے جانے کے لیے آگے بڑھیں پھر ارادہ ترک کر تی بلال اختر کی طرف مڑ گئیں۔

”گھر بیچنے کا فیصلہ آپ نے واکٹر شکیلہ کے دباؤ میں آکر نہیں کیا ہے بلکہ آپ خود اس گھر سے عاجز آگئے ہیں۔“

آپ صرف اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر رہے ہیں لیکن میں آپ کو بتا دوں اس گھر کو بیچنے سے ہمارا کفارہ ادا نہیں ہو گا اس گھر کو اگر آپ مفت میں بھی کسی کو دے دیں گے تب بھی آپ کو سکون نہیں ملے گا۔“ عائشہ اختر ایسے بول رہی تھیں جیسے انکارے چبارہی ہوں۔

بلال اختر سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے وہ نہیں چاہتے تھے کہ عائشہ اختر اس موضوع پر مزید کچھ کہیں چنانچہ انہیں خاموش رکھنے کے لیے بلال اختر ہاتھ میں پکڑی تالی بستر پر پھینکتے ہوئے ہاتھ روم میں گھس گئے۔

اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے انہوں نے پوری قوت سے ہاتھ روم کا دروازہ بند کیا تھا۔

رومیلا کی شادی کی تاریخ اتنی نزدیک کی رکھی گئی تھی کہ نمل اور اس کی والدہ بھی حیران رہ گئی تھیں۔

نمل کیونکہ رومیلا کے احساسات بھی جانتی تھی چنانچہ اسے زیادہ دکھ ہوا تھا مگر وہ اور اس کی والدہ رشیدہ کربھی کیا سکتی تھیں۔ رومیلا کے والد سے ان کی براہ راست رشتہ داری نہیں تھی رومیلا کی والدہ مرحومہ عظمت خلیل کی بہن تھیں جن کے انتقال کے بعد بس رومیلا ہی بات چیت ہی رہ گئی تھی۔

اور کچھ عرصے تک عظمت خلیل کی بے تحاشا مصونیت کی وجہ سے رومیلا بھی کمزور پڑتا جا رہا تھا۔

رومیلا کی بات طے ہونے پر بھی عظمت خلیل نہیں جاسکے تھے صرف رشیدہ نمل کے ساتھ شریک ہو گئی تھیں۔ ان دونوں کی حیثیت بس مہمانوں جیسی تھی وہ ان کے گھر کے معاملے میں بھلا کیا بولتیں اور پھر رشیدہ نے رومیلا کو الٹا سمجھانے کی ہی کوشش کی تھی کہ لڑکیوں کی ایسے اچانک شادیاں ہوتی ہیں یہ کوئی ایسی ان ہونی بات نہیں ہے۔

اور واقعی یہی تسلی دے کر ان سب نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔

نمل حسب معمول شام کی چائے رشیدہ کے ساتھ لان میں بیٹھی بی رہی تھی جب اس کے موبائل پر منبل کی

دُنیا کا بہترین لوٹھ پیسٹ انگلش

کیونکہ اس میں ہے لیکوئیڈ کیمیم کے ساتھ ڈبل فلورا ایڈز، تاکہ آپ کے دانتوں کو ملے

Maximum نہیں بلکہ Guaranteed Cavity Protection

Cavity Protection All Day Long

English

Fluoride Toothpaste
Regularmint



آج سے استعمال کیجئے کہ آپ کو فوڈ کی طرف متوجہ نہ کرے

”نمل تم نے تو کہا تھا شام نامی وہ لڑکا اپنے گاؤں چلا گیا ہے جسے پولیس نے کسی ناکرہ جرم پر گرفتار کر لیا تھا۔“ سنیل کی حیران پریشان آواز سن کر خود نمل بھی الجھ گئی۔

”ہاں! کیوں گیا ہوا؟“

”مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو سنی وی پر نہیں دیکھ رہیں ایک لڑکا جس کا نام شام ہے پولیس انسپکٹر قادر کے انسان سوز تشدد کا شکار ہو کر ہسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔“ سنیل کی بات پر نمل اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”اس کی بہن اور وہ وہاں کے بیانات چل رہے ہیں جس میں وہ کہہ رہی ہیں ان کا بیٹا پچھلے ایک ماہ سے پولیس کی حراست میں ہے مگر پولیس ریکارڈ میں اس کا کہیں نام موجود ہی نہیں تھا۔“

وہ دونوں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئی تھیں تب غلطی کے توسط سے پتا چلا کہ وہ لڑکا انسپکٹر قادر جیسے وحشی شخص کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔“ سنیل بغیر سانس لیے بول رہی تھی وہ سری طرف نمل کا اپنا سانس بھی سینے میں اٹک گیا تھا۔

سنیل کی گفتگو میں پیچھے چلتی وی کا شور بھی وہ واضح طور پر سن سکتی تھی لی وی پر اس خبر کے نشر ہوتے ہی سنیل نے اسے فون کیا تھا۔

نمل چیزی سے اندر کی طرف دوڑی لی وی آن کرنے پر اس کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

اسکرین پر بلا شک و شبہ وہ شاملہ اور اس کی ماں تھیں۔

نیوز چینل والے انسپکٹر قادر کے وحشی رویے کی کہانی سناتے ہوئے بار بار شاملہ اور اس کی والدہ کا آنسوؤں سے ترچہ فونس کر رہے تھے۔

موبائل ابھی بھی نمل کے کان سے لگا ہوا تھا وہ تو اتر سے بولتی سنیل کو سن رہی تھی جو ہر تفصیل کے بعد ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی۔

”یار تم نے تو کہا تھا انکل نے اسے چھڑوا لیا ہے انکل نے تم سے جھوٹ کیوں بولا؟“

”سنیل میں تمہیں تھوڑی دیر میں فون کرتی ہوں۔“ نمل نے بمشکل اپنے منتشر ہوتے ذہن کو یکجا کرتے ہوئے تیزی سے کہا اور سنیل کو بولنے کا موقع دے بغیر فون کاٹ دیا۔

اس نے لی وی پر تفصیلات جاننے کی کوشش کرنے کی بجائے اسی وقت ہسپتال جا کر شاملہ سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ جیسے ہی گاڑی کی چابیاں لے کر گھر سے نکلی رشیدہ کو بمشکل وہیل چیئر چلا کر گھر کی طرف آتا دیکھ کر بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

وہ انہیں کچھ بھی بتائے بغیر ایسے اٹھ کر بھاگ آئی تھی کہ وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھیں پہلے تو وہ اس کا انتظار کرتی رہیں پھر خود ہی اندر آنے کی کوشش کرنے لگیں۔

دراصل گھاس پر وہیل چیئر بڑی مشکل سے آئے بڑھتی تھی اس لیے نمل کبھی انہیں کبھی زمین پر وہیل چیئر چلانے نہیں دیتی تھی بلکہ خود ہی دھکیلتی ہوئی لاتی تھی۔

اس وقت بھی ان پر نظر پڑتے ہی نمل تیزی سے ان کی طرف بڑھی اور قریب پہنچتے ہی ان کے پوچھے بغیر بتانے لگی۔

رشیدہ بھی یہ سب سن کر وہ گنگ رہ گئیں بھر بھی چمکاتے ہوئے پولیس۔

”اس وقت جاؤ گی۔“ انہوں نے شام کے سامنے گھرے ہوتے دیکھ کر نظر سے کہا تو نمل بھی ایک نظر کھلے

آسمان پر ڈالتے ہوئے قدرے بے بسی سے بولی۔

”میرا شامکہ سے ملنا بہت ضروری ہے حشام کی حالت بہت سیریس ہے۔“ رشیدہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئیں خود ان کی حالت یہ سب سن کر عجیب سی ہو گئی تھی وہ اسے جانے سے روک نہ سکیں خود نمل کو بھی دیر ہونے کا احساس تھا تبھی وہ تیزی سے ڈرائیو کرتی محض آدھے گھنٹے میں ہاسپٹل پہنچ گئی تھی۔ مگر وہاں موجود صحافیوں کا رش اسے شامکہ تک پہنچنے نہیں دے رہا تھا خود شامکہ کی ہی اس پر نظر پڑی تو وہ اس کے نزدیک آئی۔

اسے اپنے قریب آنا دیکھ کر نمل نے اچھی طرح چادر سے اپنا چہرہ چھپا لیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ شامکہ کے باعث صحافی اس کی طرف بھی متوجہ ہو جائیں۔

اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اخبار اور ٹی وی کی زینت بننے میں۔
”آپ کب واپس آئیں رہی ہے۔“ شامکہ نے قریب آتے ہی بڑی بے چینی سے پوچھا نمل جواب دینے کی بجائے سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی جو بے اختیار اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے روپائے گئے میں بولی۔
”دیکھیں نا آپ کے پیچھے کیا ہو گیا آپ تو ہمیں سیدھا عظمت خلیل کے آفس لے گئی تھیں اور ان سے ملاقات کرا دی تھی۔“

آپ کے جانے کے بعد عظمت صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی اتنی مشکلوں سے ان سے بات ہوئی تب انہوں نے فوراً ”ہشام کے بارے میں پتا چلانے کی کوشش کی۔ مگر دیکھیں نا اس بیچ حشام کی حالت کیا ہے کیا ہو گئی اس انسپکٹر قادر نے بالکل تھرڈ ڈگری ٹارچر کیا ہے میرے بھائی پر۔ کانسٹیبل کا کہنا ہے کہ حشام نے تو انسپکٹر کو کچھ کہا بھی نہیں تھا پھر بھی پتا نہیں کیونکہ انسپکٹر قادر کو اچانک اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے بالکل درندوں کی طرح حشام کو دھو کر رکھ دیا۔“ شامکہ ایک دم رو پڑی۔
نمل خاموشی سے اسے سنے لگی۔

اس کے والد نے اگر اسے اس معاملے سے دور رکھنے کے لیے یہ سب کہا تھا تب بھی ان کا شامکہ سے جھوٹ بولنا تو بنتا تھا مگر نمل سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا تاکہ وہ بھی مطمئن ہو کر خاموش ہو جائے لیکن جب حشام کی مدد کرنی ہی تھی تو اتنا وقت کیوں ضائع کیا انہیں کون سا لیس آنے جانے کی ضرورت تھی انہیں تو صرف فون کھلنے تھے پھر کیوں کیا انہوں نے ایسا۔

نمل کا ذہن مختلف سوالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا وہ شامکہ کو جھوٹی تسلی بھی نہ دے سکی بلکہ پریس کے لوگ شامکہ کو نمل کے قریب دیکھ کر خود بھی اس کے ارد گرد جمع ہونے لگے اور اس کی بات سوال کرنے لگے شامکہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ۔ ”یہ عظمت۔۔۔“ کہ نمل نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔

”میں شامکہ کی دوست ہوں۔“ نمل نے محض اتنا کہا اور شامکہ کو اسے ایک طرف ہوتے ہوئے بولی۔
”شامکہ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتی میں چلتی ہوں حشام کے علاج پر جو بھی خرچ آئے۔“
”پیسوں کی تو کوئی پروا نہیں ہے آپ کے والد ہی سارا خرچ کر رہے ہیں بس وہ ٹھیک ہو جائے۔“ شامکہ کے لہجے میں بے بسی گھلی تھی نمل نے کچھ کہنا چاہا تو ایک لڑکی جو کسی ٹی وی چینل کی رپورٹر تھی ہاتھ میں مائیک لیے نمل کے قریب چلی آئی۔

”کیا آپ شامکہ کی دوست ہونے کی بنیاد سے حشام کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی وہ کس قسم کا لڑکا تھا اس کی کیا مصروفیات تھیں اور جو اس کے ساتھ ہوا ہے اس پر آپ کے کیا تاثرات ہیں۔“
”جی نہیں مجھے کچھ نہیں آتا۔“ نمل جان بوجھ کر نہایت گھبرائے لہجے میں بولی اور شامکہ سے کچھ بھی کہے بغیر

تیزی سے آگے بڑھ گئی تاکہ رپورٹر مزید کوئی بات نہ کر سکے مگر اس کے وہاں سے ہٹ جانے کے بعد وہ رپورٹر شامکہ سے نمل کے متعلق بات کرنے لگی۔

شامکہ کی طرف سے اسے اطمینان تھا وہ اس کا تعارف نہیں کراے گی البتہ وہ حشام کے بارے میں جانتا چاہتی تھی جو ان صحافیوں کی وجہ سے ہو نہیں سکا تھا مگر گاڑی میں بیٹھنے تک اس کے پاس رشیدہ کا فون آ گیا۔
”امی میں ہسپتال سے نکل رہی ہوں یوں گھنٹے میں گھر آ جاؤں گی ان شاء اللہ۔“

”ہاں جلدی آ جاؤ۔ تمہارے ابو نہ آ جا میں ویسے تمہاری ملاقات ہوئی حشام سے کیسا ہے وہ؟“
”امی اس سے کیسے ملاقات ہوئی اتنے صحافی موجود ہیں یہاں اور وہ تو شاید آئی ہی یوں ہو گا۔“ نمل نے کار اشارت کرتے ہوئے نمل سے کہا تو رشیدہ بھی کلویر تھیمے میں بولیں۔

”ہاں اور وہ بات کرنے کے قابل بھی نہیں ہو گا۔ یہاں ٹی وی برنٹا رہے ہیں اس کی بیک ہون پر شدید چوٹیں آئی ہیں وہ شاید اب زندگی بچ رہے ہوں گے۔“ نمل کا پائوں بے اختیار بریک پر پڑ گیا وہ تو ابھی پارکنگ ایریا سے نکلی نہیں تھی اس لیے کوئی نقصان نہیں ہوا ورنہ جس طرح اس نے بریک لگائے تھے اگر سڑک پر ہوتی تو اچھا خاصا ایکسڈنٹ ہو جاتا۔

ایک شدید قسم کے مال نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا وہ بمشکل رشیدہ کو اللہ حافظ کہہ کر گاڑی دوبارہ اشارت کرنے کے قابل ہوئی تھی۔

گھر آ کر بھی اس کا ذہن بہت منتشر رہا اس نے رشیدہ کو بھی ٹی وی نہیں دیکھنے دیا جہاں چینلز والے ایک ہی خبر کو بار بار سن رہے تھے البتہ ایک چیز جو وہ اس وقت نہیں دیکھ سکی تھی وہ اس نے اب گھر آ کر دیکھی تھی اور وہ تھی عظمت خلیل کی پریس سے گفتگو۔

جس وقت حشام کو ہسپتال لے جایا گیا تھا اس وقت عظمت خلیل بھی وہاں پہنچ گئے تھے انہوں نے بڑے جذباتی اور ڈرامائی انداز میں انسپکٹر قادر اور پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے خلاف بیان دینے کے ساتھ ساتھ حشام کے معذور ہو جانے پر بڑے غم کا اظہار کیا تھا۔

ان کے یہ کلمے بار بار دکھائے جا رہے تھے جبکہ نمل کو ڈاکٹر کے ڈکلیئر کرنے سے پہلے ہی عظمت خلیل کا حشام کو معذور قرار دے دینا ایک عجیب سی اذیت سے دوچار کر رہا تھا اس لیے اس نے رشیدہ کو ٹی وی بند کرنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ خود بھی جانے کس ٹرانس میں دیکھے جا رہی تھیں ورنہ دل تو ان کا بھی بہت برا ہو رہا تھا نمل کے کہتے ہی انہوں نے ٹی وی آف کر دیا۔

عظمت خلیل رات کو کافی دیر سے گھر آئے تھے مگر نمل ان کے انتظار میں جاگتی رہی رشیدہ بار بار اسے تاکید کرتی رہیں۔

”بھو تمہارے باپ نے ہی اسے نکالا ہے بلا وجہ گمان مت ہو۔“
وہ نہیں چاہتے ہوں گے تمہیں اس معاملے میں انوالو کرنا تبھی تم سے جھوٹ بول دیا۔ کوئی بھی باپ نہیں چاہے گا کہ بیٹی ایسی کسی کانٹروورسی میں پڑے اور تمہاری فطرت کا انہیں پتا ہے سچ بتانے پر تم چپ ہو کر تو نہیں بیٹھ جاتیں نا۔“ نمل چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ جانتی تھی اس کی ماں عظمت خلیل کی بے جا حمایت کر رہی ہے اور اس بات کا علم اسے خود بھی ہے وہ صرف نمل کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے یہ سب کہہ رہی ہیں ورنہ درحقیقت انہیں بھی اس بات کا علم ہے کہ عظمت خلیل نے جان بوجھ کر اس معاملے میں چشم پوشی کی ہے ورنہ اسے متحکم ہوتے حشام کا پتا چلنے میں اتنی تاخیر ہوتی۔

ابو بھلے ہی اسپیکر قادر کی وردی اتروارے تھے مگر حشام اور اس کی ماں بیٹی کی زندگی تو تباہ ہو گئی تھی۔
آخر رات کے ساڑھے دس بجے عظمت خلیل گھر میں داخل ہوئے تب بھی ان کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا۔

ختم نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ کسی سے جو گفتگو میں ان کے نزدیک آتے ہی کہا۔
”ابو مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ عظمت خلیل نے ایک ناگوار نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

ختم چاہتی تھی وہ ہیں ان سے بات کر لے اگر ایک بار وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو پھر رشیدہ اسے ان کے کمرے میں جانے نہیں دیں گی۔
ختم ان کے گھورنے کی پروا کیے بغیر دستور مختصر نظروں سے انہیں دیکھتی رہی تو انہوں نے جیسے زچ ہو کر ختم کو دیکھا اور بات مختصر کر کے کہا جانے والے انداز میں بولے۔

”کیا بات ہے جلدی کہو۔“
”آپ نے تو کہا تھا حشام کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے اور آپ نے اس کے گھر والوں کو پیسے دیے ہیں تاکہ وہ لوگ کچھ دنوں کے۔“

”ہاں کہا تھا۔ میرے ٹرسٹ کے لوگوں نے مجھے یہی بتایا تھا سو وہی میں نے تمہیں بتا دیا مگر جب پتا چلا کہ وہ جھوٹ تھا تو میں نے حشام کے بارے میں پتا کیا اور بلا آخر اسے جیل سے نکلوا بھی لیا۔“ انہوں نے بغیر شرمندہ ہونے نہایت وحشانی سے اتنا کمزور سا جھوٹ بولا جس پر ختم کا قائل ہونا ناممکن تھا بھی وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”آپ کے ٹرسٹ کے لوگ آپ سے اتنا بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں کیا؟“
”اس کی انکواری میں بعد میں کراؤں گا۔“

رشیدہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں شرف سے کہو ایک کپ چائے میرے کمرے میں پہنچا دے۔“ عظمت خلیل نے مختصراً کہہ کر رشیدہ کو آواز لگاتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے تھے کہ ختم ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”ابو آپ اس طرح نہیں جاسکتے۔ آپ نے کیوں جھوٹ بولا مجھ سے۔ آپ کا ٹرسٹ لوگوں کی بند کرنے کے لیے ہے۔“

”یہی پر آپ کی تعریفوں کے بل باندھے جا رہے ہیں کہ کس طرح آپ ایک پولیس والے کی سفائی کو منظر پر لائے ہیں یہی سب تو آپ کا مقصد ہوتا ہے پھر کیوں آپ نے حشام کی مدد اس وقت کی جب وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا آپ یہ کام پہلے بھی تو کر سکتے تھے۔“

”تمہارے کہنے کا کیا مطلب ہے میں یہ ساری نیکیاں یہ سب خیریت خلیق خیروں میں آنے اور تعریفیں پورنے کے لیے کرتا ہوں۔“ عظمت خلیل ایک دم جلال میں آئے مگر ختم ان کے غصے سے ذرا مرعوب نہیں ہوئی اس کا اپنا شخص بڑھتا جا رہا تھا وہ بھی جواب میں انہیں کسی تیزی سے بولی۔

”اس بحث کو رہنے دیں کہ آپ کا کیا مقصد ہوتا ہے ان نیکیوں اور خدمت خلیق کے پیچھے آپ صرف اتنا بتا دیں کہ آپ نے حشام کے معاملے میں لا روایتی کیا ہے برتی کیا اس کے پیچھے بھی آپ کا کوئی مقصد تھا۔“ ختم ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی مگر انہوں نے وہی توجہ دینے بغیر لا روایتی سے کہا۔
”میں تمہارے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔“ وہ کترا کر آگے نکل جانا چاہتے تھے کہ ختم ایک بار پھر ان کے سامنے آتے ہوئے بولی۔

”کیا ملا آپ کو حشام کی زندگی برباد کر کے اس کے معذور ہونے کے پیچھے آپ کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے کس سے بدلہ لینے کے لیے آپ نے اسے عمر بھر کے لیے بستری بنا دیا۔“ ختم کی آنکھیں پلٹنے لگی تھیں۔

عظمت خلیل جو ایک بار پھر اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھتا جا رہا ہے اسے اس کی آخری تین من کرھٹ گئے انہوں نے ایک حشامیں نظر اس پر ڈالی اور دوسری سلگتی ہوئی نظر رشیدہ پر ڈالتے ہوئے انکار سے چہا۔ اسے انداز میں بولے۔

”تو آخر بتا دیا تم نے اسے سب کچھ کوئی بات کا تم صرف خود تک میں رکھ سکتیں۔“ عظمت خلیل کی بات پر غیر ارادی طور پر ختم کی نظر میں رشیدہ کی طرف اٹھ گئیں جو عظمت خلیل کی بات سن کر بری طرح بوکھلا گئی تھیں انہوں نے جس طرح ایک نظر ختم کو دیکھ کر ہٹکاتے ہوئے صفائی دی اس پر ختم شاک میں گھری انہیں دیکھے گئی۔

”ک۔۔۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔۔۔ میں میں بھلا کچھ۔۔۔ کیوں بتاؤں گی۔۔۔ اور اور پھر مجھے خود کچھ نہیں پتا۔“ وہ جو بھرم ختم کے سامنے رکھنا چاہ رہی تھیں ان کے چہرے پر اڑتی ہوئیاں اس کا پول کھول گیا تھا پھر بھی رہی سہی کسر عظمت خلیل نے خود پوری کر دی۔

اپنے مخصوص تہے ہوئے لہجے میں انہوں نے بڑی وحشانی سے کہا۔
”تمہاری ماں نے جب سب بتا دیا ہے تو پھر یہ پوچھنے کا ذرا امہ کیوں؟“

رشیدہ نے مجھے فون پر بات کرتے سن ہی لیا تھا اور مجھے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا اگر وہ یا تمہیں بات جان گئیں کہ کل رات کا شیل نے میرے ہی کہنے پر اسپیکر قادر کو اتنا اور غلایا کہ اسپیکر قادر نے حشام کا کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی دھن کر رکھ دیا اور جب مجھے پتا چل گیا کہ اس کی حالت بہت تازک سے تب میں نے کمشنر صاحب کو فون کر کے تا صرف حشام کو پھرایا بلکہ شہر کے سب سے منگے ہاسپٹل میں اسے داخل بھی کرا دیا۔“ ختم رشیدہ کی انہیں سننے لگی اس میں جیسے کچھ کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی تھی۔

اگر عظمت خلیل کو یہ ذرا سا بھی اندازہ ہو تاکہ رشیدہ نے ختم سے کچھ نہیں کہا اور وہ صرف اپنے اندازے کے مطابق ان سے بات کر رہی ہے تو وہ یہ سب اس کے سامنے بھی قبول نہ کرتے۔

حالانکہ رشیدہ بھی ان کے معاملے میں نہیں بولی تھیں اور بتائی وہ یہ چاہتی تھیں کہ ایسی کوئی بھی بات ختم کے علم میں آئے جو اسے عظمت خلیل سے مزید خائف کر دے مگر عظمت خلیل نے بیوی پر بھی بھروسہ ہی نہیں کیا تھا انہیں تو بس ان سے شکایتیں تھیں۔

کل رات جب انہیں اپنے بیجر کے فون کرنے پر پتا چلا کہ اسپیکر قادر حشام پر زیادہ تشدد نہیں کر رہا بلکہ وہ اسے کسی اور ہی کام کے لیے تیار کر رہا ہے اور وہ مجبور حشام صرف اس کی قید سے نکلنے کے لیے تیار بھی ہو گیا ہے۔

تب عظمت خلیل کے ارمانوں پر جیسے لانی پھر گیا انہوں نے مزید انتظار کرنے اور وقت برباد کرنے کی بجائے بیجر کو صاف لفظوں میں سمجھایا کہ وہ اس کا شیل کے ذریعے اسپیکر قادر کو حشام کے خلاف اتنا بھڑکادیں کہ وہ فوری کوئی قدم اٹھائے اور عظمت خلیل کو اس کی وردی اتروانے کا موقع مل جائے۔

یہ ساری گفتگو کرنے کے بعد جب انہوں نے فون بند کیا تو کمرے کے ایک کونے میں رشیدہ کو نماز پڑھتا دیکھ کر ٹھٹک گئے مگر فوراً ہی اپنی اپنی خود سری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے نا صرف ان کے سر پر ہر وقت سوار ہونے پر رشیدہ کو تازہ دیا بلکہ جو کچھ سنا اسے بھول جانے کا حکم بھی دے دیا۔
جو اگر وہ نہ بھی دیکھتے تب بھی رشیدہ کو یہی گنا تھا ایک تو وہ فطرتاً بہت سیدھی تھیں۔ دوسرے جو بہت اعتماد اور بھروسہ تھا وہ معذور ہونے کے بعد سے کب کان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

اپنی وہیل چیئر پر اس محل جیسے گھر میں ادھر سے ادھر گردش کرتے ہوئے انہیں اپنی ذات اس گھر میں رکھے
فرنیچر سے بھی زیادہ بے مصرف لگتی تھی وہ فرنیچر تو پھر بھی امپورٹڈ تھا اور کمرے کی شان و شوکت کو بڑھا رہا تھا جبکہ
ان کا وجود اس بیش قیمت سامان کے بیچ میں بالکل ارزاں ہی تھا۔

صرف ایک محل تھی جس کی وجہ سے ان کے اندر سے جینے کی خواہش ختم نہیں ہوئی تھی وہ اسے دنیا کے ہر
سروگرم سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں۔

مگر افسوس کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اسے سب سے زیادہ نفیس اپنے والد کی طرف سے ہی پہنچی
تھی۔

اسی لیے رشیدہ کی شعوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ ایسی ہر بات نمل سے چھپالیں جو اس کی نظر میں اس کے والد
کے تاثر کو خراب کرے۔ مگر بچپن سے ہی وہ اس کوشش میں ناکام رہی تھیں۔

عظمت خلیل نے گھر سے باہر اپنا امپیریشن بنانے کے لیے جتنی محنت کی تھی وہ اس کی ادھی سے بھی ادھی
محنت گھر میں نہیں کرتے تھے۔

باہر والوں پر اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار رہتے لیکن گھر میں داخل ہوتے وہ اس
چولے کو اتنی ہری طرح فوج کرا تا رویتے کہ گھر والوں کے لیے انہیں برداشت کرنا مشکل ہو جاتا۔

انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ پوری دنیا جو ان کے کن گاتی ہے اس تعریف سے ان کی اپنی بیوی
اور بیٹی ذرا بھی متفق نہیں ہیں۔ وہ دونوں ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں۔ کیا محسوس
کرتے ہیں انہیں قطعاً پروا نہیں تھی۔

مگر رشیدہ کے لیے یہ مقام ناقابل برداشت تھا۔ نمل انہیں بے یقینی سے دیکھ رہی تھی وہ اس وقت کیا سوچ رہی
تھی یہ وہ باخولی جانتی تھیں اور سبھی چیز انہیں اذیت میں مبتلا کر رہی تھی وہ اس سے نظر ملانے کے بھی قابل نہیں
تھیں جبکہ عظمت خلیل ذرا بھی شرمندہ ہونے بغیر شہادت کی انگلی اس کی طرف اٹھاتے ہوئے نہایت سختی سے
بولے۔

”تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم میرے معاملوں سے دور رہو وہ لڑکا معذور ہوتا ہے یا مر جاتا ہے تمہاری بلا
سے۔“

میں نے آج ہی نیوز میں اعلان کر دیا ہے میں اس کی ماں بہن کو اتنا پیسہ دینے والا ہوں کہ وہ زندگی بھر گھر بیٹھ کر
کھا سکتے ہیں وہ لڑکا اگر اسے پیروں پر کھڑا بھی ہو جاتا تب بھی اتنا نہیں کما سکتا تھا۔ ”عظمت خلیل کہہ کر کتھرا اس
کے برابر سے نکل گئے مگر اچھی وہ دو قدم ہی چلے تھے کہ نمل بدستور ساکت کھڑے رہنے لگے اور خود ان ہی کی طرح
ٹھوس لہجے میں بولی۔

”کل جب انہیں پیسے ملیں گے تو وہ ساری رقم واپس کر دیں گے۔“ عظمت خلیل اس کی بات پر ٹھنک کر اسے
دیکھنے لگے تو وہ سابقہ انداز میں ہی بولی۔

”کیونکہ کل تک وہ یہ جان جائیں گے کہ ان کے بیٹے کی اس حالت کے ذمہ دار آپ بھی اتنے ہی ہیں جتنے کہ
الیکٹرک قادر یا شاید آپ کا جرم الیکٹرک قادر سے بھی بڑا ہے۔“

عظمت خلیل کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ ساتھ نظرات بھی پھیل گئے تھے وہ بغور اس کے چہرے کے
تاثرات دیکھنے لگے جو مزید کہہ رہی تھی۔

”مجھے اسی نے کچھ نہیں بتایا مجھے جو کئی بنا چلا ہے یا تو وہ میرے اپنے اندازے تھے یا اب جو کچھ آپ نے خود کہا
ہے اس کے باعث معلوم ہوا ہے۔“

اب بھی میں یہ تو نہیں جانتی کہ حشام کی زندگی تباہ کر کے آپ کو کیا فائدہ پہنچا ہے اگر اس خبر سے آپ اپنی
شہرت کو ہائی لائٹ کرنا چاہتے تھے تو وہ تو تب بھی ہو جاتا جب حشام پہلے چھوٹ جاتا۔

لیکن شاید اتنی ہمدردیاں اس کیس میں انوالونڈ ہوئیں جو اب ہوئی ہیں۔
بہر حال جو بھی ہو اگر اس الیکٹرک قادر کا ظلم منظر پر آیا ہے تو آپ کا بھی اتنا چاہیے اور آئے گا بھی۔
پریس میں یہ بھی آئے گا کہ یہ آپ کی سازش تھی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ عظمت خلیل ہنسا کر بولے مگر نمل اسے بولی جیسے ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔
”ہو سکتا ہے میں کچھ ثابت نہ کر سکوں آپ کے خلاف مگر مجھے یقین ہے آپ کی شہرت کو داغدار کرنے میں تو
کامیاب ضرور ہو جاؤں گی۔“

جب آپ کی اپنی بیوی حشام کی والدہ اور پریس سے یہ کہے گی کہ یہ سب آپ نے کرایا ہے تو بیڈلائن تو ضرور بنے
گی چاہے کیس بنے تب۔

”شٹ اپ۔ ہوش میں ہو تم۔ ایسی بیکو اس کر کے تم میرے لیے نہیں اپنے لیے مسائل کھڑے کرو گی۔“ وہ
دھاڑ کر بولے پھر رشیدہ کی طرف پتھرتے ہوئے چلا کر بولے۔

”یہ تربیت دی ہے تم نے اپنی بیٹی کو۔ یہ سکھایا ہے اسے کہ پریس کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے باپ کے خلاف
بولے۔“

تمہاری جیسی ایسا بیوی کو میں نے ساری زندگی برداشت کیا صرف یہ سوچ کر کہ میری بیٹی کون کی ضرورت ہے
لیکن تم فریض بھی ڈھنگ سے ادا نہیں کر سکیں۔

ایسی ذہنیت اور نفسیات کے ساتھ تو وہ بن ماں کے بھی پل جاتی۔ ”عظمت خلیل ہری طرح بیچ و تاب کھا رہے
تھے اسی لیے اب وہ موضوع سے ہٹ کر ذاتیات پر اتر آئے تھے۔“

اصل موضوع پر کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ تھا نہیں حسب سابق وہ رشیدہ پر برسنے لگے تھے جو ان کا غصہ
بڑھتا دیکھتے ہی زرد پڑنے لگتی تھیں اور ان کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر نمل سب کچھ بھول کر ان کی آؤ بھگت میں لگ
جاتی۔

اس وقت بھی ان کے منہ سے ایسے القابات سن کر رشیدہ ہولے ہولے کانپنے لگی تھیں مگر نمل ان کی طرف
بڑھنے کی بجائے بدستور عظمت خلیل کو دیکھتی رہی جو وہی سب دہرا رہے تھے جو وہ اکثر کہتے آئے تھے مگر ہر بار یہ
سب سن کر اسے نئے سرے سے افسوس اور نئے سرے سے ان سے نفرت محسوس ہوتی تھی تبھی وہ اسی نفرت
بھرے لہجے کے ساتھ بولی۔

”آپ نے میری ماں کو برداشت نہیں کیا بلکہ میری ماں نے ساری زندگی آپ کو میری وجہ سے برداشت کیا ہے
ناکہ میری ذات پر کوئی مشکل نہ لے آئے اس پر وہ خود ساری زندگی یہ مشکلوں سے بھرا سفر طے کرتی رہیں۔“

آپ نے تو ان کے وجود کو بھی اپنی شہرت کا ذریعہ بنا لیا۔ آپ نے ان کی معذوری کو میری وجہ سے نہیں چھپایا۔
ارے آپ کو میری کون سی فکر تھی۔

آپ نے صرف دنیا کی واہ واہ اور ہمدردیاں بنورنے کے لیے انہیں اپنے ساتھ رکھا آپ اپنی بیوی کی معذوری کا
اشتمار لگاتے رہے تاکہ لوگ آپ پر ترس کھائیں اور آپ کی مثال دیں کہ کتنا عظیم انسان ہے حالانکہ آپ کیا
ہیں یہ لوگ اگر جان لیں تو آپ پر تھوکتا بھی پسند نہ کریں۔

”بد تمیز۔“ عظمت خلیل کا ہاتھ اٹھا تھا مگر نمل برق رفتاری سے پیچھے ہٹ گئی اور ان کا وار خالی چلا گیا اسی وقت
رشیدہ اتنی زور سے چیخیں کہ عظمت خلیل کو دوبارہ آگے بڑھ کر اسے مارنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

49

نمل نے بے اختیار رشیدہ کی طرف دیکھا عظمت خلیل کو اس پر ہاتھ اٹھا تو کچھ کرانہوں نے اپنی وہیل چیئر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی اور اس کی کوشش میں وہ زمین پوس ہو گئی تھیں۔
نمل کے تو اوسان خطا ہو گئے وہ وہ زٹی ہوئی ان کے پاس پہنچی اور ان پر جھک گئی۔

”امی امی امی آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“
عظمت خلیل نے بھی بے اختیار قدم رشیدہ کی طرف بڑھائے مگر اگلے ہی بل وہ نخواست سے سر جھٹکتے کمرے کی طرف پلٹ گئے۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے وہ ہو چکا تھا اب رشیدہ خود سب سنبھال لیں گی۔
”امی۔۔ امی۔۔ رشیدہ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی مگر اس طرح گرنے پر ان کی دھڑکن تیز ہو جانے کی وجہ سے سانس پھولنے لگی تھی کچھ فحالت نے بھی انہیں فوری طور پر کچھ بولنے کے قابل نہیں چھوڑا۔
نمل نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور واپس وہیل چیئر پر بٹھا دیا ملازم کو آواز دے کر اس نے ان کے لیے چائے منگوایا۔ جب ان کی حالت کچھ بہتر ہوئی تب جا کر نمل کی جان میں جان آئی۔
وہ بے بسی سے نمل کو دیکھنے لگیں اور بس یہ وہ نظریں تھیں جو ایک بار نمل کی طرف اٹھ جاتیں تو پھر نمل کچھ کہنا تو درکنار کچھ سوچنے کے بھی قابل نہ رہتی۔

مگر سماں معاملہ اس کی یا اس کی ماں کی عزت نفس کا نہیں تھا جس کے مجروح ہونے پر نمل عظمت خلیل کے رو بہو آئی ہو بلکہ یہ ایک نوجوان کی زندگی کا سوال تھا جو تباہ ہو چکی تھی۔
اپنی ماں کی معذوری وہ بچپن سے دیکھتی آرہی تھی اسے اچھی طرح احساس تھا بے کسی کی زندگی کیسی ہوتی ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جس کے کندھوں پر آئندہ پورے گھر کی کفالت کی ذمہ داری ہو۔
نمل پہلی بار رشیدہ سے نظریں چراگئی تو رشیدہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

”کچھ نہیں ہو گا تمہارے یہ سب کرنے سے تمہارے باپ کو دنیا بہت اچھا آدمی سمجھتی ہے تمہارے اس بیان سے تھوڑے دن باتیں نہیں کی اور پھر لوگ سب بھول جائیں گے اگر کچھ یاد رہے گا تو بس اتنا کہ نمل خلیل نے باپ سے انگی اٹھائی ضرور اس لڑکی میں ہی کوئی خانی ہوگی۔

حشام کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب اس کے گھر والوں کو کچھ بنا کر تم ان کی اذیت میں اضافہ ہی کر دو گی۔
مت کرو ایسا لینے دو انہیں وہ پیسے پیسہ بہت ضروری ہے خاص طور پر جہاں اتنی غربت اور افلاس ہو رہا ہے اس پیسے کے لیے لوگ کچھ بھی بیچنے اور کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔
مت ڈالو انہیں آزمائش میں۔

اور مت ڈالو مجھے آزمائش میں۔
تمہارا باپ غصے میں کچھ بھی کر سکتا ہے میں دنیا کے سامنے تمہارا نہیں بلانا جاتی۔ مجھے سکون سے اس گھر کے ایک کونے میں بیٹھو۔

تمہارے باپ کو دنیا کے سامنے بنی اپنی شخصیت پر براغور ہے اگر اس غرور پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو وہ رشیدہ بولتے بولتے ایک دم رو پڑیں۔

نمل کو ان سے شدید اختلاف تھا مگر ان کی چند باتوں کو وہ اتنی نہیں جھٹلا سکتی تھی۔
اس کے بیان دینے سے عظمت خلیل کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جاسکتا تھا۔ لوگ صرف چند دن باتیں بنا کر خاموش ہو جانے والے تھے۔

حشام کے گھر والوں کو جواہر دہانے والی تھی انہیں اس کی سخت ضرورت تھی۔
عظمت خلیل سے کوئی بے پروا نہیں تھا کہ نمل کی اس حرکت پر وہ انتقاماً رشیدہ کو گھر سے نکال باہر کریں رشیدہ کا

باتوں وجود اس عمر میں اس رسوائی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔
نمل جیسے بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی مگر اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی جو اس کے پورے وجود کو ایک کرب میں مبتلا کر رہی تھی۔

اس کا ہاتھ رشیدہ کے کندھے پر اٹھرا تھا جس کا مطلب سمجھتے ہوئے نورا ”رشیدہ کے رونے کی نوعیت میں فرق آگیا تھا۔“

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بے اختیار رجم لیے تھے۔
آنسو اب بھی ان کی آنکھ سے بہ رہے تھے مگر اب ان میں ملال کے ساتھ ایک تشکر بھی تھا۔
نمل نے اندر ہی اندر جھٹلا ہٹ کا شکار ہونے کے باوجود محض ان کا دل رکھنے کے لیے سر اثبات میں ہلا کر اپنے قائل ہونے کا مظاہرہ کر دیا۔



”تم کہاں جا رہے ہو؟“ مسز فرقان حسن نے جیسے ہی خرم کے کمرے میں قدم رکھا ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

خرم بلیک چیئر پر ایک اینڈوائیٹ چیک کی شرٹ پہنے بڑے اہتمام سے تیار آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا۔
”ایسے ہی جا رہا ہوں مام ہارون نے مووی کا پروگرام بتایا ہے کیوں کوئی خاص بات۔“ خرم نے بدستور آئینہ میں دیکھتے ہوئے مام سے لہجے میں کہا۔

”ہاں تمہارے ڈیڈ نے کوئی مکان پسند کر لیا ہے خریدنے کے لیے۔ وہ ہم دونوں کو گھر دکھانے کے لیے آج تمام طور سے جلدی گھر آئے ہیں۔“ مسز فرقان نے اپنے خوبو بیٹے کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جو ڈرننگ ٹیبل سے پرفیوم اٹھا کر اسرے کرنے لگا۔

”تو چلیں ہارون کا پروگرام کیٹسل! آپ کے ساتھ چلتا ہوں ویسے بھی اگر ڈیڈ نے گھر پسند کر کے ہم دونوں کو دکھانے کا فیصلہ کیا ہے تو گھر اچھا ہی ہو گا ہمیں فوراً دیکھ کر فوراً ڈسٹرن لینا چاہیے۔“ خرم نے ایک آخری طائرانہ نظر خود پر ڈالتے ہوئے کہا تو مسز فرقان آئینہ میں اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے شوچی سے بولیں۔

”جناب کی تیاری بالکل مکمل ہے مزید کسی زیبائش کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی بہت سچ رہے ہو۔“ خرم ان کی بات پر بے ساختہ مسکرا دیا تو مسز فرقان چھینرنے والے انداز میں بولیں۔
”ہم گھر دیکھنے جا رہے ہیں لڑکی دیکھنے نہیں۔“

”First of all میں نے یہ تیاری گھر دیکھنے کے لیے نہیں مووی دیکھنے کے لیے کی تھی thing
Second کیا پتا گھر کے بہانے گھر والی بھی مل جائے۔“ کوئی خرم کو چھینرنے اور خرم اسے نہ چھینرنے ایسا کبھی ہوا
تی نہیں تھا۔

مسز فرقان خرم کے معنی خیز انداز پر اسے ایک دھمو کا جڑتے ہوئے بولیں۔
”ہاں جیسے ابھی تک تو تمہیں گھر والی ملی ہی نہیں ہے۔“

”What do you mean آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔“ خرم حیران ہوا۔
”یہ ایسا سے کیا مطلب ہے تمہارا۔“ بھئی مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا اگر تم خود کسی کو پسند کر لو۔ بس لڑکی
اپنے خاندان کی ہونی چاہیے۔“ مسز فرقان نے شرطیہ انداز میں کہا تو خرم بے ساختہ ہنس دیا۔

”آپ تو ایسے بات کر رہی ہیں جیسے مجھے ڈیڈ پر کسی کے ساتھ پکڑ لیا ہو۔“ خرم کے ہنسنے پر مسز فرقان حسن

اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے دکھا ہر سنجیدگی سے بولیں۔
 ”تو کیا واقعی کوئی نہیں ہے۔“ ان کے اتنی سنجیدگی سے پوچھنے پر بل بھر کے لیے خرم ٹھنک گیا جیسے اندر کہیں کسی کو نے میں واقعی کوئی موجود ہو۔
 ”نہیں کوئی بھی نہیں۔“ خرم ایسے تیزی سے بولا جیسے چوری پکڑے جانے کے ڈر سے کوئی پہلے ہی صفائی دے دے۔

مسز فرقان حسن بھی اس کے اس طرح ہونے پر زور سے ہنس دیں۔
 ”اچھا Come on hurry up تمہارے ڈیڈیٹ کر رہے ہیں۔“ وہ یہ کہتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔
 خرم کچھ دیر ان کے پیچھے دروازے کو دیکھتا رہا پھر آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں مسز فرقان کا جملہ گھومنے لگا۔
 ”تو کیا واقعی کوئی نہیں ہے۔“

جیلے کے ساتھ ہی کوئی ہلکی سی شبیہ اس کے ذہن کے پردے پر لہرانے لگی تھی اس سے پہلے کہ وہ شکل واضح ہوتی خرم کا موبائل بج اٹھا اور خرم چونک گیا۔
 دوسری طرف ہارون تھا خرم نے اسے بتا دیا کہ وہ نہیں آ رہا ساتھ ہی ریست و اچ پھنٹا کمرے سے باہر آ گیا جہاں فرقان حسن اور مسز فرقان اس کے منتظر کھڑے تھے۔
 ”تمہارا موبائل دیکھنے کا پروگرام تھا۔“ فرقان حسن نے اس پر نظر پڑتے ہی پوچھا مسز فرقان غالباً انہیں بتا چکی تھیں۔

”میرا نہیں ہارون کا تھا میں تو قائم پاس کرنے کے لیے راضی ہو گیا تھا مگر آپ جہاں لے جا رہے ہیں وہ موبائل سے زیادہ اٹرننگ جگہ ہے۔“
 کیونکہ آپ کا پسند کیا ہوا گھر یہ تھا دیکھنے سے تعلق رکھتا ہو گا۔“ خرم نے یقین سے کہا۔
 ”باہر سے تو گھر بہت شاندار ہے لیکن اندر سے میں نے نہیں دیکھا ہے کیونکہ جو لوگ مکان بیچ رہے ہیں وہ ابھی اسی میں رہ رہے ہیں فیملی کی موجودگی میں باہر گھر دیکھنے جانا اچھا نہیں لگتا میں نے سوچا ایک ہی بار چلیں گے اور ایک ساتھ دیکھ لیں گے۔“ فرقان حسن نے تفصیل بتائی۔

وہ تینوں ساتھ چلتے ہوئے گھر سے نکل کر پورچ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔
 ”ڈیڈ آپ کسی کا استعمال شدہ گھر خرید رہے ہیں کوئی نئی کوٹھی خریدنی چاہیے ہے کسی نے استعمال نہ کیا ہو۔“
 خرم نے حیرت اور بے زاری کی لمبی چلی کیفیت میں کہا۔

”ارے تم ایک بار اس گھر کو دیکھو گے نا تو تمہیں بتا چلے گا وہ گھر نئی اور شاندار کوٹھیوں کو بھی مات دیتا ہے۔“
 بلال اختر نامی بہت بڑے بزنس مین کا گھر ہے۔ وہ سالوں سے وہاں رہ رہے ہیں بلکہ ان کا آبائی گھر ہے مگر بلال اختر نے اسے ایسی زبردست کنڈیشن میں رکھا ہوا ہے کہ لگتا ہے جیسے کچھ مہینوں پہلے ہی تیار ہوا ہو پھر مجھے اس ایریا کا بھی پتا ہے۔

وہاں ہمارے علاقے کی طرح گزری لائنوں کا مسئلہ ہے نہ پانی کا یوں سمجھ لو ایک دم آئیڈیل گھر ہے۔“ فرقان حسن نے جو شیعہ انداز میں کہا تو خرم نے کوئی تبصروں میں کیا ڈیڈ کے اتنے دعوں پر اس نے پہلے دیکھ لیا مناسب سمجھا۔
 تقریباً چالیس منٹ بعد خرم نے فرقان حسن کے کہنے پر گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔
 ”یہ ہے گھر۔“ مسز فرقان نے پورے وثوق سے پوچھا۔

وہی تو اس علاقے میں تقریباً سارے ہی گھر شاندار تھے لیکن اس کو ٹھی کا طول و عرض اور شان و شوکت سب میں نمایاں تھی۔
 ”جی ہاں! اب جانتیں یہ گھر کہیں سے پرانا لگتا ہے۔“ فرقان حسن نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اترتے ہوئے پوچھا تو وہ دونوں بھی اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر اتر آئے۔
 ”یہ توئی فل۔“ خرم نے محبت سے اس گھر کو دیکھتے ہوئے زیر لب کہا تو فرقان حسن کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھرائی۔

”اندر سے دیکھنا ہے۔“ انہوں نے دونوں کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔
 ”بالکل کیوں نہیں؟“ خرم فوراً بولا۔

”یہ تو ایسا گھر ہے کہ باہر سے دیکھ کر خود بخود اندر سے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو جائے اور ہم تو آئے ہی خریدنے کے ارادے سے ہیں تو ہماری یہ خواہش تو بالکل برحق ہے۔“ مسز فرقان کی شکل سے صاف لگ رہا تھا وہ بری طرح گھر سے متاثر ہو چکی ہیں۔

فرقان حسن نے بلال اختر کو پہلے ہی فون پر مطلع کر دیا تھا چنانچہ کچھ ہی دیر میں وہ بلال اختر کی رہنمائی میں پورے گھر کا جائزہ لے رہے تھے۔

بلال اختر کو گھر کی تفصیل سے دکھانے میں کافی کوفت ہو رہی تھی لیکن جو پارٹی گھر دیکھنے آئی تھی اس کی طرف سے انہیں حیرت تھی کہ وہ بھی ان کی طرح وقت کو بہت سنبھال کر خرچ کرتے ہیں اس کے باوجود اگر وہ اتنی تفصیل سے ایک ایک کونے کا معائنہ کر رہے تھے تو قوی امکان تھا کہ وہ منہ مانی قیمت پر گھر خرید لیں گے اور پھر بھی بلال اختر کے پاس زیادہ کا بک آئے بھی نہیں تھے جو وہ بے زار بجاتے انہوں نے کل ہی تو اشتہار دیا تھا ابھی تک صرف دو چار فون ہی آئے تھے اور وہ بھی۔

”آپ پہلے قیمت بتادیں۔“ کئی ٹکرا کر رہے تھے بلال اختر کو پارٹیننگ سے سخت چڑھی وہ جانتے تھے بغیر درود سہری کے کوئی سلیبھی ہوئی پارٹی ان کا گھر خرید لے اور وہ فوراً سودا پکا کر دیں اور فرقان حسن کی فیملی انہیں ایسی ہی پارٹی لگ رہی تھی سارا گھر دیکھتے ہوئے وہ سب اوپری منزل پر آ گئے۔
 ”یہ میرا بیڈ روم ہے میری وائف اس وقت سو رہی ہیں۔“ بلال اختر نے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی اور بیڈ روم دکھا دیں ذرا کمرے اور باتھ روم کے اسپیس کا اندازہ ہو جائے گا۔“ مسز فرقان نے التجائیہ انداز میں کہا تو بلال اختر چاروں باتھ روم کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔
 ان تینوں کو وہیں روک کر انہوں نے خود پہلے ندیہ کے کمرے کے دروازے پر ناک کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

ندیہ وسیع و عریض کمرے کے ایک کونے میں رکھے کمپیوٹر کے پیچھے تقریباً روپوش تھی دستک کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا بلال اختر کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔

”ایک پارٹی گھر دیکھنے آئی ہے وہ کمرہ بھی دیکھنا چاہتی ہے۔“ بلال اختر کے دھتے لہجے پر ندیہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

حالانکہ وہ ایک بار جو فیصلہ کر لیتے اس پر قائم رہتے تھے پھر بھی ندیہ کو امید نہیں تھی کہ وہ یہ گھر واقعی چھین گے۔

”لے آؤں انہیں اندر۔“ بلال اختر نے خود پر جی اس کی حیران نظروں سے خار کھاتے ہوئے سیاٹ لیجے میں

پوچھا تو وہ ایک دم چونک اٹھی اور سانس خارج کرتے ہوئے پہلی بار بڑے سرو لہجے میں بولی۔
 ”اگر میں منع کروں گی تو کیا آپ نہیں لائیں گے؟“ زوبیہ نے دو سیکنڈ کا توقف کیا پھر واپس کپڑے ٹرا سکرین پر
 نظریں گاڑتے ہوئے بولی۔

”جب اپنی ہی مرضی چلانی ہے تو پوچھ کیوں رہے ہیں لے آئیں۔“ وہ پوچھ نہیں رہے تھے صرف بتا رہے تھے
 لیکن زوبیہ کی آنکھ میں ہلکی سی کی دیکھتے ہوئے انہوں نے خود کو کچھ بھی کہنے سے روک لیا۔
 وہ اس کے احساسات سمجھتے تھے خود وہ بھی اپنے فیصلے سے خوش نہیں تھے اس گھر سے ان کی ان گنت یادیں
 وابستہ تھیں وہ اس گھر میں پیدا ہوئے تھے مگر وہ فیصلہ کر چکے تھے اور انہیں تو لگ رہا تھا یہ فیصلہ انہیں بہت پہلے کر
 لینا چاہیے تھا۔

بلال اختر نے باہر جھانکتے ہوئے ان تینوں کو اندر آنے کی اجازت دی جیسے ہی ان لوگوں نے کمرے میں قدم رکھا
 بلال اختر کا موبائل بج اٹھا۔

اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھنے کے باوجود انہوں نے کال اینڈ کر لی کیونکہ گھر کے اشتہار کے ساتھ انہوں نے
 یہی نمبر دیا تھا مگر دوسری طرف ہیلو کے جواب میں ایک ماؤس سی آواز بلال اختر کو چونکا گئی۔

”یقین نہیں آ رہا تم نے گھر بیچنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔“
 ”کون؟“ بلال اختر نام کا شکار ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا بلال آواز بھی نہیں پہچانتے۔“ بھاری سنجیدہ سی مردانہ آواز وہ پہچان تو گئے تھے اسی لیے فرقان حسن
 سے اہکسا کہو ز کرتے تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

”کیوں فون کیا ہے؟“ انہوں نے باہر آتے ہی بے تامل انداز میں پوچھا۔
 ”اشتہار پڑھ کر کیا ہے وہ گھر خریدنا چاہتا ہوں۔“ دوسری طرف کی بات سن کر بلال اختر نے بے اختیار لب بھینچ
 لیے۔

”کیا قیمت لگائی ہے۔“ بلال اختر کو خاموش دیکھ کر دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
 ”گھر یک چکا ہے میں ڈیل کر چکا ہوں۔“ بلال اختر کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا سوچتے میں۔ وہ اتنے اشتہار سے
 بولے تھے کہ سننے والا یقین کرنے پر مجبور ہو جائے مگر دوسری طرف موجود شخص بھی بلال اختر کو اچھی طرح جانتا تھا

پہلے ان سے بھی زیادہ توجہ سے بولا۔
 ”بھوت مت بولو۔ صاف صاف کہو نا مجھے نہیں پہچنا چاہتے۔ خیر میں نے کوئی بحث کرنے کے لیے فون نہیں
 کیا۔“

قیمت لگوا لو جو بھی پارٹی بے کر رہی ہو میں اس سے دس لاکھ زیادہ دیتے کے لیے تیار ہوں آگے تمہاری
 مرضی۔“ دوسری طرف سے دو ٹوک لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ بلال اختر خالی الذہن کے عالم میں وہیں
 کھڑے رہ گئے۔

بلال اختر جیسے ہی موبائل پر بات کرنے کے لیے کمرے سے نکلے تینوں ایک دم ریلیکس ہو گئے اتنی دیر سے وہ
 کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر پار رہے تھے ان کے جانتے ہی انہیں جیسے بولنے کی آزادی مل گئی انہیں اس
 بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے کیونکہ زوبیہ کیمپوٹر کے پیچھے ایسے بیٹھی تھی کہ اس
 پر فوری طور پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی اور یہ تک کمرے میں آتے ہی بلال اختر کمرے سے چلے گئے تو وہ لوگ موصوع

پر فوری طور پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی اور یہ تک کمرے میں آتے ہی بلال اختر کمرے سے چلے گئے تو وہ لوگ موصوع

بلال اختر جیسے ہی موبائل پر بات کرنے کے لیے کمرے سے نکلے تینوں ایک دم ریلیکس ہو گئے اتنی دیر سے وہ
 کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر پار رہے تھے ان کے جانتے ہی انہیں جیسے بولنے کی آزادی مل گئی انہیں اس
 بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے کیونکہ زوبیہ کیمپوٹر کے پیچھے ایسے بیٹھی تھی کہ اس
 پر فوری طور پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی اور یہ تک کمرے میں آتے ہی بلال اختر کمرے سے چلے گئے تو وہ لوگ موصوع

بلال اختر جیسے ہی موبائل پر بات کرنے کے لیے کمرے سے نکلے تینوں ایک دم ریلیکس ہو گئے اتنی دیر سے وہ
 کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر پار رہے تھے ان کے جانتے ہی انہیں جیسے بولنے کی آزادی مل گئی انہیں اس
 بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے کیونکہ زوبیہ کیمپوٹر کے پیچھے ایسے بیٹھی تھی کہ اس
 پر فوری طور پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی اور یہ تک کمرے میں آتے ہی بلال اختر کمرے سے چلے گئے تو وہ لوگ موصوع

بلال اختر جیسے ہی موبائل پر بات کرنے کے لیے کمرے سے نکلے تینوں ایک دم ریلیکس ہو گئے اتنی دیر سے وہ
 کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر پار رہے تھے ان کے جانتے ہی انہیں جیسے بولنے کی آزادی مل گئی انہیں اس
 بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے کیونکہ زوبیہ کیمپوٹر کے پیچھے ایسے بیٹھی تھی کہ اس
 پر فوری طور پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی اور یہ تک کمرے میں آتے ہی بلال اختر کمرے سے چلے گئے تو وہ لوگ موصوع

بلال اختر جیسے ہی موبائل پر بات کرنے کے لیے کمرے سے نکلے تینوں ایک دم ریلیکس ہو گئے اتنی دیر سے وہ
 کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کر پار رہے تھے ان کے جانتے ہی انہیں جیسے بولنے کی آزادی مل گئی انہیں اس
 بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے کیونکہ زوبیہ کیمپوٹر کے پیچھے ایسے بیٹھی تھی کہ اس
 پر فوری طور پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی اور یہ تک کمرے میں آتے ہی بلال اختر کمرے سے چلے گئے تو وہ لوگ موصوع

نہایت جان کر کمرے کا جائزہ لینے کی بجائے باتوں میں مشغول ہو گئے۔
 ”گھر تو بہت اچھا ہے میرے خیال سے آپ ابھی ڈیل کر لیں کہیں کوئی اور نہ خرید لے۔“ مسز فرقان نے
 چھوٹے ہی کہا۔

زوبیہ غیر ارادی طور پر بڑے غور سے ان کی باتیں سننے لگی ویسے بھی وہ اتنی ویسی آواز میں نہیں بول رہے تھے
 کہ اسے مشکل ہوئی۔

”ہاں خیر ہے تو بہت اچھا لیکن لگ رہا ہے پرانے سے نہیں ہوں گے جبکہ اس سے پہلے جو گھر ہم نے دیکھا تھا وہ
 بہت ریزن ایبل ہے۔“ فرقان حسن بولے۔

”کم آن ڈیڈ وہ گھر تو میں نے اسی وقت دیکھا تھا اور اس گھر کو دیکھنے کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں
 ہوتا۔“ خرم نے حتمی انداز میں کہا۔

”وہ گھر تو واقعی اس گھر کے سامنے کچھ نہیں مگر انہیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے وہ بہت کم قیمت میں بیچ رہے
 ہیں۔“ فرقان حسن ڈیل اینڈ ڈھور رہے تھے۔

”تو کیا ہوا ڈیڈ اب تو ہم بس یہی گھر خریدیں گے اور یہ میرا کہہ ہو گا۔“ خرم نے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔
 ماؤس پر زوبیہ کی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی بے اختیار اس کی نظریں خرم کی طرف اٹھ گئیں جو پوری طرح
 سے فرقان حسن کی طرف متوجہ تھا۔

”اس کمرے کے آگے بنے ٹیرس سے آپ باہر لان کا ویو دیکھیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی پیراڈائز میں آگئے
 ہوں۔“

میں اپنا ٹیڈل یہاں رکھوں گا۔ مگر میں گیلری کا یہ کمرہ بیچ کر دوں گا اس بنگ کمرے تو کسی لڑکی کے کمرے کا
 نمونہ ہو رہا ہے۔“ خرم بڑی سی گلاس وال کے دوسری جانب بنے ٹیرس اور اس سے آگے نظر آتے لان کے
 دلفریب منظر کو دیکھتے ہوئے کہتا چلا گیا۔

زوبیہ کو لگ رہا تھا کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔
 جس کمرے کو وہ ہمیشہ سے محض اپنی ملکیت سمجھتی آئی تھی آج اسی کمرے کے متعلق کوئی اتنے اشتہاق سے
 بات کر رہا تھا جیسے زوبیہ کا اس کمرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

وہ غیر ارادی طور پر خرم کو دیکھتی چلی گئی اور اسی لیے خرم کو محسوس ہو گیا کہ وہ کسی کی نظروں کی زد میں ہے بے
 اختیار خرم کی نظر زوبیہ کی طرف اٹھ گئی۔

پہلے تو وہ یہ جان کر چونکا تھا کہ کمرے میں ان تین نفوس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے مگر اس بات پر حیران ہونے
 کا زیادہ وقت نہیں ملا کیونکہ فوراً ہی اس کی توجہ زوبیہ کی آنکھوں میں بھری نمی نے اپنی جانب کھینچ لی تھی زوبیہ
 نے اسے متوجہ دیکھ کر بھی اپنی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا اسی لیے خرم کی تیزی سے چلتی زبان کو ایک دم بریک لگ
 گئے حالانکہ زوبیہ اس سے بہت فاصلے پر تھی پھر بھی وہ اس کے چہرے کے تاثرات با آسانی پڑھ گیا تھا۔

اس کمرے میں اس کی موجودگی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ اسی کا کمرہ ہے اس لہذا۔ جو کچھ بھی خرم نے کہا تھا
 اسے سن کر اسے کیسا لگا ہو گا یہ خرم بہ خوبی سمجھ گیا تھا بھی ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

اس کا اس طرح جب ہونا فرقان حسن اور مسز فرقان نے محسوس بھی نہیں کیا وہ دونوں اپنی گفتگو میں اتنے
 مصروف تھے کہ بلال اختر کے کمرے میں واپس آجانے پر انہیں لگا تھا کہ جیسے ان کی بات درمیان میں ہی ادھوری
 رہ گئی ہو۔

زوبیہ انہیں دیکھ کر واپس کیمپوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی یہ اور بات تھی کہ اس کا دھیان اب بالکل بھی

زوبیہ انہیں دیکھ کر واپس کیمپوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی یہ اور بات تھی کہ اس کا دھیان اب بالکل بھی

زوبیہ انہیں دیکھ کر واپس کیمپوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی یہ اور بات تھی کہ اس کا دھیان اب بالکل بھی

زوبیہ انہیں دیکھ کر واپس کیمپوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی یہ اور بات تھی کہ اس کا دھیان اب بالکل بھی

زوبیہ انہیں دیکھ کر واپس کیمپوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی یہ اور بات تھی کہ اس کا دھیان اب بالکل بھی

سامنے لکھی عبارت پر نہیں تھا اس کی صرف نظریں اسکرین پر تھیں۔

اسی لیے اسے خرم کی طرف دیکھے بغیر بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ خرم بھی بھلے ہی اس کے والد کی طرف متوجہ ہو گیا تھا مگر اس کا دھیان ابھی بھی زوسیہ کی طرف ہی تھا اسی لیے وہ خاموشی سے فرقان حسن اور بلال اختر کی گفتگو سن رہا تھا۔

”مستر بلال مجھے گھما پھرا کر بات کرنے کی عادت نہیں مگر ہمیں بہت پسند آ گیا ہے اب آپ اس کی قیمت ایسی بتائیں کہ ہم فوراً ڈیل کر سکیں۔“ بلال اختر کے چہرے پر واضح طور پر سکون اترتا محسوس ہوا تھا انہوں نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے انکساری سے کہا۔

”میں نے تو قیمت ایسی ہی بتائی ہے کہ فوراً ڈیل ہو جائے۔“

”چلیں ٹھیک ہے میں آپ سے فون پر بات کر لوں گا کچھ تفصیلات بھی پوچھنی ہیں مجھے پر اپنی ٹیکس وغیرہ کے حوالے سے۔“ فرقان حسن نے بات سمجھتے ہوئے جانے کے لیے قدم بڑھانے تو خرم بے ساختہ بول اٹھا۔

”انگل ایک بات پوچھوں۔ آپ اپنا گھر کیوں بیچ رہے ہیں؟“ خرم کے پوچھنے پر ایک بار پھر زوسیہ کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں وہ بلال اختر کو بغور دیکھ رہا تھا زوسیہ بھی انہیں دیکھنے لگی اور تب اسے علم ہوا بلال اختر بھی اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔

پہلی بار ان کے چہرے پر زوسیہ نے ایک ملال دیکھا تھا وہ انہیں دیکھتی ہی چلی گئی خود اس کا آسٹو بڑھنے لگا تھا تب بھی وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے آئیں یا میں شامیں کرنے والے انداز میں بولے۔

”بس بیٹے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی اور۔۔۔ میں اپنا گھر کہاں بیچ رہا ہوں میں تو مکان بیچ رہا ہوں گھر تو گھر والوں سے ہوتا ہے اپنے گھر والوں کے ساتھ اگر انسان جنگل میں بھی مینٹا لگالے تو وہ بھی گھر بن جاتا ہے ورنہ بغیر کینوں کے عالی شان سے عالی شان گھر بھی محض درود یو آر ہیں۔“ بلال اختر نے ایک دم بات کو فلسفیانہ رنگ دے دیا۔

فرقان حسن کو ان کی بات بہت پسند آئی وہ انہیں سہاتے ہوئے ان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے مگر خرم نے ان کا بات گول کر جانا بڑی شدت سے محسوس کیا تھا کیونکہ زوسیہ کی طرف دیکھے بغیر اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ بھی بلال اختر کو ہی دیکھ رہی تھی یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں فرقان کے سوال کا۔

اور جو جواب بلال اختر نے دیا تھا زوسیہ اس پر ہلکے سے سہلا کر رہ گئی تھی۔

خرم سب کچھ محسوس کرنے کے باوجود بغیر کچھ کے چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔



رومیہ گھر سے نکلنے لگی تو صبح ہی صبح ابرار بھائی نے اسے یاد دلایا۔

”اب تمہاری شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں کیا ضرورت ہے یونیورسٹی جانے کی۔“

رومیہ کو خود بھی احساس تھا کہ اس کا اب یونیورسٹی جانا بے کار ہے اس لیے بھائی تو اب چھٹنے ہی والی تھی۔ لیکن وہ بڑھنے کے ارادے سے جا بھی نہیں رہی تھی وہ تو بس تھوڑی دیر کے لیے گھر سے نکلنا چاہتی تھی خاص طور پر اسے سنبل اور نمل سے ملنا تھا۔

نمل سے اس کی بات نہیں ہوئی تھی سنبل کے ذریعے اسے پتا چلا تھا۔ شام کے ساتھ ہوئے المیہ کے متعلق اسے یقین تھا نمل نے اس موضوع پر عظمت نمل سے ضرورت کی ہوگی عظمت خلیل کے مزاج کو وہ بھی بچپن سے جانتی تھی اسے پتا تھا نمل عظمت خلیل سے بات کر کے اپ سیٹ ہو گئی ہوگی۔ اسی لیے وہ نمل سے روبرو ملنا چاہ رہی تھی۔

مگر ابرار بھائی کے ایک جملے نے جیسے اسے اک کوفت میں مبتلا کر دیا تھا جسے گاڑی میں بیٹھتے ہی سنبل نے محسوس کر کے پوچھ بھی لیا۔

”اب تمہارا کیوں موڈ خراب ہے۔“ سنبل کے لب پر زوسیہ نے کہنے پر رومیہ گردن گھما کر ڈرائیونگ سیٹ پر پیشی نمل کو دیکھنے لگی۔

وہ اس کے اندازے سے زیادہ سنجیدہ لگ رہی تھی رومیہ خود کو ”کیا ہوا؟“ کہنے سے بمشکل روک پائی بلکہ گہرا سانس کھینچتے ہوئے نارمل انداز میں کہنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”میرا کوئی موڈ خراب نہیں ہے بس گھر سے نکل رہی تھی کہ ابرار بھائی نے یاد دلایا اب کیا ضرورت ہے پڑھنے کی۔ تو وہی سوچ رہی تھی کیوں جا رہی ہوں یونیورسٹی۔“

مجھے تو اب شاپنگ کے لیے جانا ہے وہ مسٹر کلفام کے گھر میں تو کوئی ہے نہیں جو میری کی تیاری کرے۔ میرے گھر میں کوئی ہے سندر جو ان سب باتوں پر غور کرے۔ مجھے خود ہی نکلنا پڑے گا اپنے شادی اور ولہیے کے جوڑے کے لیے۔

اور پھر شادی ہو کر انٹی اور جاؤں گی وہاں کے لحاظ سے بھی کچھ تیاریاں کر لوں وہاں جاتے ہی گرم کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔“ رومیہ کی بات پر سنبل تو اچھی خاصی ایکساٹنڈ ہو گئی مگر نمل کی خاموشی نہ ٹولی۔

آخر جب گاڑی یونیورسٹی کے پارکنگ ایریا میں رکی تو رومیہ اترنے کی بجائے نمل کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”آج یونیورسٹی آف ہونے کے بعد ہم تینوں ٹائٹل سے ملنے چلیں گے اس کے گھر۔“ نمل اس کی بات پر کچھ نہیں بولی اس نے رومیہ کی طرف دیکھا بھی نہیں بلکہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے ایسے ہی ساکت بیٹھی رہی۔

سنبل بھی سارے راستے خواہ مخواہ کی غیر ضروری شوخی دکھاتی رہی تھی کہ شاید نمل کا موڈ ٹھیک ہو جائے کچھ نہیں تو کم از کم وہ رومیہ کی شادی کی تیاریوں پر بھروسہ کرے۔ مگر ساری کوشش ناکام دیکھ کر اب وہ بھی چپ چاپ نمل کی شکل دیکھنے لگی۔

”چلو اترو اب گاڑی سے۔“ رومیہ نے اسٹیئرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا اور خود اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔

سنبل نے بھی اس کی تقلید کی مگر نمل اپنی جگہ ہی جمی رہی۔

وہ گھر پر ٹھہرنا نہیں چاہ رہی تھی اس لیے یونیورسٹی آگئی تھی لیکن اس کا دل کوئی بھی ڈیریڈ اینڈ کرنے پر آمادہ

ادارہ خواتین و انجمن کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جمیں	قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لنٹی جدون	قیمت: 250 روپے

شمارہ 32216361

سائلگرہ خیرا

www.paksociety.com



نہیں تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کسی سے بات کرے نہ کوئی اس سے بات کرے وہ اس وقت مکمل تنہائی چاہ رہی تھی اسی لیے تو وہ گھر پر نہیں رکھی تھی کہ رشیدہ اسے کمرے میں بیٹھا دیکھ کر اس کی اداسی دور کرنے کی کوشش کرنے لگیں گی اس کا دل بھلانے کے لیے وہ ادھر ادھر کی باتیں کریں گی جبکہ اس وقت اس کا ذہنی توازن اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اسے ڈر تھا وہ کہیں رشیدہ کو کچھ نہ کہہ دے ایک طرح سے وہ ان سے فرار ہو کر ہی یونیورسٹی آئی تھی۔ مگر سارے راتے سنبل اور رویلہ بھی وہی حرکتیں کرتی رہیں جس کا اسے رشیدہ کی طرف سے خطرہ تھا اسے پتا تھا وہ اگر ان دونوں سے بھی کہے گی کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو تو وہ بھی کبھی راضی نہیں ہوں گی۔ اسی لیے اب وہ گاڑی میں بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ ڈیپارٹمنٹ میں جانے کی بجائے کہیں اور چلی جائے مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہاں جائے۔

اور پھر وہ جہاں نہیں جائے گی سنبل اور رویلہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔
 ”وہ نمل چلو اندر۔“ رویلہ نے اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے محبت سے کہا تو نمل خالی خالی نظروں سے اے دیکھتے رہنے کے بعد گہرا سانس کھینچتے ہوئے گاڑی سے باہر آئی۔
 ڈیپارٹمنٹ سے انہوں نے اپنی گاڑی کافی دور کھڑی کی تھی اور نمل اکثر گاڑی پیس کھڑی کرتی تھی۔ نمل سوچوں میں گم سر جھکائے بڑی ست روی سے چل رہی تھی رویلہ اور سنبل بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اسی کی رفتار اپنائے ہوئے تھے اور اسے بولنے پر اکسانے کے لیے زبردستی سوال کر رہی تھیں۔
 ”یار کیا خیال ہے ہم دونوں رویلہ کی شاوی میں پارلر سے تیار نہ ہو جائیں ہم کبھی پارلر میں تیار نہیں ہوتے۔“ سنبل نے بڑے جوشیلے انداز میں پوچھا مگر نمل نے کوئی جواب نہ دیا البتہ رویلہ نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا۔

”لو میری تو فکر ہے نہیں کہ میں کہاں سے تیار ہوں گی اور اپنی۔“ رویلہ کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ رویلہ اور نمل جو بالکل برابر برابر میں چل رہی تھیں پیچھے سے بڑے والے زور وار دھکے پر اپنی اپنی جگہ سے لڑکھڑا گئیں۔

کوئی شخص ان دونوں کے درمیان سے انہیں چیرتا ہوا اس بد تمیزی سے نکلا تھا کہ اس کے ہاتھ میں موجود پیسی کی بول پوری کی پوری نمل کے اوپر الٹ گئی تھی۔
 ”اوہ سواری میں میں نے دیکھا تمہیں تھا۔“ وہ تینوں ابھی اس افتاد پر سنبھلی بھی نہیں تھیں کہ اس نے بڑے چھپوڑے انداز میں مسکراتے ہوئے نا صرف معذرت کی بلکہ جیب سے دو مال نکال کر نمل کے کپڑوں پر گری پیسی کو صاف کرنے کے لیے بڑی ڈھٹائی سے آگے بڑھا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ نمل کو چھوٹا نمل کا ہاتھ پوری قوت سے اس کے منہ پر ٹھکانا چھوڑ گیا تھا۔
 ”تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔“ وہ نہ جانے کون تھا ان تینوں نے تو اسے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا مگر شکل اور چلیے سے وہ بالکل لو فر لگ رہا تھا۔

نمل کا زور دار تھپڑ کھا کر اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا وہ بڑے جارحانہ انداز میں نمل کی طرف بڑھا تھا کہ سنبل اور رویلہ خوف سے تھرا گئی تھیں۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ملاحظہ فرمائیں)



شعیب بظاہر نیوز پیپر میں کم ضرور تھا لیکن حقیقتاً وہ کانڈ کے اس پرزے کی لوٹ میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی رہتا تو بڑی گہری اور برسوج نظروں سے دیکھ رہا تھا جو کچھ درپہلے تک حسب معمول بلیک سیولیس ناٹھی بننے کاٹن اسٹیج کی مدد سے اسکن کی کلیننگ کر رہی تھی لیکن اب اس کی تمام تر توجہ جدید ماڈل کے ننھے سے موائل فون کی طرف تھی جس پر وہ پچھلے دو تین منٹ سے محو گفتگو تھی۔

”ارے نہیں ڈیئر ڈریسنگ ٹیبل تو میرا ہمیشہ کی طرح سربراہی رہے گا اس لیے کلر تک نہیں ہٹاؤں گی۔“

فون نکلنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بڑی مہارت سے کلیننگ میں بھی مصروف تھے۔

”ہاں یہ تو ہے روز تو ہر کلر میں روز ہی رہتا ہے نا۔“

دوسری طرف سے کی گئی تعریف پر وہ مزید اترا تھی۔

”تکلیل کی بات تو تم رہنے دو وہ تو باتیں بنانا جانتا ہے اور بس۔“

وہ نے تہقیر لگا کر بات کرنے کے بعد چند الوداعی کلمات کے اور فون ہینڈ کی طرف اچھل دیا۔ دیکھے بغیر کہ تکلیل کے نام پر شعیب کی رکیں تن سی گئی تھیں سو ہزار کوشش کے باوجود آخر بول اٹھا۔

”وہ کیا پھر کہیں انوائٹڈ ہو؟“

لبھے کو حتی المقدور نرم رکھتے ہوئے اس نے تمہید باندھی تھی۔

”ہاں ہینڈ کی ہاتھ ڈے پارٹی ہے کل تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔“

کلیننگ کرنے کے بعد اس نے کاٹن اسٹیج قریب رکھے ڈسٹ بن میں ڈالا اور آنکھیں بند کر کے چہرے پر روزواٹر کا ہلکے ہلکے اسپرے کرنے لگی۔

”یوں تو وہ کہ مجھے اس قسم کی پارٹیز بالکل پسند نہیں ہیں۔“

لبھے کی سختی اس نے محض جینوں تک منتقل کی تھی کہ زبان تک لے جانے کی صورت میں یقیناً اسن خطرے میں پڑ جاتا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح

بات چیت ہمارے شروع ہو کر راک بھیری پر ختم ہو۔

”تم کیا پسند کرتے ہو اور کیا نہیں۔ یہ سب تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ ویسے بھی مجھے تو اس سب میں کوئی برائی محسوس نہیں ہوتی۔“ استہزائیہ انداز میں جواب ملا تھا۔

”ہونہہ برائی تو تب نظر آئے گی جب برائی کو برائی سمجھو گی۔“

”کم آن شیبی۔ اب تم وینا گروپ آف کینیز کے مالک ہو کھرج ڈالو اپنے دلخ سے اس چھ مرلے کے گھر کی ٹیل کلاس سوچ کو۔ اور خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو ورنہ بلیوی تم بہت پیچھے رہ جاؤ گے۔“

شعیب کی کسی گئی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کر ریڈیو کا ہلکا سا اسپرے کیا۔ مسکراتے لیوں اور بولتی آنکھوں سے اس کے ہاتھ سے نیوز پیپر لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور لائٹ آف کر کے اس کے قریب چلی آئی۔

”واصف صاحب عیسیٰ برانچ میں کام کلاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ زوار چونکہ اس پوسٹ پر کام کرنے کی بہترین قابلیت اور مہارت رکھتا ہے تو کیوں نا اسے پروموشن دے کر سنی برانچ میں ٹرانسفر کر دیا جائے اور ہینڈ آفس کے لیے کوئی نئی پوزیشن کر لیں۔“

شعیب نے درگاہ شیفتوں کے تبدیل شدہ ماحول ٹیبل پر مذاق کر کے فائل واصل صاحب کو تھماتے ہوئے ان سے مشورہ طلب انداز میں ڈسکس کیا تھا۔

”بالکل درست، میرا بھی یہی خیال تھا کیونکہ مہارت اور تجربہ کے علاوہ وہ نا صرف ورکرز سے ڈیل کرنے میں ماہر ہے بلکہ انتہائی ایماندار اور اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا ہے۔“

واصف صاحب نے حسب توقع اس کی تائید کی تھی۔

گو کہ خود شعیب نے برنس ہی پڑھ رکھا تھا لیکن تصویر اور پریکٹیکل میں ہر حال فرق ہوتا ہے اس لیے بے شک فیصلہ وہ اپنی عقل کے مطابق ہی کرتا تھا لیکن چند سینٹوز سے مشورہ ضرور لے لیتا تھا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے آپ ایسا کریں آج ہی چند ویل نوٹ ہینڈ میں ایڈوےس دےں تاکہ جتنی جلدی ہو سکے یہ ڈسکس فیمل کر دی جائے۔“

گفتگو سمیتے ہوئے شعیب نے کہا تو واصف صاحب بھی گردن ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ کر اٹھ گئے۔

شمن ہر ہنڈی کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد آخر کار انہیں کلیر کر کے لڑکھن سے نکلی تو اماں کے گرد پرواٹل کی طرح چکر کاٹنے لگی بہانے بہانے سے ان سے بات کرنے کی کوشش کرتی لیکن وہ ”ہوں“ اور ”ہاں“ کے علاوہ کسی خاطر خواہ جواب کے لیے تیار نہ ہوتی۔

رائیہ اور شمن اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر کوئی ویب سائٹ وزٹ کر رہے تھے تھوڑی دیر تو وہ یوں ہی بلا مقصد اوجھ اور چلتی پھرتی رہی لیکن پھر بے چین ہو کر ان کے پاس ہی آئی تھی۔

”اماں پلیز اٹھ کر بیٹھے نا ابابھی آتے ہی ہوں گے۔“

شمن نے ماں کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا جو کتنی ہی دیر سے دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹی ہوئی تھیں اور اس کے بلانے پر بھی ان کی سابقہ کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”اماں! میری بیاری ماں اٹھ جائیں نا ورنہ آپ کو افسردہ دیکھ کر ابابھارنا راض ہوں گے۔“ اب کی بیاری اس نے پیار سے انہیں ہلکا سا جھنجھوڑاؤ کہنیوں پر زور ڈالتے ہوئے واقعی اٹھ کھین تو شمن نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کیونکہ ان کی خاموشی شمن کو دہلائے جاری تھی اور پھر یہ بھی سچ تھا کہ گھر کے اس قدر افسردہ ماحول

میں وہ خود اپنے آپ کو شمس اور بے بس محسوس کر رہی تھی لیکن آفسی کہ تہمت کرنی ہی تھی۔

”کیا کروں میں تم سب کے ہوتے ہوئے بھی یہ گھر مجھے کاٹنے کو دے رہا ہے ہر چیز اور ہر جگہ میں اسی کی صورت نظر آ رہی ہے۔“

آنکھوں میں اٹھوڑے کھاتی نمی کو انہوں نے روکنے کا تردد نہیں کیا تھا۔ جسمی جذبات کی شدت کے باعث ہی آنسوؤں کی شکل اختیار کر گئی۔

”اماں آپ تو ہمیشہ اوپر والے کی رضا میں راضی ہوتی ہیں نا تو پھر پھر اب کیوں نہیں؟“

برآمدے کے ستون سے لٹیٹی خسی پلانٹ کی تقلید میں اس نے ماں کے گرد بازو حمال کیے تھے۔

”اور پھر یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا تھا اگر آپ یوں بریشان رہیں گی تو کیا سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔“

شمن نے انہیں روکنے سے نہیں روکا تھا جانتی تھی کہ دیوار کی طرف رخ کر کے لیٹنے کا بنیادی مقصد سب سے چھپ کر آنسو بہانا ہی ہے ویسے بھی وہ چاہتی تھی کہ ابائے آنے تک مطلع صاف ہو جائے۔

”آپ سوچیں ہم سب تو ایک دوسرے سے کہہ سن کر اپنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں اور اباب۔ جو آج تک نہ تو ہمارے سامنے کبھی روئے اور نہ ہی ہم سے ایک لفظ ہی کہا کہ کسی طور دل ہلکا ہو جائے غور کریں اماں کہ اباب تو بس اندر ہی اندر چپ چاپ اپنی ذات میں کہیں تم ہوتے جا رہے ہیں۔“

شمن کی بات بر اماں نے ایک دم سرائھایا۔ نفس میں جلتی ان گنت چنگاریوں میں ایک ایک اضافہ ہونے لگا تھا۔

”یہی ہے میں جب آپ بھی ان کے سامنے بات بے بات رونا شروع کر دیتی ہیں تو اپنا کرب اور دکھ ظاہر نہ کرنے کی کوشش میں یقیناً ان کے اعصاب شل ہو جاتے ہیں اور آخر وہ غصہ کرنے لگتے ہیں۔“ شمن گھر میں سب سے بڑی تھی اور سمجھدار بھی اسی لیے وقتاً فوقتاً موقع دیکھ کر ماں کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔

”میں بہت کوشش کرتی ہوں۔ مگر کیا کروں دل ہے کہ سنبھلا ہی نہیں۔“
ابھی وہ مزید کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ باہر سے ایسا کی گاڑی کی آواز آنے لگی۔

”بس امان جلدی سے ہاتھ روم جا کر منہ دھولیں تاکہ ابو کو آپ کے رونے کا پتہ نہ چلے۔“
خمن نے جلدی سے آڑے ٹیڑھے سلیریز سیدھے کر کے انیس ہاتھ روم بھیجا اور خود ہارن کے جواب میں تیز قدموں سے گیٹ کھولنے چل دی۔



”ہاں بھئی شعیب آفس تو ٹھیک جا رہا ہے نا؟“
اس رات اتفاق سے رضوی صاحب کھانے پر ان دونوں کے ساتھ موجود تھے۔
”جی بالکل اب تو سٹی براؤنج کی پروگریس بھی بہت بڑھ گئی ہے۔“

شعیب نے کھانے کے بعد تھوڑی سی ڈیزرٹ پاؤل میں ڈالتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا تھا۔

”ویڈن لوویسے بھی مل سیتے کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو تم میں بہت ہے اسی لیے تو ویٹا نے تمہارے ہاتھ میرے جیب سے ڈائریکٹ لاکرز تک پہنچا دیے ہیں۔“ رضوی صاحب نے بغیر کسی لٹی کے ڈائریکٹ چوٹ کی تھی یوں بھی وہ ہمیشہ شعیب کو اپنی بیٹی کی غلطی قرار دیتے ہوئے اس سے چڑے ہی رہتے تھے۔ اور طنزیہ گفتگو تو اب ان کا انداز مخاطب بنتی جا رہی تھی۔

شعیب نے چچہ منہ میں لے جاتے ہوئے ایک دم روکا خود ویٹا نے بھی جوس پیتے ہوئے گلاس لیوں سے دور کر کے کن اکھیوں سے شعیب کو دیکھا جس کے اندر اس وقت یقیناً ”جو اربھائے اہل رہے تھے۔“

”اور ہاں اسٹاف سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب نچلے طبقے کے لوگ ہیں جو انکی پکڑانے پر ہاتھ تو کیا پورا بازو کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوان سے قاضی پر ہاتھ لگائے۔“ شعیب کی طرف

تیز سی نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے بات ختم کی اور چیئر کھسکا کر اسٹڈی کی طرف چل دیئے۔
”وینا تم دیکھ رہی ہو نا یہ سب۔“ شعیب نے خشکی نظروں سے دیکھا۔

”میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ بیباویوں ہر وقت مجھے ذلیل کرتے رہیں۔“

”قصیبی برداشت تو ہمیں کرنا پڑے گا کیونکہ ہم بیبا کے گھر میں رہتے ہیں اور ان کے سامنے بولنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بہر حال تم پلیز اپنا موڈ ٹھیک کرو میں آج بیبا سے بات کروں گی۔“
”ہو نہ بات کروں گی۔“

شعیب نے جھنجھلا کر اسی کے الفاظ دہرائے اور اٹھ کر کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے چاروں طرف اڑتے بگولوں نما نظریات اور خیالات کی جنگ یقیناً اس کے اندر زور پکڑ چکی تھی۔



آج نیو یارک ٹائمز کے سلسلے میں انٹرویوز جاری تھے۔ پچھلے تین گھنٹے سے مختلف امیدواروں سے بات کرتے کرتے اب وہ اوبے لگا تھا کہ لڑکیاں اپنی قابلیت پر بھروسہ کرنے کے بجائے میک اپ کی دست لباس یعنی طرز کے ہیرا سائیکلز اور اوبے کا سہارا لے کر کوری حاصل کرنے پر زور لگا رہی تھیں۔ جیسا وہ اس مختصر دورانیے میں آگیا کر رہی تھیں۔ محسوس کرنے لگا اس کا خیال تھا کہ باقی انٹرویوز اب حل پر رگھے جائیں گی سوچ کر اس نے آخری امیدوار کو اندر بھیجنے کے لیے تیل دی۔

”سے آئی کم ان سر۔“ باوقار انداز میں سر روپیٹہ حملے دی کرنوں سا روپ لیے دروازہ کھول کر رسمی طور پر پوچھا گیا یہ جملہ شعیب کے اعصاب پر بجلی بن کر گرا تھا۔

”راضیہ تم۔“
حیرت کا ایک شدید جھٹکا سا تھا جو اس کے وجود کو بے طرح لیٹ میں لینے لگا تھا آج کتنے مہینوں بعد

دونوں کی ملاقات ہو رہی تھی حیرت اور خوشی کا احساس دونوں ہی کے چہروں سے نمایاں طور پر عیاں تھا۔
”شعیب تم۔ اور یہاں؟“ راضیہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید پھیلا دیا کہ یوں اچانک ہو جانے والی ملاقات کے بارے میں تو اس کے ذہن میں کبھی شائبہ تک نہ اترتا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ اس کے جانے کے بعد اسے اس سے ایک بار پھر ملنے کی خواہش راضیہ کی دعاؤں میں آیات کی طرح شامل تھی۔

”ہاں میں اور یہاں؟“ اسی ہی وقت پر نظر کرنا وہ عجیب زخم خورہ سی تھی بسا تھا۔

”یہ میرا ہی آفس ہے۔ لیکن تم۔ تمہیں گھر سے اجازت کسے ملی؟“

وہ کچھ گتے گتے کرک لیا تھا گزرے وقت کی حسین یادیں اس کے چہرے پر لحد بھر دھنک کھینچنے کے بعد پچھتائوں کے اندر پھرے میں مقاب ہونے لگی تھیں۔ اور پھر وہ کہتا بھی تو کیا۔ کہ یہ حق تھا تو اس نے اپنی رخصتے گنوا دیا تھا۔

”پہلے کی بات اور ہے شعیب بہت کچھ اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ تم گھر والے اور خود میں۔“

گہری سانس خارج کر کے اس نے شاید خود کو تار مل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں ہے نہ وہ دن جب دنیا بھر کی باتیں ہم سیلیوں کی طرح سر جوڑے کرتے رہتے تھے اور نہ وہ تعلق جس پر بھی مجھے مان ہوا کرتا تھا۔“

بات کرتے کرتے راضیہ کا گلہ رندہنے لگا تو شعیب نے فوراً ”پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا جسے شکریہ کہہ کر راضیہ نے لینے سے انکار کر دیا اور شکایتی نظروں سے یوں اسے دیکھنے لگی جیسے ان آنسوؤں کا ذمہ دار اسی کو ٹھہرا رہی ہو۔

”پانی پینے سے ان ظاہری آنسوؤں کی شدت میں تو یقینی طور پر کمی آجائے گی لیکن وہ آنسو جو ہر وقت دل کی بنیادیں کمزور کرتے رہتے ہیں ان کے آگے بند کون

باندھے گا۔“

”راضیہ میں۔“

”پلیز شعیب اپنے الفاظ کو زحمت نہ دو ایڈ آئی ایم سٹی سوری کہ تمہارا قیمتی وقت ان باتوں میں ضائع کیا جن کی تمہاری نزدیک اب کوئی قدر ہی نہیں ہے۔“
الفاظ چہاتے ہوئے راضیہ نے در زرد نظروں سے اسے دیکھا اور فائل سنبھالے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہاری پراہلوز اپنی جگہ۔ لیکن جس مقصد کے لیے تم آئی تھیں اسے یوں نظر انداز کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔“

اتنے دنوں بعد ملاقات ہونے پر وہ اتنی جلدی اور یوں ناراض ہی چلی جائے گی یہ خیال ہی شعیب کے لیے سوہان روح تھا۔

”نہیں نہیں دانش مندی تو وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے تم نے دکھائی۔“ مسکراتے ہوئے راضیہ نے بڑی گہری چوٹ کی تھی اس پر۔

”مجھے معاف کرو راضیہ! میں تم سمیت بہت سے لوگوں کا مجرم ہوں لیکن خدا کو اوبے کہ میں نے یہ قدم نیک نیتی سے بغیر لالچ کے اٹھایا تھا یہ الگ بات کہ درست منزل پانے کے لیے میں غلط بلکہ بہت غلط راستے کا انتخاب کر بیٹھا۔“

شعیب کے وجہ چہرے پر لہراتے ہاؤسی کے تاریک سائے کے پس منظر میں ٹوٹے لہجے میں ٹھکن سمونے بات کرنے والا یہ تو کوئی اور۔ شعیب تھا یہ وہ نہیں تھا جسے وہ بڑے پیار سے موڈ میں آکر ”جو کر“ کہا کرتی تھی جس کی ذرا سی پریشانی اس کے ہاتھ پاؤں پھلا رہتی اور جب وہ شرارت سے اس کے درازیاہوں کی چوٹی کھینچتا تو وہ مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے منہ پھلا رہتی لیکن شعیب سے ناراض ہونا ہمیشہ ہی اس کے لیے دنیا کا ٹھنسن ترین کلام ثابت ہوتا جیسی چند لمحوں بعد وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ایک بار پھر منس رہے ہوتے۔

کبھی اداس نہ ہونے والے شعیب کی سرمنی آنکھوں کے کنارے سے پھسلنا پانی دیکھ کر راضیہ کو

جسے ہفت افلاک و حیرے و حیرے اپنے اوپر سرکتے محسوس ہونے لگے۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

”تمہیں یہاں جاہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے تم اس پوسٹ کے لیے ڈیزرو کرتی ہو۔ اور یقین کرو راضیہ میں نا صرف اپنے لیے پر شرمندہ ہوں بلکہ ان سب باتوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ ایک بار پھر اپنی زندگی خود جینا چاہتا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے راضیہ کو منانا ہی پہلا قدم تھا۔

”جاہ تو کہیں بھی مل جائے گی شعیب ایک ور بند تو سوکھلا مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

راضیہ کے چہرے کے آثار چھاؤ نے اس کے کمزور لہجے کا ساتھ دینے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ ”تو ہمدردی کون کر رہا ہے؟ تمہاری کوالیفیکیشن ہماری ریکوائزمنٹ پر سو فیصد پوری اترتی ہے۔ صرف ہمدردی کی بنیاد پر تمہیں جاہ دے کر میں باقی سب کو بھلا کیا جوازوں گا۔“

شعیب اسے ہر صورت قائل کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ بات تو راضیہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس جیسی لڑکی کے لیے جاہ کرنا کس قدم آزمائشی عمل ہوتا ہے جب گھر سے نکلنے سے واپس جانے تک کتنی ہی نظریں چرتی ہوئی سخت ذہنی اذیت سے دوچار کرتی ہیں اور پھر یہاں جاہ کرنے کی صورت میں نا صرف اسے دلی سکون ملتا بلکہ ذہنی طور پر بھی وہ مطمئن رہتی کہ یہاں اتنا وقت اکٹھے گزارنے کے بعد ٹولے ہوئے تعلق کو دوبارہ جوڑنا بھی یقیناً آسان رہتا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی دل میں ہزار گلے شکوے ہونے کے باوجود اس نے کل سے آگے کی ہائی بھرتے ہوئے رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے اپنی درخواست اور رسمی جمع کروا دی۔

”شعیبی ڈیر تمہاری باتوں کا ہرگز برا مت مانا کرو تمہیں پتا ہے تاکہ ان کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ اور ویسے بھی تم سے شادی کیونکہ میں نے ان کی مرضی کے خلاف اور اپنی نام نہاد سوسائٹی کی روایات سے ہٹ کر کی ہے بس اسی لیے وہ تم سے ریزرو رہتے ہیں۔“

شعیب کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ میگزین برے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کا کوٹ کے گرہ بگ کرتے ہوئے سمجھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

”ریزرو رہنا اور بات سے دینا اور بے عزتی الگ فعل اور پھر گھر کے ملازموں کے سامنے وہ اس طرح کا بی ہو کرتے ہیں کہ میں خود کو بہت کمتر محسوس کرنے لگتا ہوں۔“

آج اسے آفس میں معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ ملاؤنچ میں رضوی صاحب سے ملد بھٹیر ہونے کے بعد اتفاقاً دینا بھی گھر پر ملی تو نالی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے فوراً اس سے شکایت کر دی۔

”کوئی کچھ بھی کے شعیب لیکن میں تمہیں شعیب کرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھا تو دینا بھی اس کے پاس بیٹھ گئی لیکن آج اس کے وجود سے اٹھنے والی armani کی دلقریب مہک اور زندگی اسے ہر پور لس بھی شعیب کو اس کڑوی حقیقت سے فرار میں مدد نہیں دے رہا تھا جس کا احساس رضوی صاحب اسے اکثر دلاتے رہتے تھے جیسی بات کلٹ کر بولا۔

”کوئی بات ہے تمہیں سے شادی کی ہے۔ خود کو بیچنا نہیں سے بلا کے آگے کہ سارا دن آفس میں سر کھپائی کرنے کے بعد گھر آکر بھی ان کے طعنے تشنے سنتا رہوں۔“

منظ کی ٹرین برداشت کی پٹری سے ہولے ہولے اترنے کو بے تاب تھی۔ خود دینا ان تمام معاملات پر بے حد پریشان رہا کرتی تھی لیکن سرحال شعیب کے سامنے اپنی کیفیت ظاہر کر کے اسے مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ جیسی بات بدلتے ہوئے اس کے بال بڑے

لاؤ سے بگاڑ کر بولی۔ ”کلام ڈاکن شعیب۔ ریپلیکس۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہونہر خاک ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کا غصہ کسی طور ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یوں بھی جب سے راضیہ سے اس کی ایک بار پھر ملاقات ہوئی تھی وہ ہر وقت پچھتاؤوں کے انگاروں پر جہاں رہتا یہ احساس کسی کرب کی صورت اب نا سوراخا جا رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کر چکا ہے۔

دینا نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو دل میں پیلا کے لیے غصہ بھرنے لگا۔ لیکن پھر چند ہی لمحوں بعد پیلا کی خلیات میں دماغ کے ویسے کے دماغ پر اس نے سر جھٹک دیا۔

”میں غمور تمہارے ساتھ بیٹھتی لیکن کل ایک بہت بڑا ایٹ نوکیر ہے۔ سبکی کے گھر اسی سلسلے میں میری آج سرینہ سے اپائنمنٹ ہے۔“

اور ڈروپ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے شہر کی شور و یوشین کا نام لیا تھا۔

”میں تمہیں کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس طرح کی پارٹیز پسند نہیں ہیں جن میں نام نہاد لہل لوگ دل میں انتہائی سطحی اور گھٹیا سوچ کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اینڈ فار گاڈ سیک تم بھی انہیں نظر انداز کیا کرو تو بہتر ہوگا۔“

ماتھے پر شکنوں کا جال بچھائے سرو لہجے میں گویا حکم دیا گیا تھا۔

”خوشیوں چھوڑ دو اب یہ ملل کلاس سوچ پتا ہے کس قدر شرمندگی ہوتی ہے مجھے جب سب تمہارا پوچھتے ہیں۔ میں تو ہلانے کر کے بھی تھک گئی ہوں۔ بہتر ہے تم بھی میرے ساتھ انجوائے کیا کرو۔“

”انجوائے؟“ سوالیہ لہجے میں وہ چیخا مگر پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے کے بعد نرم و دینز کارپٹ کا لمس محسوس کیا تو ذہن پر بھی خاطر خواہ اثر محسوس ہوا جیسی پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر لہجہ اپناتے ہوئے بولا۔

”جانتی ہوں تاکہ ہمارے درمیان ہونے والے روز روز کے جھگڑوں کی ایک وجہ تمہاری مکی پارٹیز اور فرینڈز ہیں۔ شادی سے پہلے خود کو مکمل طور پر بدلنے کا وعدہ کرنے کے باوجود آج تم کیا کر رہی ہو؟“

کبھی سوچا ہے یہ سب؟ ”خوشیوں وہ خود کو پیٹنج میں کروں لیکن کیوں؟“ ”میں نے اسے جارحیت کے رائل بلوٹراؤنڈر شرٹ کو بیڈ پر پھینک کر وہ نسبتاً مدھم لہجے میں بولی تھی۔ ”وہ نا کہاں ہے تمہاری محبت کی شدت وہ جنون اور پاگل پن جو صرف میرے لیے تھا؟ کیا ہم نے اس طرح کی زندگی کے خواب دیکھے تھے جس میں ہر وقت کی ذہنی اذیت ہو۔ اور بس۔ پچھتا تا ہوں اس وقت کے فیصلے پر۔“

شعیب بات کرتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اب صوفے سے ٹیک لگا چکا تھا۔ لیکن اس کی بات نے دینا کا دل یوں توڑا کہ اسے آواز تک محسوس نہ ہوئی۔

”میرے تمام جذبے ابھی بھی صرف تمہارے لیے ہیں شعیب لیکن تم روز بروز کیلیکس کا شکار ہو رہے ہو اور بس۔“ شعیب نے رخ مڑ کر شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”تم خود سوچو جب تمہیں اس سوسائٹی میں موو کرنا ہے تو پھر پینچ بھی تو تمہیں ہی کو ہونا پڑے گا۔ پلیزان باتوں سے اپنی اور میری لائف یوں مشکل نہ بناؤ۔“

شعیب کے ساتھ زندگی گزارنے کا جو خواب اس نے دیکھا تھا نہ چاہنے کے باوجود آہستہ آہستہ اس کی تعبیر کا ہیولہ بگڑتا جا رہا تھا۔

اپنی اپنی جگہ دونوں ہی ڈیپرس تھے اور ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔ زندگی کی گاڑی حیرت انگیز طور پر پہلے ہی گیسٹر میں آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگی تھی۔ دینا سوسائٹی میں ہر وقت دیو دنیا نوسی اور تنگ نظر شوہر کا انتخاب کرنے پر طنز یہ فقرے سنتی اور شعیب ضمیر کی عدالت میں کھڑا وقت کے دائرہ کو مقدمے میں حیرانی سے ملزم بنا پھول اور خوشبو کی طرح

ایک دو بجے کے ساتھ رہنے کی خواہش کے باوجود وہ بنا کو بھاگتی ٹرین کے مناظر کی طرح خود سے دور ہوتا دکھتا رہتا۔



اویسی کی چادر اوڑھے ہلکی ہلکی ٹھنڈ کا آغاز ہوتے ہی وقت کی پروا کیے بغیر شعیب کے دل کی پوٹلی سے بھولی بسری یادیں اور پچھڑے لوگ ایک ایک کر کے اپنا احساس دلانے کو آن موجود ہوتے اپنے کیے گئے غلط اقدام کی تلافی اب یقیناً "ناگزیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سب رشتے جو اس کے لیے کل کائنات تھے وقت کی دھند میں اپنا پیکر ضرور کھو بیٹھے تھے لیکن وہ سو دن کے نکلنے کا دعا گو تھا جس کی تیزی اور چمکیلی دھوپ میں یقیناً "سب کے گھرے گھرے وجود پہلے کی طرح اس کے سامنے ہوتے۔

ایک نئی کمپنی کے ساتھ کیے گئے کنٹریکٹ کے قواعد و ضوابط پڑھتے ہوئے شعیب کی آنکھیں لاشعوری طور پر راضیہ کے چہرے پر جا رہی تھیں۔ کام کی زیادتی کے باوجود براؤن روپے کے ہلے میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر بڑی تیزی سے اس کی انگلیاں مختلف حروف و الفاظ کی شکل دیتے ہوئے مانیٹر پر منتقل کر رہی تھیں۔ جنہیں بعد میں پرنٹ آؤٹ کی صورت میں اسی کے سامنے آتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ راضیہ کو دیر تک کمپیوٹر پر کام کرنا بھی بھی پسند نہیں رہا تھا لیکن اب وہ پچھلے دو دو گھنٹوں سے تمام سپلائز کارڈ کارڈ کمپیوٹر پر منتقل کر رہی تھی اور گوکہ اس کی خواہش پر راضیہ نے یہاں جا بھئی لیکن وہ جانتا تھا کہ ناراضی تاحال قائم ہے۔ اور ناخوش تو اس کے والدین بھی تھے لیکن راضیہ کو دکھ دینے کا مالل اپنی جگہ تھا۔ وہ راضیہ جسے شعیب کی موجودگی میں کبھی اور دوست ہانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی جو خود اپنی ذات سے بڑھ کر شعیب کے لیے فکر مند رہتا رہتا رہتا۔

ایف ایس سی تک اٹھا پڑھنے کے بعد فیلڈ اور

ادارے مختلف ہوتے اور وہیں یونیورسٹی میں شعیب اور دنیا کی پہلی ملاقات ہوئی جو یونیورسٹی کو الوداع کہنے تک محبت سے عشق تک جا پہنچی اور اتفاق سے ہی وہ واحد معاملہ تھا جس سے اس نے راضیہ کو بے خبر رکھا تھا اور پھر جب اس نے بتانا چاہا تو گھر والوں سمیت راضیہ بھی کچھ سننے پر تیار نہ ہوئی کہ وہ کسی اور ذریعے سے مکمل پریم کمانی پہلے ہی سن چکی تھی جسے شعیب نے چھپانے اور کسی اور کے منہ سے سارا معاملہ جاننے کے بعد روٹھنا لازمی ٹھہرا۔

"یہ نٹ کھٹ سی لڑکی جانے اب بھی ویسی ہی شرارتیں کرتی ہوگی کہ نہیں۔"

"بہتے بہتے شاید اب بھی اس کی آنکھوں میں پانی تیرے لگتا ہوگا۔ لیکن اتنے سارے دنوں میں میں نے تو اسے بہتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔"

اپنے آفس کی ہانگ گلاس وال سے وہ اکثر دیکھتا اور دل میں نہ جانے کیا سوچنے لگتا یہ دھیان کیے بغیر کہ اگر راضیہ کی توجہ اس کی طرف نہیں تو کیا دفتر کے کئی لوگ کن آنکھوں سے اس کی سرگرمیوں کو نوٹ کر رہے ہیں۔

یوں تو اس کے آفس کے عین سامنے صرف راضیہ ہی کی جگہ تھی اور باقی اسٹاف ذرا ہٹ کر بیٹھا مگر دیکھنے والے تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

دوسری طرف جس کی خاطر اس نے ساری دنیا سے منہ موڑا ماں باپ تک کا دل دکھانا ان سے دور ہو گیا وہی دنیا اب اسے شاید کسی ضرورت شان میں نظر آنے لگی تھی۔ جیسی اس وقت اس کے نزدیک سب سے اہم کام راضیہ کو سنا تھا جب تک اس کا وہٹ شعیب کے دل میں تیز پڑتا تھا اب کاراضی ہونا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ یونہی نہ جانے وہ کب تک سوچتا ہی رہتا کہ زندگی آمد نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ نیپل کے دوسری جانب بیٹھا راضیہ سے شاید پروڈکٹس کی مزید ڈیمانڈ کے متعلق خیالات کا تبادلہ کر رہا تھا۔

شریف اور عزت دار گھرانے سے تعلق رکھنے

والے زوار سے وہ پہلے بھی کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے منتہیل کے خواب اور اس کی محنت و کوشش کے ترقی کے مدارج یوں تیزی سے طے کرنے پر مبارک یاد بھی دی تھی لیکن آج راضیہ کے ساتھ یوں بیٹھا دیکھ کر وہ جس طرح چونکا تھا یہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ جیسی ان دنوں کے بارے میں وہ کن میں جنم لینے والے خیالات اس کی ماضی کی سوچ سے کہیں مختلف تھے۔



یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ اس کی کوشش بے کار ہے، شمن پھر بھی مختلف طریقوں سے اہل اور اپا کا دل بہلانے کی کوشش ضرور کرتی۔ سر دیوں نے گوکہ ابھی اس قدر زور نہیں پڑا تھا لیکن پھر بھی شعیب کی دعا پت کو برقرار رکھتے ہوئے اس واقعہ وہ خود ڈرائی فرم سے آئی تھی تاکہ ابا کو نہ لانے پڑیں اور وہ پھر شعیب کو یاد کر کے دل گرفتہ سے ہو جاتے۔ بیشک کی طرف اس نے دو تین ایریٹاٹ جار میں میوہ جات ڈال کر اہل ابا کے کمرے کی شایف پر ڈھانپ کر رکھے اور باقی احتیاط سے کچن میں رکھ آئی۔

روزانہ کھانے کے بعد سب اسی کمرے میں بیٹھ کر فی وی حالات حاضرہ اور مختلف موضوعات پر بات چیت کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرائی فرم سے بھی لطف اندوز ہوتے، شعیب کے بغیر آنے والی یہ پہلی سرویج کچھ زیادہ ہی بوجھل معلوم ہو رہی تھی، شمن اور شعیب میں بمشکل ایک سال کا ایک ہونے کی وجہ سے دونوں کی ایک دوسرے پر جملے پھینکنے کی عادت سے ماحول کا گرم ہونا بھی مس کر رہے تھے۔

"تمہی پتا تم کہاں تک شعیب کا خطا پر کرنے کی کوشش کر رہی۔ میری جان ہر بندے کی اپنی الگ جگہ ہوتی ہے جسے کوئی بھی دو سرا ہزار کوشش کے باوجود پڑ نہیں کر سکتا۔" شمن نے شعیب کی طرح اہل کے ہاتھ سے چلتوزے لے کر خود انہیں چھیل کر دیے تو وہ بولے بتانہ وہ تمہیں اور اہل کی بات سن کر چھائے

گئے سائے میں کبھی کے جذبات پر اوڑھے گئے لہا ہے۔ حجت سے ان کے شمن نے کن آنکھوں سے ابا کو دکھانا جو اہل کی بات سن کر شمن کے ساتھ اس کے اسکول کو ڈسٹکس کرنے کے لیے ایک دم خاموش ہو کر کئی برس پیچھے جا پہنچے تھے۔

سوچتا ہوں آج سے بیالیس سال پہلے محض پانچ روپے مزدوری لیتے لیتے اللہ کے فضل اور اپنی محنت و ایمان واری کے بل پر اتنی ترقی کی کہ آج اچھا خاصا منافع دینے والی تین دکانیں ہیں جن سے لوگ صرف میرے نام پر اعتبار کر کے بند آنکھوں سے خریداری کر جاتے ہیں۔" ابا نے میوڈنی وی کو سامنے رکھے رہ موٹ سے آف کیا اور بڑے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھی۔

"خود بالکل کورا ان پڑھ تھا جو پڑھا سیکھا سب زمانے کے حالات اور رویوں سے۔ لیکن پھر بھی تم چاروں کو اس قدر پڑھا لکھایا کہ کسی بھی معاملے میں لوگ تم کو مثال بنایا کرتے تھے۔" اہل کی آنکھ سے آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح اپنا تسلسل قائم رکھے ہوئے تھے جبکہ باقی سب سو گوار خاموشی کی وہیز چادر اوڑھے چپ بیٹھے تھے کہ شعیب کے جانے کے بعد آج پہلی مرتبہ ابا یوں ان سب کے سامنے اپنا دل کھول رہے تھے۔

"مجھے شکر تھا کہ میری اولاد بڑی مضبوط کردار اور لالچ و حرص سے پاک ہے، لیکن۔ شعیب ایک امیر لڑکی کو پانے کے لیے ہم سب سے منہ موڑ گیا، چلتوزوں کے ان چٹکوں کی طرح اس عمر میں بے وقعت کر گیا ہمیں۔ یہ جانے بغیر کہ بوڑھے ماں باپ کے دل پر کیا بیتی ہوگی بجائے اس کے کہ ضد کر کے اپنی بات منواتا میرے ناراض ہونے پر اس گھر کو ہی چھوڑ گیا اور میں۔" بات کرتے کرتے ان کا گارنڈھنے لگانا پناہن رکھنے کے لیے سر جھکا کر ہتھیلی پر سر ٹکا کر خاموشی سے چند آنسوؤں کو بہ جانے دیا کہ یقیناً "اب ان میں ضبط کا پارا نہ رہا تھا۔"



بہار

نزلہ زکام، گلے کی خراش اور کھانسی!

Take No Tension
Take Sudin

with TOOT SIYAH efficacy



Easy Tear
پینک میں

کر رہی تھی، شعیب نے اس کی تیاری کے نام
لوازمات اور کیے گئے سولہ سنگھار کو کسی خاطر میں نہ
لائے ہوئے قدرے درشت انداز میں پوچھا۔
”کہاں جا رہی ہو؟“

”مسلمان کے گھر ایک میوزیکل پروگرام ہے آج،
طبیعت ٹھیک ہے تو چلو، بڑی انجوائمنٹ رہے گی۔“
سفید بلاؤزی ہمد رنگ ٹوٹی کا اسٹریپ ٹائٹ کرنے کے
بعد وہ اس کے قریب چلی آئی تھی اور پیشانی چھو کر نکتہ
بخار کا اندازہ کرتے ہوئے بولی۔

”گولی مارو مجھے اور میری طبیعت کو۔ جب تمہیں
میری پروا ہی نہیں ہے تو پھر میرے ساتھ یہ ڈرامہ
بازی مت کیا کرو۔“ اس نے جھٹکے سے ویٹا کا ہاتھ
پرے کیا۔

”یہ پروا ہی ہے شعیب کی تمہارے اس بی بی پیور کے
باوجود ہم دونوں ابھی تک ایک ساتھ ہیں اور نہ آپ
کے اکسانے پر میں کب سے تم سے الگ ہو چکی ہوں،
لیکن میں کبھی بھی تم سے الگ ہونے کا سوچ ہی
نہیں سکتی۔“ ایک بار پھر وہ بڑی لگاؤ سے اس کا ہاتھ
تھامے ہوئی تھی۔

”شٹ اپ ویٹا، صرف تمہاری خاطر میں سے اپنی
محبتیں ٹھکرائیں، گھر والوں کو چھوڑنا اپنی لانا اور عزت
نفس سب بھول کر تمہیں اپنا اور تمہیں تم سب کچھ
جاننے کے باوجود صرف اپنی عیاشیوں میں مگن ہو۔“
”عیاشی؟“ ویٹا اس کے گے گئے الفاظ پر حیران
تھی۔ لیکن آخر کب تک چپ رہتی، گنڈا بولتی ہی
تھی۔

”تم میرا منہ بند ہی رہنے دو، کیونکہ میں
نہیں چاہتی کہ بات بڑھے اور یہ رہا سا طاہری ساتھ
بھی اپنے انجام کو پہنچے، تمہارے لیے نہ سسی، لیکن
میرے لیے تمہارا اسی طرح کا ساتھ بھی بہت سستی
رکتا ہے۔“

”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے یہ ڈانڈیلا گزرت
سٹایا کرو، آگیا ہوں میں تمہاری لائن ہوں اور تمہارے
ساتھ گزرنے والی اس زندگی سے۔“ شعیب کی لہانہ

شمن نے فوراً پانی کا گلاس اپا کی طرف بڑھایا اور
آہستگی سے ان کا کندھا سہلانے لگی کہ اب اسے ہی
سب کو حوصلہ دینا تھا، جانتی تھی کہ شعیب کے اس
اقدام پر سب بری طرح ٹوٹ گئے تھے۔ کبھی دل چاہتا
کہ اسے اس کے خوابوں کے محل سے کان پکڑ کر
لائے اور اہل اہل کے قدموں میں بٹھا کر معافی مانگنے کو
کہے، لیکن پھر سوچتی کہ یہ سب کام زبردستی نہیں دل
سے ہوں تو بھلے معلوم ہوتے ہیں اور اگر وہ اہل اہل
بھائی بہنوں کو بھلا کر خوش سے تو انہیں بھی اس کے
بغیر خوش رہنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

آج کل شعیب کو کچھ زیادہ ہی ڈپریشن رہنے لگا تھا
کہ آٹس میں ہر وقت راضیہ کے موجود ہونے سے
اسے بچھتاؤں کا پہلے سے زیادہ سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔
ایسے میں وہ لا شعوری طور پر اپنی موجودہ اور سابقہ زندگی
کا موازنہ کرنے لگا اور ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچتا کہ اس
نے بڑا گھائے کا سودا کیا ہے۔ اسی کشمکش میں آج وہ
جلدی گھر آگیا تھا، شام کی چائے ویٹا کے ساتھ بننے کے
بعد وہ آرام کرنے بیڈ روم اور ویٹا گھر ہی میں تشکیل
دے گئے ان کے روم کی طرف چل دی۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جب شعیب کی آنکھ
کھلی تو ویٹا کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی، ڈیپ
میون کلر کی ساڑھی میں جہاں اس کی چاندی سی
رنگت غضب ڈھا رہی تھی وہیں ہلکے میک اپ سے
چمکتے ہوئے اس کے بھرے بھرے رخسار آج کسی کو
بھی مد ہوش کر سکتے تھے۔ وائٹ گولڈ کانیگلس میون
ڈائمنڈ کے ساتھ اس کی صراحی دار گردن سے لپٹنے پر
مغزور تھا تو ڈائمنڈ وایج کلائی تھامنے پر نازاں۔ جہاں
ساڑھی سے بیچ کرتی میون لپ اسٹیک نے ہونٹوں
کے کنارے کو مزید نمایاں کر کے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا
وہیں Dior کی مسکور کن خوشبو بے جی اس کی
شخصیت کا حصہ بن کر اپنی اہمیت خانی تھی۔
اور اس وقت جب وہ وہاں کو چارجر سے الگ

کمرے کی حدیں عبور کرنے لگی تھی۔

”ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی، اگر آج تم اپنی مردانگی کے دربار میں مسند سجا کر بیٹھ ہی گئے ہو تو مجھے بھی انصاف چاہیے۔“ کناروں کے اندر بٹنے والا خاموش ورہا آج دونوں اطراف سے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ کاجل لگی آنکھیں شدت کرب سے سرخی مائل ہونے والی تھیں۔

”زندگی کے اس طرح گزرنے کے ذمہ دار تم خود ہو شہابی میں نہیں جس نے صرف تمہارا ساتھ چاہا تھا، دو کے بجائے آدمی روی کھا کر خوش رہنے کا وعدہ کیا تھا تم سے۔“ بیڈ سے اٹھ کر اب وہ قدم آؤم آئینے کی چٹب پشت کر کے کھڑی ہو گئی تھی۔

”کوئی بھی لڑکی شادی کے بعد شوہر سمیت میکے میں رہنا پسند نہیں کرتی، میرا بھی خواب تھا کہ شادی کے بعد پاپا کی دی گئی آسائشوں کے حصار سے نکل کر میرا اپنا گھر ہو جہاں سوسائٹی کی پسند ناپسند کے بجائے تمہاری مرضی کا لائف اسٹائل ترتیب دوں۔“ بے خبری میں گھٹی پگھلی پریا قوت آویزاں ہونے لگے تھے۔

”لیکن تم جب ماں، ابا کو منانے میں ناکام رہے تو بجائے اس کے کہ ان کی ناراضی کے باوجود مجھے اپنے گھر لے جاتے۔ Sorry to say کہ خوب پاپا کی طنز یہ باتیں سننے اور سوسائٹی کا مذاق بننے کے لیے رخصت ہو کر یہاں آگئے۔ کب تک ناراض رہتے ماں، ابا؟ میں اپنا آپ فٹا کر کے بھی انہیں منالیتی اور پھر یقیناً وہ تمہاری پسند یہ فخر کرتے۔ لیکن تم نے تو ان رشتوں کے سامنے اپنا کارجم بلند کر دیا، جن کے سامنے یہ تمام الفاظ ایسے ہی کھو جیتے ہیں۔“ وہ بولنے پر آئی تو ایک ہی سانس میں روانی سے بولتی چلی گئی۔ لمحہ بھر میں اس نے شعیب کو آئینہ دکھا دیا تھا اور آئینے کی دکھالی گئی تلخ تصویر کے باعث اب شعیب کی سماعتوں میں آندھیوں کا سانہ رکنے والا شور مچانا محسوس ہو رہا تھا۔

”اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جب سے میرے

دل نے تمہارے نام پر دھڑکننا شروع کیا تبھی سے میں نے یہ اس چیز کو الوداع کہہ دیا جو تمہیں پسند نہ تھی۔ کتاب بدل دیا ہے میں نے خود کو یہ ان سے پوچھو جو میرا اب مذاق اڑاتے ہیں۔ اور تمہیں تم پھر بھی میرے ساتھ سے اب اکتانے لگے ہو۔“ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اب اس کا سر بھاری ہو چلا تھا، لیکن آتش فشاں چونکہ پھٹ چکا تھا اس لیے لاوا تو بہنا ہی تھا اور شعیب کے پاس آج سامع بنے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

”تمہارے جذبوں کی سچائی سے تو صرف میں ہی واقف ہوں ناشہبی! لیکن دنیا والے تو وہ دھاری لکوار ہیں، کس کس کو یقین دلاؤں کہ تم نے صرف محبت کے لیے مجھ سے شادی کی ہے، دولت، تمہیانے کے لیے نہیں۔“ ہاتھوں میں منہ چھپا کر وہ بلکنے لگی تھی اور شعیب حیران تھا کہ بظاہر لاپرواہی سے بیٹا اپنے اندر کتنا کچھ چھپائے ہوئے تھی اور وہ جو آج تک سمجھتا رہا تھا کہ اس قدر ناز و نعم اور آسائشوں میں پلی بڑھی ہونے کے وجہ سے وہ نسبتاً ”چھوٹے گھر میں کس طرح گزارا کرے گی“ یہ سب تو غلط ثابت ہو گیا تھا اور اب اسے کیا کرنا تھا؟ دھند چھٹنے کے بعد کا منظر غمناک واضح تھا۔

وقت سرو نظروں سے اتر کر وہ بھٹا ہے پاؤں گزر رہا تھا۔ ان دنوں کمپنی کے اکاؤنٹس کے ٹکڑنگ، پرافٹ اینڈ لاس اسٹیٹ منٹس، بیلتس شیٹ، بینک سریز، ورکرز اور دیگر اسٹاف کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ کے علاوہ ہی ایسے معاملات تھے جن کی وجہ سے مسووقیت سرانجام دینے نہ رہتی۔ ان تمام کاموں کے باوجود راضیہ کا جدوجہد خیال رکھنے پر آفس ممبرز کا ٹھنکا لازمی تھا۔ سو آفس میں موجود رہنے کے کسی معتمد خاص نے راضیہ اور شعیب کے تعلقات کی رپورٹ مبالغہ آرائی سمیت اس کے کانوں تک پہنچائی تو خود سے زیادہ شعیب پر اعتماد کرنے والی وہ بٹا کا ٹھنکا فطری عمل تھا۔

لیکن اس کے باوجود شام کو شعیب کی واپسی پر اس کے کوٹ پر کوئی نسوانی ہیل تلاش کرنے کے بجائے عام دنوں کی طرح وہ نائے بڑی خوشدلی اور محبت سے اس کا استقبال کیا تھا کہ کسی بھی قسم کے ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ شعیب سے یہ معاملہ ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

شک ایک ایسا زہر ہے کہ اگر علم میں آتے ہی اس کا تریاق نہ کیا جائے تو پھیلنے پھیلنے زندگی کی مہام تر خوشیاں کو چاٹ جاتا ہے۔ اسی ایک فلسفے کے تحت آج وہ شعیب کے زیر انتظام دی گئی کمپنی کی اسٹاف لانی کے باہر مختصر راہ واری مجبور کر کے اس کے آفس کے باہر کھڑی تھی۔ دروازے کے ساتھ موجود راضیہ کی خالی نشست گاہ اس کی آفس میں موجودگی ثابت کر رہی تھی۔

”راز میٹ سیٹ خالی تھیں، یعنی تھخلیے میں بات نہ ہو رہی ہے۔“ شک کے ناگ نے سر اٹھانا چاہا، وہ یہ زہر اب آہستہ آہستہ اس کے مضبوط اعصاب کے باوجود گدو پدے میں سرایت کرنا محسوس ہونے لگا تھا۔

دروازہ معمولی سا کھلا ہوا تو ضرور تھا، لیکن اس نے ایک دم اندر داخل ہونے کے بجائے پہلے ذرا ہٹ کر کھڑے ہونے کے بعد کچھ سننے کی کوشش کی، تاکہ وہ اس کی کانوں سنی بات کو جھٹلا نہ سکے۔ اور اس صورت میں وہ شعیب کے منہ پر بے وفائی کے طمانچے زیادہ شدت سے مار سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ جس جگہ کھڑی تھی وہاں سے وہ ان دونوں کی صرف آواز ہی سن سکتی تھی، دیکھ نہیں سکتی تھی۔

”راضیہ خدارا مجھے معاف کرو، ایک غلطی کی اتنی کڑی سزا نہ دو مجھے اور مجھ پر۔ اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو اماں، ابا تو میری بات تک سننے کو تیار نہیں ہوں گے۔ میں اپنی گئی تمام گستاخوں، غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے لیے مجھے تمہارا

مرکز انڈیا

Email: id@khawateendigest.com

مارچ 2011



بلبل دیوتا کے بھانجری
ان کے بارے میں ہمیں سب کو جاننا چاہیے، وہ ایک نئی جہت کا ہونا ہے۔

سحر زاوی
سحر زاوی کی لکھی ہوئی کہانیوں میں ہمیں ایک نئی دنیا کا احساس ہے۔

کارواں
کارواں کی زندگی میں ہمیں سب سے زیادہ سیکھنا ہے۔

مشیت گنہ
مشیت گنہ کی کہانیوں میں ہمیں سب سے زیادہ سیکھنا ہے۔

بے مثال
بے مثال کی کہانیوں میں ہمیں سب سے زیادہ سیکھنا ہے۔

آنٹی ٹیبل
آنٹی ٹیبل کی کہانیوں میں ہمیں سب سے زیادہ سیکھنا ہے۔

آنٹی ٹیبل
آنٹی ٹیبل کی کہانیوں میں ہمیں سب سے زیادہ سیکھنا ہے۔

آنٹی ٹیبل
آنٹی ٹیبل کی کہانیوں میں ہمیں سب سے زیادہ سیکھنا ہے۔

ساتھ چاہیے، تمہارا اوٹ چاہیے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اماں کیا تمہارا کہاں ہی نہیں سکتے۔" کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی جسے شعیب نے ہی توڑا۔

"کیا تم چاہو گی کہ یہ صبح کا سورج میرے لیے خوشیوں کی لویہ لانے کے بجائے پچھتاؤں کی گرم اور تپتی شعاعیں لے کر آئے۔" شعیب کا حد درجہ سچی لہجہ دینا کے دل پر ہتھوڑے برسائے لگا تھا۔

"میری بات تو چھوڑو، یہ قدم اٹھانے سے پہلے تمہارے ذہن نے ایک بار یہ نہیں سوچا کہ وہ جنہیں تم یوں تمہا کر کے جا رہے ہو، کوئی اور نہیں تمہارے اپنے ماں باپ ہیں جنہوں نے تمہیں پرہانے لکھانے اور اس کاٹل بنانے میں کیا کیا پارٹ نہیں کیلے ہوں گے۔ میں تو دہلی جاتی ہوں ان کی بوڑھی آنکھوں میں انتظار دیکھ کر۔" کمرے سے اب سسکیں لینے کی آواز آرہی تھی۔

"بس راضیہ ایک دفعہ تم مجھے معاف کر دو تو تمہارے ساتھ جا کر میں سب کو مناؤں گا۔" دروازے کی اوٹ میں کھڑی دینا کے دلخ میں جھکڑ چلنے لگے تھے مزید برداشت کی سکت نہ رہی تو اس نے ایک دم ہی لاپرواہ اندر داخل ہونے کا سوچا، لیکن یہ کیا۔

"میں کیا شعیب، کوئی بھی تم سے ناراض نہیں رہ سکتا۔ البتہ رنج ضرور ہے سب کے دلوں میں۔" راضیہ اور شعیب آس میں رکھے صوفے پر اس طرح بیٹھے تھے کہ شعیب معافی مانگنے کے انداز میں ہاتھ باندھے ہوئے تھا۔ چند ثانیے بعد راضیہ نے شعیب کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر آسوں مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"ہم مہم۔ تو لگتا ہے پاؤ جی ہمارے صبح کے بھولے کو شام کے وقت گھر یاد آئی گیا۔" "ارے گھر کیا مجھے تو چھٹی کا دوہہ یاد آیا۔" وہ ہنسا تھا۔

دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر دینا نے شعیب اور راضیہ کو کھلکھلاتے دیکھا اور ہنسنے ہوئے راضیہ کا

دوہہ سہرنے پر اس کا چہرہ دیکھ کر زبان رہ گئی۔

"اوائے نم۔ اگر جو رہتے ہوئے دلوں کا جذباتی مکالمہ ختم ہو گیا ہو تو کیا میں بھی اپنا مقدمہ پیش کروں۔" دینا نے خوشدلی سے دلوں کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ اس کی ہانک اند پر حیران رہ گئے۔

"تم؟" دلوں کے حزن سے بیک وقت آواز آئی۔

"جی ہاں میں گور تھہن سکس، ار کہ تم نے شعیب کو معاف کر دیا اور اب ہم دو وقتوں کو اماں سے معافی دلو اور تمہیں جیہننا۔" ہن ہونے کا حق ادا کرتا ہے۔" لہ بھر یہ کہ اس نے شعیب کی آنکھوں میں خوشی سے جگنو چمکتے دیکھے اور راضیہ کا ہاتھ تمام لیا۔

"ویسے میں تمہیں نم کہوں یا راضیہ؟" دینا کے لہجے میں شوخی تھی سو راضیہ بھی ریلیکس ہو کر مزید ہانکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔

"راضیہ نم میں سے راضیہ ہاں سب کے لیے اور نم صرف اماں، اماں کے لیے۔ لیکن بھابھی بھی تو ماں کا ہی درجہ رکھتی ہے نا، اس لیے آپ کے لیے دلوں آہستہ کھلے ہیں۔" جو اب راضیہ چمکی تو شعیب کیلے پیچھے رہتا۔

"ارے واہ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہونے ہیں ابھی اس رشتے کو اور اماں، اماں کے برابر لاؤ اور ایک میں ہوں بے چارہ۔" شعیب نے چہرے پر مسکینی طاری کرتے ہوئے معنوی بے چارگی سے کہا تو دلوں ہنسنے ہوئے ایک دم چمکے لگے۔

☆ ☆ ☆

ٹڈر ٹڈر خنوں پر بہار آنے کو تھی، چاروں سمت ننھے ننھے شگوفے پھول کھلیا ہئے کو بے تاب تھے تو ہوا کی تازگی ان کی خوشبو اپنے اندر بسانے کو بے تاب۔

ایسے میں صبح معنوں میں بہانے کا مفہوم راضیہ سے پوچھ کر کون سمجھ سکتا تھا۔ جس نے اخبار میں اشتہار

دیکھ کر باقاعدہ حکمت عملی طے کرنے کے بعد شعیب کے آفس میں جا کر کہا، "ناکہ وہ اماں، اماں کی آنکھوں کی خوشیاں لوٹا سکتے۔"

اور آج بھی بڑے مزے سے اماں، اماں کے کمرے میں بیٹھے ماضی کی رنج یادوں کو فراموش کر کے حال میں نم ہنسنے مار رہے تھے۔ سب کے بچپن بچ بچھی دینا لقیے لگائی ہرگز اجنبی معلوم نہیں ہو رہی تھی کہ اماں، اماں نے وسیع قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے یہ مقام دیا تھا جس کی اس کے دل نے خواہش کی تھی اور اس سارے ماحول میں راضیہ کو سراہا جا رہا تھا جس کی وجہ سے یہ حسین ملاپ ممکن ہو گیا۔

"راضیہ آئی ڈائننگ کر کے دیکھیں شعیب بھائی کا کیا حال ہو گیا ہے اس کمرے ہو کر اگر میں کھانس بھی دلوں تو گر جائیں گے۔" شعیب کسی کی کل ریسپو کرنے کے لیے اب دینا کے کمرے میں داخل ہوا تو نم نے اس کی صحت پر چوٹ کی جس پر شعیب کے بجائے راضیہ نے جواب دیا۔

"تمہارے منہ سے کھانسی کے نام پر جو ڈرون حملے ہوتے ہیں ان سے تو خود تمہاری ساری منڈلیں مل جاتی ہیں تو پھر اتنے اسارت لوگ تو ویسے بھی آہم ذرا نازک ہوتے ہیں، کیوں دینا؟" راضیہ نے تائید کے لیے دینا کی طرف دیکھا، جس نے بھرپور انداز میں گرون ہلا کر اس کی بات پر درست کی سرشبت کی جبکہ شعیب نے اس کا کیس لڑنے پر راضیہ کو سیلٹ مارا۔ "ہائیر۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں آپنی، پہلے تو آپ شعیب بھائی پر بڑے جملے مارتی تھیں اور اب ان کے حق میں بیان دے رہی ہیں، کہیں یہ سیاست تو نہیں چل رہی۔"

"اوائے فروری کے مہینے میرا دلخ بھی فروری جتنا ہی ہے۔ لیکن آج کے بعد راضیہ کو کچھ نہیں کہنا، سمجھئے؟" شعیب نے مسکراتے ہوئے نم کو تنبیہ کی تھی۔

"کچھ نہ کہو۔ لیکن کیوں؟ کیا یہ امر کی شہری ہن گئی ہیں؟"

"مہارے لیے تو امر کی شہری کیا چیز ہے لٹل برادر۔ لیکن ہاں، کچھ ہی دنوں کی بات ہے پھر راضیہ کی پیا دلیں نڈا گئی ضرور ہے۔" شعیب کی بات پر راضیہ سمیٹ سب کے منہ کھلے کھلے رہ گئے تھے۔ دینا کو جو غم سب معلوم تھا اس لیے شعیب کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر بھی فطرتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"اماں کل نڈار اور اس کے والدین راضیہ کے رشتے کے لیے آرہے ہیں۔" شعیب اماں، اماں کے پاس بیٹھ کر انہیں نڈار اس کے گھر والوں کے متعلق بتانے لگا تو راضیہ اٹھ کر بچن میں آئی کہ لہجہ بھر میں چہرے پر کھنکھرتی قرح سے وہ خود گھبرا رہی تھی۔

گھر کی ویلیز پر پاؤں پھیرنے بھی پوری نے بہار کے لیے جگہ خالی کر دی تھی، اب گھر اور گھر کے کینوں پر پوری طرح ہمار چھا رہی تھی۔

بچن کی کھڑکی سے ہوا کا تازہ جھونکا اندر آیا تو راضیہ نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے اپنی اور سب گھر والوں کی دائمی خوشیوں کی دعا کی اور دل میں نئی ترنگ لیے لگنکٹانے لگی۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے فائرہ افکار کے خوبصورت ناول

آہنوں کا شہ	قیمت - 500/- روپے
بھول بھالی نئی کہانیاں	قیمت - 500/- روپے
یہ کیا سال یہ پورے	قیمت - 300/- روپے
بھلاؤں سے ایک ہزار	قیمت - 250/- روپے

ناول چھپانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

72735021



تانو کے گھر آنے کا اتفاق مجھے اتفاقاً ہی ہوا اور وہ بھی بوجہ مجبوری اور نہ مجھے کوئی شوق نہ تھا ان سکاں جا کر رہنے کا نہیں یہ مت سمجھے گا کہ میں سرسبز لڑج ایک پور ساڑ کا ہوں۔ بلکہ میں تو زندہ دل (آہم) لڑج دیر محبوب صورت سا ایک ایسا نوجوان ہوں جسے وہ اکثر لڑکیاں منہ میں انگلیاں دیا لیتی ہیں (بھئی بی خوب صورتی کی وجہ سے)

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اتفاقاً ہی تانو کے گھر میں طویل قیام کے لیے جانا پڑا تھا وجہ؟ یقیناً اپ وجہ جانا چاہیں گے تو وجہ ہے میرے بڑے بڑے بھائی بھائی میرے بھائی بھائی سے سارا قصہ سنا ہوں۔

میرے بھائی جہا نکیر جو کافی عرصے سے امریکہ میں سہیل ہیں۔ انہیں اچانک ہی ایک ایسی ضرورت ان پڑی ہے کہ ملا، پاپا کو لیکر جہاں میں جانا پڑا ہے۔ جہا نکیر بھائی جو کہ مجھ سے آٹھ سال بڑے ہیں۔ لے باہر بائیر ایجوکیشن کے لیے گئے اور پھر وہیں گئے ہوئے

درمیان میں چار سال پہلے انہوں نے جب ایک کچا چکر لگایا تو پاپا نے ان کی شادی کروادی۔ جس کا وہ اپنی زوجہ محترمہ فوزیہ بھائی کے ہمراہ واپس چلے اور یوں ہم تینوں کے دل میں اداسی سے ڈیرے ال دیے۔ خیر اب اللہ اللہ کر کے اللہ سے امیدیں اتنے سالوں بعد اولاد کی نعمت سے نوازا گیا ہے۔ بھائی کی حالت اچھی نہیں ہے اس لیے پاپا سمیت امریکہ جا رہی ہیں۔

بھائی کی جانب کارپم سے اور بھائی کی سوانیا کو لے کر جا رہی ہیں اور مجھے اکیلا چھوڑے جا رہے ہیں۔

خوش تو میں بھی تھا مگر پاپا نے میری ساری خوشیاں ٹیٹ کر دی یہ کہہ کر کہ میں یہ سارے دن تانو کے گھر گزاروں گا۔ میں نے پاپا سے کافی بحث کی حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا۔

پاپا کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے اور اس طرح کے زمانہ کاموں میں کیا کام؟ پاپا نے ان

سائلگرہ فقیرا



صدف زیب

کتنی اچھی لڑکی تھی

مکمل ناول

بات پر گھورا پایا کو تو چائے پیتے ہوئے اچھو لگ گیا۔
 ”بزخوردار اذرا اس بات کی تشریح فرمائیں گے؟“
 اور میں تشریح فرماتے ہی والا تھا کہ ملائی گھوری نے
 بولتی بند کر دی۔

”مگر ملا میں کسی اجنبی جگہ ایزی فیل نہیں کرتا۔
 بس میں نے کہہ دیا میں کہیں نہیں جا رہا۔“ میں نے
 اڑیل کیجے میں کہا۔

”بیٹے نہیں ہو عباس! کہ تمہیں بتانا ہو اور اب یہ
 فضول کی بحث اور ضد چھوڑو۔ سلمان وغیرہ بیک کر
 لینا۔ میں مزید کچھ نہ سنوں۔“

انہوں نے تو سابقہ صدر کے سے لہجے میں آرڈر
 دے دیا۔

”پاپا۔“ میں نے احتجاجاً انہیں دیکھا وہ محض
 کندھے اچکا کر رہ گئے۔

ریکارڈ منٹ کے بعد سے پاپا ایسے ہی ہر معاملے میں
 غیر جانبدار ہو گئے تھے جیسے ہر معاملے سے رٹنا ہو گئے
 ہوں۔

”وہاں جانے میں کیا برائی ہے؟“ ملا نے اب کے
 ذرا نرمی سے پوچھا۔

”نہ جانے میں کون سی برائی ہے؟“
 ”کیوں کیسے رہو گے؟“

”کیوں؟ کیا حکومت نے اکیلے رہنے پر پابندی لگا
 دی ہے۔“ وہ دو سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

”نہیں بیٹا جی! میں نے عاتک کی ہے۔“ انہوں نے
 بڑے پیٹھے لہجے میں کہا۔

”تو فوراً ہٹا دیجیے۔“
 ”سوری اس کے آفٹریٹیفیکشنس اچھے نہیں ہوں
 گے۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولیں۔

”کیا مطلب۔“ کیسے آفٹریٹیفیکشنس؟ آپ کو
 اپنے بیٹے پر اعتبار نہیں کیا۔“ میں نے انہیں صدمے
 سے دیکھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں مجھے تو اپنے پیارے بیٹے کی
 ہر بیاری عادت کا علم ہے۔ پھوٹا لڑکا تو ایک نمبر کا
 مست الوجوہ چائے تو تمہیں ڈھنگ سے بنانی آتی

نہیں گھر کی دیکھ بھل کیا خاک کرو گے۔“ ان کی باتوں
 پر مجھے سخت اعتراض ہوا۔
 ”ماسی ہے نا۔ وہ کر لے گی گھر کی دیکھ بھل۔ اب
 میں تو سر۔ دوپٹہ کس کے صفائی کرنے سے رہا۔“ میں
 سخت ناراض ہوا تھا ملا سے۔

”ہاں ماسی کرے گی۔ وہ صاحبزادے! صفائی کرنے
 کی بجائے یوں کو صفایا کر لے گی۔ وہ تو میں سر پر کھڑی
 رہتی ہوں تو ذرا ڈھنگ کی صفائی کرتی ہے ورنہ اس کا
 بس چیلے تو سر سے بوجھ اتار کر چلتی بنے اوپر سے تم
 انتہائی غیر ذمہ دار ہو۔ جب سے یونیورسٹی چھوٹی ہے
 تب سے تمہاری صبح پارہ بچے سے پہلے ہوتی ہی نہیں۔“
 جب تک تم اٹھو گے تب تک کوئی میرے برسوں کی
 محنت سے بنائے گھر کا صفایا ہی کر جائے گا۔ سوناؤ
 اسٹاپ آرگومنٹ چلو۔“

ان کے حتمی لہجے پر میں ہار مان گیا۔
 سو ملا پاپا کے جانے کے بعد میں بھی یہاں آ گیا۔ دل
 کو سمجھا لیا تھا کہ ”چل یار! یوں بھی اب تھوڑا عرصہ
 ہی فراغت کا ہے جا اور زندگی کے مزے لوٹ۔“

اور اب یہاں مزے لوٹنے آ گیا ہوں۔ ماما نے ٹانگو
 فون کر کے میرے آنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔
 جانے سے پہلے وہ ٹانو سے مل کر بھی گئی تھیں اور اب
 میں چار سال بعد ٹانو سے مل رہا تھا۔ کیونکہ آخری
 ملاقات تو بھائی کی شادی پر ہوئی تھی۔ استقبال تو میرا
 نہایت شاندار ہوا۔

ٹانو کے رونور خفیہ چہرے پر مجھے دیکھ کر کتنی
 خوشی جھلکی تھی۔ البتہ ماموں سے میری ملاقات ابھی
 تک نہیں ہوئی۔ ٹانو مجھ سے کتنی دیر باتیں کرتی
 رہیں۔ وہ اس عمر میں بھی بہت ایکٹو اور خوب صورت
 تھیں۔ ان کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ کر مجھے ماما یاد
 آئیں۔ ماما میں ٹانو کی کافی مشابہت آتی تھی مگر ٹانو کی تو
 بات ہی اور تھی۔ سفید چکن کا دوپٹہ اوڑھے وہ آسانی
 حور لگ رہی تھیں۔ یہ بات میں نے ان سے بھی کہہ
 دی تو مسکرائیں۔

”اچھا جاؤ اب آرام کرو۔“

کھانے کے بعد میں اپنے لیے سوٹ کیے گئے کمرے
 میں آ گیا اور سوٹ لگا کر کراچی جیسے شہر سے پشاور جیسے
 شہر میں آ کر رہنا اتنا مشکل اور مختلف ثابت ہو گا۔ یہی
 سب سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ پھر مجھے کچھ
 ہوش نہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں ابھی نیند میں تھا کہ ایک عجیب سے شور نے
 مجھے بے داری کر دیا۔ میں بمشکل آنکھیں کھولے اس
 شور کو مجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازہ کھانڈنے
 مجھے بیڈ سے اچھال دیا۔

”ہائے عباس بھائی۔“ وہ چینی آوازیں میری
 سماعتوں پر برم پھونکنیں۔

”کون۔۔۔ کون ہو تم دونوں۔“ میں جلدی سے
 سنبھلا اور بیڈ کے سائیڈ پر کھڑی اس مخلوق کو دیکھا۔
 ایک ہی طرح کے لباس انداز اور آواز۔

”ہائے۔۔۔ آپ ہمیں نہیں پہچانتے؟“ انتہائی
 مدد سے ہیپزل آنکھوں والی نے کہا۔

”سوری بھئی! میں نے صرف تم لوگوں کے بارے
 میں سن رکھا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک ایسی مخلوق
 نکلے گی جن کے قد چھوٹے ہوں گے اور انہیں یا ہوج
 ماہوج کہا جائے گا۔“ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو
 براؤن آنکھوں والی کا منہ حیرت سے کھل گیا جبکہ
 دوسری فوراً آنکھوں میں آ گئی۔

”جی ہاں اور یہ بھی تو سنا ہو گا نا کہ ایک آنکھ والا آدمی
 بھی آئے گا جسے عرف عالم میں وجہل کہا جائے گا۔“

اس نے صاف مجھ پر چوٹ کی۔
 ”یار عباس! یہ والی تو بڑی تیز ہے۔“ میں نے سوچا
 اور پھر مسکرا کر کہا۔

”بھئی اپنے بھائی بند کو تو اب تم ہی مجھ سے زیادہ
 بہتر جانتی ہو گی نا۔ خیر یہ بتاؤں کہ تم دونوں کون ہو۔“
 میں نے فوراً ”صلح کی جھنڈی لہرانا چاہی۔“

”جی آپ ہمارے بھائی ہیں۔ اس لیے تو آپ کو بتانا
 ہی ہو گا۔“ آف یہ ہیپزل آنکھوں والی تو پٹاڑھ تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
 خواتین کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	نویسنہ	ناول
500/-	آمنہ پاش	سلاطین
600/-	راحت جمیں	درد موم
500/-	رخسانہ گارہ خان	زندگی اک روشنی
200/-	رخسانہ گارہ خان	خوشبو کا کوئی کمر نہیں
400/-	شازیہ چودھری	شہر دل کے دروازے
250/-	شازیہ چودھری	تیرے نام کی شہرت
450/-	آسیہ مرزا	دل ایک شہر جوں
500/-	فاخرہ افتخار	آنکھوں کا شہر
500/-	فاخرہ افتخار	بہول بھلیاں تیری گلیاں
250/-	فاخرہ افتخار	بھلاں دے رنگ کالے
300/-	فاخرہ افتخار	یو گلیاں یہ چہ پارے
200/-	فرزادہ مزید	میں سے عورت
350/-	آسیہ زبانی	دل اُسے ڈھونڈ لایا
200/-	آسیہ زبانی	کھڑا نا کیں خواب
250/-	فوزیہ یاسین	رہم کو خدا ہی سنبھالی سے
200/-	مترزی سعید	اماں کا چاند
450/-	انصاف آفریدی	رنگ خوشبو کا ہوا دل
500/-	رضیہ جمیل	درد کے قاصدے
200/-	رضیہ جمیل	آج سمن پر جانگس
200/-	رضیہ جمیل	درد کی منزل
300/-	نسیم عورتی	میرے دل میرے مسافر
225/-	بیونہ خورشیدی	میری ماہ میں ڈل گئی
400/-	ایم سلطانہ	شام آرزو

ناول خواتین کے لیے ڈائجسٹ کی طرف سے
 قیمت: 300/-
 ڈائجسٹ کی طرف سے
 قیمت: 300/-
 ڈائجسٹ کی طرف سے
 قیمت: 300/-

”تم پلوٹ لور یہ زرمینہ ہے۔ ہے نا۔“ میں نے واو طلب نظروں سے دیکھا انہیں۔ پہچان تو میں کیا تھا۔ دونوں عارفین ماموں کی جڑواں بیٹیاں تھیں۔ چار سال پہلے تو بہت چھوٹی سی تھی اب ماشاء اللہ قدر کاٹھ خوب نکالا تھا۔

”ٹھیک۔ ایک دم رائٹ۔ بھلا آپ نے کیسے اتنی جلدی پہچان لیا ہمیں۔“ وہ خوش ہو کر پوچھ رہی تھی۔ براؤن آنکھوں والی اب تک خاموش تھی۔

”بھئی تمہیں تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ بھلا کوئی پری کی دستن چڑیل کو بھی بھول سکتا ہے؟“ پری پر میں نے مینا کو دیکھا تھا۔ پلوٹ اپنی بے عزتی پر خفا ہو گئی۔

”آپ مجھے چڑیل کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ میں نہیں پڑا۔

”میں تو زرمینہ کو پری کہہ رہا ہوں۔“ وہ بیاری زرمینہ میری بات پر بلش کر گئی۔ جبکہ پلوٹ غصہ ہونے لگی۔

”آپ بہت برے ہیں عباس بھائی۔ میں آپ سے اتنے پیار سے ملنے آئی ہوں اور آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں اور مینا کی تعریفیں۔ حالانکہ وہ تو ابھی نہیں رہی تھی۔“ اس کے ناراض لہجے اور چہرے پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

”میں تو زرمینہ کو پری کہہ رہا ہوں۔“ وہ بیاری زرمینہ میری بات پر بلش کر گئی۔ جبکہ پلوٹ غصہ ہونے لگی۔

”آپ مجھے چڑیل کہہ رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ میں نہیں پڑا۔

”میں تو زرمینہ کو پری کہہ رہا ہوں۔“ وہ بیاری زرمینہ میری بات پر بلش کر گئی۔ جبکہ پلوٹ غصہ ہونے لگی۔

”آپ بہت برے ہیں عباس بھائی۔ میں آپ سے اتنے پیار سے ملنے آئی ہوں اور آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں اور مینا کی تعریفیں۔ حالانکہ وہ تو ابھی نہیں رہی تھی۔“ اس کے ناراض لہجے اور چہرے پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

”بھئی مذاق کر رہا تھا۔ خیر بیاں تو تم دونوں ہی لگتی ہو۔“ میں نے فوراً سیز فائر کر دیا اور زرمینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا۔

”مجھے دونوں ہی بیاری لگی تھیں مگر زرمینہ بہت ہی شرمیلی لگ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں پلوٹ بہت پراعتماد تھی۔

”عباس بھائی! داد دے بھیجا ہے کہ آپ سے مل بھی لیں اور آپ کو ساتھ لے کر آئیں۔ شام کی چائے تیار ہے۔ آپ فوراً آئیں۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

”میں نے آہیں تسلی دی۔“

نہیں کرتا دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا۔

دونوں میری تعریف میں رطب اللسان تھیں جبکہ اب تو وہ محترمہ بھی کچھ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگی تھیں۔

”اچھا بس چپ کرو تم دونوں۔ وہ اگر بتانا نہیں چاہتی تو تنگ مت کرو۔“

آخر کار میں نے انہیں ٹوک دیا۔ تو لاؤنج میں یوں خاموشی چھا گئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس خاموشی کو نانو کی آواز نے توڑا تھا۔

”شانزے بیٹی آئی ہے۔ کیسی ہو۔“ شانزے فوراً اٹھی اور جا کر نانو کا پیار لیا۔

”ٹھیک ہوں نانو۔ آپ سناں! ابھی چکر ہی لگا لیا کریں ہمارے گھر۔ خالہ چچی کئی دن سے کہہ رہی ہیں کہ آپ کی طرف آئیں گی۔“ وہ نہایت محبت سے نانو کے ہاتھ تھام کر بولی۔

”آؤں گی بیٹا۔ بس مصروفیت بہت رہی پچھلے دنوں۔ اس سے ملیں یہ میرا لواسا ہے عباس۔ رہنے کے لیے آیا ہے۔“

وہ از سر نو میرا تعارف کروانے لگیں تو اس نے سر ہلادیا۔

”اس کے آنے سے گھر میں رونق ہو گئی ہے۔ پھر کام بھی بڑھ گیا ہے تا میرا اور عباس یہ میری دوست کی نو اسی سے اور بچیوں کی بہت اچھی سہیلی شانزے ہماری ہی لیمن میں اس کا بھی گھر ہے۔“

شاید نانو کو وہ بہت اچھی لگتی تھی جیسی اتنے پیار سے اس کا تعارف کروا رہی تھیں۔

”ناس ٹو میٹ ہو۔“ میں نے شرارتی لہجے میں کہا جو ابیا ”وہ صرف گھور کے رہ گئی۔“

”اور ستاؤ بیٹا! یوں پورٹی کیسی جا رہی ہے؟“ وہ اس سے باتوں میں مصروف ہو گئیں اور میں اس کا جائزہ لینے میں۔ وہ بڑے اوب سے نانو کے سوال کا جواب دے رہی تھیں۔ اتنے میں چائے بھی آگئی۔

ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ نانو کے کچھ بیٹا آ گئے۔ وہ انہیں ڈرائیونگ روم میں بلانے کا کہہ کر

وہاں چلی گئیں۔ لاؤنج میں ہم چاروں رہ گئے۔

”ہاں تو بیٹا۔ تمہاری آبی کو کیا مسئلہ ہے؟“ میری بات پر اس نے جڑ کر مجھ دیکھا۔

”میرے مسئلے سے کوئی سروکار رکھنے کی بجائے آپ اپنی چائے کی فکر کریں۔“ وہ پلٹ سے بولی۔

”شکر ہے۔ وہ تو میں نے پی لی ہے۔ ویسے ایک بات بتانا پسند فرمائیں گی محترمہ! میں نے ایسا کون سا ہم پھوڑ دیا ہے آپ پر کہ آپ ناراض نظر آ رہی ہیں؟“ میں نے بڑے متفکرانہ لہجے میں پوچھا تو وہ ایک دم سے

اوپر نظر آنے لگی۔ پلوٹہ نے جو اس کے چہرے کو دکھاتا فوراً ”ممدان میں اتر آئی۔“

”عباس بھائی ایلیز آبی کو تنگ مت کریں۔ پہلے ہی یہ اتنی ٹینشن میں ہیں۔ مزید ٹینشن مت دیں۔ آپ نہیں جانتے کہ ان کی خالہ ان کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں اور آج کل ان کے۔“ نہ نہ کرتے بھی پلوٹہ نے بھانڈا پھوڑ دیا مگر شانزے کی دھاڑ نے اس کی آومی بات کٹ کر رکھ دی۔

”تم۔ تم پلوٹہ۔“ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کیا کر دے اور پھر اسی بے بسی میں وہ اٹھی اور فوراً ”واک آؤٹ کر گئی۔ پیچھے سے وہ دونوں اسے آواز دیتی رہ گئیں۔“

”یہ کیا ہوا بھائی! وہ تو خفا ہو گئی ہیں مجھ سے۔“ اس نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے کئی دیتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ ان جائے گی۔ تم پہلے مجھے پوری بات بتاؤ۔“ ”ہاں تاکہ وہ مزید خفا ہو جائیں۔“

وہ دگ گئی۔

”نہیں۔ نہیں۔ خفا کیسے ہوگی۔ میں اس کے مسئلے کا ایسا شاندار حل نکالوں گا کہ ایک دم سے وہ عیش عشا کرے گی۔“ میں نے اسے تسلی دی اور آخر کار اس سے ساری بات انگوالی۔

بات کچھ یوں تھی کہ شانزے آفریدی اپنی خالہ کے ہمراہ اکیلی رہتی تھی۔ والدین اس کے دینی میں تھے۔ اس کے نانا نانی کا انتقال اس کی بلما کی شادی کے بعد

ایک جاوتے میں ہو گیا تھا۔ ان دنوں اس کی بلما یہیں رہتی تھیں۔ بھائی کوئی تھا ہی نہیں اس کی خالہ اور ماما صرف وہ نہیں تھیں۔ والدین کی وفات کے بعد اس کی خالہ بھی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ شانزے جب آٹھ سال کی تھی تو اس کی بلما نے دینی شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ ان کی ساری فیملی ہی وہیں تھی۔ مسئلہ اس کی خالہ کا تھا جس نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی کرنا چاہتی تھی۔ تب اس کے والدین نے شانزے کو مستقل ان کے پاس چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ یہ فیصلہ شانزے کی مرضی سے ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی خالہ سے بہت اٹھ جھڑکتی تھی۔ اس کی فیملی دینی شفٹ سے ہو گئی جس میں شانزے سے چھوٹے دو بھائی بھی تھے۔

تب سے شانزے اپنی خالہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ شانزے کے بہت پر بوزل آرہے تھے اور اس کی خالہ نے بہن بہنوئی سے مشورہ کرنے کے بعد ان میں سے ایک کو اوب کے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خالہ صاحب جائیداد تھیں۔ ان کی زمینیں اور باغات تھے۔ جن سے انہیں اتنی آمدنی ہو جاتی جس سے ان کی گزر بسر بہت اچھی طرح ہو رہی تھی۔ مگر

شانزے شادی پر تیار نہیں تھی وہ فاسٹ ایئر میں تھی اور خالہ کا ارادہ کھٹکتی اور پھر اس کے فاسٹل کے بعد اس کی شادی کا تھا۔ مگر وہ خالہ کو اکیلا چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ خالہ کی تمنا تھی تو اسی کے دم سے آبلو تھی۔ خود وہ اس کی باتوں کو اہمیت دینے کو تیار نہ تھیں۔

”اب مسئلے کا حل تو یہ ہونا چاہیے کہ شانزے کے ساتھ ساتھ اس کی خالہ کا بھی بیواہ کر دیا جائے۔“ ساری کتھانے کے بعد میں نے فیصلہ سنایا۔

”کیا۔؟ ان کی شادی! یہ تو ممکن نہیں بھائی۔ ان کی خالہ کو شادی سے چڑ ہے۔“ پلوٹہ نے فی الفور یہ حل مسترد کر دیا۔

”کیوں کیا ان کے ساتھ کسی نے بے وفائی کی تھی یا وہ بہت عمر رسیدہ ہیں؟“ میں نے اعتراض اٹھایا تو وہ دونوں معنی خیزی سے ہنسنے لگیں۔

”اس کا تو ہمیں پتا نہیں مگر عمر رسیدہ تو وہ ہیں۔ کیوں بیٹا!“

پلوٹہ نے معنی خیزی سے بیٹا کو دیکھا۔

”کیا کہتی ہو۔ بھائی کی ایک ملاقات نہ کروا دی جائے خالہ سے؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ بھی فوراً پر جوش ہوئی اور یوں میرے ذہن میں ایک موٹی و تنگ سفید پالوں والی عورت کا خاکہ ابھر آیا۔



اور ملاقات بھی اگلے دن ہو ہی گئی۔ دونوں مجھے صبح ان کے گھر لے گئیں۔ شانزے شاید یونیورسٹی جا چکی تھی۔ میں بڑے سارے سرسبز لان کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب بیٹا نے میرا بازو کھینچا۔

”آئیں تاکہ اندر چلیں۔“

میں اس کے ہمراہ اندر گیا تو میرا بے بغیر رہ ہی نہ سکا تھا۔ اتنی نفاست! اتنی صفائی تھی کہ دل بلاغ بلاغ ہو رہا تھا۔ میں لاؤنج میں بیٹھا دل ہی دل میں سراہ رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے بٹھا کر عتاب ہو گئی تھیں۔ شاید خالہ کو بلائے نہ چلی گئی تھیں۔

”آئیں خالہ! جلدی کریں۔“ پلوٹہ کی پر جوش آواز پر میں سنبھل کر اوب سے بیٹھ گیا۔ سر کو یوں جھکا لیا جیسے مجھ سے زیادہ حیز دار تو اس دنیا میں کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔

”یہ ہیں ہمارے عباس بھائی۔“ بیٹا کی باریک سی آواز پر میں سر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اسلام علیکم۔“ بڑے اوب سے سلام کر کے میں نے سر کو ان کے آگے جھکایا تھا۔

"بیٹھ جاؤ عباس۔" وہ نہ جانے کتنی دیر سے کہہ رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو خوشخوار نظروں سے گھورا جو کہ مسلسل مسکرا رہی تھیں اور پھر بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو؟ شانزے سے سنا تھا کہ آنٹی کا تو اسما آیا ہوا ہے۔ مگر ان دونوں کو کچھ مصروفیت تھی اس لیے نہ ہی تم سے ملنے آسکی اور نہ ہی آنٹی سے۔" وہ بڑے نرم لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"الحمد للہ۔ میں تو تھک تھا مگر آپ کو دیکھ کر شاید نہ رہوں۔" میں نے دونوں کو گھورا کر انہیں کہا تو چونک گئیں۔

"کیوں بھی! مجھ کو دیکھ کر صدمہ ہوا ہے؟"

"آپ صدمہ کہہ رہی ہیں۔ میرا تو نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے بچا ہے۔ سچ میں تو ان دونوں کی باتیں سن کر یہ سمجھا تھا کہ آپ کوئی عمر رسیدہ خاتون ہوں گی۔ جن کے بال سفید، کمر جھکی ہوئی اور ہاتھ میں پتھر ٹری ہوگی۔ چہرے پر جلال۔ مگر آپ تو میری سوچوں کے بالکل برعکس نکلیں۔" میں نے کھل کر اپنی حیرت کا اظہار تو وہ مسکراتے لگیں۔

"بھئی ضروری تو نہیں کہ ہر عمر رسیدہ شخص ان جملہ خصوصیات پر پورا اترتا ہو۔ کچھ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔" وہ افسارگری سے بولیں۔

"کیا؟ عمر رسیدہ؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ تو کہیں سے بھی عمر رسیدہ نہیں لگتیں۔ بلکہ مجھ سے چند سال ہی بڑی ہوں گی۔" میرے کہنے پر وہ صرف ہلکا سا مسکرا کر چپ ہو گئیں پھر موضوع بدل کر مجھ سے میرے گھر والوں کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

"آپ بلا کو جانتی ہیں؟"

"بہت اچھی طرح سے کئی دفعہ ان سے ملاقت بھی ہوئی ہے۔ تم بتاؤ تم آج کل کیا کر رہے ہو؟" میں نے ان جیسا مترنم لہجہ بہت کم سنا تھا۔

"سی اے کے ایگزام کے بعد رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں پھر جانے۔"

"چلو اللہ تمہیں کامیابی دے۔ مجھے بھی پورا انٹرسٹ تھا جب میں۔ مگر پھر شانزے کی ذمہ داری کی

وجہ سے مجھے اپنی جاہ چھوڑنی پڑی۔ خیر اب تو وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ خود کو سنبھال سکے مگر پھر بھی بچوں کی طرح حسدیں کرتی ہے میرے ساتھ۔"

وہ بہت محبت سے اس کا ذکر کر رہی تھیں میں بغور ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

دلی پٹلی ہی مگرین بڑی بڑی آنکھوں والی یہ خالہ تو کہیں سے بھی عمر رسیدہ نہیں لگتی تھیں۔ میرے خیال میں یہ تیس کے قریب ہوں گی۔ عام سے گھریلو طے میں ملیوں براؤن بالوں کو جو لڑے کی شکل میں لپیٹے وہ بہت خاص لگ رہی تھیں۔

"کیا وجہ تھی کہ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ حالانکہ ان جیسی صورتوں پر مرنے والے ہزاروں ہوتے ہیں۔" میں سوچ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان سے کھنگلو میں بھی مصروف تھا۔

"کیا لوگے عباس؟ کوئی ڈرنگ یا چائے؟" ان کے پوچھنے پر میں نے چائے کا کہہ دیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے جانے کے بعد پلو شہ نے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔

"کیوں بھائی؟ دیکھا کیسی پیاری سی خالہ ہیں شانزے آپ کی۔" وہ یوں دلو طلب کر رہی تھی جیسے یہ اسی کی دریافت ہوں۔

"واقعی بھی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ خالو بھی شانزے کا ہونا چاہیے۔ میرے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" میں نے پر سوچ لہجے میں کہتے ہوئے اس سے رائے طلب کی تو وہ ہکا بکا کہنے لگیں۔

"کیا آپ خالو؟" کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" دونوں اتنی حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں ان کی حیرت پر دل بہاؤ میں ملاحظہ ہو رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ ان کے لیے لڑکا بھی میرے جیسا پونڈرسم سا ہونا چاہیے ہے نا؟"

"ایک دم ٹھیک۔ مگر عباس بھائی ایسا لڑکا ڈھونڈیں گے کہاں سے؟" وہ فوراً تشویش سے پوچھنے لگی تھیں۔

"اور ڈھونڈ بھی لیا تو خالہ کیا راضی ہو جائیں گی؟"

اس نے وہ سراسر اہم نقطہ اٹھایا۔

"خیر وہ بھی سوچ لیں گے۔" میں نے پر سوچ انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔ گھر میں تجسس سر اٹھا چکا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے جو انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی؟

گھر آنے کے بعد وہ دونوں تو اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں اور میں ماموں کی اسٹڈی میں آیا۔

کچھ مچلا کر رہی تھیں۔ اس لیے میٹ پر بیٹھ گیا۔ ماما کی میل آئی ہوئی تھی۔ رات کو ماموں پر ہی سے کیوں پڑے پر اس لیے مجھے پانا چلا۔ میل پڑھ کر اس کا جواب دیا اور پھر اپنے چہرے پر شرمندگی کے ساتھ ٹیٹ کرنے لگا۔ کتنی دیر بعد جب وہ سیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے اٹھا تو شانزے کی خالہ کا خیال میرے ذہن میں تھا۔

میں نیچے آیا۔ لاؤنج خالی تھا۔ نالو کے کمرے میں جھانکنا تو وہ سوچ تھا کہ بیڈ پر بیٹھی نظر آئیں۔

"ہاں! آسکتا ہوں؟" میں دروازے سے سر اندر دیکھا کہ اجازت چاہی۔

"آؤ عباس! پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" انہوں نے نرمی سے مسکرا کر کہا۔

میں اندر آ گیا اور بیڈ پر چڑھ کر نالو کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نالو تسلیج برہنہ کے ساتھ ساتھ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"تنگ تو نہیں ہو رہے یہاں پر تم۔"

"نہیں نالو۔ بلکہ مجھے تو اتنا مزہ آ رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ ماما نے اچھا کیا جو مجھے یہاں بھجوا دیا۔ وہاں پر میرا اتنا خیال رکھنے والا کون تھا۔"

میں نے سر میں گردش کرتا ان کا ہاتھ تھام کر چوما۔

"کہہ رہی تھی مجھے شینہ کہ تمہیں میرے بیٹے کا بہت خیال رکھیے گا کیونکہ یہ کبھی میرے بغیر اتنے دن رہا نہیں۔"

نالو کی بات پر مجھے بے اختیار ماما پر پیار آ گیا تھا۔ وہ بظاہر مجھے ٹوکتی رہتی تھیں مگر میں انہیں بہت پیارا تھا۔ جہاں غیر بھائی سے بھی زیادہ۔

"نالو ایک بات بتائیے۔ کیا آپ بھی ماما اور ماموں

سے اتنی ہی پیار کرتی ہیں۔" ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر ان سے۔ میں کیا تو ان کے چہرے پر مستاکا اور بکھر گیا۔

"عباس! ہر دماغ کو اولاد دینی ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی بڑی ہو جائے ماں باپ ہمیشہ ہی ان کا اسی طرح خیال رکھتے ہیں جیسے چھوٹے بچوں کا رکھا جاتا ہے۔"

"تو کیا نالو۔ آپ کو ماما یاد نہیں آتی تھیں۔ ان کی شادی بھی آپ نے دور کی تھی اور آپ کی وہ اکلوتی بیٹی تھیں۔ ہمیں نے کتنے اعتراض اٹھایا۔"

"کیوں نہیں یاد آتی تھی۔ شروع شروع میں میں اسے یاد کر کے روٹی تھی مگر تمہارے نانا مجھے منع کر دیتے تھے اس کے سامنے رونے سے کہ نہی کا دل برا ہو گا۔" نئے گھر میں ایڈجسٹ نہیں کر پائے گی۔ پھر میں بھی یہ بات سمجھ گئی۔ رفتہ رفتہ دل کو سمجھا لیا تھا میں نے پھر عارفین تھا میرے پاس گھر کے دھندے بس بدل کو ممبر کرنا آتا گیا اور جب عارفین کی شادی ہوئی تو گھر میں رونق اتر آئی تھی مگر وہ بھی چند دن ہی رہ سکی۔"

نالو بات کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں۔ ماموں کی زندگی ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

"نالو تو آپ ماموں کی دو سری شادی کروا دیتیں نا اتنے تنگ سے تو ہیں وہ اب بھی۔" میں ان کے ہاتھوں کو تھام کر بولا۔

"بہن! میں نے تمہارے نانا شینہ ہم سب نے کتنا دیا وہ والا مگر اس کی تاپاں میں نہ بدلو اسکے۔ وہ اپنی بیٹیوں پر سوتلی ماں کا سایہ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ ایک تو پہلے میں نے اس کی اتنی کم عمری میں شادی کر دی تھی گھر کے سنانے کی وجہ سے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ رونق بھی عارضی ہوگی اور سنانا میرے بیٹے کا مقدر ہی بن جائے گا۔"

نالو کی آنکھوں میں نمی جھلکانے لگی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور نالو کو اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

"فکر مت کریں نالو ان شاء اللہ میں دیکھیے تو کیا کرتا ہوں۔ آپ بس رویئے مت۔" میرے ذہن

میں شانزے کی خالہ اور ماموں کا خیال ایک ساتھ آیا اور میں مسکرانے لگا۔

شام کی چائے کے بعد میں ان دونوں کے ساتھ واک پر نکل گیا۔ ہلکی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ ہم تینوں واک کرتے ہوئے آنسکویم کارنر تک گئے۔ آنسکویم لے کر ہم دوبارہ کالونی کی طرف مڑے تھے۔ دونوں خوب چمک رہی تھیں میں ان کی باتوں پر ہنس رہا تھا۔ جب اچانک میرے نظر سامنے شانزے پر پڑی تھی۔ وہ اکیلی کھوٹی کھوٹی سی ایک طرف چل رہی تھی میں نے ان دونوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

”وہ دیکھو۔ سامنے تمہاری درزی آئی۔“

دونوں نا سمجھی سے مجھے دیکھنے لگیں اور پھر سامنے زی کو دیکھ کر چبھیں۔

”زی آئی۔“ ان کی تیز چوچ پر کئی لوگوں نے سر گھما کر انہیں دیکھا مگر وہ دونوں سب سے بے نیاز اس کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ شانزے حیرت سے انہیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔ میں سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

”آئی۔۔۔ اب اکیلے واک کر رہی ہیں۔ ہماری طرف آجائیں۔ آکھٹے چلتے۔ سچ ہمیں تو اتنا مزا آ رہا ہے۔ عباس بھائی کے ساتھ انہوں نے ہمیں آنسکویم بھی کھلائی ہے۔“

”آئی۔۔۔ اب اکیلے واک کر رہی ہیں۔ ہماری طرف آجائیں۔ آکھٹے چلتے۔ سچ ہمیں تو اتنا مزا آ رہا ہے۔ عباس بھائی کے ساتھ انہوں نے ہمیں آنسکویم بھی کھلائی ہے۔“

”آئی۔۔۔ اب اکیلے واک کر رہی ہیں۔ ہماری طرف آجائیں۔ آکھٹے چلتے۔ سچ ہمیں تو اتنا مزا آ رہا ہے۔ عباس بھائی کے ساتھ انہوں نے ہمیں آنسکویم بھی کھلائی ہے۔“

”آئی۔۔۔ اب اکیلے واک کر رہی ہیں۔ ہماری طرف آجائیں۔ آکھٹے چلتے۔ سچ ہمیں تو اتنا مزا آ رہا ہے۔ عباس بھائی کے ساتھ انہوں نے ہمیں آنسکویم بھی کھلائی ہے۔“

”آئی۔۔۔ اب اکیلے واک کر رہی ہیں۔ ہماری طرف آجائیں۔ آکھٹے چلتے۔ سچ ہمیں تو اتنا مزا آ رہا ہے۔ عباس بھائی کے ساتھ انہوں نے ہمیں آنسکویم بھی کھلائی ہے۔“

”میری بات پر اس نے تڑخ کر مجھے دیکھا۔“

”مجھے ایروں غیروں سے محبت برصانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”آف۔ ایہ کیا کر رہی ہو۔ تم نے سنا نہیں کیا۔“

اکیلے کس طرح ہم حل کریں گے۔

محبت اجتماعی مسئلہ ہے۔ میں نے مسکراہٹ دیا کر سنجیدگی سے شعر پڑھا۔ وہ ہونٹ بھیج کر رہ گئی۔

اس کی خاموشی نے مجھے پھر اکسایا۔

”لو کھالویوں بھی غصہ کو ٹھنڈا کرنے کا بہترین فارمولہ ہے۔“

”تم۔ تم اپنی حد میں رہو تو بہتر ہے۔ میرا دلغ ویسے بھی اس وقت بہت خراب ہے۔ اگر ایسا ویسا کچھ کہہ دیا تو بعد میں سر پکڑ کے رو گے۔“ اس نے غصیلے لہجے میں وارننگ دی۔ میں ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے لگا۔

”میں یار! مجھے بچاؤ۔ تمہاری آئی تو جی جی غصے میں لگ رہی ہیں۔“ پلوٹہ میری بات پر مسکرانے لگی تھی جبکہ میں خفا ہو گئی۔

”آپ دونوں دوستی کیوں نہیں کر لیتے بھائی۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“

”بھئی میں تو دوستی کرنا چاہتا ہوں مگر تمہاری درزی آئی۔ سوری زی آئی ہی بے زار نظر آئی ہیں مجھ سے۔“ میں نے مقلوبیت سے کہا۔ شانزے صرف گھور کر رہ گئی۔

”کیوں آئی! میرے لئے آئی ہے بھائی ہیں۔ آپ ان سے دوستی کریں نا پلوٹہ۔“ اس نے التجا آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر چلتی ہوں۔ تم لوگوں نے جانا ہے؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کر گئی۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ خفا نظر آنے لگی تھی۔ شانزے بے بسی سے سانس بھر کر رہ گئی۔

”چلیں آئی! ہاتھ ملانے بھائی سے۔“ حسب معمول پلوٹہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے

ہاتھ میں تھام لیا۔ اس اچانک اقدار پر وہ گھبرا گئی۔ میں نے شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ دیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے لگی۔

”دیکھو میں تو دوستی کر رہا ہوں مگر تمہاری آئی ہی مجھ سے ہاتھ چھڑا رہی ہیں۔“ میں نے انجان پن سے اسے دیکھ کر دونوں سے احتجاج کیا۔

”بھائی اس وقت تک ہاتھ نہ چھوڑے گا جب تک آئی مان نہیں جاتی۔“ پلوٹہ کے نئے آرڈر پر وہ گھڑی لگا گئی۔

”تو پھر کیا خیال ہے یونسی چلے ہیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ دے۔“ میں نے کیڑھکی سے آکھ دیا کہہ لگا۔ وہ ٹھملا گئی۔

”کیہ نہ۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور ہاتھ چھڑانے لگی۔ میں نے سن لیا تھا۔ اس لیے اور زور سے اس کا ہاتھ دیا گیا۔

”آف۔ تو کر ایسی۔ دونوں تالیاں بجا رہی تھیں۔“

”تو ٹھیک سے ٹھیک ہے۔ دوستی منظور ہے۔“ وہ لاچارگی سے بولی تو بچیوں نے ایک دم سے ہرے کانٹوں لگایا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ چند گزرنے والے لوگوں نے ہماری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے گزر گئے وہ اپنا ہاتھ دبا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے بچیوں۔ دوستی کی خوشی میں میں تم لوگوں کو کوک پلا تا ہوں۔“

”جی نہیں صرف کوک نہیں۔ ہم سینڈویچز بھی کھا میں گے۔“ پلوٹہ نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔

”اور برگر بھی۔“ میں نے باریک سی آواز میں اضافہ کیا۔

”آپ کیا لیتا پسند فرمائیں گی۔“ میرے کہنے پر اس نے تڑچھی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر جیبا چا کر بولی۔

”تمہارا سر۔“

”وہ تو ابھی بھی حاضر ہے۔“ میں نے فوراً ”سر کو اس کے آگے جھکا دیا۔ دونوں ہنسنے لگیں۔ کچھ دیر وہ میرے سر کو گھورتی رہی پھر ایک دم سے مسکرائی۔

”وہ تو ابھی بھی حاضر ہے۔“ میں نے فوراً ”سر کو اس کے آگے جھکا دیا۔ دونوں ہنسنے لگیں۔ کچھ دیر وہ میرے سر کو گھورتی رہی پھر ایک دم سے مسکرائی۔

بچیاں اس کی مسکراہٹ پر تالیاں پٹنے لگیں۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

”تھینک یو اللہ لوگوں کے دل بھی ہمارے لیے کھلے۔“

میں نے آسمان کو دیکھ کر بلند آواز سے شکر ادا کیا اور پھر انہیں نوک کے ساتھ برگر، سینڈویچز، پیس کے ساتھ شانزے کی فرمائش پر وہی بھلے بھی کھلائے۔

یوں ایک بھر پور شام گزار کر ہم گھر آئے تو ہم چاروں میں پٹی دوستی ہو چکی تھی۔

ماما کا فون آیا تھا۔ ان سے بات کر کے میں ماموں کے پاس آ بیٹھا۔ نانا اب ان سے گفتگو کر رہی تھیں اور دونوں بہنیں فون کے پاس پر اشتیاق انداز میں کھڑی تھیں۔

”ماموں! اور ان دونوں کو تو دیکھیں۔ ملا کا فون سن کر کتنی خوش ہو رہی ہیں۔“ میں نے ماموں کی توجہ لی وہی کے بجائے ان پر مبذول کروائی۔ وہ متوجہ ہوئے اور پھر انہیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔

”انہیں یونسی آپا کے فون کا انتظار رہتا ہے۔ بہت محبت کرتی ہیں دونوں اپنی پھپھو سے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ ماموں! ماں کی محبت تو انہیں نصیب نہیں ہوئی۔ ملا کی محبت میں یہ ممتا کے عکس تلاش کی ہیں۔“ میں نے چالاک سے انہیں ایموشنل کرنا چاہا۔

”الحمد للہ عباس! اللہ نے انہیں کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اور پھر دونوں بہت سادی اور سمجھ دار بچیاں ہیں انہیں اس طرح کا کوئی کیپلکس نہیں ہے۔“ انہوں نے نہایت اطمینان سے ایموشنل ہوئے بغیر کہہ دیا۔ مگر میں نے بھی ہمت نہ ہاری۔

”یہ ٹھیک ہے کہ نانو نے انہیں ماں کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی مگر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ماں کی کمی کا کوئی احساس نہیں۔“ میں نے جرح

کرنے والے انداز میں اعتراض کیا۔

”وہ اس لیے بیٹا جی! یہ دونوں بچیاں مجھ سے بہت کلوز ہیں اور اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتی ہیں۔ آج تک انہوں نے کبھی مجھ سے ماں کی کمی کی شکایت نہیں کی۔ ذرا مہینہ تو پھر بھی ساہ سی ہے مگر پلوٹہ بہت آوٹ اسپوکن ہے اس کو جو چاہیے ہوتا ہے کھل کر کہہ دیتی ہے۔ آج تک مجھے ان سے یہ سننے کو نہیں ملا۔ سات سال ہو گئے ہیں انہیں ماں کے بغیر رہتے ہوئے اور انہیں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔“ بیجیے! ماموں نے تو بات ہی ختم کر دی۔

یعنی کہ اب انہیں اس کمی کا احساس دلایا جائے۔ میں سوچنے لگا کہ انہیں خود تو کسی ساٹھی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اگر بیٹیاں ضد کریں تو ہو سکتا ہے کہ ماموں ان کی خاطر اپنا گھر آباد کرنے کا سوچ لیں۔

”آئیڈیا اچھا ہے عباس پتھر چل آج سے اس مہم پر شروع ہو جا۔“ اپنے گریس فل سے ماموں کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا جو اب نہایت اٹھماک سے بزنس پلس دیکھ رہے تھے۔

رات کو کھانا کھا کر میں ان دونوں کے ساتھ شانزے کے گھر آ گیا۔ وہ لان میں اپنی خالہ کے ہمراہ ہمیں ٹھلٹے ہوئے مل گئی۔

”ہیلو لیڈیز! کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے خوشگوار انداز سے کہا۔

”واک کی جارہی ہے۔ آؤ تم بھی ہمیں جوائن کر لو۔“ شانزے نے دعوت دی۔

”نہیں بھئی واک کامز تو سڑکوں پر ٹھلٹے ہوئے آتا ہے ہم تمہیں اسی لیے لینے آئے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ۔“

”مثلاً؟“

”زنس کلر ہوئی یا پھر۔“

”بس عباس۔“ وہ بے ساختہ مسکرائے گئی تھیں۔ جس سے ان کے دائیں گال پر بھنور سا بننے لگا تھا۔

”مجھے تو تم بس خالہ ہی کہہ لو یہی کافی ہے اور سوٹ کرنا ہے مجھے۔“

”مگر خالہ سے تو ذہن میں ایک بزرگ سی ہستی آجاتی ہے آپ تو اتنی بیگ ہیں۔“ انہوں نے سر جھٹک کر مجھے ٹوک دیا۔

”کوئی بیگ ونگ نہیں ہوں۔ اس سال پورے چھتیس سالوں کی ہو جاؤں گی میں۔“

”مگر شکل سے تو بمشکل تمہیں کی لگتی ہیں آپ۔“

”اس بحث کو چھوڑو۔ واک پر نہیں جانا۔“ انہوں نے سہولت سے موضوع بدل ڈالا۔

”آپ چلیں گی؟“

”سوری! تم لوگ شانزے کو لے جاؤ مجھے کچھ کام ہیں۔ جاؤ شانزے۔“ وہ ہمیں اللہ حافظ کہہ کر اندر چلی گئیں۔

میں نے پلوٹہ اور زرمینہ کو آواز دی اور شانزے کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل آیا۔ جاتی سڑکوں کے دن تھے اب راتیں اتنی سرد تھیں۔ واک کرتے ہوئے میں نے ٹٹولنے کی غرض سے پلوٹہ سے پوچھا۔

”وشی ڈیئر! تمہیں اپنی ماما اور سسٹن آئیں؟“ وہ جو شانزے کو کوئی قصہ سنارہی تھی ایک دم میری طرف مڑی اور بے نیازی سے بولی۔

”نہیں۔“ اس کے صاف نکا جواب پر میں ہکا بکارہ گیا۔

”کیوں؟“ میں نے کبھی ان کی کمی محسوس نہیں ہوئی؟ میں یہ مان ہی نہیں سکتا۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ہمیں تو ماما کی شکل بھی ڈھنگ سے یاد نہیں بھائی اور پھر واو ہم سے اتنا پیار کرتی ہیں۔ سبیا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ ہمیں تو کسی کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔“ وہ

پراعتقاد انداز میں صاف گوئی سے بولی تھی۔

”لو بھئی چھٹی ہوئی۔“ میں نے سوچا اور پلوٹہ کو دیکھا جو پھر سے زور و شور سے اپنا قصہ شروع کر چکی تھی۔ اچانک ہی مجھے اپنے ہاتھ پر کسی کی نرم گرفت کا احساس ہوا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ زرمینہ تھی۔

”لیکن بھائی مجھے ماما کی کمی نہیں ہوتی ہے۔ بہت زیادہ۔“ وہ دم لہجے میں سر جھٹکا کر بولی گئی۔

”میںنا تمہیں کیوں ہوتی ہے؟ کیا تانوں اور ماموں تم سے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا وہی سے؟“ میرے پوتے نے گئے سوال پر اس نے ایک دم سے گلی میں سر ہلادیا۔

”کرتے ہیں۔ بہت کرتے ہیں مگر جب میں اور بچوں کو ان کی ماما سے ضد کرتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ کاش میری ماما ہوں۔ میں بھی ان سے ضد کرتی۔“ اس کے بچے میں حسرتیں بول رہی تھیں۔

”تو تم تانوں سے ضد کر سکتی ہو۔ وہ بھی تمہاری ماما کی طرح ہیں۔“ میں نے پیار سے سمجھایا۔

”میں بھائی! واو پوتے ہی ہماری وجہ سے suffer کرتی ہیں۔ میں انہیں اپنی ضد کی وجہ سے پریشان نہیں کر سکتی۔ وہ ہماری اتنی کیئر کرتی ہیں۔ اتنا پیار دیتی ہیں۔ میں ان سے کیسے ضد کر سکتی ہوں ہاں اگر ہماری ماما ہوتیں تو میں ان کو خوب تنگ کرتی۔“ خڑے دکھائی پھر وہ بھی پیرتس ڈے رہی پاپا کے ساتھ آتیں۔ سب کتنا اچھا ہوتا ہے نا۔“ اس کی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ میں نے ذرا جھک کر نرمی سے اس کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں کی پوروں سے صاف کیا۔

پلوٹہ اور شانزے ہم سے کافی آگے نکل گئی تھیں۔

”تم نے کبھی پاپا سے یہ سب کہا ہے۔“ میں نے سوچ کر کہا کیونکہ مجھے ماموں کی بات یاد آگئی تھی۔

”نہیں۔“ اس نے سر ہلادیا۔

”تو کونسا ڈیئر پاپا سے کہو کہ تمہیں بھی ایک پیاری سی ماما چاہیے۔ جو تمہارے خڑے اٹھائے۔ تمہاری ضدیں پوری کرے۔“ میں نے پیار سے اسے آکھایا۔

”یو مین اسٹیب مدر؟“ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ڈیئر ماماں! ہوں۔“ چاہے سگی ہو یا سوتیلی اور پھر ضروری تو نہیں کہ ہر شے بہادر ظالم اور بری ہو۔“ میں نے نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

”یو مین اسٹیب مدر؟“ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”ڈیئر ماماں! ہوں۔“ چاہے سگی ہو یا سوتیلی اور پھر ضروری تو نہیں کہ ہر شے بہادر ظالم اور بری ہو۔“ میں نے نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

”یو مین اسٹیب مدر؟“ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”سب کو چھوڑو۔ تم اپنی بات کرو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تمہیں ماما چاہیے کہ نہیں۔“

”چاہیے۔“

”تو پھر ڈن تو اپنے پاپا سے کہو گی کہ تمہارے لیے ایک پیاری سی ماما لائیں۔“ میرے ذہن میں خالہ کا سراپا ابھر آیا۔

”کیوں وہ کوئی مارکیٹ میں ملتی ہیں۔ وہ خفگی سے بولی۔

”نہیں بھئی ماما دلانا میرا کام ہے تم صرف روزانہ صبح دشا مپا کو تنگ کرو بس۔ پھر دیکھنا تمہارے پاپا تمہارے لیے ایک پیاری سی ماما لائیں گے جو تمہارے خڑے اٹھائیں گی تمہارے اسکول آئیں گی۔ تمہیں چکن یا سٹا بنا کر کھلائیں گی۔“ میں اسے رٹھمن سپنوں میں اچھا رہا تھا اور کچھ دیر بعد وہ واقعی الجھ بھی گئی۔

”مگر بھائی! اس نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ایسی کیئرنگ مدد آئے گی کہاں سے؟“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ تم یہ تانوں شانزے کی خالہ کیسی لگتی ہیں؟“ میں نے اس کی رائے جاننی چاہی۔

”وہ تو مجھے اتنی اچھی لگتی ہیں کہ کیا تانوں۔“ بات کرتے کرتے وہ جیسے اچانک ہی چونک پڑی اور پھر پر جوش لہجے میں بولی۔

”بھائی ہم شانزے کی خالہ جیسی ماما لائیں گے ٹھیک سے بھائی۔ ہمیں ایسی ماما مل جائیں گی نا۔“ وہ بڑی بے چینی سے میرا بازو جھجھوڑ کر پوچھ رہی تھی۔

”ان جیسی تو مشکل ہے۔“ میری بات پر اس پر منہ لٹک گیا تھا۔

”ہاں اگر وہ ہی تمہاری ماما بن جائیں تو؟“

میں نے اوصوری بات چھوڑ کر اسے واو طلب

نظروں سے دیکھا۔ وہ اچھل پڑی۔

”کیا... وہ؟ مگر وہ تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں۔“
وہ پریشان سے لہجے میں بولی تھی۔

”تو تمہارے پاپا کون سا کرنا چاہتے ہیں۔ بس تم اپنے پاپا کو راضی کرو اور میں خالہ کو ڈن؟“ اس نے میرے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”او ان دونوں سے آگے نکلتے ہیں۔“ میں نے اچانک ہی کہہ کر دوڑ لگا دی۔ زرمینہ تو پہلے کھڑی رہی پھر وہ بھی بھاگی۔ ہم ان دونوں کو کراس کرتے ہوئے آگے نکل گئے پیچھے سے شانزے ارے ارے کہتی رہ گئی۔ زرمینہ آج دل کھول کر ہنس رہی تھی اور میرے عمرے پوری کالونی میں گونج رہے تھے۔ جبکہ پیچھے وہ دونوں حیرانی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔



لگے دن میں صبح سو کر اٹھا تو دس بج رہے تھے۔ کچھ دیر بستر پر بڑے رہنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر نیچے اتر آیا۔ نانو چین میں کھڑی دوپہر کے کھانے کی ہدایات دے رہی تھیں میں نے پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”عباس۔“ انہوں نے فوراً گیس کر لیا۔
”کیا ہے نانو اتنی آسانی سے اندازہ لگا لیا۔“ میں ڈائیننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔

”گھر میں اور ہے ہی کون تمہارے سوا۔ ناشتے میں کیا لوگے؟ پراٹھا یا بریڈ؟“ انہوں نے پوچھا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔

”آج تو پراٹھے کھانے کو دل چاہ رہا ہے پراٹھے بنا دیں۔“
”ولی خان پہلے عباس کا ناشتا بنا دو باقی کام بعد میں کر لیتا۔“

خانہ لانا نانو کی بات پر فوراً فریج کی جانب بڑھا تھا۔

”ولی یار! پہلے چائے بنا دو اور باہر لے آؤ میرے دروہو رہا ہے۔“ میں اس سے کہہ کر نانو کے ساتھ باہر

نکل آیا۔

”خیریت بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ نانو فوراً تشویشناک لہجے میں کہہ کر میرے ماتھے پر پھونکنے لگیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ٹھیک ہوں نانو! بس رات ڈرائیٹ سوا تھا اسی وجہ سے طبیعت میں سستی ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“ میں اطمینان سے کہتے ہوئے لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بچے لا پرواہی اچھی نہیں ہوتی۔ صحت کا خیال رکھا کرو۔“ وہ مجھے نصیحتیں کرنے لگیں میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

”اوہ نانو ٹھیک تو ہوں۔ آپ تو ملا سے بھی زیادہ وہمی ہیں۔ یہ بتائیں کہیں جا رہی ہیں؟“ ان کے چیلے پر ایک نظر ڈال کر میں نے اندازہ لگا لیا۔

”ہاں نیلو فر کے گھر جا رہی ہوں۔ بچی کافون آیا تھا۔ کسی ضروری کام سے بلوایا ہے۔“ نانو نے شانزے کی خالہ کا نام لیا۔

”ضروری کام۔“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔
”تم ڈھنگ سے ناشتا کر لینا اور اگر سر کا درد ٹھیک نہ ہو تو ولی سے کہنا تمہیں ٹیبلٹ دے دے۔“ نانو کے کینٹ میں پڑی ہوگی۔

نانو ہدایت نامہ دینے کے بعد وہ چلی گئیں۔ ولی چائے لے آیا۔ میں چائے پیتے ہوئے نورو میں سن رہا تھا جب اچانک شانزے چلی آئی۔

”زبے نصیب نصیب۔“ شانزے نے آج تو بڑی بڑی ہتیاں آئی ہیں۔
”عباس پکیر! اس وقت مجھے تنگ مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت غصے میں ہوں۔“ وہ دم سے صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”خیریت ہے کیوں غصہ ہو؟“ وجہ کچھ کچھ تو مجھے معلوم ہو ہی چکی تھی تفصیل میں اس کے منہ سے سنتا چاہ رہا تھا۔ کیونکہ اتنے دنوں میں اس سے اچھی دوستی ہو چکی تھی۔

”ایک ہی تو وجہ ہے میرے غصے کی اور وہ ہے خالہ

کی خمد شادی۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”شادی شادی شادی میرے تو کان پک گئے ہیں۔“ سن سن کر آخر اور بھی دکھ ہیں زمانے میں اس کے سوایا صرف اور صرف یہ ہی مسئلہ رہ گیا ہے جس کا حل میری شادی ہی ہے۔“

وہ نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھی۔ ولی کے آنے سے بریک لگے۔ وہ ناشتا سرو کر کے چلا گیا تو میں نے اطمینان سے ٹرے کھینچی اور اسے بھی دعوت دی۔

”تھمتکسی ناشتا میں کر چکی ہوں صرف چائے لوں گی۔“ ولی کو آواز دے کر میں نے کپ لے کر کہا۔
”میری جھولی چائے پیو گی۔“ میں نے جھیر اتوہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ ولی کپ لے آیا۔ میں نے چائے ڈال کر کپ اس کے آگے سر کیا۔

”وہے آن چھٹی کپ کی ہے یونور مٹی سے۔“ وہ فائن آرٹس کی طالبہ تھی۔

”بس کیا تاؤں خالہ کی وجہ سے کرنی پڑی۔ انہیں دلو کے ساتھ کہیں جانا ہے اور آج گاؤں سے ہمارے منی کو بھی اتنا ہے سو مجھے گھر پر رہنا پڑ رہا ہے۔“ وہ مڑے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

”کہاں جانا ہے؟ یقیناً کسی لڑکے کا پتا کروانے۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا جو سیدھے نشانے پر جا بیٹھا تھا۔ اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

”کیا تاؤں عباس! میں کس مشکل میں ہوں۔“ چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ کر اس نے بے چارگی سے کہا۔

”تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟“ میں نے سنجیدگی سے اس سے سوال کیا تھا۔

”میں کیسے شادی کر سکتی ہوں عباس خالہ بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ میں ہی تو ان کی شمالی کا سارا ہوں۔ ماما پاپا مجھے اسی لیے تو چھوڑ گئے تھے کہ میں ان کی شمالی بانٹوں کی اب وہ اگر میری شادی کر دیں گی تو خود کتنی اکیلی رہ جائیں گی۔“ وہ بے چینی سے بول رہی تھی۔ میں نے بغور اسے دیکھا۔

”کی وجہ سے کیا کوئی اور بھی ہے؟“

”ایسا مطلب؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”مطلب؟“ میری اور کو تو پسند نہیں کر میں نا۔“ میری بات پر اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

”جی نہیں۔ مجھے ان فضولیات کا کوئی شوق نہیں نہ ہی دلچسپی ہے۔“ وہ ناگواری سے بولی تو میں مسکرا دیا۔

”شکر ہے میرے اللہ اور نہ میں تو بے موت مارا جاؤں۔“ میرے شکرانے پر اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔

”کیا مطلب تمہارا؟“
”کچھ نہیں کچھ نہیں تم یہ بتاؤ اس کے علاوہ تو کوئی اور راز نہیں ہے نا؟“

”اور اگر یہ وجہ بھی ختم ہو جائے تو۔“
”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ اس نے الجھ کر مجھے دیکھا۔

میں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ کر فیکن سے منہ صاف کیا اور پھر بڑے اطمینان سے اسے دیکھا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تمہاری خالہ کی شمالی ختم کر دی جائے۔ یعنی ان کی شادی کروادی جائے۔ تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ میں نے استغما سے لہجے میں پوچھا۔

”یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”تو کیا تم بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہتی ہو کتواری رہ کر۔“ میری بات پر وہ مجھے ٹھورنے لگی۔

”اوکے۔ گھورنا بند کرو اور مجھے اس بات کا جواب دو کہ کیا خالہ کسی سے محبت کرتی تھیں اور اس نے دھوکہ دے دیا تھا؟ اسی بے وفائی کی وجہ سے وہ شادی سے دلبرداشتہ ہو گئی ہیں؟“ میری بات پر وہ چڑ گئی۔

”جی نہیں میری خالہ ایسی نہیں ہیں۔“
”تو پھر کیا انہیں مردوں کی غلامی سے نفرت ہے؟“
”اوفوہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ ماما اور خالہ دونوں ہمیں ہی بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ اس لیے جب ماما کی شادی ہو گئی تو نانا نانو کے پاس

صرف خالہ تھیں۔ خالہ اس وقت پڑھ رہی تھیں پھر ان کے انتقال کے بعد خالہ کو اپنے گھر لے آئیں خالہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد تانا کی زمینوں کا چارج سنبھالنے لگیں۔ اسی دوران پایا وہی شقت ہونے لگے۔ انہوں نے خالہ کو بہت گما کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں مگر خالہ نہ مانیں۔ اوہ ان کی جانب بھی تانا کی زمینیں تھیں بالآخر ماما پاپا مجھے اوہر خالہ کے پاس چھوڑ گئے۔ حذیفہ اور حمزہ تو بہت چھوٹے تھے۔ پھر خالہ کو میری وجہ سے اپنی جانب سے ریزائن کرنا پڑا ان کے خیال میں مجھے ان کی ضرورت زیادہ تھی۔ اب تم خود بتاؤ عباس! انہوں نے میرے لیے اتنی سیکرینٹاز کی ہے تو میرا بھی فرض بنتا ہے تاکہ انہیں یوں تھانہ چھوڑ کر جاؤں۔ وہ جذباتی ہو گئی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے تم کیا نہیں چاہتیں کہ خالہ کی شادی کر دی جائے۔“ میرے استفسار پر وہ فوراً بولی۔

”کیوں نہیں مگر خالہ نہیں چاہتیں۔ انہیں کون سمجھائے؟“

”اس مسئلے کا ایک حل ہے اور اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے...؟“ اس نے بغور مجھے دیکھا۔ میں پراسرار طریقے سے مسکرایا پھر اسے آہستہ آہستہ اپنے پلان کے بارے میں بتانے لگا۔

”کیا...؟“ وہ چیکی۔

”لو فوہ بے وقوف لڑکی! پہلے پوری بات تو سن لو۔“ میں نے جھٹلا کر اسے ٹوکا پھر ساری بات بتانے کے بعد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اب کیا کہتی ہو؟“ میں بڑے فخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند ثانیے مجھے گھورتی رہی پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔

”پورے غیبت ہو تم۔“

”تھنکس۔“ میں سینے پر ہاتھ رکھ کر جھٹکا تھا۔

میرے کہنے پر اس نے اپنے والدین کو فون کیا اور وہ

رو کر التجا کی کہ فی الحال اس کے رشتے کا سلسلہ ملتوی کر دیا جائے۔ اس کے ایگزٹ کے بعد وہ جو دل چاہے کریں۔ وہ مشقی بیٹی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ نہیں بولے گی۔ ابھی یہ سارا سلسلہ اس کے ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی پڑھائی کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کی بحث کے بعد جب اس نے فون بند کیا تو مجھے وکٹری کا نشان دکھایا۔ اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد اب دوسرا مرحلہ تھا دوشی اور مینا کو اعتماد میں لینے کا۔

دوپہر کو کھانے کی میز پر حسب معمول ہم تینوں نے خوب ہنکامہ بجائے رکھا تھا۔ تانو حسب معمول کھانے کے بعد آرام کرنے چلی گئیں۔ میں نے ان دونوں کو لیے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔

”مجھے اور تمہاری زلی آپنی کو تم لوگوں سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

میں نے انہیں بتایا اور اب مجھے شانزے کا انتظار تھا۔ جس کی تشریف آوری ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

”کیسی بات بھائی؟ کہیں جانا ہے؟ جلدی بتائیں نا۔“ ہمیشہ کی جلد باز پلوٹہ کو جاننے کی بے چینی تھی۔ مینا البتہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔

”بتائیے نا۔ بھائی مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔“ وہ پیچھے پڑ گئی تو مجھے اسے جھاڑنا پڑا۔

”صبر کرو بے وقوف لڑکی زلی تو آئے نا۔“ میرے جھاڑنے پر اس کا منہ پھول گیا۔

”آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ چلیے مجھے اب کوئی بات نہیں سننی۔“ میں بھلا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شانزے چلی آئی۔

”بہت جلد تشریف لائی ہیں۔“ میں نے بڑے بیٹھے لہجے میں اس پر طنز کیا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بے نازی سے نظر انداز کر کے دوشی اور مینا کے پاس بیٹھ گئی۔

”ہائے دوشی! یہ منہ کیوں پھلار کھا ہے؟“

”بھائی نے مجھے ڈانٹا ہے۔“ وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

”بھئی دفع کرو۔ تمہارے عباس بھائی کو تو عادت ہے خواہ مخواہ رعب جھاڑنے کی۔ تم انہیں چھوڑو اور جلدی سے موڈ ٹھیک کرو۔“ میرے پاس تمہارے لیے ایک سیکرٹ کام ہے۔“ اس نے دوشی کو پکارا تو سدا کی لیدو نخر س دوشی خوش ہو گئی۔

”کیا سیکرٹ کام؟“ ہم نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر شانزے نے مٹا کھنکار کر مخاطب انداز میں بولنا شروع ہو گئی۔

”تم لوگ جانتے ہو نا کہ خالہ میری شادی کروانا چاہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میری شادی ہو جائے اور میں تم لوگوں سے دور چلی جاؤں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا اور فوراً اس سے پلٹ گئیں۔

”نہیں۔“

”تم لوگ یہ تو چاہتے ہو نا کہ نیلی خالہ کی شادی ہو اور ہم حسب سادہ سارا مزا کریں؟“

”نہیں۔“ انہوں نے زور و شور سے سر ہلایا۔

”تو ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو مجھے تم دونوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ پر اس کر دو کہ تم دونوں میری اور عباس کی مدد کرو گے اور ہم جو کہیں گے وہاں لو گے۔“

شانزے نے ہنسی پھیلائی دونوں نے اپنے ہاتھ رکھ دیے اور ایک زبان ہو کر بولیں۔

”پر اس۔۔۔ ہر بات مانیں گے۔“

”ٹھیک پو۔۔۔ اب تو پر اس کر لیا ہے نا تو اب ہماری ہر بات مانتی پڑے گی اور تم دونوں نے پڑھا ہو گا نا کہ جو پر اس کو پورا نہیں کرتے انہیں توڑتے ہیں انہیں اللہ پاک سخت سزا دیتے ہیں۔ پڑھا ہے نا؟“

دونوں نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلادے۔ میں صرف خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔

”اچھا اب یہ بتاؤ۔ ماما یاد آتی ہیں؟“

”ہاں نہیں۔“ دو متضاد جواب موصول ہوئے۔

شانزے نے بھنوں اچکا کر مجھے دیکھا۔ میں نے کیری آن کا اشارہ کیا۔ وہ پھر سے ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”آپ کو ماما کیوں یاد نہیں آتی؟“ دوشی سے سوال

ہوا۔

”اس لیے کہ میرے پاس داد اور پاپا ہیں۔“ اس نے اپنی دوایت میں پڑھ کر جواب دیا۔

”اور تمہیں مینا کیوں یاد آتی ہیں؟“

”مجھے تو بہت یاد آتی ہیں حالانکہ میرے پاس داد اور پاپا بھی ہیں مگر میرا دل چاہتا ہے کہ کاش ہماری بھی ماما ہو تیں۔“ دوشی نے خوب پیار کرتے لہجے میں کہا۔ پڑا پیک کر کے مجھے منتوں سے کھلاتیں۔ اسٹوریز بھی سنائیں۔ شانزے نے مینا کو دیکھا جو آنکھیں بند کیے جذب سے بولتی جا رہی تھی۔

”اور اگر آپ کو ماما مل جائیں تو۔۔۔!“ اس کی بات پر پلوٹہ نے حیرت سے اسے دیکھا البتہ مینا پر جوش ہو گئی۔ مینا سے میری اس موضوع پر پہلے بھی بات ہو چکی تھی سو اس کی طرف سے میں مطمئن تھا۔

”ہمیں کوئی ماما نہیں چاہیے۔ اسٹیپ ماما گندی ہوتی ہیں۔ مارٹی ہیں Cruel اور Unsensitive ہوتی ہیں۔“ پلوٹہ نے غصے سے یہ بات رو کر دی۔

”جی نہیں۔ سب اسٹیپ ماما گندی نہیں ہوتیں نہ ہی Cruel اور Unsensitive ہوتی ہیں۔ نیلی خالہ ایسی نہیں ہیں۔ ہے نا بھائی۔“

مینا بڑی سادگی اور روانی سے بھانڈا اچھوڑ گئی۔

”نہلی خالہ کا کیا ذکر؟“ وہ مشکوک ہو گئی اور ہمیں دیکھنے لگی۔

”نہلی خالہ ہماری ماما نہیں گی۔ مجھے بھائی نے بتایا ہے۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولی تھی۔

”عباس بھائی! یہ مینا کیا کہہ رہی ہے۔“ مینا کے مقابلے میں وہ ہوشیار تھی اور پھر یوں بھی آج یہ ہی بات ہم ان سے کہنے والے تھے سو میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور نرمی سے بولا۔

”مینا ٹھیک کہہ رہی ہے دوشی۔“ میری بات پر اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

”تمہیں یہ بات بری لگی ہے؟ کیا تمہیں نیلی خالہ پسند نہیں۔“ بولو دوشی میری بات کا جواب دو۔“ اس کی مسلسل خاموشی پر میں نے اصرار کیا۔ وہ پھر بھی محسوس

بیٹھی رہی۔

”وشی گزیا۔ میں کیا بوجھ رہا ہوں۔“ میرے دوبارہ اصرار کرنے پر اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر بے بسی سے بولی۔

”مجھے پتا نہیں شاید مجھے یہ سب سن کر اچھا نہیں لگا یا شاید۔“

وہ ابھ کر بولی۔ اس کے جواب پر چند لمحوں میں اسے دیکھا رہا۔ پھر اس کے جھکے ہوئے سر کو دوبارہ اوپر اٹھا کر کہا۔

”دیکھو وشی۔ خالہ کی ماموں سے شادی اس گھر کے مستقبل کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تم ابھی پھولی ہو ان معاملات کو ابھی سمجھ نہیں سکتیں۔ اس گھر کو ایک عورت کی اشد ضرورت ہے۔“

”تو داد ہیں نا۔“ وہ احتجاجاً بولی۔

”بے شک نانو ہیں مگر وہ بیمار ہیں۔ یہ ان کے آرام کی عمر ہے۔ تم لوگوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں کو لک آختر کر کے وہ کتنا تھک جاتی ہیں لوپر سے ان کا بلڈ پریشر بالی رہتا ہے وہ کب تک یہ سب سنبھال سکتی رہیں گی پھر کل کو تم لوگ بڑی ہو جاؤ گی۔ مسائل بھی اور بڑھیں گے ایسے میں نانو کا کمزور وجود کب تک سہارا دے سکے گا؟“

میں نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ وہ خاموش تھی۔ کچھ بولی نہیں۔

”اور پھر کل کو تم لوگوں کی شادیاں بھی تو کرنی ہوں گی۔ وہ سب کون کرے گا؟“ میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا تو دونوں بلیش کر گئیں۔ گمو ششی نے یہاں بھی من مانی کی۔

”آپ لوگوں ہوں گے نالور شانزے آپنی بھی ہوں گی وہ کر لیں گی سارا کام۔“

”واہ گی۔ میں کیوں ہوں گی؟ میں تو خود اس وقت نہ جانے کس کو پیاری ہو چکی ہوں گی اور تم چاہتی ہو کہ میں صرف تمہاری شادی کے کاموں کی دیکھ بھال کروں؟ کنواری بیٹھی رہوں؟ لو خود تو شادیاں اور شادیوں کی اور میں بڑھی ان کے کام کرنے کو رہ جاؤں گی۔“ شانزے نے

ایسے ہاتھ نچا کر چمک کر بولی کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”تم فکر مت کرو۔ میں کر لوں گا تم سے شادی۔ کیا ہوا جو تم بوزھی ہو چکی ہو گی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ مگر اسے آگ لگ گئی۔

”منہ دھو رکھو تمہ میں کیوں بڑھاپے میں شادی کر لوں۔ اللہ نہ کرے کہ جو ایسا ہو۔“ وہ سخت برامان لگی تھی۔ زمین سے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”آپ کیا کہہ رہے تھے بھائی۔“ وہ اوجھوری بات کو پھر سے وہیں سے جوڑنا چاہ رہی تھی۔ میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان سب مسائل سے بچنے کا حل صرف ایک ہی ہے وہ ہے خالہ اور ماموں کی شادی۔ کیونکہ جب تم دونوں بھی چلی جاؤ گی تو نانو اور ماموں اکیلے رہ جائیں گے پھر ایسے میں کون ان کی دیکھ بھال کرے گا؟“ بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وشی تہذیب کا شکار نظر آ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”اور پھر جب خالہ کی شادی ہم ماموں سے کروالیں گے تو تم لوگوں کی زنی آپنی بھی ہمارے ساتھ آکر رہنے لگیں گی۔“ میں نے انہیں مزید لالچ دیا۔ وہ دونوں نے بے یقینی سے شانزے کو دیکھا۔

”نہیں۔؟“

”آف کورس۔“ اس نے تسلی دے دی۔ میں نے باری باری سب کو دیکھا۔

”تو پھر کیا خیال ہے؟“ انہوں نے شانزے سے شروع کر دیں۔ میں نے خاص طور پر اس نکتے میں پوچھا۔

”آف کورس۔“ شانزے اور مینا چنکیں۔

”اور تم۔“ میری بات پر وشی نے چند لمحوں سے سوچا اور پھر مسکرائی۔

”اوکے۔“

”یہ ہوئی ناپت اور اب مشن کو پلان کرتے ہیں اور ہمارے اس مشن کا نام ہے ملیں گے۔ ملیں گے۔“ میں نے اعلان کیا۔

”چلو عشق لڑائیں۔“ جو اب ”شانزے تیزی سے بولی تھی۔ میں بڑے اسٹائل سے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

”بچلو۔!“

”کہاں۔۔۔“ وہ سمجھی نہیں۔

”عشق لڑانے۔“ میں نے اسے خباث سے آنکھ ماری۔

بچیاں کھی کھی کرنے لگیں اور وہ غضب ناک ہو کر مجھے نشانہ بنانے لگی تھی۔

”لو فر کینے۔“

”ارے ارے! ابھی خود ہی تو وہ بھنگش کی تھی عشق لڑانے کی اور اب خود ہی غصہ ہو رہی ہو۔“ اپنا پچاؤ کرتے ہوئے میں نے ہلکا آہی۔

”ذلیل وہ تو میں نے؟“ مشن کا نام تجویز کیا تھا۔ تم جیسے پونے سے میں مگر کبھی عشق نہ لڑاؤں۔“ اس نے مجھے چڑھایا۔

”اور اب لڑکی۔ تم میری یعنی کہ عباس ظفر کی نو بین کر رہی ہو۔ میں چھ فٹ دو انچ ہینڈ سم ڈیشننگ لڑکا تم کو پورا نظر آتا ہوں۔ گتلیخ! تمہیں اس کی سزا دی جائے گی۔“ میں نے فوراً ”جلالی لہجے میں اسے کہا۔ وہ بڑے اطمینان سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔

”سزا اور تم دو گے۔ جو خود ایک سزا ہے۔“ اس نے میرا مذاق اڑایا۔ میں فوراً ”سگین شکل بنائے اس کی طرف بڑھا اور پھر میں اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

”سزا تو اب تمہیں دے کر رہوں گا اور ایسی سزا ہو گی جس سے تم عمر بھر جھکا رہنا نہ پاسکو گی۔“

میں معنی خیزی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ اس نے فوراً ”سراٹھا کر مجھے استہزا سے انداز میں کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر مجھے اپنی طرف گھورنا یا کہ وہ چپ رہ گئی۔ بچیاں بڑی دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ میں ہنوز اس کی طرف غور سے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں سے تو برداشت کرتی رہی پھر

جھنجھلا کر چلا اٹھی۔

”کیا مصیبت ہے ایسے کیوں میرے سر پر کھڑے

گھور رہے ہو؟“

اس کے گھبراہٹ سے ہونے لگے اور تپے چہرے کو دیکھ کر میں بے ساختہ ہنسنے لگا۔ میرے ہنسنے میں بچوں کی ہنسی شامل ہو گئی میرے تعجب پر اس نے اپنی نجات منانے کو مجھے تین چار منہ سے القابات سے نوازا مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا اور نہ ہی ہنسی ختم ہو سکی۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

اس کے ہاتھ میں تھما کر وہ خود گیت عبور کر گئے۔
میں جو گیت پر ہورہی ساری کاروائی اپنی بالکونی میں
کھڑا دیکھ رہا تھا فوراً نیچے اترا اور لاؤنج میں فردوس
کے سر پر پہنچ گیا جو کارڈ اور پھول میز پر رکھ رہا تھا۔
”میں نہیں شک تو نہیں ہوا؟“

”بالکل نہیں عباس بھائی! میں نے ایسی زبردست
اداکاری کی کہ انہیں مجھ پر ذرا بھی شک نہ ہو سکا۔“ وہ
بڑے نخر سے بولا۔ میں نے ترچھی نظروں سے اسے
دیکھا۔

”گند۔ آئندہ بھی ایسی ہی اداکاری کرنا کیونکہ یہ
تمہارے لیے مشکل کام نہیں۔“ میں نے طنز کیا جو کہ
اسے سمجھ نہ آسکا۔
”بے فکر رہیں صاحب۔“

”وہ تو میں رہوں گا اور اگر تم نے بھانڈا پھوڑ دیا تو
تمہاری ہونے والی زوجہ نسرین کو تمہارے سارے
موبائل انفریجی خبر کروں گا۔“ میں نے دھمکانے
والے لہجے میں خبردار کیا تو وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے
لگا۔

”توبہ کریں جی! میری کیا مجال جو ایسا کچھ کروں۔
میں کوئی پاگل تھوڑی ہوں۔“
”اچھی بات ہے۔“ میں سر ہلا کر وہ چیزیں اٹھائے
ماموں کی اسٹڈی میں رکھ آیا۔



باشتا کر کے میں لان میں آیا تو شانزے چلی آئی۔
”ہائے عباس کیا بنا؟ کیسا رہا؟“ حال احوال پوچھنے
کے بجائے وہ بے صبری سے بولی۔

”ایک دم پر لہکتی تم اپنی سناؤ؟“
”بے فکر رہو۔ وہاں بھی کام ہو گیا۔“ وہ
ہنسی تھی اور مجھے اپنا کارنامہ ستانے لگی۔ میں
نرم نگاہوں سے دھوپ میں دکھتا اس کا شہاب چہرہ
دیکھنے لگا تھا۔ میری محویت اس کی آواز سے ٹپکنے لگی جو
جلانے کو مڑ رہی تھی۔

”ہائے چلتی ہوں۔ کہیں پوائنٹ میں نہ ہو جائے۔“

ہاتھ ہلا کر وہ تیزی سے گیت کی طرف جانے لگی
تھی۔
”کیوں؟ تمہاری گاڑی کو کیا ہوا؟“ میں نے پیچھے
سے چیخ کر پوچھا تھا۔

”سروس کے لیے دی ہے خراب ہے۔ ہائے۔“ وہ
بھی گیت کر اس کرتے جواباً چیخی اور پھر میری نگاہوں
سے اونچل ہو گئی۔

میں بھی اندر کی طرف بڑھ گیا۔ بعد کا سارا وقت
میں نے نانوکے ساتھ ان کے کاموں میں ہیلپ کرتے
گزارا تھا۔ البتہ جب گیارہ بجے نانوا اپنے کمرے میں
چلی گئیں تو میں بیوی کھول کر بیٹھ گیا۔ موبائل نکال کر
میں نے نیلو خالہ کا نمبر نکالا۔ پھر ایک اچھا میوزک
چیلن لگایا۔ اس وقت بہت اچھا گانا آ رہا تھا۔ میں نے
اطمینان سے ان کا لیڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔ ایک ”وو“
تین چوتھی بل پر فون اٹھایا گیا تھا۔

”ہیلو۔“ ان کی سرٹلی آواز ایئر پیس سے ابھری
تھی۔ میں نے جلدی سے موبائل بیوی کے قریب کر
دیا۔ جنید جمشید کہہ رہا تھا۔

کہہ دو جو چھی من میں آئے۔
وہاں سے وہ ہیلو ہیلو کر رہی تھیں۔ پھر خاموشی چھا
گئی۔ میں نے موبائل اسکرین کو دیکھا۔ وہ ابھی تک
لائن پر تھی۔ اور پھر کچھ دیر بعد لائن ٹسٹ کنکٹ کر
دی گئی۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ سو میں صونے پر
اطمینان سے بیٹھ کر گانا سنانے لگا۔

شام کو میری شانزے سے ملاقات ہوئی وہ نانوکے
لیے حلیم لائی کی جو خالہ سے پکا کر بھیجی تھی۔ میں شور
مچانا دماغ میں چلا آیا۔

”جیہا شانزے۔“
”کہاں؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
میں اس کی حیرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سابقہ لہجے
میں بولا۔

”تم چلو تو۔ ستا تاہوں۔“
”جاؤں کہاں بتاؤ تو سہی۔“ وہ نچ ہو گئی تھی۔ میں
نے افسوس سے اسے دیکھا۔

”گھر سے بھاگنے کو نہیں کہہ رہا۔ ضروری بات کرنی
ہے تم سے۔“ نانوکے سامنے ایسی بات پر اس کا منہ
سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کہا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھنے
لگی۔

”عباس! کیا جلدی مچائی ہوئی ہے۔ بچی کو سانس تو
لینے دو۔“

نانو نے خشکی سے مجھے ڈوکا پھر شانزے سے بولیں۔
”نیلو کو کہو کہ میری طرف چکر لگائے نہ۔ وہ تو میرے
لیے عید کا چاند ہو گئی ہے۔“

”فکر مت کریں داد۔۔۔ ایشیا آپ کا دل من و عن
پانچا دیوں گی۔“ شانزے نے آئینہ کھلی دی۔ میں
بڑے صبر سے ان خواتین کی گفتگو سن رہا تھا۔

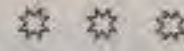
”خاتون! اگر آپ اپنی بات کر چکی ہوں تو چلیں۔“
بالا خر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں چبا چبا کر بولا
تھا۔ میرے تپو دیکھ کر اٹھ گئی تھی۔ باہر لان میں آ
کر وہ بے نیازی سے بولی۔

”جی پھوٹو اب کیا بات ہے؟“
”اب سے۔“ میں نے فوراً ”ڈوکا پھر اسے مشن
کے نئے حصے کے بارے میں آگاہ کرنے لگا تھا۔

”ہوں۔ واقعی اگر جلد مطلوبہ نتائج چاہتے ہیں تو
آئیڈیا تمہارا اچھا ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے تائید
کی پھر جوگی۔

”بیوشی اور مینا کہاں ہیں؟“
”دونوں کی کسی فرینڈ کے گھر گید رنگ ہے وہیں گئی
ہیں۔“

میں چیخ کر اطمینان سے پاؤں پسا کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی
میری تقلید میں بیٹھ گئی۔ پھر اوہر اوہر کی باتوں کے
دوران میں وقتاً فوقتاً ”اس پر بھی نرم نرم نگاہ ڈالنا اپنی
دھن میں مگن اسے کچھ محسوس ہی نہ ہو رہا تھا۔ واقعی
دعا گل تھی۔ میں سر جھٹک کر رہ گیا۔



ماموں کو اگلے دن پھر پھول اور کارڈ بڑے ملے
تھے فردوس نے حسب ہدایت لائسنس کا اظہار کیا۔

اس دن بھی ماموں انکوار کر گئے۔ مگر جب انہیں
مسلل پھول اور کارڈ ملے رہے تو وہ چونک گئے۔ اس
دن بھی وہ ملے کے لیے کارڈ کو کھول رہے تھے اور آج پہلی
دفعہ کارڈ پر نخر، مددرت چند رائیٹنگ میں شعر لکھا ہوا
تھا۔

جو بات کہہ نہیں سکتا اسے میں فرض کرتا ہوں۔
چلو میں فرض کرتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے فرام
سول میٹ نیچے جلی حروف سے لکھا یہ نام انہیں ابھھا
گیا تھا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا پھر کارڈ اور پھول مالی
کو تھما کر چونک کے لیے چلے گئے۔ میں جو روزانہ کی
طرح یہ سارا منظر بالکونی سے دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں جا
کر بسی ٹکن کر سو گیا۔

گیارہ بجے حسب معمول میں نے نیلی خالہ کو فون
ملایا اور۔
اے میرے دل کے چین
چین آئے میرے دل کو دعا کیجیے۔

سنا کر سوچنے لگا کہ ہفتے سے زیادہ تو ہو گیا ہے یہ سارا
سلسلہ شروع کیے۔ اب تو ان پتھروں میں جو تک بڑنی
چاہیے۔ شانزے نے بھی ملاقات ہونے پر بتایا تھا کہ
خالہ نے شکایت کی ہے ڈسب کالز پر کسی کے تنگ
کرنے کی۔

”آہ عباس! تو بھی کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔“ میں
ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔



اس وقت میں کمپیوٹر سے نیلی خالہ کو Admirer
Secret کے نام سے میل کر رہا تھا۔ شانزے
میرے سر پر کھڑی ہدایات دے رہی تھی۔
”دھانسو قسم کی میل ہونی چاہیے۔ جسے پڑھ کر
خالہ جلدی سے پٹ جائیں۔“

”مثلاً یہ لکھوں کہ اے جان من۔ تمہارے
بغیر میں اوہر اوہر ہوں۔ میرے ہتھیے پھڑکے جواب دے
گئے ہیں تجھے پکارتے پکارتے۔ دلغ کا خلل بڑھ گیا
ہے۔ فراق کی راتیں ناگن کی طرح ڈستی ہیں اور مجھے

ایسی فراق چیکے لگوانے پر رہے ہیں۔ میں نے اس کا مذاق اڑایا۔ وہ برائیاں لگی۔
 "میں نے اب ایسی فضول باتیں لکھنے کو نہیں کہا۔ کوئی خوب صورت رومانٹک سی بات لکھو۔" اس کی بات پر میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔
 "رومانٹک؟ تمہیں پتا ہے رومانٹک باتیں کسے کہتے ہیں؟ ہونہ بڑی آئی رومانٹک۔" میں بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میرے جملے کئے لہجے پر وہ حیران رہ گئی۔
 "کچھ نہیں۔" میں منہ پھلا کر کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ یہاں تو چراغ تلے اندھیرا تھا۔ میں دو سرے لوگوں کے دلوں کو ملانے کی کوشش کر رہا تھا اور خود کسی کو احساس ہی دلانے میں ناکام تھا۔

For my soul mate Neelofar

تو صندل کا بیڑ ہے
 میں خوشبو کا چاہنے والا
 میں ایک بے گلے پرندہ
 میرا سفر انجامنا
 میرے چہرے پہ لکھا ہے
 اک اجالا خوبوں جیسا
 تجھ کو رہوں تو مجھ پر رست
 رنگ گلابوں جیسا
 تیرے جسم کی مٹی مٹی سے لپٹوں
 سچ سمندر
 دھوپ کو اوڑھوں اور سو جاؤں
 پہلے پہلے پھول بنوں
 پھر پتھر ہو جاؤں۔

کھٹ کھٹ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے میں اکٹ رہا تھا۔ لطم مکمل ہونے کے بعد میں نے شانزے کو دیکھا۔
 "کیسی لگی؟"
 "اچھی ہے۔ بہت خوب صورت۔" اس نے دل سے داد دی میں گردن اگڑائے Send کرنے لگا تھا۔ مگر

اس کا بانی کا جملہ سن کر میرا دل غمک سے اڑ گیا۔
 "ویسے اس کا مطلب کیا ہے؟"
 "ہائے تیرا کیا بنے گا اے دل۔" میں بے چارگی سے آہ بھر کر رہ گیا۔ پھر اسے دیکھا جو منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
 "تم بس شیلا کی جوانی اور منی بدنام ہوئی ٹائپ کی چیزیں بنا کر۔ یہ باتوق شاعری تمہارے بس کا کام نہیں۔"

میں نے بڑے بیٹھے لہجے میں طنز کیا مگر ادھر ہنوز اثر نہ تھا اتنا وہ جوش سے بتانے لگی۔
 "تم ٹھیک کہہ رہے ہو عباس۔ رینلی یہ شاعری تو میرے سر سے گزر جاتی ہے۔ میٹرک تک بڑی مشکل سے پڑھی تھی۔ تمہیں پتا ہے میرے اردو میں کتنے مار کس آئے تھے؟ 40 ہے نامزے کی بات۔" اپنے کارنامے پر وہ فخریہ مسکراتی تھی۔ میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"وہ مزید گل افشائیاں کر رہی تھی۔ میں آہ پر آہ بھرتا کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے اس طرف گھوما اور استعمالیہ لہجے میں بولا۔

"تو اب ماموں کو تم کیا گانے میل کرو گی؟ ماں دانا لاؤلا بگڑ گیا ٹائپ کے؟" میری بات پر اس نے پریشانی سے مجھے دیکھا پھر میری منت کر کے لگی۔
 "ہائے عباس! اب کیا کروں گی؟ واقعی مجھے تو شاعری آتی ہی نہیں بس اعتبار کی لطم لب پہ آتی ہے دعابن کے تمنا میری یہ ہی زبان آتی ہے اور یہ تو لکھنے سے رہی۔ پلیز دل لپ کر کے، میری؟" اس نے اس طرح مجھے دیکھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ کچھ اکڑ بھی گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں چند اچھی سی نظمیں لکھ دوں گا تم روز میل کر دیا کرتا۔" میں نے کمال سخاوت کا مظاہرہ کیا۔

"تھینک یو عباس۔ آئی ایم ویری گریٹ فل ٹو یو۔ تم بہت اچھے ہو۔" وہ یوں عقیدت مندی کا اظہار کر رہی تھی جسے میں اسے نظمیں نہیں صدارت

سے والا تھا۔ اس کی بے وقوفی و نیاز مندی پر میں دل دہل میں مسکرا رہا تھا۔



خالہ نے جب رات کو میل یا کس چیک کیا تو یہ میل بڑھ کر انہیں جھٹکا گا۔
 "کیوں ہے؟" انہوں نے ذہن میں سوچو نہ ناموں کو کھنگالا مگر کوئی بھی نام کلک نہ کر سکا۔

Soul Mate کے الفاظ اور نچے لکھا۔
 Secret Admirer انہیں اچھا لگے تھے۔ کئی دن سے وہ اسی نام سے کیے وصول کر رہی تھیں اور آج یہ میل۔
 "ہو گا کوئی فارغ شخص۔" سے کوئی اور کام نہیں ہو گا۔ انہوں نے سر جھٹک کر خود کو تسلی دی مگر روزانہ صبح و شام آنے والا میل ان کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر گئی۔ اور ابھی آنے والی میل انہیں مزید پریشانی میں مبتلا کر گئی تھی۔

درد دکھ بے کسی اور تھائی
 میرے چہرے کے سارے رنگ ہیں یہ
 ان رنگوں کو تبدیل جاؤ
 آؤ اور آکر مجھ میں ڈھل جاؤ
 "انتظار کی اذیت میں مبتلا۔"

Secret Admirer کتنی دیر سے اس میل پر نظرس جمائے وہ گہری سوچ میں تھیں۔ جیسی دیوانہ کھول کر شانزے نے اندر چلی آئی تھی۔ انہوں نے میل باکس کھولا کر دیا۔
 "کیا ہو رہا ہے خالہ؟" پیچھے سے بازو ان کے گلے میں ڈال کر وہ لاؤ سے بولی۔

"کچھ خاص نہیں آؤ بیٹھو۔" اس کے بازو گلے سے نکال کر انہوں نے اسے اپنے پاس رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھنے کے لیے نہیں آئی ہوں۔ باہر عباس آیا ہوا ہے واک پر جانے کے لیے۔ آپ کو بھی بلا رہا ہے۔" وہ انکار کرتے ہوئے بولیں۔

"سوری تم لوگ جاؤ۔ مجھے کچھ ضروری سہلو کرنی ہے۔" انہوں نے اسے الٹا کر دیا۔ شانزے ان کے پیچھے لگی۔
 "مجھے کچھ پتا ہے۔ آپ کو جانا ہے۔ بس تو جانا ہے۔" وہ ان کے سر پر سوار خندی لہجے میں بولی۔

"خالد خالہ۔"
 "شانزے۔" اب کے وہ ذرا غصے سے بولیں۔ وہ پاؤں پٹختی دھب دھب کر کے چلی گئی۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ ناراض ہو کر گئی ہے۔ مگر اس وقت وہ اپنی الجھن میں تھیں۔

"بے وقوف، ناگل۔" وہ بڑبڑائیں پھر میل یا کس کھول کر اس ای میل کو دیکھنے لگیں۔ آخر کون تھا جو انہیں روزانہ میل کر رہا تھا اور آج تو شاعری سے ہٹ کر لکھے گئے جملے انہیں پریشان کر گئے تھے۔

شانزے باہر آئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔
 "خالہ نہیں آئیں۔" بچوں نے اس کے پیچھے دیکھا مگر خالہ کو نہ پا کر یو سی گھملا دیا۔

"کیا بنے گا عباس۔" نہ ہی خالہ آنے کو راضی ہوتی ہیں اور نہ ہی عارفین انکل اپنے خول سے نکلنے کو راضی ہیں۔ ہم کیسے ان کی ملاقاتیں کر سکتے ہیں؟ کیسے ہمارا متحن آگے بڑھے گا؟

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے وہ حیرت آواز میں جملے دل کے پیچھو لے پھوڑ رہی تھی۔
 "چلو ہم تم تو مل لیتے ہیں نا۔" میں نے اسے چھیڑنے والے انداز میں تسلی دی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اچانک ہی رک گئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑا کا انداز میں بولی۔

"وہی جو تم دل میں سوچتی ہو اور میں اظہار کر لیتا ہوں۔" میں بدستور غیر سنجیدہ تھا۔
 "کیا ہے بھائی! آپ لوگ رک کیوں گئے ہیں؟"

دونوں ہم سے کافی آگے جا چکی تھیں۔ مڑ کر نہیں

دیکھنے لگیں۔

”آتے ہیں ہم۔ بس تمہارے عباس بھائی کے لگتا ہے اسکو ڈھیلے ہو گئے ہیں۔“ وہ مجھے گھورتی آگے چلنے لگی۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔

”تو تم اپنے پیارے ہاتھوں سے کس لونہ۔“ میری بات پر اس نے بے ساختہ مجھے دو دھمو کے جڑ دیئے۔ ”لو کس لیے ہیں۔“ پلو شہ اور زورینہ کھلکھلا کر لگیں۔ میں اپنی کمر سہلاتے ہوئے وہاں دینے لگا۔

”بے حس، ظالم حسینہ! کچھ تو خیال کرو اتنی سختی سے ہاتھ جڑے ہیں اگر کوئی پرزہ میرا ڈھیلا ہو کر گر جانا تو؟ کل کو یوں بھی تمہیں میرے لیے ہی رہتا ہے پھر کہاں سے میرے اسپین پارکس ڈھونڈتی پھرو گی۔“

وہ مل کھا کے میری طرف مڑی میں نے اس کے تیور بھانپ کر فوراً ”دوڑ لگا دی۔ پلو شہ ڈوشی محفوظ ہوتے ہوئے میرا مورال بلند کرنے کے لیے چیخ رہی تھیں۔ شانزے بھاگتے بھاگتے تھک گئی تو رک کر ہانپنے لگی۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر شرافت سے اس کی طرف بڑھ آیا۔

”کیوں زوجہ! کیا ہوا۔“ مصنوعی تشویش سے میں نے جھک کر پوچھا۔

”عباس۔ پلیز میرا ہاتھ پکڑو۔ مجھ سے تو اب کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔“

وہ پھولی سانسوں کے درمیان رک رک کر بولی تھی۔ منہ اس کا لال ٹماڑ ہو رہا تھا۔ میں ہاتھ بڑھائے اس کی طرف بڑھا تھا۔ وہ ایک دم سیدھی ہوئی اور بازو جکڑ کر مجھے کے مارنے لگی تھی۔

”ڈھیٹ لے شرم۔“ اور میں اس کی چالاکی پر مصنوعی بے چارگی سے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔



نبیلی خالہ اور ماموں کے لیے میل پر میل کیے پر بکے آرہے تھے۔ ناٹو بھی مٹا کر ہو گئیں۔ دونوں

بچیوں نے اچانک ہی ضد کرنی شروع کر دی تھی۔ ہمارا مشن قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ آج میرا شانزے کے ساتھ کچھ خریداری کا پروگرام تھا۔ میں سینی کی دھن پر۔

”خیرے لیے ہے میرا دل میری جان کتناتے ہوئے ان کے گیٹ میں داخل ہوا۔ موسم صبح سے ہی بہت خوشگوار اور تقریباً ہو رہا تھا۔ کالے۔ یا دل آسن پر یہاں سے وہاں انگھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ سبک رو ہوا بڑے دھیمے انداز سے چل رہی تھی اور جسم و جاں کو گدگد رہی تھی۔ میں لان میں داخل ہوا تو بے ساختہ خوشبو بھری ہوا میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ میں گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ ہوا سے درخت ہلکے ہلکے جھوم رہے تھے۔ دل ہی دل میں لان اور موسم کو سراہتے ہوئے میں لاؤنج میں داخل ہوا۔ پورے گھر پہ خاموشی کا راج تھا البتہ بچن سے اشتہا انگیز خوشبو میں اٹھ رہی تھیں۔ میں بچن میں چلا آیا۔

”ہیلو ہوئی فل ایڈریز۔“

بلند آواز میں کہہ کر میں نے اشتہا انگیز خوشبو میں اپنے اندر اتارا۔ نبیلی خالہ اسپرین باندھے برز کے کھڑی کچھ بل رہی تھیں۔ میری آواز پر انہوں نے مسکراتے ہوئے مڑ کر مجھ کو دیکھا۔

”کیا حال ہے عباس۔“

”میرے حال کو چھوڑو۔ یہ بتائیں کیا ایک رہا ہے۔“ میں۔ ان کے تہیب چلا آیا۔ وہ فریج فرائزر مل رہی تھیں۔ میں ایک سے اٹھا کر کھانے لگا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”فریج فرائزر، چکن وائٹ فورم اور ساتھ دم کے کباب ہیں۔ کھا کر چانا۔“ مینو پتا کر انہوں نے مجھے بھی دعوت دے ڈالی۔

”وائے ٹاٹ شیور آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی اتنی خلوص سے دی گئی دعوت میں بھلا ٹھکرا سکتا ہوں؟“

”یہ کہو کہ جہاں کھانا ہو۔ وہاں تو تم بن بلائے بھی

بائے جاتے ہو۔“ شانزے کی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فریج میں سرگھسیڑے بول ٹرتیب سے رکھ رہی تھی۔

”میں جلنے والوں کی باتیں دل پر نہیں لیتا۔“ اسے بے نیازی سے جواب دے کر میں فریج فرائزر کھانا رہا۔

”یہ کہو کہ ڈھیٹ ہو پورے۔“ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر فریج بند کر کے اس طرف آئی۔

”تم جو بھی کہو۔ میں نے کہا نا کہ میں جلنے والوں کی باتیں دل پر نہیں لیتا۔“ اوہ ہنوز اثر نہ تھا۔

”یہ بتاؤ جانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟“ میرے پوچھنے پر وہ بولی۔

”بے بس لہجہ کر لیں پھر نکلتے ہیں۔ تم بیٹھو میں ذرا پیچھ کر آؤں۔“ وہ جو نکل رہی تھی۔ جاتے جاتے دوبارہ پلٹی۔

”میرے کہنے تک فارغ مت بیٹھے رہنا جلدی سے نکل لگاؤ۔“ بے نیازی سے آرڈر دے کر وہ چلی گئی اور اس کے آرڈر کی تکمیل میں شرافت سے نیل سب کرنے لگا۔ خالہ مجھے نوکنے لگیں۔

”یہ لڑکی تو بالکل پاگل ہے۔ تم چھوڑو عباس مہمان ہو تمہ میں خود ہی گرتی ہوں۔“ برز آف کر کے انہوں نے اسپرین اتارا اور مجھ سے پلٹیں لینے لگیں۔

”کوئی مہمان نہیں ہوں میں۔ اتنا سا کام ہے ابھی کرتا ہوں۔ آپ سامن ڈونگولوں میں نکالیں۔ بڑے زوروں کی بھوک لگی ہوئی ہے۔“

میں جلدی مچا رہا تھا۔ پھر کھانے کے دوران میں مسلسل خالہ کو قائل کرنے میں لگا رہا کہ آئندہ وہ بھی ہمارے ساتھ واک پر جائیں گی۔ وہ ٹالنے والے انداز میں مسکراتی رہیں میں برلمان گیا۔

”آپ کو میرے کہے کا ذرا ابھی خیال نہیں؟ چند دنوں کا مہمان ہوں یہاں پر پھر چلا جاؤں گا۔ آپ کچھ دن میری خاطر میرے ساتھ واک پر نہیں جاسکتیں۔“ میرے ایموشنل کبجے پر آخر کار انہوں نے ہائی بھری۔ شانزے نے مجھے دکھڑی کانٹان دکھایا خالہ سے آنکھ بچا کے۔

لہجے کے بعد ہم دونوں شانزے کے لیے اٹل کے تھے۔ موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ شانزے کی گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے پکڑ کر لی جا رہی تھی۔

”تمہارے جلنے میں کتنے دن رہ گئے ہیں؟“ ایک کیسٹ کیسٹ پلیئر میں لگاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ابا! میتھ ڈیڑھ تک آجائیں گی۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔“ میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جواب دیا۔

میری بات پر اس کے چہرے پر ایک سلیپ سا گزر گیا تھا۔ مگر اس نے جلد خود پر قابو پاتے ہوئے لہجہ نارمل کیا۔

”اور اگر اس وقت تک ہمارا مشن ڈیل ایم کامیابی نہ حاصل کر سکا تو؟“

”ڈونٹ پوری۔ ان شا اللہ ہم اس وقت تک کامیاب ہو چکے ہوں گے۔“ میں نے باوثوق لہجے میں کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ آہستگی سے کہہ رہا دیکھنے لگی تھی۔ گاڑی میں جنید جمشید کی آواز گونجی تو میں نے چونک کر شانزے کو دیکھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہ تھی۔ نجانے کن خیالوں میں گم رہا ہو دیکھ رہی تھی۔

”یہ شام پھر نہیں آئے گی۔ اس شام کو اس ساتھ کو۔“ اوامر کر لیں۔ گاڑی کی خاموش فضا میں جتنا گانا میرے دل کی ترجمانی کر رہا تھا۔

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے دو پارہ گردن موٹر کر شانزے کو دیکھا۔ وہ ہنوز کھوئی ہوئی تھی۔ میں گردن سیدھی کر کے ڈرائیو کرنے لگا تھا اور اس گلے کے طلسم میں کھو گیا۔

”بارش۔“ اس کی خوشی سے بھرپور آواز نے یہ طلسم توڑا تھا۔ میں نے نیٹو اسکرین پر گرتے بارش کے قطروں کو دیکھا۔

”تمہیں بارش اچھی لگتی ہے۔“ میں نے گردن موڑتے پوچھا۔

”بہت زیادہ اور خاص کر برستی بارش میں ڈھیر

ساری آکس کریم کھانا۔ وہ بچوں کے سے جوش سے بولی تھی۔ کچھ دیر بعد اچانک ہی میں نے گاڑی جھٹکے سے روک دی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”چلو آؤ تمہیں آکس کریم کھلا تا ہوں۔“ میں نے گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

”اوہ عباس! تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ چمک کر بولی۔ اور پھر اس دن بارش میں بھیجتے ہوئے گاڑی کے بوٹ پر بیٹھ کر ہم نے ڈھیر ساری آکس کریم کھائی اور خوب ساری باتیں کیں۔ ماموں کے لیے ایک بے TCS کروا کر چند سی ڈیز اور پھولی موٹی چیزیں خرید کر گھر آئے تھے۔ وہ شام واقعی ہمارے لیے ایک امر ہو جانے والی شام تھی۔

اس بارش سے جانے والی سرریاں لگتا تھا پھر واپس آجائیں گی مگر رات تک مطلع صاف ہو گیا تھا اور تارے بھی نکل آئے تھے۔ میں ماہی کا فون اینڈ کر کے لاؤنج میں چلا آیا۔ نانو نے کٹنی کا کک میری طرف بڑھا دیا۔ ماموں نیوز سن رہے تھے جبکہ وہ دونوں نانو کے گرد بیٹھی انہیں اسکول کے قصے ساری تھیں۔

”دادو۔۔۔ آج اسکول میں مینا رو رہی تھی۔“ باتوں باتوں میں اچانک پلوٹھ نے نانو کو بتایا تھا۔ نانو کے ساتھ ساتھ ماموں بھی چونک گئے تھے۔

”کیوں میرا بچہ کیوں رو رہا تھا؟“ نانو نے تشویش سے مینا کی طرف دیکھا۔

”وہ دادو! آج میری کلاس میٹ اپنی ماہ کے ہاتھ کا بیگ کیا بڑا لاتی تھی۔ اس نے سب کو نیٹ کر دیا اور مجھے یہ کہہ کر دیا تم بھی کھاؤ۔ کیونکہ تمہاری تو ماہ بھی نہیں جو تمہیں پراکھلا سکے۔ بس یہ بات سن کر مجھے روتا آیا۔“ وہ معصومیت سے سر جھکا کر بولی۔ میں سمجھ گیا کہ مشن ڈیل ایم کے تحت دونوں اپنا کام کر رہی تھیں۔

”اس میں رونے والی کیا بات تھی۔ میں ہوں نانا بی بی کو پراکھلا کے کھلانے والی۔“ مینا کو سچ کر مانو نے

پکارا۔

”مگر آپ کو تو یہ کتنی نہیں آتی۔“ وہ بسوہری اس سے پہلے کہ نانو کچھ کہیں دوشی وہ بارہ سے بولنے لگی۔

”اور دادو۔ اس نے دو دن پہلے ہماری کلاس میٹ زویا کا جرنل بھی بھاڑ دیا تھا کیونکہ اس پر اس کی ماہا نے ڈائیکرام ہٹائی تھی اور ہم نے اسے لٹا دیا تھا۔ وہ تو بے چاری زویا نے ہم کو شکایت نہیں کی ورنہ اسے ضرور سزا ملتی۔“ اس کے دوسرے کارنامے (جھوٹے کوسن کرنا نانو شاک میں رہ گئیں اور ماموں بھی نیوز چھوڑ چھاڑ کر بے یقینی کے عالم میں اپنی ساہو بی بی کے کارنامے سن رہے تھے۔ میں صرف دل میں سرلوہی سکا تھا دونوں کو۔

”یہ میں کیساں رہا ہوں مینا! ماموں کی گونج دار آواز پر مینا بولی۔

”کم ہیرو۔“ وہ مرے مرے قدموں کی ان کی طرف بڑھی۔

”نیل می۔ یہ سب کیا ہے؟“

”وہ۔۔۔ پاپا! آئی وانٹ آندر۔ آئی نیڈ اس بڈر۔“ جھکے سر کے ساتھ وہ بامشکل اپنی مہین آواز میں بولی۔ اس کی بات پر ماموں چپ رہ گئے تھے۔ اسے اپنی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”یو آر اے گردن اپ چائلڈ ٹاڈ اینڈ ٹو لکھو ڈی رنلشی کہ تمہاری ماہ کی ڈیٹہ ہو چکی ہے۔ وہ بڑے ضبط سے بولے۔

”آئی لو پاپا! بٹ وہ میری ماہ تو اہمکتی ہیں نا۔“ اس کے جواب پر ان کے اٹھے پہلے ہو گئے تھے۔ پہلی دفعہ اولاد کی طرف سے انہیں ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا اسے کیسے سمجھائیں۔ چند منٹوں کی گھبر خاموشی کے بعد وہ اس کی باتیں نظر انداز کر کے حکمہ لہجے میں بولے۔

”جاؤ تم دونوں صبح پھر اسکول کے لیے اٹھا نہیں جائے گا۔“ ان کے انور کرنے پر دونوں منہ لٹکائے گڈ بائٹ کہتی چلی گئیں ان کے جاتے ہی نانو شروع ہو

گئیں۔

”دیکھا عارفین! میں نہ کہتی تھی کہ آج نہیں تو اہل انہیں ماہ کی کمی محسوس ہوگی مگر تم ہمیشہ میری باتوں کو نظر انداز کرتے رہے۔“ ماموں نے لی وی آف کر کے جھٹلائی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اہل پلیز! یووس ٹاپک اور رہی بات بچوں کی تو ایک دونوں میں پھر سے ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”کیسے ٹھیک ہو جائیں گی؟ وہ اب بچیاں نہیں رہیں۔ بڑی ہو رہی ہیں۔ ایسے میں ان کی سوچوں کو تم اپنی مرضی سے نہیں چلا سکتے۔“ وہ ماموں کو لٹاڑنے لگیں۔

”تو کیا کردوں میں بھلا چاہتی ہیں آپ کہ جوان ہوتی بچیوں کی مہم جوئی میں شادی رچا لوں۔“ وہ لہج ہو گئے۔

”تو کون سا مگر گزر گئی ہے تمہاری اور ابھی خود ہی انہیں بچیاں کہہ رہے تھے اور اب جوان نظر آنے لگیں۔“ نانو نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ماموں کا اچار چرود کچھ کر مجھے ہنسی آئی۔

”عارفین! میں تمہاری ماہ ہوں۔ بھلائی چاہتی ہوں تمہاری۔ کب تک یونسی اکیلے رہو گے آج جوان ہو۔ کل کو جب بیڈوں میں جان نہیں رہے گی تو کسی سارے کسی ساٹھی کی کمی شدت سے محسوس کرو گے۔ زندگی یوں نہیں گزارنی چاہتی۔“ وہ بڑے سجاؤ سے انہیں سمجھانے لگیں مگر جب وہ بولے تو میرا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

”اچھا اہل سونے چٹنا ہوں۔ شب بخیر۔“

”من بھی رہے تھے کہ میں نے کیا کہا؟“ ان کے انور کرنے پر نانو کو غصہ آیا۔

”جی۔“ وہ ایک لفظی جواب دے کر سر جھکا کر ان سے پار لینے لگے۔ نانو نے ان کو پار تو کر دیا مگر ان کا یوں نظر انداز کر جانا انہیں سخت ٹھٹھا تھا۔ میں نے بھرپور نگاہوں سے جاتے ہوئے اپنے شاندار ماموں کو دیکھا۔ چھ فٹ قد کے ساتھ۔ سر پابست بھرپور تھا۔

”ہمیشہ ہی ایسا کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ میں دشمن

ہوں۔ اب اللہ سمجھائے تو سمجھائے میں تو تھک گئی ہوں۔“ وہ ہالی میں اور مجھے شانزہ کو فون کر کے جاتے کی سیر ہو رہی لائن ہو گئی۔

ماموں کے لیے آنے والے کارڈز اور کچھ نانو کو بھی منگوا کر لے گئے تھے۔

آج میں نے خالہ کو دعوت تھی شام کی چائے کی۔ وہ کل آنے کا وعدہ کر گئیں اور رات کو میں نے انہیں میل کیا تھا۔

تم سے ملنے کی یوں خوشی تو ہے دھڑکا بھی ہے تم نہ آناؤ تم سے ملنے لگی ہے تنہائی زندگی بھی خوشی سی لگتی ہے اب آنکھوں میں انتظار کی بھوت ہم کتب سے جلائے بیٹھے ہیں آہجی جاؤ کہ مدتوں سے ہم اپنا دامن بھیلانے بیٹھے ہیں تم سے ملنے کی آس لیے

جلد ملنے والا Secret Admirer

میل کرنے کے بعد میں نے تصور میں نیلی خالہ کا چہرہ دیکھا جو یقیناً ”یہ پڑھ کر تجس میں مبتلا ہو جائیں گی۔ وہاں سے اپنے کمرے میں آکر میں کل ہونے والی دعوت کے بارے میں سوچنے لگا تھا جو کہ میں چاہتا تھا کہ خالصتاً خالہ اور ماموں کی ہو۔ سچ میں نہ نانو ہوں اور نہ ہم۔“

صبح لاؤنج میں اکیلا بیٹھا میں اسی اوپن میں تھا کہ نانو کو کیسے منظر سے آوٹ کیا جائے کہ اچانک ہی ذہن میں جھمکا ہوا۔ میں دوشی کو آواز میں دینے لگا۔

”جی بھائی۔“ وہ کہیں سے نمودار ہوئی۔

”ادھر آؤ اور جلدی سے بتاؤ کہ نانو کے جاننے والوں میں کون ایسا ہے جو میریس بیمار ہو۔“ اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سامنے بٹھایا میرے سوال پر اس نے

حیرت سے مجھے کھا۔
"کیا مطلب؟"

"اوہو مطلب و مطلب چھوٹو۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" میں جھنجھلا یا۔ وہ سوچنے لگی۔

"لوں۔ ہاں آئی عالیہ۔" اس نے چٹکی بجائی۔
"وہ بہت بیمار رہتی ہیں۔"

"انہیں کیا بیماری ہے؟" میرے اشتیاق سے پوچھے گئے سوال پر اس کا جواب میرا دل گھما گیا۔

"بڑھاپا۔ انہیں بڑھاپا ہے۔"

"اف۔ عقل مند! اتنی خطرناک بیماری نہیں چاہیے۔ ذرا کم خطرناک بیماری بتاؤ۔" بظاہر میں نے بڑے ضبط سے کہا۔ وہ پھر سوچنے لگی۔

"کم خطرناک۔ ہاں آئی ثروت بھی بیمار ہیں۔" اس کے جواب پر مطمئن ہو گیا۔

"شکر ہے اللہ۔" میرے شکرانے پر اس نے حیرت و تاسف سے مجھے دیکھا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے بھائی! آپ ان کی بیماری پر شکر ادا کر رہے ہیں۔"

"خیر اب اتنا بھی سنگدل نہیں ہوں میں شکرانہ تو کسی اور بات کا تھا۔" اور کس بات کا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا۔

"تو کیا آپ دادو کو اسلام آباد بھیجیں گے؟" اس کی حیرت میں ڈوبی آواز پر میں اچھل پڑا۔

"مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ وہ تو اسلام آباد میں رہتی ہیں۔" اس کے اطمینان سے کہنے پر دانت کچا کر رہ گیا۔

پھر کتنی دیر کی مغز ماری کے بعد ایک ایسی رشتہ دار نکل آئیں جو ہارٹ کی ہیشینٹ تھیں اور یہیں رہتی تھیں۔ ابھی ہم میں یہی باتیں ہو رہی تھیں جب ماموں بھی لاؤنج میں چلے آئے۔ نانو کمرے سے نکلیں۔ وہ ہفتہ بھر کی لائڈری جمع کروا رہی تھیں۔

میں آج اسپتال میں تھا جو سب کی پسند پر جی توڑنے اور وحشی خاموش ہو گئے۔ زرینہ نانو کی ہدایت پر کمرے کے باہر لے گئی واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بے

تھا۔

"صاحب جی! یہ پھول آئے ہیں جی آپ کے لیے۔" نانو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کون سے گیا ہے۔" ماموں نے کہا۔

"وہ جی ڈاکہ دے گیا ہے۔" ہائیکے میز پر رکھ کر استفسار طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"اچھا۔ تم جاؤ۔" وہ کچھ رک کر پوچھ کر سر ہلا کر چلی گئی۔ ہم سب کی نظریں ماموں پر پڑ گئیں۔

"پاپا کس نے بھیجے ہیں؟" وحشی کے کی طرف بڑھی۔ نانو بھی مختصر نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ماموں نے بکے اٹھالیا۔

"ڈونٹ نو بیٹا۔" انہوں نے کاؤ نکالا اور کھول کر دیکھا۔ Soul Mate کی جانب سے تھا۔

وصل کے پل نصیب ہوں گے نور
خاطر رہنا بس میرے ہدم

فاصلہ جلد ہی طے کر لیں گے!
رہ جائیں گے دو چار قدم

تم سے جلد ملنے والی تمہاری
Soul Mate

نیچے لکھے الفاظ پڑھ کر وہ چند لمحے گنگ رہ گئے چونکہ تو وحشی کی آواز پر جو بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

"Who is papa"

ماموں نے ہم سب کو ایک نظر دیکھا اور پھر ایک دوست کہہ کر کارڈ انہوں نے سنبھال لیا۔ زرینہ کو بلا کر اپنے اس کے حوالے کر کے اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے تھے۔

"گتا ہے کوئی بہت ہی کلوز فریڈ ہے۔" وحشی نے مستی خیزی سے مجھے دیکھا اور میں ہم انداز میں کھنکار کر رہ گیا۔

چار بجے حسب پروگرام وحشی ہر سال صورت لیے نانو کے کمرے میں پہنچی۔

"دادو دادو۔"

"کیوں بیٹا! کیا ہو آخر پتہ؟" وہ اس کی ہوائیاں اڑی صورت دیکھ کر فوراً "لینے سے اٹھ بیٹھیں۔"

"وہ دادو! ابھی کسی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ خالدہ آئی کی طبیعت سخت خراب ہے لگتا ہے کہ ان کا آخری وقت آپ بچا ہے۔ آپ فوراً پہنچیں۔" اس کی بات پر نانو پریشان ہو گئیں۔

"اللہ خیر کرے۔ اس کی مشکل آسان فرما۔ تم فوراً زرینہ کو بلاؤ کہ میرے کمرے نکالے اور ڈرائیور سے کو گاڑی نکالے۔" وہ بستر سے اٹھتے ہوئے دریا بت دینے لگیں۔ وحشی سر ہلا کر فوراً باہر کی طرف چلی۔

چھ دیر بعد نانو پریشانی میں چلی گئیں۔ ہم نے خوشی سے تعریف کیا۔ پھر میں تانسانا کے سر پر پانچال سے شام کی چائے کی ہدایت دینے کے بعد میں نے شانزے کو فون کر کے حالات سازگار ہونے کی اطلاع دی۔ وہ فوراً حیرت ہو گئی۔

"اب عباس۔ پو آراے وبری جینٹس! سچ تم سے تو میں پچھا کتنیاں بھی جیت نہیں سکتیں۔" اس کی تعریف سن کر بھک سے میرا دل غاڑ گیا۔

"یہ تم میری تعریف کر رہی ہو؟" میں نے چپا چپا کر پوچھا۔

"آف کورس ڈیئر۔" وہ وثوق سے چٹکی میرا موڈ خراب ہو گیا۔

"بس فضول بکو اس بند کرو اور جلد پہنچو۔" اس کی سنے بغیر میں نے کھٹ سے کل ڈسکنٹ کر دی۔

"ہونہ! بڑی آئی۔" دل ہی دل میں ہنساتے ہوئے میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور پھر جب زرینہ نے ممانوں کی اطلاع دی تب میں باہر نکلا۔

بچیاں اور ماموں ان کے استقبال کر رہے تھے۔ بچیاں تو خالدہ کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔ ماموں اخلاقاً "بیٹھ گئے۔ میں نے بڑی گرجو شہی سے انہیں دیکھ لیا۔ سی گرین اور سلور گرے کمر کے سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ میں نے انہیں اطلاع دی۔ نانو گھر پر نہیں ہیں۔ ایمر جنسی میں انہیں جانا پڑ گیا۔

جسے معذرت کر رہی تھیں وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ نانو کو تو ان کے آنے کی اطلاع بھی نہیں تھی۔ خیر میں ہی بولتا ہا زیادہ پوچھنا اور انہوں نے اس کے کالز ڈالے ہیں۔ سڑا لیتے تھے۔ ان کی اس بے نیازی پر میں جل کر رہ گیا تھا۔

شانزے نے تو پور ہو کر بیوی لگا لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے خانساہل کو چائے لانے کو کہا۔ چائے کے دوران بھی ہم ہی بے وقوفوں کی طرح بولتے رہے اور چائے کے بعد بلا آخر میرے ضبط کا بیان لہرز ہو گیا۔ میں نے آنکھ سے ان تینوں کو اشارہ کیا۔

"آؤ تمہیں چڑیا کا گھو تسلا دکھاتا ہوں۔ جو اس نے آج بتایا ہے۔" میرے اشارے کو سمجھتے ہوئے وہ جلدی سے میرے ساتھ باہر نکل آئیں۔

"شاید اب ان کی زبان کے نقل تو نہیں۔" میں بے بسی سے بولا اور پھر گلاس وندو سے ہم سب چپک کر انہیں دیکھنے لگے۔

وہاں سین جوں کا توں تھا۔ کچھ دیر بعد ماموں نے ازراہ موت خالدہ کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر کچھ دیر اوپر اوپر دیکھنے کے بعد خالدہ نے انہیں مسکرا کر دیکھا۔

"لا حول ولا۔" یہ کیا اسما کل ڈے منایا جا رہا ہے۔" میں چڑ گیا تھا۔ شانزے نے مجھے خاموش کروایا۔

"چپ کرو اور اب ذرا دیکھو۔" میں اسے گھور کر اندر دیکھنے لگا۔ جہاں سین میں تھوڑی تبدیلی آئی تھی اب دونوں مسکرانے کے ساتھ چند ایک لفظ بھی بول رہے تھے۔

"ہونہ! یوں لگتا ہے جیسے ایک کہہ رہا ہوں۔ ہائے اور دوسرا کہہ رہا ہو بیلو؟"

"اوہو تم تو صبر کرو۔" وہ مجھے ٹوکے لگی۔ میں پھر سے اندر دیکھنے لگا تھا۔ سین اب کچھ یوں تھا۔ دونوں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کر رہے تھے۔

ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چالی کھو جائے تمہرے نینوں کی بھول بھلیاں میں بولی کھو جائے گلے کی آواز پر ان کے ساتھ ساتھ ہم بھی چونکے

تھے۔ شانزے شاید کوئی گانوں کا چینل لگا چھوڑ آئی تھی۔ جس سے اب بوا شاندار گانا نشر ہو رہا تھا۔ ہم دونوں نے اب کے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مننے لگے۔

ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اندر ماموں شاید ریوٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ جو انہیں سائڈ کی میز پر داخل کیا۔ انہوں نے جلدی سے ٹی وی آف کر دیا۔

”لو جی چھٹی ہوئی۔ کیا تھا جو گانا گارہنے دیتے۔“ مجھے سخت اعتراض ہوا۔

”یہاں کھڑے رہ کر کڑھنے سے بہتر نہیں کہ ہم لان میں واک کر لیں؟“ شانزے کی تجویز معقول تھی۔ ہم چاروں مارچ پاسٹ کرنے لگے۔

”کب ان کی شادی ہوگی عباس۔“ میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے حسرت سے پوچھا۔ ”ہاں۔۔۔ تاکہ پھر تمہارا نمبر آسکے۔“ میری بات پر وہ ہلکی۔

”جی نہیں مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ میں تو شادی کروں گی تو اپنی پسند کے لڑکے سے۔“ ”اور تمہاری پسند کا لڑکا کیسا ہے؟“ میرے پوچھنے پر وہ بڑی اٹھلا کر بولی۔

”ٹام کروڑ جونی ڈیپ شاہد آفریدی مسخین یونڈ جیسے لڑکے مجھے اچھے لگتے ہیں۔“ ”آخ۔۔۔ وہ ناٹا ٹام کروڑ اور جوڑے مند والا جونی ڈیپ اور۔“ میں سب کے عیب گنوائے لگا تھا مگر وہ ٹوک نہ تھی۔

”بس بس ہم کیوں جل رہے ہو۔“ اس کی بات پر میں مل کھا کر رہ گیا۔ ”جلتی ہے میری جوتی۔ شکل دیکھی ہے تم نے اپنی۔ ہونہ نام کروڑ اور شاہد آفریدی۔“ میں نے اس کا مذاق اڑایا وہ اترائی۔

”کیوں نہیں دیکھی۔ اتنی حسین و نازک اندام ہوں۔ ہزاروں لوگ مرتے ہیں۔“ یہاں وہ شی ٹینا پو اس کے پوچھنے پر وہ دونوں اس کی تعریف میں

چھپوں کی طرح رطب اللسان ہو گئیں۔ ”ان معصوموں سے کیا پوچھتی ہو۔ انہیں کیا معلوم حسن کیا ہوتا ہے۔“ میرے کہنے پر وہ چلتے چلتے۔ یکدم میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”اچھا تو کہیں تو پتا ہے ناکہ حسن کیا ہوتا ہے اتم بتاؤ۔ کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“

وہ شہر لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھرپور نظروں اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر میری نگاہیں اس کے چہرے پر ایک ٹکٹ دیکھنے پر وہ ذرا پریشان ہو گئی مگر میری نظروں کا نہ زاویہ بدلا۔ میں یونہی توجہ سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ گھبرانے لگی۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔

”بتاؤ نا۔“ وہ جھنجھالی۔ میں گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم واقعی۔“ میرے گہرے لہجے پر وہ پٹلائی۔

”تم واقعی کبھی کرنے لگیں۔“ ”تم واقعی راحت کی طرح خوب صورت ہو۔“ ”یہ راحت کون ہے؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔ ”یونس مسیح کی بیوی۔“

”اور یونس مسیح؟“ وہ اب بھی نہ سمجھی۔ ”ہمارا جعدار۔“ میرے سنجیدہ لہجے پر وہ ہلے تو کبھی نہیں مگر جب بچوں کو دیکھتے اور مجھے مسکراہٹ ضبط کرتے دیکھا تو آگ بولہ ہوئی۔

”تم خود کون سے خوب صورت ہو۔ کوڑو کی طرح تو تمہاری شکل ہے۔“ ”انہوں نے تو چہرے سے بھی زیادہ ہے۔“ میں اسے جلاتے کو بڑے اطمینان سے بولا۔

”قد سے کیا ہوتا ہے؟ قد تو اونٹ کا بھی لہبا ہوتا ہے۔“ وہ چوٹ کرنے کے انداز میں بولی۔ میں بدستور مسکرا رہا۔ میری مسکراہٹ پر اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ ”دیکھو زیادہ غصہ مت ہو۔ زیادہ غصہ ہونے سے خون جل جاتا ہے اور تمہارا توکل ریڈی جلا ہوا ہے۔“

میرے بچکانے والے انداز پر وہ غصہ سے واک اونٹ کر گئی۔ میں اور بچیاں بھی اس کے پیچھے اندر چلے آئے۔ وہ منہ پھلائے کھنٹی تھی۔ جبکہ ماموں اور خالدہ میں رسمی سی گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ اجازت لے کر چلی گئیں۔

نانو کی آمد رات تو بچے ہوئی وہ دیر تک ہمیں ان کی بیماری کی تفصیلات سناتی رہیں۔ شکر تھا کہ ہمارا بھائی نہیں پھوٹا تھا۔

وہ اور زربند کے گاؤں میں لہجہ رسمی آ رہی تھی دونوں ایک ہفتے کی چھٹی پر پہلے کے تھے۔ لیکن کی ساری ذمہ داری بے چارے نانو پر آ رہی تھی۔ ساتھ والے بیٹے کی فیونہ آئی کی ملازمہ صفائی کرنے ایک دو گھنٹے کے لیے آ جاتی تھی۔ اب ہم روزانہ ماموں اور خالدہ کو رات کے لے جاتے تھے اور انہیں ساتھ ساتھ چھوڑ کر خود ان سے است آگے نکل جاتے۔

میں اور دونوں بچیاں کسی ملنے والی کے گھر چلی گئی تھیں۔ ماموں آئس سے جلدی آگئے تھے اور اب میرے ہاتھ کی بی جو شانہ نما چائے کا گھونٹ بھر کر کھیاں کر کے بیٹھے تھے۔ میں لان میں چلا آیا۔ فردوس نے مجھے ایک گفٹ پیک لاکر دیا۔

”یہ شانزے لی لی چھوڑ گئی تھیں۔“ میں گفٹ اس سے لے کر اندر چلا آیا۔ ”ماموں۔۔۔ ماموں آپ کے لیے گفٹ آیا ہے۔“ دروازے سے نکارتے ہوئے میں اندر چلا آیا۔ وہ ٹھٹھکے میں ان کے پاس گیا۔

”وہ۔“ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے شرافت سے ان کے ہاتھ میں پیک تھما دیا۔ وہ مسکراتے لگے۔ اندر ہی ڈیز تھیں۔

”وادہ سی ڈیز۔۔۔ کس نے بھیجی ہیں۔“ میں نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے سی ڈیز لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ ہلکا سا مجھے دیکھنے لگے۔ ”کوئی بہت سی باتوں انسان لگتا ہے۔“ غلام علی اور

نور جہاں کی غزلوں کی سی ڈیز دیکھ کر میں مکاری سے بولا یہ ہم نے اکٹھی خریدی تھیں۔

”لگاؤں ماموں؟“ ان کے تاثرات سے بے نیاز بولے جا رہا تھا اور پھر ان کو کچھ کہنے کا موقع دے کر بغیر میں جلدی سے سی ڈیز پلیئر میں لگانے لگا اور کسی نے ٹھیک لگتا ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ میں نے تو صرف ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لیے سی ڈیز لگائی چاہی تھی اور جب وہ بچی تو۔

مٹی بدنام ہوئی ڈارنگ تیرے لیے کو نور جہاں کا اور گانا مٹی کا۔ میں نے حسرت سے کور کو الٹا پٹا اور پھر چور نظروں سے ماموں کو دیکھا۔ جو منہ کھولے یہ گانا سن رہے تھے۔ جلدی سے میں نے پلیئر آف کیا اور بو کھلا کر غلام علی کی سی ڈیز لگائی۔

پینڈی اے برسات سے نا جاویں آج رات سے نصیبو نعل، بیج کر برسات کا عندیہ سن رہی تھی۔ کن انکھوں سے ماموں کی طرف دیکھا۔ وہ بت بننے کی بجائے بڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہے تھے اور ان کے سنجیدہ تیور مجھے سنگین کا احساس دلا رہے تھے۔

”وہ ماموں۔۔۔ لگتا ہے غلطی سے کسی نے غلط سی ڈیز بھیج دی ہیں۔“ میں نے گڑبڑاتے لہجے میں کہہ کر دل ہی دل میں شانزے کو کوسا۔ جس نے یہ خرافات بھر کے بھجوا دی تھیں۔ تیسری سی ڈیز جل تو جلالی تو کاورو کرتے ہوئے ڈالی۔ جس پر نینا مائی کی تصویر تھی۔

”اے اے اے“ اے اے اے مزا لے پیار کا جم کے مزا لے۔

”اف شانزے۔“ میں سر پیٹ کر رہ گیا۔ ”عباس یہ سی ڈیز تم رکھ لو۔“

ماموں کی سنجیدہ آواز پر میں نے مرے مرے انداز سے انہیں دیکھا۔ ”یہ تو آپ کے لیے آئی ہیں۔“ ”تجانے کس نے میرے ذوق سے مذاق کیا ہے۔ تم ہی رکھ لو۔ میں اس طرح کے گانے نہیں سنتا۔“ وہ سنجیدہ صورت بنائے اٹھ کر چلے گئے اور میں

فورا غصہ سے بھرا وہ سی ڈیز اٹھائے شانزے کے سر پر پہنچ گیا۔ حالہ کچن میں تھیں اور شانزے لالان میں۔
 ”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے سی ڈیز والہ ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر پوچھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
 ”سی ڈیز ہیں اور کیا ہیں۔ یہ تو میں نے اس کے فردوس کو دی تھیں۔ کیا اس نے ماموں تک نہیں پہنچائیں؟“
 ”اف شانزے کی بیٹی۔ تم نے تو ہمارے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔“ میں سر پیٹ کر رہ گیا۔
 ”کیوں میں نے میں کیا کیا؟ تم نے خود ہی تو یہ سی ڈیز میرے ساتھ خریدی تھیں اور کہا تھا۔ پہنچانے کو وہ خفا ہونے لگی۔
 ”ہاں میں نے خود خریدی تھیں مگر اس میں یہ والے منحوس لگانے نہ تھے۔“ میری بات وہ خاک نہ سمجھی۔
 ”مسئلہ کیا ہے صاف صاف بات کرو۔“
 ”مسئلہ؟“ میں نے دانت پیستے ہوئے ساری داستان الم اسے سنائی وہ اچھل پڑی۔
 ”ہائے اللہ! یاد آیا۔ یہ تو میری فرزند ناکہ کی سی ڈیز ہیں جو اس نے مجھے سنے کو دی تھیں اور وہ مجھ سے کس ہو گئیں۔“
 ”تو ان کو میں اس کی سی ڈیز کا کیا کام؟“
 ”وہ آئی تھی کل میں مصروف تھی تو اسے کماؤ خود ڈھونڈ لے۔ میرے خیال میں اس نے ہی یہ ساری گڑ بڑ مچائی ہے۔“
 ”اور اب اس گڑ بڑ کے بارے میں بتاؤ۔ کیا کریں۔ تم سے تو ڈھنگ کا کام ہوتا ہی نہیں۔“ میں نے بے کلمے لہجے میں اسے گھورا۔
 ”تو اس میں میرا کیا قصور؟ ایک تم اور ایک تمہارے سزمل ماموں۔ اب ان کی پسند اتنی مقدم ہے تو میں کیا کروں۔ بس ہو گیا جو ہونا تھا۔“
 اس کے بے نیاز لہجے پر میں پتھر تو تپ کر رہ گیا۔
 ”تو تمہاری پسند کون سی اعلیٰ درجہ ہے؟ یہ کھلیا

لگانے جنہیں کوئی بھی سنا پسند نہ کرے وہ تم شوق سے سنتی رہو مگر یہ بڑا معاملہ صرف تمہاری لاپرواہی کی وجہ سے ہے۔“
 ”تم کیا چاہتے ہو اب میں ذرا سی بات پر خود کو مار ڈالوں۔ بھئی غلطی ہو گئی اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا ہوا جو غلط سی ڈیز چلی گئیں۔ اب اتنے برے بھی لگانے نہیں ہیں۔ یہ بندے کو ایسے ہی لگانے سننے چاہیں جنہیں سن کر زندگی کا تو مزا آئے گا۔“ وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھی۔
 ”ٹھیک ہے۔ تمہیں تو کوئی گلت ہی نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے یہ سارا ڈرامہ۔“
 میں پاؤں رخ کر وہاں سے چلا آیا۔ وہاں نئی خبر منتظر تھی۔ ماما کا فون آیا تھا۔ بھائی کے جڑواں بیٹے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ماما کو کال بیک کی۔ پھر رات گئے تک نانو پچیاں اور میں کمپیوٹر کے آگے بیٹھے رہے۔ ویب کم کے ٹھرو ہم نے براہ راست بھابھی اور بھائی سے بات کی۔ شانزے کو پتا چلا تو اس نے بھی مجھے مبارکباد دی جو میں نے پھولے منہ کے ساتھ قبول کی تھی۔
 اگلے دن میں نے سب کو ٹرسٹ دی۔ خالہ اور ماموں کو بھی زبردستی گھسیٹ لیا اور ہوٹل میں جب شانزے نے بڑی اداسی سے پوچھا۔
 ”کہ اب تو تم جلد چلے جاؤ گے باعہاس۔ تم ہمیں پاؤ کرو گے؟“ تو میرے جواب پر اس کی آنکھوں میں نمی جھلکانے لگی تھی۔
 ”ہاں ہاں کیوں پاؤ نہیں کروں گا۔ سال کے سال تمہیں فون لازمی کروں گا اور اپنی شادی پر بھی ضرور اوائٹ کروں گا آخر کو اس وقت تک تم میری رشتہ دار بن چکی ہو گی۔“ پھر اس کے بعد وہ بڑے ضبط سے سارا وقت بیٹھی رہی تھی۔
 پچیاں خالہ سے ضد کر کے کھانا کھا رہی تھیں اور ماموں بے چارے شرمندہ ہوتے رہے۔ واپسی پر ہمیں پتا چلا کہ نانو کالی بی ایک دم شوٹ کر گیا تھا۔ ڈاکٹر ان کو دیکھنے آیا تھا۔ ہم سب پریشان ہو گئے۔ ان کی

طبیعت رات گئے تک سنبھلی تھی مگر صبح بڑا تیز بخار چڑھ آنا ہم سب بوکھلا گئے۔ اس دن پچیاں سوکھے منہ اسکول گئیں۔ میں نے جیسے تیسے سب کے لیے ناشتا بنایا مگر کسی کو پسند نہ آسکا۔ ماموں کو تسلی دے کر میں نے آفس بھیجا اور پھر نبلی خالہ کو فون کر دیا۔
 نانو کی بیماری کا من کر وہ دوڑی چلی آئیں اور پھر آتے ہی انہوں نے گھر کا چارج سنبھال لیا۔ نانو کو برہیزی بنا کر انہوں نے وہ سارا رات کے لیے ہی کھانا بنا دیا تھا۔ میں ان کا منہ ہونا مارا اور مجھ سے خفا کہ وہ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ شام تک نانو کی حالت پھر بگڑ گئی۔ میں نے ماموں کے ساتھ انہیں ہسپتال پہنچایا۔ تین گھنٹے کی رخصت کے بعد جب ہم گھر آئے تو شانزے اور خالہ پچوں کے ساتھ تھیں۔
 ”کیا پتا پتا کر کے؟“ مجھے دیکھ کر شانزے چھوٹے سے بولی تھی۔
 ”میں نے خراب ہے اور اسی وجہ سے بخار ہے۔“
 میں اسے بتانے لگا تھا۔ نبلی خالہ کھانا گرم کر لائیں۔
 ”عہاس عارفین کو بھی بلا لو۔ پچیاں بھی ابھی تک بھوکی بیٹھی ہوئی ہیں۔“ ان کے بتانے پر میں ماموں کو بلائے گیا جو ہاتھ منہ دھونے اپنے روم میں گئے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر پچیاں تو سونے چلی گئیں۔ میں نانو کے کمرے میں چلا آیا۔
 ماموں ان لوگوں کو ذرا بے کرنے چلے گئے۔ وہ رات میں نے نانو کے کمرے میں گزار دی تھی۔ اگلے دن نبلی کا فون آ گیا کہ وہ مزید ایک ہفتہ تک نہیں آسکتا۔ میں جو اسے فوراً آنے کو کہنے والا تھا۔ کچھ سوچ کر جب وہ گیا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے موقع ملا تھا۔ ہمیں گھر کو سنبھالنے کے لیے نبلی خالہ کی خدمات حاصل کر کے میں ماموں اور خالہ کو ایک ہی ٹریک پر لا سکتا تھا۔ ان میں اب وہ تکلف تو رہا نہیں تھا۔ آنے والے دو دنوں میں خالہ بڑے خلوص سے نانو کے گھر کو سنبھالتی رہیں ماموں ان کے بہت مشکور تھے۔ پچیاں بھی ان کے آنے سے مطمئن ہو جاتی تھیں کیونکہ نانو کی بیماری

نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔
 ابھی نانو کی طبیعت تھوڑی سنبھلی ہی تھی کہ اچانک ہی نبلی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس دن اسکول سے آکر اس نے دو مشنگ کیں۔ پھر بغیر کچھ کھائے وہ سو گئی۔ شام تک وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ اس دو سری افطار پر ماموں بوکھلا گئے۔ نبلی خالہ اپنی زمینوں کے سلسلے میں آج گاؤں گئی ہوئی تھیں۔ وہ بے چاری کئی دنوں سے اپنا جاننا نانو کی وجہ سے منسوخ کئے ہوئے تھیں آج نانو کی طبیعت تھوڑا سنبھلی تو وہ چلی گئیں۔
 مینا نے بخار کی وجہ سے ضد شروع کر دی۔ ماموں پریشان ہو گئے۔
 ”میں تھوڑا سا کھاؤ۔ پھر وہ ابھی بھی پنی ہے نا۔“
 وہ منت کر رہے تھے مگر وہ مسلسل ضدی لہجے میں انکار کر رہی تھی۔ ٹھک کر ماموں نے مدد طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں ان کی مدد کو آگے بڑھا۔
 ”میں گریبا! کھالو ضد نہ کرو۔ پھر کیسے اچھی ہو گی تم۔“ میں نے دلہے کا چمچہ اس کی طرف بڑھایا۔ جو ماموں نے پکایا تھا۔ اس نے ہاتھ سے پرے ہٹا دیا۔
 ”مجھے ماما کے ہاتھوں سے کھانا ہے۔“ اس کی بڑکانہ ضد پر ماموں کو غصہ آ گیا تاہم وہ بڑے ضبط سے بولے۔
 ”ماما نہیں ہیں تمہاری۔ چلو کھاؤ۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے اور نہ ہی تنگ۔“ مینا ان کی بڑی صابر اور سادہ بیٹھی تھی مگر آج اس کا مزاج عجیب ہو رہا تھا۔ یہ سب شاید میری برین واشنگ کا اثر تھا۔
 ”میں نہیں ہوں اچھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں ہے مجھے ماما چاہیے۔ بس میں نے کہہ دیا مجھے ماما چاہیے۔“
 اس کی ماما کی تکرار پر وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ماموں کی طرف میں نے دیکھا۔ وہ بہت غصہ ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ صورت حال بگڑتی میں نے ماموں کو تسلی دے کر چلا گیا۔
 ”آپ جائیں ماموں۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔“
 وہ میرے کہنے پر چلے گئے تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم میری پیاری بہن ہو بیٹا۔ میری خاطر تھوڑا سا کھالو۔“ میں نے نرمی سے اسے آگاہ کرنا چاہا تھا۔ پھر بڑی دقتوں سے وہ تھوڑا کھانے پر آمادہ ہوئی۔ اسے مشکلوں سے دو انیاں دے کر میں کمرے میں آ گیا تھا۔



صبح ناشتے کا مسئلہ تھا۔ نانو کے لیے ماموں نے پوریج بنا لیا اور ہمارے لیے انڈہ اور ٹوسٹ کا ناشتا دیا۔ اسٹول چلی گئی۔ ماموں کی آج بہت ضروری میٹنگ تھی۔ وہ مجھے ڈھیروں ہدایات دے کر آفس گئے تو میں نے مینا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ سو رہی تھی۔ بارہ بجے خالہ چلی آئیں۔

”آگئیں آپ گاؤں سے؟“ میں نے انہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر کے کاموں سے فارغ ہوئی ہوں تم بتاؤ ناشتا کیا؟“

”کہاں کیا۔ نانو کے لیے تو ماموں دلہ بنا گئے اور مجھے سوکھے سزے تو س کھانے پڑے۔“ میں نے مقلوبیت سے آہ بھری۔

”خیر تم فکر نہ کرو۔ ابھی کچھ بتاتی ہوں تمہارے لیے۔“ بچیاں کہاں ہیں۔ ”وہ یکن میں چلی آئیں میں ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور مینا کی طبیعت کے بارے میں بتایا۔ وہ سن کر تشویش کا اظہار کرنے لگیں اور پھر اس کے کمرے میں چلی گئیں اور واقعی ان کے ہاتھ میں جلوہ تھا۔ سب کچھ منٹوں میں ٹھیک ہو گیا۔ مینا نے خاموشی سے ان کے ہاتھ سے کھالیا۔ کام ہال نے ٹھیک ٹھیک صفائی کی نانو اٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگیں۔ وہ انہیں خوب دغا میں دے رہی تھیں۔ جبکہ خالہ انکساری سے سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

دوپہر کے بعد وہ چلی گئیں۔ ماموں میٹنگ اینڈ کر کے فوراً چلے آئے تھے۔ رات تک اس کا درد رہا۔ مگر رات کے کھانے پر مینا نے پھر ضد شروع کر دی۔ میں نے جلدی سے خالہ کو فون کھینک لیا۔

”مینا اسٹاپ ناؤ۔ تم کوئی جگہ نہیں ہو۔ کہاں سے

لاؤں تمہارے لیے ماما؟“

وہ اس پر برس پڑے تھے۔ وحشی سہم گئی جبکہ مینا اندر سے چیخی۔

”آئی ڈونٹ کیئر۔ آپ ماما کہاں سے لاتے ہیں۔ مجھے بس ماما چاہیے۔“ اس کی بات پر ماموں کی تیوری چڑھ گئی۔

”بس بہت سن لی ہیں تمہاری باتیں۔ اب خاموشی سے کھانا کھا کر دو بیوی۔“ اسی وقت نیلی خالہ اندر داخل ہوئیں پیچھے شانزے تھی۔

”میں چپ نہیں رہوں گی۔ آپ نیلی خالہ کو میری ماما بنالیں اگر آپ کو اور کہیں سے ماما نہیں مل رہیں۔“ اس کی بات پر سب سنانے میں رہ گئے تھے۔ میں نے شانزے کو دیکھا جو منہ کھولے مینا کو دیکھ رہی تھی۔ ماموں بس مینا کو گھورے جارہے تھے۔ وحشی خوفزدہ تھی جبکہ نیلی خالہ وہ تو بہت ہی کھڑی تھیں۔



اندر بارہ ایک افزا آفری لہجی ہوئی تھی۔ میں گنگلاتے ہوئے لاؤنج سے گزر کر جب ماما کی آواز آئی۔

”تم تو نمی انڈر پیر گھوم رہے ہو۔ جلدی جا کر تیار ہو۔ مہمان آنے ہی والے ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر غرور سے نانو کے کمرے میں گھس گئیں۔ میں گنگلاتے ہوئے ”بھائی۔ مجھے یہ چوڑیاں پڑھائیں۔“ مینا زیادتی صورت بنائے آکھڑی ہوئی۔ میں گنگلاتے ہوئے اس کے لیے اسے چوڑیاں چڑھانے لگا۔

”مینا ڈرا احساس کو تو کر۔ مہمان آنے والے ہیں۔ وہ لوگ کب تک نانو آئیں گے۔“ نانو نے کمرے سے نکل کر آ رہا۔ ماموں میں فون اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔

”میں نے سنا ہے والی ہیں نانو۔ راستے میں ہیں۔“ میں نے انہیں تسلی دی اور اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

وقت کم تھا اور سب ہی تیار ہو رہے تھے۔ ایک صرف میں ہی یوں لندورا گھوم رہا تھا۔ آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے یہ سب کیا ہے۔ تو جنتاب آج عارفین ماموں اور نیلی ماما کا ولیمہ ہے۔ جی ہاں

حیران مت ہوں آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ سب کیسے ہوا؟ تو آئیے میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔ مینا کی اتنی بڑی بات پر ماموں خالہ سے سخت شرمندہ ہو گئے تھے اور جواباً ”اسے کچھ سخت کہنے ہی والے تھے خالہ نے انہیں روک لیا۔“

”آپ سب جائیں۔“ مینا کی نظر ہر سکون آواز پر ہم سب باہر چلے گئے۔ پھر اسی رات نانو نے ماموں کو اپنے واسطے دے لیے کہ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تم مان جاؤ اور شادی کر لو۔ اس کمرے کا ایک عورت کی سخت ضرورت ہے۔ ماموں نے اسے ہی اپنے ہونے والے نانو کے کمزور لیجے پر مینا کو گھرتے ہوئے دیکھا۔

”ایسی باتیں مت کر رہو ماما۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ آپ سب کچھ ہو جائیں گی۔“

”یعنی کہ تم میری بات نہیں مانو گے؟“ نانو کے باپوں نے سب کچھ وہ چپ رہ گئے تھے۔ مگر جب نانو کالی پی ایک دم سے پوچھا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”میں نے نانو سے وعدہ کر لیا کہ جو وہ کہیں گی وہ مانیں گے۔“

ادھر نیلی خالہ نے دو رات مینا کے ساتھ گزارا اس کے بعد وہ تب تک آئی رہیں جب تک وہی اور زریہ نہ آگئے۔ مگر ماموں ان کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے۔ ماما نانو آ رہا تھا۔ پاکستان آچکی تھیں اور مجھے گھر آنے کو کہہ رہی تھیں۔ جس دن مجھے جانا تھا۔ اس رات میں اپنے کمرے میں کھڑا پیکنگ کر رہا تھا جب وہ احمق فریڈس کارڈز پکڑے چلا آیا۔

”صاحب جی! آپ تو جا رہے ہیں۔ میں ان کارڈوں کا کیا کروں؟“ میں نے ایک نظر ان کارڈز پر ڈالی پھر اسے روکھا۔

”یہ تم اپنی منگیت کو دے دینا۔“ اور میری بات پر وہ خوشی خوشی کارڈز اٹھا کر بھاگ گیا۔

مگر رات کو ہونے والی پیشی نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ احمق یہ کارڈز اٹھا کر مزے سے جا رہا تھا جب ماموں سے اس کا سامنا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے کارڈز ان کو چوکا گئے۔ پھر کچھ تھوڑی سی لغبیش سے ہی

اس نے سب کچھ اگل دیا۔ ادھر جس رات مینا نے سب کے سامنے نیلی خالہ سے شادی کی بات کی تھی اسی رات مینا خالہ نے نرمی و شفقت سے اس سے ہمارا راز انکشاف کیا۔ مینا ان کی محبت اور اپنی سادگی میں سب کچھ متاثر ہوئی۔

اور جب میں ان کی عدالت میں کھڑا تھا تو دونوں بہت کمبھیرا اثرات لیے مجھے دیکھ رہے تھے۔

”ان سب کا مقصد کیا تھا؟“

”وہ ماموں۔“ میں ڈر کر کا پھر اچانک ہی جرات سے بولنا شروع ہو گیا۔

”ماموں میرا مقصد ایسے دو انسانوں کو نارمل زندگی کی طرف لانا تھا جو بظاہر اپنے خول میں بند تھے اور اپنے پیاروں کو اذیت پہنچا رہے تھے۔ جو یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی دنیا میں خوش وطن ہیں۔ جو دنیا دکھلوے کو مطمئن نظر آتے تھے مگر درحقیقت وہ خود غرض و بے حس تھے۔“

میری بات پر دونوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں ان کے تاثرات سے بے نیاز بولتا رہا۔

”جی ہاں۔ آپ دونوں بے حس ہیں جنہیں اپنے پیاروں کی پروا نہیں۔ جو ان کی ادھوری تنہا اور نامکمل زندگی دیکھ کر دکھی ہیں۔ آپ دونوں خود غرض اور خود فریبی کے خول میں بند ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ آپ کا فیصلہ ہی درست ہے اور آپ اپنی اکیلی دنیا میں خوش ہیں۔ مگر نہیں آپ دونوں ہی غلط ہیں۔“ میری جذباتی آواز کا گلا ماموں نے گھونٹا۔

”تو جنتاب! جو کچھ آپ کرتے پھر رہے تھے وہ درست تھا؟“ وہ طنز لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

”اب وہ غیر جذباتی بندوں کے جذبات ابھارنے کے لیے یہ سب کرنا تو مجبوری تھی۔“ میں دھشائی سے بولا۔

”تمہارے خیال میں ان حربوں سے تم ہمارے جذبات میں پھیل چکا رہے تھے؟“

”یقیناً! بلکہ جی بھی تھی۔ کیوں نیلی خالہ؟ آپ تجسس میں مبتلا نہیں ہو گئی تھیں؟“ میں نے ایک

دم ان سے پوچھا وہ گڑبڑا گئیں۔

”میں۔ میں تو۔“

”تم انہیں چھوڑو۔ مجھے بتاؤ ان خرافات سے تمہیں کیا حاصل ہوا۔“ ماموں نے انہیں خاموش کروا کر مجھے گھورا۔

”یہ نا انصافی ہے میرے ساتھ شانزے بھی اس کیم میں شامل تھی۔ اس سے بھی۔ جو اب وہی کریں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”اسے تو میں گھر جا کر اچھی طرح سمجھ لوں گی۔“ خالہ نے سنگین لہجے میں کہا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔

”اب کیا کہتے ہو؟“ ماموں کا سوال ہنوز تھا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ دونوں کو برا لگا تو آئی ایم سوری مگر مجھے اس پر کوئی گت نہیں کیونکہ میرا مقصد نیک اور نیت صاف تھی۔ یہ سب میں نے خلوص دل سے کیا تھا تاہو“ شانزے اور میناوشی کے لیے۔ ”میری بات بر ماموں مجھے گہری نظروں سے دیکھتے رہے۔ نیلی خالہ کسی سوچ میں غرق تھیں۔ کتنے لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولے تو یہ۔

”اوتے جاؤ تم“ اور میں نکل گیا۔ پھر سب کو اس چھوڑ کر اور خود بو۔ محل دل لے کر اچی آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد دن بہت پھیکے پھیکے گزر رہے تھے کہ اچانک تانوکے فون نے نہوہا کہ کر دیا۔

”ماموں نے شادی کے لیے رضا مندی دے دی۔“ اور پھر سب کچھ ہوتا چلا گیا۔ ماما کا بس نہ چل رہا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائیں۔

جہا تکیر بھائی کا فون آیا کہ وہ جلد آنے والے ہیں شادی ان کے آنے پر کی جائے۔ وہاں سے شانزے کے ممالیا دو فیملی کے آرہے تھے۔

شادی کی رسومات پر میرا ماموں سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا۔ وہ مہندی کی رسم کے خلاف تھے بھول ان کے کہ اب اس عمر میں یہ رسم کرتے تو وہ مجھے تھوڑی لگیں گے۔ وہاں سے شانزے کی خالہ سے بحث ہوئی۔ جو خود

بھی اس رسم کے حق میں نہ تھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہ رسم نہیں ہوگی۔ کل ماموں کی بارات تھی اور آج ان کا ولیمہ اور اب وہ اپنی زوجہ محترمہ نیلو فر کو پارلر سے لینے گئے تھے اور جلدی جلدی تیار ہوتے میں سوچ رہا تھا کہ لگے ہاتھوں میں بھی مٹلنی گروالوں۔ بلیک تھری پیس فریج کالر کے سوٹ میں میں بہت چند سم لگ رہا ہوں۔ ماشاء اللہ۔

”عباس! جلدی سے عارفین کو فون کرو۔ کہاں رہ گئے ہیں یہ لوگ۔“ ماما دروازے سے سر اندر گھسائے بولیں۔ پھر اسی جگت میں چلی گئیں۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ کیسی ماں ہے میری جو اپنے اتنے خوبو بیٹے پر کوئی دم چھونک ہی مار کر نہیں لگیں۔

”ہونہ۔“



تقریب اپنے عروج پر تھی۔ نیلی ماما ماموں کے ساتھ تھی شاندار لگ رہی تھیں بچیاں ان کے ارد گرد منڈلا رہی تھیں۔ جبکہ شانزے سی گرین لانگ شرٹ اور گولڈن کلر کے ٹیل پوٹم میں کام سے بھرا ہوا سنبھالے ادھر سے ادھر چکراتی پھر رہی تھی۔ میری نظریں اسی پر تھیں جب اچانک بچوں سے بے زار فون بھا بھی نے چھوٹا بار میری گونڈ لایا۔

”ذرا اسے سنبھالو۔ کچھ کرنے ہی نہیں دے رہا مجھے۔“ میں اس افتاد پر بوکھلا گیا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع دے بغیر وہ اسٹیج کی جانب بڑھ گئیں۔ پیچھے ریس کر رہا رہ گیا۔

”بھائی۔“ میں نے وہائی دی مگر کوئی شتوئی نہیں ہوئی۔

”میرا راجہ مجھے بھی تو دیکھو۔“ جہا تکیر بھائی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ دیکر کہہ کر لی دی۔

”خیر اپنی تو بات ہی مت کریں۔ یہ آپ کا اپنا ہی کارنامہ ہے۔“ میں نے جل کر بچوں کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے فلک شگاف تہقہہ لگایا۔

”تو تم بھی ایسے کارنامے کرو۔ تم پر کوئی پابندی تھوڑی ہے۔“

”کیسے کر سکتوں۔ میری کارنامہ کرنے والی مجھے دکھائی نہیں دے رہی۔“ میں نے متلاشی نظروں سے شانزے کو کھوجا۔ بھائی سمجھ کر مسکرا دیے۔

”ارے شانزے۔ ادھر تو آنا ذرا۔“ بھائی نے دور کھڑی شانزے کو بلایا۔ وہ چلی آئی۔

”جی بھائی۔“

”بھئی تم دونوں کب کارنامے کرنے والے ہو گے کیونکہ عباس کو تو بہت ہی جلدی ہے۔ ان کے شرارتی لہجے کو وہ خاک نہ کر سکتی۔“

”کیسے کارنامے؟“

”بھائی۔“ اس سے پہلے کہ بھائی مزید گل افشانی کرتے میں فرار ہو رہے تھے چلے گئے شانزے نے حیرت سے منہ دیکھا۔

”بھائی بھائی کیا کہہ رہے تھے؟“

”جو بھی کہہ رہے تھے تمہارے سمجھنے کا نہیں ہے۔ تم یہ جاکو کہ اب بھی تمہاری پسند وہی ہے نام کروڑو غیر؟“ کہنے پر وہ بڑے فخر سے مسکرائی۔

”بالکل۔“

”تو پھر میرا کیا بنے گا۔ میری پسند تو یونس مسیح کی زوجہ ہے جو تم سے ہو ہوتی ہے۔“ میری بات پر اس کا موڈ بگڑ گیا۔

”ہاں تو کرو اس سے شادی میں نے روکا تھوڑی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم راضی ہو۔“

”مطلب۔“ وہ تیوری چڑھائے بولی۔

”مطلب یہ کہ اس کی صورت تم سے ملتی ہے اور وہ تو شادی شدہ ہے اب صرف تم ہی بنتی ہو اور تمہیں کوئی اعتراض بھی نہیں۔“

”عباس تم تم بہت ہی کہینے ہو۔“ میری بات پر وہ خفا نظر آنے لگی۔

”جیسا بھی ہوں۔ اب تو تمہارا ہوں۔“ میں نے خفا سے اسے آنکھ ماری۔ وہ اچانک ہی مجھے مارنے

کو لپی تھی مگر وہ کہ لوگوں کا خیال آتے ہی رک گئی۔ میں اس کی بے بسی پر کھل کر ہنسنے لگا تھا مگر اچانک ہی باہر کے رونے کی آواز سن کر میں اس پر جھکا۔

”کچھ دیر اسے تو پکڑو۔ بھابھی بھی مجھے کیا کام سونپ گئی ہیں۔“ میری التجا پر وہ مزے سے بولی۔

”تم ہی سنبھالو۔ اچھا ہے ابھی سے پریکٹس ہو جائے گی۔“ بات کرنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔ میری معنی خیز مسکراہٹ میں اس کی جھینپی جھینپی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔ جبکہ ننھا باہر سب باتوں سے بے خبر حلق پھاڑ رہا تھا۔ آج کی رات واقعی رگڑوں میں ڈوبی رات تھی جو میری زندگی کو خوشی کا رنگ دے گئی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ رضیہ جمیل 300 روپے

اے محبت تیری خاطر شازیہ کھنول شازیہ 225 روپے

مکتبہ اے کاتب مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

سائلگرہ خدین



ام شمامہ

گنگوڑی سی پادے

وہ تک سبک سے تیار ہو کر ہاتھ میں گفٹ تھاٹے کوٹھی میں داخل ہوئی ہر طرف رنگ و نور کا میلہ ساگا ہوا تھا۔ سارا لائن برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا لال رنگ کے پھولے ہوئے دل غباروں کی صورت قدموں میں دل رہے تھے سائینڈ ٹیمبل پر رنگ برنگے ریپرز میں لپٹے مختلف سائز کے بیش قیمت تحفوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا سینٹر ٹیمبل پر شرکی سب سے ہنستی اور اچھی نیکری کا بہت بڑا سارا اسٹراہری فریش کریم کیک رکھا ہوا تھا جس پر روشن موسم تینوں کی روشنی ہاتھ میں چھری تھاٹے کھڑی کرن کے چہرے پر سنہری لودے رہی تھی۔

”ابھی برتھ ڈے ٹویو ابھی برتھ ڈے ٹویو ڈیر کرن ابھی برتھ ڈے ٹویو۔“

”ارے کم بخت کیا اندھے کو گھر پہنچا کر آئے گی سلائی کرتے کرتے میری کمرود ہری ہو گئی ہے جا جا کے روٹیاں ڈال لے تیرے ابا آنے والے ہوں گے۔“

بہار کی نرم گرم دھوپ لٹھنڈی ہوا کا ہاتھ تھاٹے سورج کی چمکیلی کرنوں کو ساتھ لیے دھیرے دھیرے چار مرلے کے صدیقی پیلس کی دیواروں پر اتر رہی تھی سفوامرد کے درخت تلے ٹیٹھی رسال ہاتھ میں تھاٹے جاگتی آنکھوں سے دیکھے خوابوں کی حسین دلیلوں میں گم تھی کہ حسب معمول اماں کی لگاؤ سے حقیقت کی سنگین دنیا میں لے آئی۔

کہتے ہیں کہ نقش خوابوں کا روپ و حمار کر مین کنوروں میں پیرا کرتی ہیں اور کرن کی سا لگرہ بھی سونے کے لیے آج کل کسے ہی خواب کے مانند تھی جو وہ سلی جانی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

”اے سفومی آواز آرہی ہے یا جوئی مار کر تیرا“ انینا درست کردوں؟ اس سے پہلے کہ اماں کی جوئی عین نشانی پر ٹیٹھی اور اک درد بھری آہ برآمد ہوتی وہ منہ بسورتی پلورچی خانے کی طرف چل دی۔

راجہ کالونی میں بنا چار مرلے کا صدیق پیلس سفو کی رہائش گاہ تھی جس میں کل چار نفوس رہتے تھے ابا صدیق علی بریاب کی طرح شفقت اور محبت کا پیکر



ساری عمر طرکی کی اور اب رہنا تو ہونے کے بعد ایک میڈیکل اسٹور پر کام کر رہے تھے لہذا رشیدہ بیگم گہری نکل مختار چہرا کی طرح اندر سے مہراں اور سے چکنیز خانہ بچوں کی تعداد تین حالانکہ اس زمانے میں منصوبہ بندی کا نام بھی نہیں تھی سفونہ جلی اولاد بھی اس سے بڑی عمر نہ ہو کہ عمری میں بیباہ وی گئی اور اب چار عدد بچوں کی لہاں بھی اور سب سے چھوٹا صحیف لولاد نرسہ ہونے کے باعث لہاں کالا ڈلا سپوت تھا۔

”لہاں!“ روٹیاں پکا کر وہ لہاں کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی لہا اور صحیف کے آنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔

”لہاں۔“ اس نے پھر لہاں کو پکارا۔
”ہوں بول بھی دے مجھے بتا ہے تو کوئی الٹی سیدھی فرمائش ہی لے کر آئی ہوگی لوتھا ہو گئی مگر ابھی تک بیچھے میں حقل نہیں سالی۔“ وہ شلواری کی کلیاں جوڑتے ہوئے بولیں بڑوں والی استانی جی نے ار جنت سوٹ سنے دیا تھا اس لیے لہاں کے ہاتھ جلدی جلدی چل رہے تھے سفو کو لگا بات کرنے کے لیے یہ وقت ٹھیک نہیں ہے مگر لہاں ہر وقت مصروف رہتی تھیں اور ہر وقت ان کا پارا چڑھتا رہتا تھا یہی سوچتے ہوئے اس نے پھر لہاں کو آواز دی۔

”لہاں۔“

”ہاں بول بھی دے تیری خاموشی کے پیچھے جو طوفان چھپا ہے وہ جلدی آجائے تو اچھا ہے۔“ وہ بے زار ہو کر بولیں۔

”لہاں وہ مجھے کچھ پیسے چاہئیں“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”تجھے تو ہر وقت کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا ہے اس میں کیا نئی بات ہو گئی“ لہاں نے سنی آن سنی کرتے ہوئے کہا۔

”لہاں مجھے لازمی پیسے چاہئیں اس نے لازمی پر زور دیا۔“

”چھوٹا کیا کرے گی پیسوں کا۔“
”وہ لہاں اگلے ہفتے کرن کی سالگرہ ہے وہ جو اتنی

بڑی گاڑی میں آتی ہے اس نے کہہ دیا ہے اگر اس بار میں اس کی برتھ ڈے پارٹی میں نہیں آئی تو وہ جج جج سے ناراض ہو جائے گی بس لہاں کھنے کے لیے پانچ سو روپے دے دو اس دفعہ کپڑوں کا خرچہ نہیں کروں گی تمہارے جینز کی جو بلی اور کھلی ٹی شیرٹیں بڑی ہیں ان میں سے کوئی بیچ کر کے پین لوں گی اب مزگانی کی مہرابی سے اپنی سالگرہ تو منانا نہیں سکتے لیکن ایک اچھی برتھ ڈے کی دعوت تو کھا سکتے ہیں نا۔“ لہجے میں دنیا جہاں کی بے چاری سموتے ہوئے کہا گیا۔

”سفونہ تجھے بتا ہے نا۔ مینے کا آخر چل رہا ہے اس ہفتے تو دال روٹی مشکل سے پوری ہونی ہے اور تجھے تھوڑی بیسی باڑے میں جا کے پورے پانچ سو کا ایک کھانے کی سوجھ رہی ہے۔“ لہاں نے خلاف معمول آرام سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لہاں اچھی لہاں بس تین سو روپے دے دو باقی دو سو روپے میرے پاس جمع ہیں ان میں سے ملاؤں گی پھر بھی اتنی بڑی کو بھی میں سب سے کم قیمت تحفہ میرا ہی ہو گا۔“ سفونہ لہاں کا گھٹنا پکڑتے ہوئے منت کی۔

”آنے دے آج تیرے لہا کو بناؤں گی کہ ہمارا لہا کے من میں جب جو بات سالی ہے اسے پورا کرنے کے لیے میری جان کو جو تک کی طرح چھٹ جائی ہے اور کس نے کہا کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں سے دوستیاں کر جن کے یہاں آنے جانے سے پہلے سو پار سوچنا پڑے۔“ اب لہاں کی طرح سفونہ بھی لہا کا انتظار کرنے لگی اسے پتا تھا وہ ان سے ہی اپنی فرمائش پوری کروا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر میں بڑوں کیوں کا لڑکا پیغام دے گیا تھا کہ آج صدق چاچا اسٹور کے کام سے شہر سے باہر گئے ہیں اس لیے وہ کہہ رہے تھے کہ رات کو دیر سے آئیں گے اور انتظار کرتی سفو کے امانوں پر اس بڑی۔

وہ آج ہی لہا سے پانچ سو روپے دینے کا وعدہ لینا چاہتی تھی چاہے وہ انہیں ادھار ہی کیوں نہ لینے پڑیں وہ ایسی ہی بارہ صفت تھی وہ چاہتی تھی دل میں اندھے والی کوئی بھی خواہش آنکھوں میں در آنے والا کوئی بھی

لو اب بس لہوں میں پورا ہو جائے اب تو اسے اگلے دن تک کا انتظار کرنا پڑا لہا جانے رات کو کب آتے خیر صبح چھٹی کا دن تھا وہ اٹھ کر لہا سے بات کرنے کی دل میں ارادہ بندھتی وہ کمرے میں چلی دی اب اسے صبح سے شروع کیے ہوئے ٹول کا لینڈ بھی پڑھنا تھا جس میں بہرو کی لہاں خیالی سانسوں کی طرح اب اچھی بننے والی تھی۔

”اے رشیدہ تیری بیٹی کی کتنی اچھی نہیں لگتیں سورج کی کرنیں انہوں کے دوست کی بڑوں تک آتی ہیں اور یہ ابھی تک بڑی سو رہی ہے۔“ ابا کے وضو کرنے سے لے کر نماز پڑھنے اور پھر اسٹور پر جانے کے لیے رانیل نکالتے ہوئے اس کے چین کی چپس چپس کی آواز اور لہاں کے ہاتھ تپانے اور ساتھ ساتھ کمر بچھڑانے جا کی جانی پہچانی آوازوں میں اک آواز سن کر اس نے فوراً ”منہ برسے خلف اتارا“ کہا۔ لہاں کے پاس دھڑکی چار پائی ہر ایک نمائیت فریہ خاتون تھی انہیں پراگے اور چائے سے پورا پورا انصاف کر رہی تھیں سفو جلدی سے بستر سے اٹھی پاؤں میں چپل اڑتی ڈوبتے درست کیا اور کشاں کشاں نئے مہمان کے بارے میں دریافت کرنے کمرے سے باہر آ گئی۔

سلام کرنے کے بعد سفونہ پانی سے منہ دھوتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں لہاں سے مولی خالہ کے بارے میں پوچھا جنہیں مجرور نخری آنے کی اتنی جلدی تھی کہ رات کو ہی سفر پر چل نکلے ہوں گی۔

”ارے یہ تیرے لہا کی رشتے کی بھابھی ہیں یعنی تیری مائی کچھ دن کے لیے حیدر آباد سے ہم سے ملنے کے لیے آئی ہیں پوری سسرال میں ایک کہا ہی تھیں جن سے میری خوب بستی تھی عادت ہی اتنی اچھی تھی کیا کی۔“ لہاں نے تعارف کراتے ہوئے کہا کلی کرتے ہوئے سفو کو اچھو لگ گیا لہاں اور کسی سسرالی رشتے دار کی تعریف یقیناً دال میں کچھ کالا قمانہ ہاتھ دھو کر وہ

جیسے ہی لہاں کے پاس تھی گوشت کے پھاڑ یعنی تائی جی نے اس کے زرمو لڑکے کو کوباسوں میں لے کر بے حال کر دیا اس جگہ کی پھیکی نے اک لمحے کے لیے سفونہ کے ہاتھ میں پھرنے کی گھنٹی بجائی لہاں کے پاس بڑی بڑی ہنسی برسی تھی۔ اس نے انڈے کی خالی پلیٹ کی طرف دیکھا جو تائی جی نے اسے صاف کی تھی کہ تھی کا کوئی قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا لہاں نے اس کے آگے خالی چائے پر اٹھا رکھا تو اس نے دلی زبان میں انڈے کی دہائی دی جو لہاں نے اشاروں سے سمجھایا کہ وہ انڈا صرف مہمانوں کے لیے تھا۔

دوپہر کے کھانے تک ابا سے بات کرنے کا انتظار سفو کو بے چین کر رہا تھا مگر لہاں نے صبح سے اٹھتے ہی اسے کاموں میں لگا رکھا تھا پہلے اسے گھر بھر کی صفائی پر لگایا اور اب وہ کب سے باورچی کھانے میں بند بیٹھی تھی لہاں کے پکائے ہوئے کھانوں کے سر ہانے بیٹھتی وہ یہ امپریشن دے رہی تھی کہ وہ دوپہر کا کھانا وہ ہی بنا رہی تھی۔ حالانکہ اسے انڈیا بنانے چائے پکانے اور روٹیاں جلانے کے علاوہ کچھ نہیں آتا تھا۔

”ابا مجھے پانچ سو روپے چاہئیں میں نے کرن کی سالگرہ پر جانا ہے۔“ ابھی لہا نے پہلا ٹوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ سفونہ جلدی سے مدعا بیان کیا۔

”اے لڑکی یہ کیا موئے فرنگیوں کی رسموں میں جانے کی بات کر رہی ہو۔“ ابا کے کچھ کہنے سے پہلے مائی جی نے اپنی ڈھائی من کی ٹانگ بیچ میں اڑائی۔

”سفونہ ہم تھوڑی بیسی باڑے کی بات بعد میں کر لیں گے پہلے ابا کو کھانا کھانے دے۔“ لہاں نے اسے تہنہہ کی کیونکہ وہ جنھالی کے سامنے سفید پوشی کا بھرم رکھتا تھا چاہتی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی مائی جی نے فضول خرچی فضول رسموں اور فضول سیلیوں کے بارے میں اتنا اچھا لکچر دیا کہ ابا بھی قائل ہو گئے۔

”سوہنی تم سے اس سلسلے میں پھر بات کریں گے ابھی مجھے ایک ضروری کام پر جانا ہے تو اسے ٹالتے ہوئے کھانا کھا کر باہر نکل گئے اور اسے پتا تھا کہ وہ

ضروری کام کیا تھا مٹی کی خدمت اور ضیافت کے لیے کہیں سے پیسے ادھار مانگ کر لانا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے لڑکے صاحب زادے کے لیے سفو کا انتخاب کر لیں بقول ماں کے مٹی اس کا رشتہ لائی ہیں اور اس خبر کے سننے کے بعد ہی لے ان سے خدا واسطے کا پیر ہو گیا تھا۔

وہ امرود کے پڑتے اور اسیوں میں گھری امرود کے بچے توج توج کر اپنا حصہ کم کر رہی تھی کہ سیفی چلا آیا۔ ”قہنا آیا۔“ اس کا نام سفینہ صدیق تھا جو لبا کے لیے سوہنی ٹماں کے لیے کم بخت اور سیفی کے لیے قہنا آیا اور شہینہ کے لیے سفو تھی اس کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پکارا۔

”ہاں بولو کیا کام ہے۔“ وہ غرائی۔
”قہنا آیا آپ اب اسے پیسے مت مانگیں میں نے ایک بہت اچھا تحفہ سوچا ہے جو کم پیسوں میں آجائے گا۔“

”اچھا ایسا کون سا چارو کا تحفہ ہے۔“ وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ٹونون کا سورہے والا کارڈ“ تاجب آپ کے پاس موبائل تھا تو آپ کبھی نہیں کاش کوئی مجھے سو روپے والا کارڈ لادے تو یہ میرے لیے سب سے بڑا تحفہ ہو گا۔“ اس نے اپنی تھکی سی داغ والی کے مطابق مشورہ دیا۔

”ارے یا گل وہ کوئی ہم جیسے تھوڑی ہیں کہ اگر کبھی بیس روپے سے زیادہ کا بیٹنس ڈالو لیں تو دوکان دار کو پریشانی ہو جاتی ہے۔“ اک لمحے کے لیے وہ موبائل جسے ماں گھوڑی مشین کہا کرتی تھیں کو یاد کر کے آہیں بھرنے لگی۔

”ارے چھوٹے بھائی تم فکر مت کرو کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا میرا نام بھی سفو ہے۔“ اب تو بھی کرنا تھا اپنی مدد آپ کے تحت کرنا تھا وہ کوئی پلان سوچنے کے لیے کی طرف چل دی اور وہ سفو کی طرف کی طرف کیونکہ اب اس کے فیورٹ کارڈ لے جانے والے تھے۔

سفو کے ہی پر زور اصرار پر چند ماہ پہلے اپنے گھر میں کیبل لگوائی تھی اب کونٹے نئے خبروں کے چینل دیکھنے کو مل جاتے تھے ماں کو اس نے ڈراموں میں لگا دیا تھا اور خاص طور پر بتایا تھا ان رسالوں میں چھپنے والے ناول پر بنے ہیں جو وہ اسے پڑھنے نہیں دیتیں اور صحیف کو تو کارٹون چینل کی صورت ہفت الیمیر کی دولت مل گئی تھی لیکن دونوں سے یہ صورت حال تھی کہ بچارا بچہ جیسے ہی کارٹون میٹ ورک کا ٹن دیا تا کارٹونوں کے ساتھ مٹی جی بھی کہیں نہ کہیں سے نازل ہوئیں۔

”ارے لڑکے سارا دن یہ کہتے بے دیکھے گد تو ان جیسا ہی بن جائے گا سارے شیطانی کام اس گھر میں ہی ہوتے ہیں“ وہ ٹی وی کے آگے کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔

”مٹی جی بس تھوڑا سا ٹین ٹین دیکھتے دین پھر بند کروں گا۔“ صحیف نے پیار سے مٹی جی کو پکارتے ہوئے کہا۔

”گولی مار اس ٹین ٹین کو جا مجھے نکلوانی دوکان سے سارا پان لادے اور ہاں پیسے اپنی ماں سے لے لے اور یہ مجھے دے میں لے سے بند کروں۔“ انہوں نے ریموٹ کی طرف اشارہ کیا۔

سفو کمرے میں بیٹھی گل ہوئے والے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی ماں نے یوس رین استعمال کی کے کپڑے دینے کے ساتھ ان سے چھ رقم ادھار مانگنے لگی تھیں تاکہ ہو سکے وہ اپنی صاحبہ کا ڈھیر سارا خیال رکھا جائے بقول مٹی کے حیدر آباد میں ان کا اپنا اتنا اچھا اور بڑا زانی مکان تھا جسے کی اچھی سرکاری نوکری تھی اور پھر سونے پر سہاگہ ان کا بیٹا نہایت خوبصورت اور بھولا تھا ان ہی ساری خصوصیات کے باعث ماں چادر کے کونے پھاڑ کر بھی مٹی جی کی خدمتیں کر رہی تھیں تاکہ اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔
”قہنا آیا پیسے دے دین مٹی جی کے لیے پان لانا

”صحیف منہ بسور تا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔
”پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں ہماری اپنی جان کمانے کے بعد اب بیٹ میں پان کھانے کی گنجائش ہوتی ہے اور تیرے منہ پر بارہ کھول کر رہے ہیں۔“ وہ بڑبڑاتی اس سے پہلے کہ صحیف اپنی الم ناک داستان سنانا دو سرے کمرے سے ”منی بد نام ہوئی ڈالر لنگ تیرے لیے“ کی مدھر آواز کانوں میں پڑی تو ازا کر پڑا مٹی جی دھیمی دھیمی گمریہ بھی سفو کے کان تھے اس نے صحیف کا ہاتھ پکڑا اور دو سرے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔
”گھوڑی اور وہاں کا منظر ناقابل حد تک غیر متعارف۔“
مٹی جی اپنی چاروں آنکھوں کو کھولی وہی رنگ بد نام منی کی بد نامی کا سبب ٹھونڈ رہی تھیں۔

”واہ مٹی جی کتنا زبردست کاٹا ہے نا۔“ سفو نے وہم سے مٹی جی کے ہاتھ دیکھے ہوئے کہا اک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر جو رسی پکڑے اور ڈر جانے کے اثرات نے جنم لیا مگر اگلے ہی لمحے وہ اپنے گلے پینے لگی۔

”تو یہ ایسی بے حیائی دیکھی نہ سنی۔“
”مگر ابھی تو آپ یہ دونوں کلام کر رہی تھیں۔“
صحیف کہاں چپ رہنے والا تھا۔

”ارے ہاں بیٹے میرا تو ہاتھ کسی ٹین پر لگ گیا تھا اور یہ خرافات آنے لگی ابھی میں کسی کو آواز دینے ہی والی تھی کہ اگر اسے بند کروں کہ تم لوگ آگے۔“ مٹی جی دیکھنے چینیٹ بدلنے کی ان ساری مشکلوں کو دیکھا اور انہوں نے حل کر دیا صحیف باہر کھیلنے چل دیا اور مٹی جی استغفر اللہ استغفر اللہ کا ورد کرنے لگیں۔

زندگی پہلے بھی کوئی خاص سسل نہیں تھی مگر مٹی جی کے آنے سے اجرن ہو گئی تھی ساگرہ میں بس تین دن رو گئے تھے ابھی مٹی جی خاندان بھر کی برائیاں کرنے میں شہود سے مشغول تھیں اور ماں ان کے لیے شامی کباب مل رہی تھیں ان کی خوش خوراک ان کی صحت سے جھلک رہی تھی۔

”ارے رشیدو تمہارے وہ بڑے تایا کی ہو قسم سے اس کی ہونے تو اسے کھنی کھنی نجانا کھا ہے اور وہ جو میری منہ سے تاس کی کھنی کھنی جو کئی بار گھر سے بھاگ گئی ہے اور وہ میری دلورائی کم بخت جلا دین گئی ہے پھول ہی ہونے کے لیے کہہ کے سانس لینے سے پہلے انہیں بھی کھنی کرنی ہے اور وہ اللہ بخشتے تمہارے بھائی صاحب کے جھوٹے ماموں ایک بیوی کے بھاگنے کے بعد اور دو دوسری بیوی کے مرنے کے بعد اب ستر سال میں سہرا سجا کر تیسری لے آئے ہیں اب اللہ جانے اس کا کیا ہو گا۔“ وہ مزے لے لے کرتا رہی تھیں آٹا گوند متی سفو کے دل میں ایک لمحے کو خیال آیا کہ کہہ دے کہ ”نہایت کرنا بہستان لگانا“ جھوٹ بولنا مومے فرنگیوں کی رسموں میں جانے سے کہیں بڑا گناہ ہے مگر اس وقت وہ ماں اور مٹی سے بڑا انور نہیں کر سکتی۔

”ارے آپا چھوڑو ان باتوں کو یہ کہا ب کھا کرو کھو میری سفو نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔“ ماں نے کہا بوں سے بھری پلیٹ ان کے آگے کرتے ہوئے کہا وہ بھی اپنی جگہ تھی ساری تیار مسالے کی ٹکیاں اس نے ہی اپنے کٹوارے ہاتھوں سے بنائی تھیں کہا بوں کی پوری پلیٹ ”صفائی نصف ایمان ہے“ کہ مقولے پر عمل کرتے ہوئے صاف کر دی گئی تھی۔

”ارے رشیدو یہ پلنگ کی چادر تو بہت خوبصورت ہے۔“ کہا بوں سے دھیان ہٹا تو چادر میں الجھ گیا۔
”ہاں ہاں مٹی جی یہ بھی میں نے اپنے ہاتھوں سے۔“ بچھالی ہے۔“ ماں سے پہلے سفو بول پڑی۔

”ارے آیا اچھا کیا کہ آپ آگئیں آپ سے ملنے کو لٹال کر آتا تھا مگر سفو کے ابا کو تا تم کہاں ملتا ہے۔“ ماں کے بچے سے شیرینی ٹپک رہی تھی صحیح کہتے ہیں سرسالی رشتے داروں کی عزت پوسی اور آخری بار جب ہی ہوتی ہے جب ان کا کوئی بیٹا خوبصورت قابل اور جوان ہو جائے ہاتھوں ہاتھوں کے دوران سفو کے دل کی تھکی بجی اسے ایک اچھوتا خیال آیا اب اسے عملی جامہ پہنا کر سب کچھ حاصل کیا جاسکتا تھا مٹی جی کی ناکام واپسی بھی اور کرن کی گھوڑی ابھی پاؤں سے کانٹے

اسے دیکھا مگر وہ ہمت ہارنے والوں میں سے تھی ہی نہیں۔

”ارے آپ کو یاد نہیں ہے شرنہ تپا کی مگنی کے فوراً بعد ان کی ساس کا انتقال ہو گیا تھا آپ بھی سوئم پر گئی تھیں۔ اماں کے ساتھ نوابشاہ اور پھر اماں کی شادی کے فوراً بعد داوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔“

”ہاں ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ تالی کی ساری فرہنہنسی اڑن چھو ہوئی انہیں معلوم نہ تھا یا بڑھاپے اور گھبراہٹ کی وجہ سے یہ بھی بھول گئیں ہماری داوی اور ان کی چاچی ساس کو گینسر تھا اور آخری دنوں میں اپنے بیٹے کے سر پر سرار کھنا چاہتی تھیں پھر اماں اپا کی شادی کے چار مہینے بعد انتقال ہو گیا تھا۔

”اور پھر ایک بار ایک ملنے والی خاتون میرا رشتہ لے کر آ رہی تھیں راستے ہی میں بس کالیکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ ہمارے طرف آنے کے بجائے اوپر کی طرف نکل لیں۔“

دو بے اتفاقات کے درمیان تیسرے جھوٹے واقعہ کا اضافہ کیا گیا۔

”تالی جی اتفاق ایک بار ہوتا ہے بار بار نہیں۔“ سانسے سے آتی اماں کو دکھ کر سنو آخری جملہ سوچتے ہوئے لہجے میں بول کر اٹھ گئی۔

”آپا آپ اکیلی آئی ہیں سلیم بیٹے کو بھی لے آئیں۔“ چینی کے مہنگے ہونے کے باوجود اماں کے لہجے میں اس قدر مٹھاس تھی کہ الو ابیں کے منہ سے پھول نہیں گزرا لے جاہل بھروسے تھے۔

”ہیں رشید! اسے اس میں ضروری کام تھا پھر میں اکیلی جان ہی آئی۔“

”بس پاپا کھوڑے دن ہیں آپ کے بھی سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔“ اماں نے تسلی دی۔

”جب آپ ہی نہیں رہیں گی تو دکھ خود ہی دور ہو جائیں گے۔“ پاس بیٹھی سفونے کان میں گھس کر دھیرے سے کہا۔

”اے کیا مطلب رشیدہ تیری بات کا۔“ تالی جی بد کہیں۔

شام کے سرمئی سناٹے صدفی پیلس کی پلسترز وہ دیواروں پر اپنا ڈیرہ جمارے تھے تالی جی نما دھو کر کھری کھری تھیں منے سے صحن کی اکلوتی چارپائی پر بیٹھی ہال سکھارتی تھیں لیا کام پر صحیفہ کئی میں اماں حسب معمول سلائی کے کپڑے دینے اور پیسے لینے گئی تھیں سفونے کے لیے سنہری موقع تھا ہم شروع کرنے کا اس نے اٹھ کا نام لیا اور تالی جی کی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔

”تالی جی آپ اتنی عمر میں بھی کتنی فریش ہوتی۔“ اس نے مکھن پالش سے کام اشارت کیا۔

”اے لڑکی کیا اتنی عمر تیری اماں سے کم عمر ہوں بس رشتہ بڑا ہے اور پھر اماں باوانے کم عمری میں بیاہ دیا اس لیے میرا سلیم بڑا ہے۔“ انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

”ہاں ہاں میرا مطلب تھا کہ آپ کو تو کوئی بری بیماری بھی نہیں ہے پھر سندھ بوں اچانک چلا جائے تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ سارے آپ کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہوگی بلکہ اماں نے تو ذکر بھی نہیں کیا ہو گا آج کل اچھے رشتے ہاتھ سے کون جانے پرتا ہے۔“ سفونے پر تالی۔

”اے کیا اول فول بول رہی ہے۔ سیدھی سیدھی بات بتا پیلیاں کیوں بھجھواری ہے۔“ وہ تنک کر بولیں۔

”بس تالی جی میرا آپ سے اپا کے حوالے سے اتنا قریبی رشتہ ہے اور پھر انسانیت کا رشتہ تو سب سے بڑا ہوتا ہے اسی کے تحت ہمارے ہوں آپ اماں سے بالکل ذکر مت کیجئے گا۔“ وہ راز دارانہ انداز سے جھک کر بولی۔

”گپ بتا بھی دے۔“

”وہ دراصل تالی جی ہمارے یہاں نسلوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ جس گھر میں میں کا رشتہ کرو ساس چند دنوں میں اٹھ کو پیاری ہو جائی ہے۔“ سفونے نے ہوا میں حیر چلایا تالی نے عجیب سی نظروں سے



http://www.pakfunda.com

Bread is Life

Since my bread makes the world a better place, I will continue to make it better. I will continue to make it better. I will continue to make it better.

”وہ آپ میرے کہنے کا مطلب تھا کہ سلیم کی شادی کے بعد آپ کا اکیلا بن ختم ہو جائے گا۔“ اماں تکی کے بدلتے تیور کو دیکھ کر گڑبڑائیں۔

”اے رشیدہ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں میرے لیے مسکن جبین بنا کر لا دے دل گھیرا رہا ہے۔“

تائی جی حکم صلور فرما کر سوچ بچار کرتی کمرے میں چل دیں۔

”جاکم بخت کبھی مل بھی جایا کر میری بوڑھی ہڈیوں کا ہی جوس نکالتی رہتی ہے۔ جا کر انہیں مسکن جبین بنا کر دے۔“ اماں نے چار پائی پر بیٹھی سفو کی کمرہ پر دھبہ رسید کرتے ہوئے کہا اور پہلی بار اسے اماں کا کام برا نہیں لگا اسی بہانے وہ تائی جی سے باتیں کر سکتی تھی وہ مسکن جبین اور سازش دونوں کو بنانے پاوری کھانے کی طرف چل دی۔

جب وہ مسکن جبین کا بھرا جگ (گلاس سے تائی کا لیا بگڑنا تھا) لے کر کمرے میں داخل ہو گئی تو تائی ناساز طبیعت کے ساتھ باداموں کی پیالی ہاتھ میں تھامے اس میں سے بادام چن چن کر کھا رہی تھیں جو اماں نے بطور خاص تائی جی کی پسند پر تکیا کرتے تھے۔

”تائی جی آپ یہ بادام کیوں کھا رہی ہیں۔“ اس نے ذرا ساج کر کہا۔

”کیوں یہ بادام سجانے کے لیے ہیں۔“

”یہ بادام آپ کو اماں نے لا کر دیئے ہیں۔“ اس نے مشکوک سے لہجے میں سوال کیا۔

”ہاں تو اور کون دے گا؟“ وہ ایک اور بادام اٹھا کر کھاتی ہوئی بولیں۔

”آپ کو پتا ہے ان باداموں پر سے پچھلے ہفتے چھپکلی پھر گئی تھی صحیفہ مانگ رہا تھا اماں نے چھپکنے کے لیے اس سے چھپا کر رکھ لیے تھے اماں اپنی خاندانی رسم کو پورا کرنے کے لیے اس حد تک چلی جائیں گی میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا۔“ ابھی اس کا جملہ ادا ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بھاری بھر کم و جو دست و دم دھم کرتی بیسن کے پاس پہنچ گئیں اور اس وقت تک انہیں کھاتی رہیں جب تک آخری بادام بھی ان کے پیٹ

سے نکل نہ گیا اماں نے چاری پوچھتی ہی رہیں کیا ہوا آپا اگر آپ اب کیا بتائیں کہ کیا ہوا اور کیا ہونے والا ہے۔

سفو نے برآمدے میں سے جھانک کر دیکھا تائی جی اپنی چار پائی پر لیٹی خزانے لے رہی تھیں اس نے لیٹے لیٹے اماں کو آواز لگائی جو اپنے لاڈلے کو دودھ کا کپ دینے جا رہی تھیں۔

”اماں تائی جی کہہ رہی تھیں کہ انہیں دوسرا تکی دے دو یہ بھاری ہے۔“ اور پھر لحاف میں منہ ڈال لیا تائی کی آنکھ آہٹ سے کھلی تو رشیدہ بیگم ہاتھ میں تکیہ لیے ان پر جھکی کھڑی تھیں۔

”ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو۔“ وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھیں۔

”آپا وہ تکیہ رکھ رہی ہوں۔“

”یہاں منہ پر۔“ وہ گھورتے ہوئے بولیں۔

”تیا آپ نے خود تو مانگا تھا۔“

”ہاں ہاں یہاں رکھ دو میں خود لے لوں گی۔“ سفو نے لحاف میں سے جھانک کر اماں کی حیرانی اور تائی کی پریشانی کو دیکھ کر دل میں سوچا کہ کام ہو جائے گا کہتے ہیں تا پتھر بھی پانی کا قطرہ قطرہ کرے تو سوراخ ہو جاتا ہے اور پھر یہ تو تائی کے موٹے دل کی موتی عقل تھی۔

”اے سفو کم بخت آج کل تو اتنی سویرے سے ایسے اٹھ جاتی ہے دو دن سے کلچ بھی نہیں جا رہی اور سارا دن تائی جی سے چٹنی رہتی ہے کہاں تو رشتے کی بات سنتے ہی آپ سے باہر ہو گئی تھی اور کہاں اتنا پیار وال میں کچھ گلا نہیں ہے۔“ اماں نے سفو کو گھورتے ہوئے دریافت کیا کہ ان کے پاس کھڑی مرغیوں کو کتنا ڈال رہی تھی ان نے وسیع و عریض صحن میں ایک طرف یہ شوق بھی پورا کر رکھا تھا اپنی لی ایم ڈبلیو چکار ہے تھے صحیفہ اسکول جانے کے لیے تیار کھڑا تھا اور تائی جی ہاتھ منہ دھو رہی تھیں۔

”اماں وہ بابا کو چھری دے دو بالکل کند ہو گئی ہے۔ اب تو ناک بھی نہیں کاٹنے کی۔ اور ہاں وہ اپنی دوائی

بھی منگوا لو ساری رات چکرائی پھرتی ہو۔“ دانست اماں کو یاد کروا کر وہ ہاتھ دھونے کے بہانے تائی جی کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی اپنی سائیکل کو چکالنے کے بعد جیسے ہی گھر سے نکلنے لگے اماں نے انہیں آواز دی اور سفو نے تائی جی کو آنکھوں کے اشارے سے کہا کہ وہ سن اور سمجھ لیں۔

”صحیفہ کے ابا آتے ہوئے میرے لیے نیند کی گولیاں لیتے آنا بلڈ پریشر کی وجہ سے ساری رات نیند نہیں آتی اور ہاں یہ چھری تھی۔“ سفو نے تکیہ لیتے لیتے آنا اب تو اس سے سزا بھی نہیں سکتے کچھ اور کیا کہنے لگا۔ ”اتنا سننا تائی جی کے لیے کافی تھا کافی جہاں دیدہ خاتون تھیں۔“

”اگرے صدیق میاں ذرا ٹھہر مجھے بھی بس تک چڑھا آئے دن ہوتے میرا سلیم اکیلا ہو گا اور پر سول ٹھہرا رہے بھائی صاحب کی برسی بھی ہے تو رک میں اپنا زمان لے آؤں۔“ جو شاید پہلے ہی باندھ کر رکھا ہوا تھا۔

”مگر آپ نے تو پرسوں جانا تھا اور ناشتا تو کرتی چائے۔“ اماں کمرے میں جاتی تائی جی کے پیچھے لپکیں۔

”بس بس رشیدہ زندگی رہی تو ناشتے بہت بس اب تو مجھے جانا ہے اس سے پہلے کہ وہ ہو جائے۔“ تائی نے ابا کو ٹینگ ٹھمایا اور دھم دھم کرتی چٹنی سویرے آئی تھیں اتنی سویرے واپس بھی چلی گئیں سفو کو لگا امروہ کے درخت پر بیٹھی تھی شریر چڑیا بھی اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی۔

”ارے سفو کے ابا لوگ کہتے بے موت ہیں تمہاری موتی جبین سی بھالی کو دو دن میں کیا کیا نہیں کھلایا کیا کیا خد متیں نہیں تھیں مگر سرالیوں میں بھی بھلا وفا ہوتی ہے یوں اچانک چلی گئیں رشتے کی کوئی بات بھی نہیں کی کم از کم برسی پر ہی آنے کی دعوت دے دیتیں (اب بھولی اماں کو کوئی کیا بتانا انہیں تو اپنی برسی کی پڑی تھی وہ کیا برسی پر آنے کا کہتیں اماں شور بے کی تم میں تیرانے کے لیے ایک یاو گدو کاٹتے ہوئے چلے

دل کے پھینچو۔“ پھر ڈر ہی تھیں۔

”ارے سفو بخت کیوں پریشان ہوتی ہو ہماری سفو کے جہاں نصیب ہو گا وہ رشتہ ہو جائے گا اور پھر بیٹیاں نکلا کب تک باہل کے آنگن میں رہتی ہیں۔“ ابانے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا بقول تائی کے شام کے سائے امروہ کی جڑ تک پہنچ گئے تھے اماں کف افسوس ملتے ہوئے پاوری کھانے کی طرف چل دیں اور سفو آہستہ آہستہ ابا کو کچھ سمجھانے لگی اسے پتا تھا اب اس کی بات مان جائیں گے۔

بس انہیں اس کے ساتھ بازار تھفہ لینے جانا تھا اور اماں سے کہنا تھا کہ انہوں نے سفو کو تھفہ کے لیے پیسے دیئے ہیں اور ابا کو بتایا تھا کہ پیسے اس کے پاس جمع تھے۔

”ارے اب اتنا مت سوچو خاندان کا اتنا اہم اور خطرناک راز بھلا ایسے ہی تائی جی کو تھوڑی بتا دیا تھا پورے پانچ سو روپے لے لیے تھے۔“

کرن نے کہا تھا کہ وہ اسے لینے کے لیے ڈرائیور کو بھیج دے گی اب اسے کل کے لیے تیاری کرنی تھی بعد میں بات کھلی تو کوئی بات نہیں اتنی اچھی ابھی پاؤں میں جا کر اتنا مزے کا کیک کھا کے واپس پر اسے اگر اماں کے جوتے اور گالیاں کھائی ہی پڑیں تو یہ سفو کے لیے مہنگا سودا نہیں تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے آسید سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ چھٹی سی رہا تھی	500/- روپے
آزاد و بھارتی	450/- روپے
تھوڑی دور ماٹھریلو	400/- روپے

ناول شمارے کے لیے کتاب ڈانک فرمز - 45/- روپے

مکتبہ کا پتہ:

مکتبہ نوران، 37 - اردو بازار، لاہور - فون نمبر: 32736021

سائلگرہ خدین



نایاب جیلانی

سایا سونے اور سونے



مکمل فارم

”تمہارے حضور ایک درخواست پیش کی تھی۔“ وہ اس کے ضبط کا امتحان لینے سویرے سویرے لیکن کے دروازے کے چوکھٹے میں اپنا منہ سجا کر گھڑا ہو گیا تھا۔

”رات بھر میری اہلی کیشن پر غور کرتی رہی ہو جو آنکھیں اس طرح سے سوچ رہی ہیں گویا شد کی کہی نے ان پر بار سے منہ مارا ہو۔“ اب وہ تھوڑا سا آگے جھک گیا تھا۔ جواب اب بھی نہ مارا۔ وہ زور و شور سے آنا گوندھنے میں مصروف تھی۔

”آج صبح بیڈنی میں ایک اور چائے کی جگہ ٹیسٹ بدلنے کے لیے گونے کا گڑ کھالیا ہے؟“ بڑی معصومیت سے استفسار کیا جا رہا تھا۔

”زبان کیا سیکے میں بھول آئی ہو؟“ ویسے اس انہونی کے لیے دل نہیں مانتا۔ ”وہ سلیب سے ایک چھوٹا سا اہل اٹھا کر زور سے رگڑتے ہوئے کھانے لگا تھا۔

”سونے! او سونے! خیر تو ہے؟ کیا صدے کی شدت سے زبان پر فلج تو نہیں گر گیا؟“ ہائے نہیں۔ ”وہ سخت غم ناکي خود پر طاری کیے بن اسٹول پر ڈھے جانے کے اسٹائل میں بیٹھ گیا۔

”ارے بلیا! نہیں کر رہا دوسری شادی۔“ بدلق کر رہا تھا میری جان! تم نے خواہ تو اول جو لے لیا۔ آنکھیں ابھی بھی جھپکی جھپکی ہیں۔ ابھی تک رو رہی ہو۔ اتنے آنسو ضائع کر دے! اتنی محنت ہے مجھے میرا ہزارہ گوارا نہیں تمہیں۔ ”وہ ایک ہی جست میں سونے تک پہنچ گیا تھا اور سونے اس کے بازوؤں کے حلقے میں چلا رہی تھی۔

”سایا! بد تمزاجی چھوڑو مجھے۔“ ”میں چھوڑنے کے لیے تو نہیں دو جا ہائے۔ تمہیں قدر لوٹ کر بار آ رہا ہے مجھے تمہیں۔ ایسی محبت کا انبار ہفتے میں کوئی بیس میں دفعہ کر دیا کرو۔ میں بغیر کھائے بے موٹا ہو جاؤں گا۔“ سایا نے مارے جذبات کے اسے گولی گولی گھما ڈالا۔

”واہیات آدمی! مجھے پکر آرہے ہیں۔“ ”ہیں۔ پکر آرہے ہیں۔“ اس نے حیرانی سے



بیوتی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال ہوتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں ملتا ہے
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جلی رینوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تعویذی مقدار میں تیار ہوتا ہے یہ بازار میں کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کرنا کیلئے سوہنی فریڈا جاسکتا ہے ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے دوسرے شہروں کے لئے آڈرنگ کر دینا پارسل سے منگوائیں اور پستی سے منگوانے والے کو آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچہ اور پیکنگ پارچ شامل ہیں۔

منی آڈر بھجوانے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوتی بکس، 53 اورنگزیب مارکیٹ، پیکڈ فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والی حضرات سوہنی ہیرائل ان چیکوں سے حاصل کریں
بیوتی بکس، 53 اورنگزیب مارکیٹ، پیکڈ فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اورنگزیب مارکیٹ
فون نمبر: 32735021

”دور ہا ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو تمہیں میری قطعاً“
”ہیں۔“ وہ پھر سے چیخی۔
”بڑی خوش فہمی ہے۔“ وہ طنزیہ انداز میں کہتے
سے پلٹی۔
”اور اس چھوٹے سے پلاسٹک کے باؤل کو
بلاؤ۔“

”خود پکڑ لو پاس ہی تو رکھا ہے۔“ سہمی نے بھرپور
تی بھری انگڑائی لی۔
”اٹھا کر دو مجھے۔“ سوہنی نے حکم سے کہا۔
”نہیں دے رہا، خود پکڑ لو، وہ ہاتھ کے ناسٹیل پر
ہے۔“ سہمی نے چڑچڑے انداز میں کہتے ہوئے اٹھ
کھائے سیب کو پھر سے اٹھا لیا۔ وہ ہمیشہ سوہنی کے
لکھانے انداز سے ہری طرح سے خار کھاتا تھا۔
”تمہیں یہ باؤل پکڑانا ہوگا۔“ وہ بھی تو سوہنی ہی
کی پیشہ کی اندکی۔

”خود پکڑ کر آجائے تو یہ اور بات ہے۔ یہ باؤل تو
میں ہرگز نہیں پکڑاؤں گا۔“ بات خود یہ خود کسی
سج کی طرف چل نکلی۔ ہمیشہ آغاز خوش گوار ہوتا
کا اور انجام تک پہنچتے پہنچتے وہ دونوں ایک دوسرے
سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ
اب تمام عمر ایک دوسرے سے بات نہیں کریں گے،
کے۔

”سہمی! اگر تم نے یہ باؤل مجھے نہ پکڑ لیا تو پھر جانتے
رہتا میں کیا کروں گی۔“ سوہنی نے اپنی مخصوص دھمکی
الی۔

”کیا کرو گی؟“ وہ بغیر سوچے سمجھے استہزاء بولا۔
”بھوکا رہتا ہوگا کیونکہ میں ناشتا ہرگز نہیں بناؤں
گی۔“

”اچھا۔“ سہمی نے آنکھیں پھیلائیں۔
”کھانا بھی نہیں بناؤں گی۔“
”او۔“ سہمی نے ہونٹ سیکڑے۔ ”تو ہوٹل کس
مرض کی دوا ہیں۔“

”اچھا۔“ سوہنی نے بھنویں اچکا کیں۔ ”کتنے دن
میں کھانا کھاؤ گے؟ کیا ہمیشہ؟“

”مجھے گھمائے جا رہے ہو، اسی لیے تو چکر آ رہے
ہیں۔“ وہ پھر سے چیخی۔
”نہیں یہ خاص چکر ہیں، ان میں کچھ راز ضرور
ہے۔“ سہمی بھی اپنی بات پر اڑا رہا۔
”خاص بات یہ ہے کہ میں نے پانچ بجے چائے کے
ساتھ کیک کھائے تھے۔ ساڑھے چھ بجے مجھے پھر
بھوک لگ گئی تھی۔ رات کا بچا ہوا آنا برا تھا قرینج
میں۔ آلو کے دو پرائے بنا کر کھالیے تھے۔ پھر برتن
وغیرہ دھونے لگی تو پتا ہے کام کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ
ٹوٹنے کی عادت ہے میری۔ بس نمکو پر نظر پڑی تو رہا
نہیں گیا۔ اسی لیے طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ اس
کی بھرپور وضاحت نے سہمی کے چہرے کے زاویے
بگاڑ دیے۔

”گھر بھی اپنا ہے اور پیٹ بھی امت دھایا کرو اپنے
بے چارے معدے پر تم۔“
”اف سہمی! اور وہ بھی ہونے لگا ہے، ارے مجھے تو
چھوڑو۔“ وہ جھنجھالی۔
”تو چھوڑ دیا۔“ سہمی نے ایک بھرپور شرارت کے
بعد اسے چھوڑا تو وہ محض گھور کر اسے دیکھتے ہوئے
دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔
”یہ تو بتاؤ کہ آنکھیں کس غم میں اندر رہ کر بھیانک
کرتی ہیں۔“ وہ بھی تو سہمی تھا۔ اسے ترجیح کرنے کے
بعد ہی اس نے بچن سے باہر نکل کر آنا تھا۔

”خود کو بھتا مرنے ہی چاہیے بے نیاز کر لو۔ ڈھول پیٹتی
رہو کہ تمہیں میری پرستش میں کچھ بھی کر لوں
تمہاری بلانے سے چاہے دوسری شادی ہی سہی تم سے یہ
دوستی رہے۔“ سہمی نے اپنے اپنے مین یہ مسلی ہوئی
پلٹیں یہ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں یہ خشک ہونٹ
بے راز افشا کر گئے ہیں جانم۔“ سہمی نے بھرپور قہقہہ
لگایا تھا۔

”تمہارے خشکی سے بھرے بالوں والے سر کی قسم!
رات کو میرے دوسری شادی کے انکشاف اور
تمہارے حضور اجازت نامے والی درخواست نے
چہرے پر کیا کیا برنٹ کیا ہے؟ میں تو دیکھ دیکھ کر لوٹ
چکا ہوں۔“

”آنکھیں پھیلائیں اور پھر اور بھی سوئی کو بھینچتے ہوئے
چلایا۔“ تو چکروں کو آنے دو، انہیں کھو اور زور و شور
سے آئیں یہ تو اتنے باہرکت ہوتے ہیں ان ہی کے
توسط سے تو خوش خبری کی رپورٹ ملتی ہے۔“
”سہمی! مجھے تو المی بھی آ رہی ہے پیچھے ہٹ جاؤ
ورنہ تمہارے اوپر الٹ دوں گی۔“ سوہنی نے اسے
دھمکانا چاہا۔

”المی بھی۔ یعنی کہ۔“ سہمی نے فرط مسرت سے
اس کے دونوں رخساروں پر زور سے چٹکی بھری تھی۔
وہ بلیاتی رہ گئی تھی جبکہ سہمی پھر سے اسے دلوں چکا
تھا۔
”تین سال بعد یہ چکروں اور الٹیوں کا سیزن
شروع ہوا ہے۔ آنے دو انہیں، موسٹ ویلکم۔
موسٹ ویلکم۔“

”تمہارا دل غ چل گیا ہے سہمی۔“ سوہنی اس کے
پازوؤں کے حلقے کو توڑنے کی کوشش میں محض پھڑپھڑا
کر رہ گئی تھی۔
”مجھے جھوٹو تو سہی بتاتی ہوں۔“
”کیا بتانا ہے؟ یہی ناکہ میں پیلا بننے والا ہوں۔ میری
جان! بتانے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ تو میں جان ہی چکا
ہوں، مزید تسلی کے لیے ڈاکٹر نوٹکی سے چیک اپ
کروا لیتے ہیں۔“ سہمی کی اپنی ان تڑتیاں جاری
وساری تھیں سوہنی کو غصہ آیا۔

”بد تمیز! دفتر سے لیٹ ہو رہے ہو، خالی پیٹ جاؤ
کے کیا۔“
”یہ خوش خبری سن کر ہی پیٹ بھر چکا ہے۔“ سہمی
جھوٹا تھا اور سوہنی کو بھی جھوٹا پڑا۔
”مف سویرے سویرے دماغ پیلا بنے لگے ہو۔“
”آج تو گالیاں بھی امرت لگیں گی، کچھ بھی کہہ لو،
میں نہیں برہانے والا۔“ سہمی قہقہہ ہونے لگا تھا۔
”مجھے چھوڑو تو سہمی۔“ سوہنی چلائی۔ سہمی کے
بچے ایسا کچھ بھی نہیں۔“

”کیسا ضرور ہے۔“ سہمی زور سے گروا۔ ”تمہی تو
چکر آ رہے ہیں۔“

”میشہ کیوں؟ شادی کرلوں گا۔ مسالائی وی کی کسی کو کنگ ایکسپرت کے ساتھ۔“ سہمی نے بھی کھل ہار ماننا سیکھی تھی۔

”اور کپڑے کس سے دھواؤ گے؟“ سونہ نے طنزوں کی جھلی میں سے آہستہ آہستہ طنز کے تیر نکالنے شروع کر دیے۔

”ایک اور شادی کر لینا کسی دن کے ساتھ۔“ ملازمہ رکھ لوں گا۔“

”دوسری والی کے لیے نوکرائی فورڈ کر لو گے کیسے۔“ سونہ ایک دم دھاڑی۔

”ورژن ڈھونڈنا اور جان وغیرہ کو اکٹھا کر لو“ سب سے نکاح کر کے، گنجاکر کے رکھ دیں گی تمہیں۔“

”اگلی بیویاں۔ اتنی بیویاں۔“ سہمی گویا خوش گووار خواب کی کسی حسین ولدی میں اتر گیا تھا، مگر یہ کیا۔ وہاں تو کچھ اور ہی ہی منظر تھا۔ مسالائی مشین پر جھکی دو شیزہ کپڑوں کے ڈھیر پر لیٹی تڑھال، بے حال اچھے پالوں، بھرے حواسوں والی مدہ جیں۔ اور ک’ لسن، بیاز کی بو میں مدہ ہوش کو تڑے میں لال مرچیں کو نئی حسینہ، کیاریوں کی گوڈی کرتی، گھاس کا نئی کھردرے اور پھٹے پھٹے ہاتھوں والی کھٹے سینے کی پاس سے ادھ موٹی ہوئی دلنشینہ ہائے نہیں، نہیں، نہیں۔

”سہمی!“ سونہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے چنگلی بجا لی۔

”کیا ہے؟“ وہ ہڑبڑا کر گویا نیند سے جاگا۔

”میشہ میں تو۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”پہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“ ہنستا تمہیں ملے گا، تم نہ کھاؤ، البتہ یہ پاؤں تم ہی کو پکڑا لے۔“

”پھر سے پاؤں۔“ سہمی نے اپنے بال نوچے۔ ”مور پکڑ لو، پاس ہی تو رکھا ہے۔ میں اٹھ کر جاؤں۔“

”تا نکلس ٹولی ہیں تمہاری؟“ ”تمہیں اٹھتا۔“ سہمی بھی مندی انداز میں گویا ہوا۔

”تمہیں اٹھنا ہی پڑے گا۔“ ”اس پاؤں میں ہے کیا؟“ سہمی نے مرے مرے انداز میں پوچھا۔

”خود دیکھ لو۔“ وہ پر اٹھانے کے لیے بیڑہ تار ہی تھی۔

”اب تو وہ کھنا ہی پڑے گا۔“ سہمی اٹھا تھا، سلیب پر رکھا ڈونگہ اٹھایا اور منہ بنا کر اس کے ہاتھ میں تھمائے ہوئے بولا۔ ”ہونہ، پیاز، میں نے سمجھا تھا شاید ہیرے جو ہرات سے بھرا ہو گا۔“

”تم اسی شوق میں اٹھے بھی تھے۔“ سونہ نے ہنستا شروع کر دیا۔ ”کہاں جارے ہو؟ بات سنو۔“ وہ باہر نکلتے سہمی کی شرٹ کھینچ کر بولی۔

”تم میرے روئے روئے نیوں کا راز پوچھتا جاوا رہے تھے نا۔“

”کوئی ضرورت نہیں بتانے کی، جانتا ہوں میں۔“ سہمی چمک کر بولا۔

”کیا جانتے ہو؟“ ”یہ ہی کہ میرے دوسری شادی کے ارادے نے تمہارے دل پر تم ڈھاپا ہے۔“ وہ لگتا تھا۔

”خوش تھی۔“ سونہ نے طنزیہ کہا۔ ”یہ کات رہی تھی میں، آٹلیٹ کے لیے پیاز۔“ وہ چٹا کر بولی۔

”ج۔“ سہمی بے یقین تھا۔ خوش نصیوں پر پانی پھر چکا تھا۔

”ج۔“ اب چمک کی باری سونہ کی تھی۔

”بھاڑ میں جاؤ، تمہارے دست مشتقل ہو کر باہر نکلتے گا۔“

”رگڑو رگڑو۔“ وہ تھاگ کر اس کے سامنے آئی۔

”کیا ہے؟“ ”ایک بات کرنا تھی۔“ اس نے جان بوجھ کر سوچنے کے لیے وقت لیا۔

”پھوٹو۔“ سہمی کے منہ کے زاویے بگڑے بگڑے تھے۔

”تم ایک چھوڑ تین، تین شادیاں کر لو، مجھے پروا نہیں۔“ وہ غصے رہی تھی۔

”جس دن کرنی دیکھوں گا کیسے دانت نکالتی ہو۔“ سہمی بھنایا۔

”آزاد کرو کیجیو۔“ وہ صاف مذاق اڑا رہی تھی۔ ”تم سے بھلا کس احمق نے شادی کر لی ہے۔“

”مگر کسی احمق نے مجھے پر پوز کر دیا تو؟“ وہ بھی چیلنجنگ انداز میں بولا۔

”تمہیں پر پوز۔“ سونہ کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ”شور و آہٹ میں غور سے دیکھنا زرا۔“

”تیس سالوں سے دیکھ رہا ہوں۔“ وہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ ”راہ چلتی، خواتین مڑ کر دیکھتی ہیں۔“

”شہزادہ عالم جو ہوئے۔“ سونہ نے پھر سے طنز کیا۔

”اس میں شک ہے کیا؟“ سہمی کے لہجے میں تفسیر پھر گئی۔

”سوئی رہاں پر مات کھا جاتی تھی۔ یو لاتی خواہتا رہند، ہو جاتی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ لڑکیاں بالیاں تو سائو اتنیں تک رک رک کر اسے دیکھنے لگتی تھیں۔

وہ ایسا ہی تھا، بس دیکھے جانے کے لائق، ایک ایک لفظ نکلتے بولتا ہوا، واضح ہوتا، اس کی تعریف، بس ایک لفظ میں تھی۔“ ”وہ جسم و شکل اور وہ خود کیا تھی؟ اکثر وہ دونوں برابر چل رہے ہوتے تو لوگ چونک جاتے، کئی دفعہ بازار میں آئی نما خواتین بے تکلفی سے رشتے کی نوعیت بھی پوچھ لیتی تھیں۔ پھر حیران ہوتیں۔ ”بھلا ان دونوں کا کیا جوڑ۔“ اور جوڑ تو واقعی نہیں تھا، یہ تو رب نے بنا دیا تھا۔ اور آسمانوں پر لکھا جا چکا تھا۔

نصیب ساتھ جزے تھا۔ ہاتھ کی لگیوں میں ایک دوسرے کا نام کھیرا تھا۔

”کہاں تم ہو گئیں؟ کسی نئی کریم کا فارمولا سوننے لگی ہو؟ تو میری بیماری چندا نہ ترو کرو اتنا رنگ تو رگڑو رگڑو کر کے کھار۔“ لوگی، نگریہ پھیلی سی تاک اور بھی کیسے کرو گی۔ ہونٹوں کو باریک کرنا بھی ضروری ہو گا۔

ہاں یہ ڈیلے نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے۔ بس تھیک ہیں اور اگر ان میں میری محبت ٹھاٹھیں مارنے لگتی تو ان آنکھوں کے علاوہ دنیا کی ساری خوب صورتی مجھے کہاں

نظر آتی تھی۔ خیر، تاتا ہوں تم تم نہ کھاؤ، مجھے اس مسالائی رنگت کے لیے تو دلور ان روگے بے جان پاؤں والی سونہ سے روٹی لگتی ہے۔ بہت بہت۔

”بہت۔“ ایسے ہی تو نکاح نانے پر جھٹ سے دستخط نہیں کر دیتے تھے۔ ”سونہ جانتی تھی، اب وہ محض اسے پارہا ہے جلا رہا ہے۔“

”خالی۔“ نے مجبور کیا تھا، سب جانتی ہوں میں۔“ سونہ خواہتا وہ ملکہ جذبات بنی۔ حالانکہ جانتی تھی سب جانتی تھی کہ سہمی نے کس طرح خالی کے پیر پکڑ لیے تھے کہ شادی کروانی ہے تو سونہ سے کرواویں۔ وہ اس کی محبت میں ایوان عمری سے جلا ہو گیا تھا۔ اور یہ بہت برائی بات تھی۔

”آج تمہارا بھوکے رہنے کا ارادہ ہو گا۔“ وہ خطرناک طور پر اسے اس کی سمت پڑھی۔

”ظلم مت کرنا۔“ سہمی نے ہالی دی۔

”گھڑی کی طرف دیکھو ذرا۔“ سوئیاں آگے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ یہ جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کے نوکری ملی ہے نا، ساڑھے نو ہزار والی، بس چار دن کی ممان سمجھو۔“ وہ اسے وقت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ سہمی روزانہ ہی دانستہ لیٹ و فتر جاتا تھا، بقول اس کے گھر سے نکلتے کو دل نہیں کرتا۔ تمہاری صورت ہر سو نظر آتی ہے۔ فائلوں میں، پاس کی سیکرٹری کے چہرے میں، کمپیوٹر اسکرین پر، بھلا میں کیا کروں؟ وہ بھولی سی صورت بنا کر کہتا تھا۔

”یہ نوکری مجھے اس وقت ملی تھی، جب تم میری زندگی میں شامل ہو گئی تھیں۔ بڑی بھاگوان ہو ڈار لنگ۔“ وہ اس کے گلن میں گھنٹایا۔

”سہمی! دو منٹ میں کپڑے پہنچ کر کے آؤ، میں ناشتا لگا رہی ہوں۔“ قافٹ آجاؤ بس، مجھے بہت سخت بھوک لگی ہے؟“ سونہ نے سترے سترے آٹلیٹ کو پلیٹ میں رکھ کے سہمی کو زبردستی کچن سے باہر دھکیلا۔

”تمہیں پھر سے بھوک لگ گئی ہے سونہ!“ وہ حیرت کے مارے بس گرنے ہی والا تھا۔

”جس دن کرنی دیکھوں گا کیسے دانت نکالتی ہو۔“ سہمی بھنایا۔

”آزاد کرو کیجیو۔“ وہ صاف مذاق اڑا رہی تھی۔ ”تم سے بھلا کس احمق نے شادی کر لی ہے۔“

”مگر کسی احمق نے مجھے پر پوز کر دیا تو؟“ وہ بھی چیلنجنگ انداز میں بولا۔

”تمہیں پر پوز۔“ سونہ کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ”شور و آہٹ میں غور سے دیکھنا زرا۔“

”تیس سالوں سے دیکھ رہا ہوں۔“ وہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ ”راہ چلتی، خواتین مڑ کر دیکھتی ہیں۔“

”شہزادہ عالم جو ہوئے۔“ سونہ نے پھر سے طنز کیا۔

”اس میں شک ہے کیا؟“ سہمی کے لہجے میں تفسیر پھر گئی۔

”تو اور کیا کافی دیر سے کچھ بھی نہیں کھایا۔“ سونلی نے مسکین سی صورت بتائی۔

”اور وہ کیک اور چائے دو عدد آلو کے پرانھے وہ کہاں گئے۔“

”وہ تو صبح کھائے تھے۔“ سونلی اطمینان سے بولی۔

”اور اب وہ پھر ہو گئی ہے کیا؟“

”سامی! جاؤ یہاں سے“ میری روٹیاں گھٹنے بیٹھ جاتے ہو۔“ سونلی کو ہمیشہ کی طرح غصہ آیا۔

”بیٹھا کہاں ہوں میں تو کھڑا ہوں۔“ سامی نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔

”اور اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

”اللہ کا شکر ہے چلتا پھرتا بھی ہوں۔ ماشاء اللہ سے بھاگتا دوڑتا بھی ہوں۔“ سامی پر امان گیا۔

”بس دوڑ کے دانت نہیں نکلے ابھی تک دفع ہو جاؤ سامی۔“ وہ اسے بازو سے کھینچ کر کمرے میں لے آئی۔

”آج پھر تمہارا چمٹی کا ارادہ ہو گا۔ یہ جو باتوں میں مجھے الجھا رہا ہے ہونا سب جانتی ہوں میں یہ ڈرا ہے۔“

”سونلی! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ چلا۔

”کیا ہوا ہے طبیعت کو ٹٹے کٹے تو کھڑے ہو۔“

سونلی کو اور بھی غصہ آیا۔ اس کی آنے دن کی بمانے بازووں سے سونلی بہت چڑتی تھی۔

”سر میں درد ہے ٹیسس اٹھ رہی ہیں۔ فشار خون بلند ہو گیا ہے۔ گنا ہے بلڈ کا پریشر بڑھ گیا ہے۔“ وہ آواز میں نفاہت بھرے بیڈ پر ڈھے گیا۔

”میرا دل چاہتے ہوئے تو سرد نہیں تھا۔“

”اچانک ٹیسس اٹھنے لگی ہیں۔“ سامی نے اور بھی چہرے پر مظلومیت طاری کر لی تھی۔

”فائنٹ اٹھ جاؤ۔ میں ٹیلیٹ دیتی ہوں تمہیں۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر اٹھانے لگی۔

”مجھے نہیں روالی کھانی۔“ سامی کا بغیر دوا کھانے منہ کڑوا ہو گیا۔

”ماشا اللہ کرنا ہے ناکہ آج تازہ کرو گے؟“

”ماشا اللہ! سامی نے سوچتے میں کچھ وقت لیا۔“

تم اصرار کرتی ہو تو۔ اچھا ادھر ہی لے آؤ۔“

”نہیں میں کیوں اصرار کرنے لگی۔ تمہارا دل نہیں چاہ رہا تو خود کو مجبور مت کرو۔“ وہ بھی اس کی ہر نبض سے واقف تھی۔

”سر میں درد ہے سونلی! پیٹ میں نہیں۔“ سامی لاچار رہی بولا۔

”شکر تکلیف تو تکلیف ہوتی ہے نا۔ میں تمہارے لیے ویلہ لے کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر جانے لگی تھی۔

”نہیں سونلی! ویلہ تو بالکل نہیں۔“ وہ چیخا۔

”تو پھر؟“ سونلی رکی۔

”وہ آلیٹ اور پرانھے، کیا ضائع کرنے ہیں۔“

”ضائع کیوں ہوں گے۔“ وہ ملنے بغیر بولی۔ ”وہ ابھی کھاؤں گی اور دو دو پیر کو گرم کر کے کھا لوں گی۔“

”اس سادگی پر میں مری نہ جاؤں۔“ سامی جل کر رہ گیا۔ ”جا رہا ہوں کپڑے نکالوں میرے۔“

”درد سر میں ہے اور اثر نظر ہو گیا ہے یہ صوفے پر کیا رکھا ہے۔“ سونلی فتح مندی کے احساس سے سرشار ہو گئی۔

”لے بھی آؤ ماشا اللہ! وہ کھا جانے والی نظروں سے اے دیکھنے لگا۔

”بھی لائی۔“ سونلی ہنسی اور پھر ہنستا چلی گئی تھی۔

کیونکہ سامی کا سردرد بالکل بھاگ چکا تھا اور سونلی کو اس کے سردرد اور ہر قسم کے درد کو بھگنے کے ایک ہزار ایک طریقے آتے تھے۔

”جا رہا ہوں درد بردہ کر۔“ وہ سلگ کر دروازے کے قریب جا کر بولا۔

”کرتے ہیں تم جاؤ۔“ وہ دوسرا پر اٹھا کھاتے ہوئے بیٹھے گئی۔ سامی جا چکا تھا ابھی وہ دروازہ بند کرنے کے لیے اٹھنے ہی لگی تھی جب سامی کا چہرہ پھر دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

”موبائل لا کرو۔“

”کتنی مرتبہ کہا ہے یاد سے ساری چیزیں لے کر جایا کرو۔ کبھی آئی ڈی کارڈ بھول جاتے ہو کبھی ہائیڈک کی

ہالی کبھی گھاسز اور کبھی یہ چھن چھن۔“ وہ موبائل اٹھا کر لے آئی تھی۔

”بک بک نہ کرو۔“ وہ پلٹ رہی تھی جب سامی نے اس کی لمبی چوٹی کو کھینچ کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

”سامی! وہ چیخی۔

”روماس میں آخری تڑکا کا تورا کیا تھا۔“ سامی نے اس کی پیشانی پر دو تین بو سے دیے۔ ”تمہارا بادل مت اتنا آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورو۔“ وہ پلٹے پلٹے چل کر باہر نکل آئیں گے۔

”دفع ہو جاؤ۔“ وہ اسے باہر دھکیل کر گیٹ لاک کر چکی تھی اور پھر وہی ہی دل میں نئی سورتیں پڑھ کر غائبانہ سامی پر چبوتے کے بعد سامی کے بچے کچے ناشتے کی بات کو بھی حث کر گئی۔

”رنگ تو ضائع کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

اس کی صحت سی پختہ ہو چکی عادتوں میں ایک عادت خود سے اٹھنے کرنے کی بھی تھی۔ تمنا ہونے کے باوجود بھی آج تک سونلی نے کبھی خود کو اکیلا نہیں محسوس کیا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ کوئی اس کے ساتھ ہے ہمیشہ سے۔



”اماں بی! کہاں رہ گئی تھیں آپ۔“ سونلی زہنت بی کو دیکھتے ہی چمک اٹھی۔ زہنت بی نے بھی بڑی گر جوشی سے سونلی کو گلے لگایا تھا۔ اماں ابا کے زمانے سے زہنت بی کا ان کے گھر آنا جانا تھا۔ رشتہ داری تو نہیں تھی البتہ قرابت داری کی وجہ سے یونہی محسوس ہوتا تھا کہ زہنت بی سے گہرا اٹوٹ تعلق ہے اسی سگھے اور اسی بند گلی کا آخری مکان زہنت بی کا تھا۔ سو اور بیٹے کے ہمراہ رہتی تھیں، مگر اکثر یہی عزیزوں کے ہاں سے بلاوا آ جاتا تھا۔ بڑی ہی معاملہ فہم سمجھ دار خاتون تھیں سونلی کو تو ہمیشہ اپنی اماں کا پرتوی لگا کرتی تھیں۔

”مسووال سے مہمان آئے ہوئے تھے ان ہی میں مصروف رہتی پردل تو ادھر ہی اٹکا رہا تھا۔ مہمانوں کے جاتے ہی بھاگتی چلی آئی ہوں۔ سو چاہی کو ایک نظر دیکھ

آؤں۔ تم تو کم کم ہی نکلتی ہو۔“

”مہمان وہ کون سے تھے گئے؟“ وہ اماں بی کو کو لیے صحن میں آگئی۔ ”کچھ تھے اونچے اور بے تحاشہ درختوں کی وجہ سے سارا کم ہی جھلک دکھا تھا۔ مگر اس وقت گھر کے کچھ ہی محاسن دیکھنے سے آگن میں اتر آئی تھی۔

وہ منزلہ مکان تھا پرانی طرز کا سا ہوا مگر سہولت کی ہر شے موجود تھی۔ اس کی اماں بڑی سلیقے کرتے والی خاتون تھیں۔ کفایت شعار بھی تھیں۔ ہر کھیتی کھلنے کے بعد گھر کے لیے کچھ نہ کچھ منگوانی رہتیں، غریب و اشک مشین، ایئر کولر، گیزر اور اے سی تک لگوایا تھا۔ سونلی کے پوچھنے پر اماں ہنس پڑتیں۔

”یہ ساری چیزیں تیری سہولت کے لیے ہیں۔ شادی کے بعد کام آئیں گی۔“ سونلی گویا سمجھ کر سر ہلا کر تھی، حالانکہ پہلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ عمر ہی ایسی تھی۔ سونلی جاگتی سی، پچھن جا رہا تھا، کڑکھن دامن کھینچ رہا تھا۔ شعور ابھی دور تھا، کوسوں دور بے فکری کا زمانہ اور اماں کی بے حساب محبت کہا تو تین سال پہلے دل کے معمولی جھٹکے سے سنبھل نہ پائے تھے۔

”مہمان ابھی ادھر ہیں ہمیشہ ادھر ہی رہیں گے۔“ اماں بی کی آواز سے سوچوں کی وادی سے واپس کھینچ لائی۔

”اچھا۔“ سونلی حیران ہوئی۔ ”واپس نہیں جائیں گے۔“

”نہیں۔۔۔“ اماں بی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”میرے مرحوم بچا کی نواسی اور اس کی بیٹی ہے۔ ماں بیٹی بے آسرا ہیں۔ کرایوں پر دھکے کھاتی رہی ہے۔ ساری زندگی مشقت ہی کی۔ کچھ بنانہ پائی کہ پیٹ کا دونوں بھرتا تو کچھ اور سوچتی، لڑکی کو پرہا لکھا دیا تھا یہ بھی نالی کی مہمانی سے سولہ جماعتیں پاس کر گئی۔ ادھر براٹیوٹ اسکول میں نوکری کی بات کر کے آئی ہوں چچی کے لیے۔ صرف دو ہزار تنخواہ ماں کہتی ہے گھر میں ڈھونڈو چاہے ایک کمرہ ہی ملے۔ ماں بیٹی سر چھپا کر بیٹھ جائیں گی۔ میری بہو کے مزاج سے تو واقف ہو

انہیں پل پل شرمندہ کے وقتی ہے۔ میں نے بھی سوچا ٹھکانہ تو ڈھونڈ دیتی ہوں مگر وہ ہزار تنخواہ میں اگر چند سو کر ایہ نکل گیا تو یہ دونوں مینے کے دن کیسے گزاریں گی۔ بہت سوچنے کے بعد تمہارے پاس آئی ہوں۔

اماں بی کے چہرے پر سوج کی پرچھائیاں تھیں سوئی چپ سی رہی۔

”میں چاہتی ہوں اگر تم سامی سے مشورہ کر کے اوپر کی منزل کا ایک کمرہ ان ماں بیٹی کو دے دو تو بیس چارویں کی پریشانی کم ہو جائے گی۔ میرا تو دل کھتا ہے ان دونوں کی بے بسی دیکھ کر بچی تو سونے کی تار ہے، رنج رنج کر سوہنی ماں اپنے بچوں میں پھیلائے بیٹھی ہے۔ یہ معاشرہ اور اس کے چٹن کہاں کسی شریف بچہ کو چین سے بیٹھے دیتے ہیں۔ اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹی! ایک طرف فیصلہ نہ کرنا۔ سامی سے مشورہ کر لو۔ تم بھی تنہا ہوتی ہو تمہارا وقت بھی اچھا کٹ جائے گا۔ ثروت اور اس کی بیٹی سوہنی کی تسلی میں دیتی ہوں۔ میری ذمہ داری پر بغیر کسی خوف کے تم فیصلہ کرنا۔ سامی بھی دکھا بھلا شریف بچہ ہے۔ مجھے ثروت اور سوہنی کے لیے اس سے زیادہ اچھا اور یا حفاظت ٹھکانہ نہیں ملے گا۔“ اماں بی بات کے اختتام پر گم سم بیٹھی سوئی کے ہاتھ پر اپنا کھردرا مگر شفیق ہاتھ رکھ کے نرمی سے بولیں۔

”تم اچھی طرح سے سوچ لو۔ اگر دل نہیں مانتا تو زبردستی کلمے کی۔“

نرمی سے مزید بولیں۔

”بیٹی! جس ڈاکٹری کامیں نے تمہیں بتا دیا تھا اس سے رابطہ نہیں کیا؟“

”یہ دیر تو اللہ کی طرف سے ہے اماں بی! ہم دونوں کی رپورٹس ٹھیک ہیں۔“ سوئی نے لہجے میں اتنی رنجیدگی کو بشکل خود برطاری نہیں ہونے دیا۔

”رب سوہنا اپنا فضل ضرور کرے گا نماز میں دل لگایا کرو بیٹی! دعا عبارت کا مشر ہوتی ہے۔“

”جی اچھا۔“ ہمیشہ کی طرح سوئی جی بھر کر شرمندہ ہوتی تھی۔ نماز تو وہ پڑھتی تھی مگر ایک یا دو نمازیں ہمیشہ چھوٹ جاتیں۔ پابندی کا تسلسل قائم نہیں رہتا تھا۔

”سامی کب تک آجاتا ہے دفتر سے۔“ اماں بی پھل کے بوجھ سے جھکی امروہ کی شاخوں کو دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”چار بجے تک مگر آج دیر سے آئے گا۔ چناب بازار جانا ہے اس نے کرایہ لینے۔“

”اللہ رزق میں اور برکت ڈالے بیٹی! یہ پھل اتار لینا تھا۔“

”اتنی مرتبہ سامی سے کہا ہے مگر مجال ہے جو میری بات مان لے، خود کا دل چاہا تو میرے کئے بغیر سارے فحش میں سے ہی تے پھیر دے گا سارا پھل مار لے گا مگر فحش کی صفائی کرنے میں سلفہ مندی دکھائے گا۔“

”ایسوں بھی زبردستی مان لے ہو رہے ہیں اچار ڈال لیتیں۔“

”اماں بی! اس کی کو اچار پسند نہیں ہیں بھی صرف آپ کا اچار کھاتی ہوں۔ آپ کو ضرورت ہے تو لے جائیں۔“

”نہیں بیٹی! میں نے مرتبان بھر کے مرچ اور آم کا اچار ڈالا تھا۔ یاد ہے نا آم بھی اس درخت سے سامی نے تو ڈکریے تھے مگر ایسوں بھی نہیں سے لے کر گئی تھی۔ رب تعالیٰ زیادہ کی ہوس سے بچائے جب تمہاری ماں زندہ تھی نا پورے محلے میں موسم کے

اور سبزیاں بانٹتی تھی۔“ اماں بی کسی اچھی یاد کو وقت کے کسی لمحے میں کھونے لگیں۔ سوئی کو گویا لگا تھا۔ وہ کچھ مل کے لے ساکت رہ گئی۔

”اور میں کیا کرتی ہوں۔ اللہ کی وہی ہوتی نعمتوں کو صاف محض سستی کی وجہ سے۔“ سالن اور روٹی کے ٹکڑوں کو بچانے کے لیے ہر وقت کنشس رہنے والی تھی کہ کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ بیڑوں پر بے پھل کسی کسی وہابی دیتے ہیں۔ مگر اس کا بھی قصور نہیں تھا۔ سامی کی منتیں کرتی رہتی تھی کہ امروہ کیلے ہمیں ماہین وغیرہ اتار دیا کرے، موڑ ہو نا تو اتار دیا۔ پھر روٹی کی موم ہو جاتی تھی۔ کبھی بلکھن رہا ہے تو کبھی تازہ پھلوں کی چاٹ، کبھی فروٹ کسٹرو اور کبھی طرح طرح کے میزے ماں اس نے اماں کی روایت برقرار رکھ رکھی تھی۔ کھانے کے کسی گھر میں موسم کی سبزی یا پھل نہیں بیچا تھا۔ نہ جانے کیوں سوئی کو جی بھر کے پھل ہوتی تھے۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ باندھا تھا کہ اگر وہی اماں کی یاد اس طرح تازہ کرے گی اور پھر شکر کرنی رہے گی۔

”اماں بی! میری پینچ جہاں تک ہوتی ہے نا کوئی بھی فروٹ میرے ہاتھوں سے بچ نہیں پاتا۔ آپ کو پتا ہے کہ میں کتنا کھاتی ہوں۔ اگر کچھ نہ ملے تو گاڑ اور مولی سے پیٹ بھر لیتی ہوں۔ مگر یہ اونچے درختوں کی چوٹیوں تک پہنچنا میرے لیے آسان نہیں۔ ایک دفعہ کوشش ہی کی تھی مگر اس کوشش کے بعد توبہ کر لی۔ مرتے مرتے بچی تھی میں یاد ہے نا آپ کو کتنے دن بستر پر ہی رہی۔ آپ کے گھر سے تینوں وقت کا ناشتا کھانا آنا تھا۔ اور یہ سبزیاں بھی میرے شوق کی بدولت جری جری ہیں۔ آپ کو نہیں لگتا درختوں پھولوں اور پودوں سے محبت میں نے اماں سے وراثت میں لی ہے۔ اور صفائی ستھرائی کا خیال بھی اماں کی طرح میرے سر پر سوار رہتا ہے۔ صبح صبح صحن دھو لیتی ہوں۔ دن بھر کھانے والوں بچوں کو اٹھاتی رہتی ہوں مگر شام کو پھر بہت نہیں ہوتی کہ سامی درختوں کو ہلا کر بچوں کے امیر لگائے اور پھر مجھے دوبارہ سے صفائی کرنا پڑے۔“

اس نے اپنی سستی دو سرے معنوں میں بے بسی کی اچھی خاصی وضاحت کر ڈالی تھی۔

”سلیقہ قرین مگر عورت کی پہچان ہوتا ہے۔“ اماں بی صاف سمجھنے چکے فرش کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

”بچے سال سوئی کی ضد اور شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر سانی نے پورے صحن میں ماربل لگا کر دیا تھا۔ سوئی کی خواہش رہی پورے گھر کو پینٹ بھی کر دیا گیا تھا۔ اس گلے کے بھی گھروں میں یہ دو منزلہ مکان اپنی الگ ہی شناخت اور پہچان رکھتا تھا۔ بیوی دیواریں تک بیلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ گیٹ بھی نیا لگوا دیا تھا۔ اماں کے وقت میں لکڑی کا پھاری دروازہ تھا جسے وقت نے ریمک کی بیماری لگا دی تھی۔

گیٹ کے اوپر انگور کی تیل نے سلیہ کر رکھا تھا۔ اتنا پھل لگتا تھا کہ گلے کے بچے کچے اور کٹھے بیٹھے انگور کے کٹھے کھنے سے پہلے ہی ہڑب کر جاتے تھے۔ یہ تیل نہ جانے کس نسل کی تھی۔ محلے میں اکثر مہمان کسی گھر میں آتے تو خصوصاً انگور کی اس تیل کا دیدار ضرور کرتے۔ جو ابا کے ہاتھ سے لگائی گئی تھی اور اس کا پھل نہ جانے کس کس نے کھانا تھا۔ سوئی کو یاد تھا۔ اماں نے کبھی بھی کسی بچے کو پھل توڑنے سے منع نہیں کیا تھا۔ حالانکہ سوئی کو بہت غصہ آتا۔

”اماں! کچے توڑ کر لے جاتے ہیں۔ کھنے کا انتظار بھی نہیں کرتے۔ ایک دن سارے کٹوا دیں گی۔“

”نہ میری بیٹی! وعدہ کران درختوں کو محض اس وجہ سے نہیں کٹوائے گی کہ محلے کے بچے پھر پھلتے ہیں۔ کچے پھل کو توڑتے ہیں۔ انہیں کھانے دے یہ ان کا بچپنا اور شوق ہے اور لگانے والوں کے لیے صدقہ جاریہ موت کے بعد کا بھی انعام۔“ اماں ہمیشہ دہل کر ٹوک دیتی تھیں اسے اور سوئی کو اماں کا ٹوکنا ہمیشہ یاد رہا تھا۔ اس کے ذہن میں محفوظ تھا اسی لیے کبھی بھی اس نے درختوں کو کٹوانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی بچوں کو کبھی منع کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت کے بچے اب جوان ہو چکے تھے اور ان کے بچوں نے ٹنکر اور پتھر اٹھا لیے تھے۔ ماں سوئی نے اماں کی طرح کبھی

تو کڑی بھر بھر کے کسی کے گھر موسم کی سبزی نہیں بھجوائی تھی۔

”ایک ہماری سو ہے۔ گندگی کی پوٹ نہ کبھی خود کو صاف رکھانے گھر کو سوہنی بے چاری نے کمروں اور برساتی کا گند کیا نکل دیا وہ بھی میرے ہی کتے پر۔

بس سو بیگم نے سارے بھرم کے چولے اتار دیے۔ بچی کو ایسی بے بھاؤ کی سنائیں کہ منہ سے ادا کرنا بھی مشکل ہیں، ایسے گھٹیا الفاظ گندے القابات، توبہ توبہ۔

”اماں بی کا چہرہ ایک دم رنگ بدل گیا۔ شاید ثروت اور ان کی بیٹی کے لیے اماں بی کے دل میں بہت عجیبائش تھی، نرمی بھی غیر نرمی کے کیا ہی کہنے اماں بی تو راجے جیسے فقیروں سے بھی ہمدردی جتانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ اجنبیوں کو گھر لے آئیں، کھانا کھلائیں، بساط بھر دے کرتیں۔

”کوڑھ بھی کامزاج ہی ایسا ہے۔“ سونی نے عام سے انداز میں بھرو کیا۔ ”آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

”نہ بیٹی! اب چائے کا تردد مت کرنا۔ میں چلتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی تھی اور اماں بی نے سرعت سے اس کا ہاتھ تھام کر روکا۔

”تردد کیسا میں اپنے لیے بنا رہی ہوں۔“ وہ سونی ہی کیا جو اپنی منوائے نہ اٹھ کر اندر جاتے ہوئے اس نے اماں بی کو دھمکایا تھا۔

”آپ اگر چلی گئیں میری چائے پیے بغیر تو پھر دیکھے گا۔“

”اگر میں چلی گئی اور پورا امکان ہے کہ میری بیٹی کچن میں گھسے گی اور میں باہر کی طرف دوڑ لگا دوں گی۔ تب چائے کی دو سری بیانی میری بیٹی قطعاً ضائع تو نہیں ہونے دے گی۔“ اماں بی کے لبوں پر شفیق سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس محلے کی بھی بچیاں انہیں مان اور عزت دیتی تھیں۔ خواتین تو کیا مرد حضرات بھی سلام کیے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے، آس برسوں کی بچیوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ سلائی، کڑھالی، کھانا پکانا، لٹاف اور ہر قسم کے مذاق بنانا۔ غرض ہر

اس فن کو اماں بی نے صفت میں آگے منتقل کیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے انہیں سکھایا تھا۔ سونی بھی اماں بی کی شاگردوں میں سے تھی بلکہ ہر بل عزیز شاگرد تھی۔

”آپ نے ٹھیک کہا۔ چائے کی بیانی میری ٹھیک ہی چلی جائے گی۔ تاہم گاجر کا یہ حلوہ کون چلے گا۔“ چھوڑی ہی دیر میں سونی جھٹ پٹ چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”حلوہ کب بنایا؟“

”سہا کے لیے بنایا تھا۔“ شام کو گاجریں چھیلیں۔ صبح کش کر لی تھیں اور پھر ساتھ ہی چولے بھجوا دیں۔ جھٹ پٹ بن گیا تھا۔ ”سونی نے چائے کی چٹکیاں لیتے ہوئے بتایا۔

”گاجریں کو گرمیوں میں نرم کر لی ہوں گی، آج کل سہولت کے سو طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔“ اماں بی نے سچ ہی کہا تھا سونی بس بڑی۔

”اماں بی! یہ سہولتیں وقت بھی تو بچاتی ہیں۔“

”ٹھیک کہا، تا صرف وقت، بلکہ گیس کی بچت بھی۔“

”تو اور کیا۔“ سونی نے شہد سے سر ہلایا۔

”اماں بی! اتنے دن عذاب مت رہا کر رہو۔“ سونی نے لاڈ سے ان کے گلے میں بائیں ہاتھ لگا لیا۔

”کیوں بھلا۔“ انہوں نے جان بوجھ کر استفہار کیا۔

”سچی پور ہو جاتی ہوں۔“

شادی بیاہ کر اسی محلے کی تیسری گلی میں آئی۔ مگر سیاسی کی نازک مزاجی کے باعث کم کم ہی آتی تھی اور سونی تو بغیر کسی وجہ کے کسی کے گھر جا کر نہیں تھی، سولنا بلانا سرت کم ہو کر رہ گیا تھا۔

”پھوپھی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے گئی تھی۔“ اس نے منہ بنا کر بتایا۔

”تو ٹھہر جاتی۔“ اماں بی نے سادگی سے کہا۔

”سہا کا پچھلے ٹھہرنے زینا تب بنا۔“ سونی نے اماں بی سے بھی زیادہ سادگی کا مظاہرہ کیا۔

”مستم سے اماں بی! جتنی دیر بھی چھٹی رہی سہا نے اتنے شہو کے مارے تھے اور کوئی نہیں چٹکیاں میرے اندر میں بھری تھیں سچ نیل پڑے تھے۔“

”اللہ تمہاری خوشیوں کو سدا قائم دائم رکھے۔“ ساک سلامت رہے۔ اماں بی نے ہنستے ہوئے اور اچھے کلمات کہے تھے۔ اور یہ ان کا مخصوص انداز تھا۔

”سونی اس محبت پر ہمیشہ دل ہی دل میں مشکور رہتی تھی۔“

”کچھ دیر تو بیٹھے۔“ اس نے بھی ہمیشہ کی طرح اسرار کیا۔

”چلتی ہوں بیٹی! کافی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ اٹھنے لگی تھیں۔

”سہا سے ضرور بات کرنا، میں شکر رہی ہوں گی۔“ جاتے جاتے انہوں نے ایک دفعہ پھر یاد دہانی کروائی تھی۔

”میں ضرور بات کروں گی۔ اگر سہا مان گیا تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ سونی نے خوشدلی سے کہا۔

ذہن میں محفوظ رکھے ہوئے تھی، مگر سہا کو دیکھتے ہی سب کچھ دماغ سے نکل گیا۔ بلکہ وہ اپنے سوا کچھ یا د رہنے ہی کہاں رہا تھا۔

”سونی! اور سنی! کہاں گئی ہو۔“ سہا کی بابت تک رکنے کی آواز آئی تھی اور دوسرے ہی لمحے وہ چیخا ہوا اندر داخل ہوا۔

”کیا ہوا ہے؟“ ہمیشہ کی طرح سونی دلن کراس کی طرف آئی۔

”یہ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“ وہ ایک ڈیبا ہاتھ میں پکڑے اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا۔

”کیا ہے؟“ سونی مارے اشتیاق کے چل اٹھی۔

”تمہیں بھی میرے لیے کچھ لے کر آنا یاد رہا۔“

”یہ تو نہیں کھولنے دوں گا۔“ سہا نے پیننگ میں لپٹا ڈیبا پیچھے کر لیا۔

”اس میں ہے کیا؟“ وہ مچلی۔

”جو جھو۔“ سہا جان بوجھ کر اس کے تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔

”بٹاؤ نا۔“

”اگر بتا دیا تو مارو گی تو نہیں۔“ سہا نے ڈرتے ڈرتے بوجھا۔

”کوئی فضول چیز ہوگی۔“ سے غصہ آ گیا۔

”ہاں واقعی۔ تم نے بوجھ ہی لیا۔ اچھی خاصی ذہین ہو۔ پھر بھی۔“ انٹر میں بورڈ والوں کی سازش کی وجہ سے قیل ہو گئی تھیں۔

”سہا نے اسے چڑایا۔“

”اور تم نے لی اے کی نہ جانے کتنی رشوت دے کر ڈگری حاصل کی تھی۔“ سونی نے بھی بدلہ چکایا۔

”میں ملک کے سیاست دانوں کی طرح نہ سمجھو مجھے۔“ وہ بھی کہاں جو کتا تھا۔

”میرا بھیجاست کھاؤ۔ جلدی سے بتاؤ اس میں کیا ہے۔“ سونی بھی تجسس کے ہاتھوں مجبور تھی۔

”لال بیگ۔“ سہا نے اطمینان سے کہا۔

”تم سے مجھے یہ ہی امید تھی۔“ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

”کوئی نہیں لال بیگ پکڑتے رہے ہو۔“

"تو اور کیا؟" سہمی سنجیدہ تھا۔
 "پاس نے اپنی بیوی کے لیے لے کر جانے تھے" بھی نے اپنی بیویوں کے لیے دو دو چار چار پکڑ لیے میں نے بھی سوچا تمہیں کیوں ناخوش کروا جائے۔"

"پورے کہنے ہو۔" وہ جل بھن کر رہ گئی۔
 "مجھے پتا ہے۔" سہمی ہنس رہا تھا۔
 "ویسے تمہاری اماں زندہ ہوتی تا تو اپنی لاڈلی زبان سے نکلنے والے شعلوں کو دیکھ کر خودکشی کر لیتیں۔ میں تمہارا شوہر ہوں سہمی! مجھے پار بار کیوں تمہیں یاد دلانا پڑتا ہے۔" وہ تانسف سے بولتا گیا۔
 "جانتی ہوں۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔" سہمی نے بے نیازی سے کہا۔ وہ سیاہی کے آثارے جوتے جرابیں وغیرہ ٹھکانے لگا رہی تھی۔ سہمی کا شلوار قمیص ہاتھ روم میں لٹک رہا تھا۔ وہ پالش اور برش دو ازم میں سے نکال لائی۔ فوراً "جوتے بھی دوبارہ سے چمکا ڈالے تھے۔ وہ آج کا کام کل پر چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھی۔ پھر بھی سہمی کے شکوے ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔"

"یہ لال بیگ تم نے اچھا کیا ہے لے آئے ہو بریانی کے ساتھ کھا لینا۔"
 "حساب برابر کر چکی ہو تو ادھر دیکھو۔" وہ اس کے سامنے دو زانو بیٹھ چکا تھا۔
 "کیا ہے؟" سہمی پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"یہ ہے۔ برسلسٹ۔" چھوٹا سا ڈبا کھل چکا تھا۔ سونے کا نازک سا برسلسٹ، سہمی دم بہ خوردہ گئی تھی۔

"سہمی! تم نے یہ کب خریدا؟ اور کیسے؟"
 "کب اور کیسے کو مارو گولی بتاؤ پسند آیا۔" اس لیے سہمی کی آنکھیں جگر جگر کر رہی تھیں۔ یوں کہ سہمی کا دل بری طرح پھڑپھڑانے لگا تھا اور وہ ان آنکھوں کی چمک سے نظر حرا گئی تھی۔
 "ماشاء اللہ۔" اس کے ہونٹوں سے صدرا نکلی۔ اور یہ صد برسلسٹ کے لیے نہیں تھی۔ سامنے

بیٹھے خدا کے اس شاہکار کے لیے تھی۔ جو اس کا کمرہ کچھ تھا۔ اور جس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی دھڑکنے والے لیے قیامت تھا۔
 "پسند آیا۔" وہ برسلسٹ سہمی نے اس کی کالی میں سجایا تھا اور لمحہ بھر کے لیے سونے کو یوں لگا تھا برسلسٹ بے قیمت ہو کر رہ گیا ہے۔ سہمی ہی گول مٹول نرم کلائی میں پھنسا چمکتا دکھتا برسلسٹ سہمی کو ہنس نہیں لگ رہا تھا۔ بس یہ کلائی اتنی خوب صورت نہیں تھی جس میں یہ قیمتی برسلسٹ اپنی قیمت کو بوجھا تاکہ اس کے متنی خیالات سے انجان سہمی بہت پر جوش تھا۔

"اتنے عرصے سے تمہیں کوئی ڈھنگ کا تحفہ دینے کے لیے سوچ رہا تھا۔ اپنی سالگرہ پر تمہیں سوٹ دیا تھا۔ تمہاری سالگرہ پر تم نے سوٹ لے لیے وہ بھی میرے لیے۔" بیٹھنے نے اجازت ہی نہیں دی تھی۔ شادی کی سالگرہ بھی روکھی پھسکی گزر گئی۔ تمہاری پھوپھی بیمار تھیں۔ دوسری سالگرہ ہم نے منائی ہی نہیں۔ یاد ہے تم جاسن کے درخت سے گر گئی تھیں تیسری بھی فلاپ ہو گئی۔ اور جو تھی کے لیے یہ سہمی نے کہا۔
 "سہمی نے اس کا ہاتھ تھام کر جو یہاں۔" وہ آپ تو خوش ہونا۔" وہ اس کا گل تھپتھپاتا رہا تھا۔

"ہاں۔ خوش تو میں ہمیشہ رہتی ہوں۔ اتنے قیمتی تحفے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی بیٹی کو دیکھنا تھا۔" وہ سنبھل کر بولی۔
 "یہ تحفہ تم سے ملتا ہے۔" وہ پورے دل سے مسکرایا۔

"ماں! تمہیں عزت بھانڑو۔" سہمی جوتے پالش کر چکی تھی۔ اس بات کو دھونے ہاتھ روم میں جا رہی تھی۔
 "کھانا۔" سہمی نے وہالی دی۔
 "پھر بھی آرہی ہوں تمہا ہاتھ متہ تو دھو لو۔"
 "میرے حصے کے تم دھو آنا۔" اسے سخت بھوک لگی تھی اور وہ میز پر سبے لوازمات بھی دیکھ چکا تھا۔ سہمی آئی تو وہ کرسی کی بجائے میز پر بیٹھا بریانی کھا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نوکری کی بجائے خود بھی کھانا کھانے لگی

تھی۔ سہمی کا منہ بہت خوشگوار تھا اور وہ چاہتی تھی کہ اس کا منہ اسی طرح خوشگوار ہی رہے۔ کیونکہ روک ٹوک سہمی کو کرپوں کی طرح بری لگتی تھی جو سہمی نے چپکے سے میز پر سے اٹھا لیے تھے۔

سہمی یعنی سونیا باقریاو بیگم اور باقر شریف کی لاڈلی اولاد تھی۔ ماں اور باپ کی آنکھ کا تارا۔ پھر بھی نفیسہ کی لاڈلی ڈلاری بیٹی۔ اماں بی کی عزیز از جان شاکر گو اماں بی نے اسے قرآن پاک بھی پڑھایا تھا اور اس کی اماں اس لیے بھی اماں بی کی عزت کرتی تھیں۔
 ابا کی وفات کے بعد اماں نے بڑے سلیقے سے وقت بتایا۔ چناب بازار میں ابا کی سات وکانیں تھیں۔ جن کا کرایہ ماں نے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ہی ذریعہ آمدن تھا۔ اماں کی فرمائش اور اماں بی جیسے لوگوں کے تعاون سے اچھا وقت گزرنے لگا تھا۔ معاشی طور پر سہمی کو اماں نے کسی بھی بنیادی ضرورت سے محروم نہیں رہنے دیا۔ ہمیشہ اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، اچھی تربیت کی، تھوڑی ضدی اور جذباتی تھی، اماں کا خیال تھا وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔

اماں کا ساتھ بھی مختصر رہا تھا۔ ابا کے جانے کے نو سال بعد چل بسیں۔ اماں بی اور پھوپھی کے سہارے سہمی نے سہمی کو کبھی بے سہارا نہیں ہونے دیا۔ پھوپھی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھیں۔ چار سال وہ پھوپھی کے پاس رہی پھوپھی کی شفقتوں اور محبتوں سے دامن بھرتی رہی۔

شادی اور سہمی نے ایک ساتھ انٹر کے پرچے دیے تھے۔ شادی پاس اور وہ شان دار طریقے سے منگ ہو گئی تھی۔ اماں بی انٹر کے رزلٹ کاسن کر مٹھائی کے ڈبے سمیت پھوپھی کے گھر آئیں۔ سہمی کو ڈھیروں پیار کیا تھا۔

"راشدہ کالز کا پاس ہوا ہے، جلیبی دینے آئی تھی، مجھے خیال آیا کہ میری سہمی نے بھی بارہویں کے پرچے دے رکھے ہیں۔ بس پو کو بھیج کر مٹھائی منگوائی اور

فورا "اگلی۔" خوشی خوشی بتا رہی تھیں۔ سہمی کے لیے سوٹ بھی ملائی تھیں جو شادی کو پسند آگیا۔
 "اماں بی! یہ تو میرا ہوا۔"
 "اماں بی! تہذیب کا شکار ہو گئیں۔" سوٹ اسے ملنا چاہیے، جو پاس ہوا ہے۔ شادی کے دن سوٹ کا لکڑے کیے۔

"کیا مطلب؟" اماں بی حیران سی بولیں۔
 "اماں بی! آپ کی لاڈلی تو منگ ہو گئی ہے۔" شادی نے پناہ چھوڑا۔

"نہیں۔" اماں بی بے یقین سی شرمندہ شرمندہ سہمی کو دیکھنے لگیں۔ گویا پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ "پچی! کیا یہ ٹھیک بول رہی ہے۔"
 "اماں بی! پرچے چیک کرنے والا کوئی بڑا ہی سنگ دل تھا۔ گول گول انڈے دیتا رہا۔ دیتا رہا دیتا رہا۔" سہمی نے منہ بسور کر رکھا شروع کیا۔

"پچی! کیا وہ مرغ تھا۔" اماں بی اور بھی حیران ہو گئیں۔
 "مرغ نہیں، مرغی انڈے دیتی ہے۔" شادی چکی۔

"مر اس نے سہمی کو انڈے کیوں دیے۔" اماں بی گویا اٹک کر رہ گئیں۔
 "یہ انڈے لینے کے قابل تھی اماں! سارے پرچے خالی پکڑا آئی تھی بغیر کچھ لکھے۔" شادی نے راز اگل دیا تھا۔

"سہمی! کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟" اماں بی کو اب بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"جی اماں بی! سہمی نے اثبات میں سر ہلایا۔
 "اچھا۔" تم دل چھوٹا مت کرو، اب کے محنت کر کے پھر سے پرچے دینا۔" انہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔ "راشدہ کالز کا بھی تیسری مرتبہ کامیاب ہوا ہے۔"

"محنت کرنا اسے پسند ہے، ہر کام کو دیکھتی سے کر سکتی ہے، مگر سوائے پڑھنے کے کتاب دیکھتی ہی محنت کرنے سے بے رغبت جاتے ہیں۔" شادی سچ کہہ

رہی تھی۔ سونی بغیر برائے گلاب جامن کھائے جا رہی تھی۔
 "اماں بی! مٹھائی تو بڑے مزے کی ہے۔"
 "تمہیں پسند آئی۔" اماں بی خوش ہو گئی تھیں۔
 اب وہ ہنہ کھولے دو مڑے تڑے نوٹ نکالنے لگی تھیں۔ پھر یہ نوٹ انہوں نے شازی کے ہاتھ میں دیا۔
 "مجھے خبر ہوتی کہ تم بھی بارہویں میں پاس ہوئی ہو تو تمہارے لیے بھی جوڑا لائی کب یہ رکھ لو۔"
 "اماں بی! میں تو مذاق کر رہی تھی۔" شازی شرمندہ ہو گئی۔
 "رکھ لو شازی! اماں بی کو تمہارا انکار کرنا برا لگے گا۔" سونی اب انگلیاں چوس رہی تھی۔ پھوپھی اماں بی کے لیے چائے لے کر آئی تھیں۔
 "بیٹی! اتنا کچھ کیوں اٹھالائی ہو۔" اماں بی سخت خفا ہوئیں۔
 "کوئی بات نہیں اماں بی! ہم جو ہیں آپ کا ساتھ دینے والے۔" سونی نے کیا اب اور سموسے پلیٹ میں رکھ لیے۔
 "سونی نے ٹھیک کہا۔" شازی کیوں پیچھے رہتی فوراً ایک سموسہ اور کباب ایک لیا۔ حالانکہ پھوپھی دونوں کو بیک وقت گھور رہی تھیں۔
 "پھوپھی! آپ بھی لیں نا۔" اماں بی کے "زندہ" کرنے کے باوجود سونی ان کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھ رہی تھی اور اب وہ پھوپھی کے آنکھیں دکھانے کے باوجود بڑی معصومیت سے انہیں بھی پلیٹ میں آخری بچا ہوا سموسہ آفر کر رہی تھی۔ اماں بی نے تو صرف بسکٹ لیے تھے۔ باقی سب کچھ ان دونوں نے چٹ کر دیا۔ اماں بی کے چلنے کے بعد ان دونوں کو خوب جھاڑ پڑی تھی۔ اور وہ دونوں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی رہیں۔
 "کاش میں پاس ہو ہی جاتی۔" سونی نے چپکے سے شازی کے دوپٹے سے ہاتھ پوچھے۔
 "اچھا۔ وہ کس لیے۔"

"اماں بی کے لیے۔" سونی اٹھ کر ڈورا اور بیٹھ گئی تھی۔ "میرے فعل ہونے کی خبر نے انہیں کافی رنجیدہ کر دیا تھا۔"
 "اگلی دفعہ اماں بی کو خوش کر دینا۔" شازی برتن دھونے لگی تھی۔ دوپٹہ اتار کر کرسی کی پشت پر رکھا تھا۔ مگر پلو کو دیکھ کر چونک گئی۔
 "یہ کیا ہوا ہے؟"
 "سونی نے چونکنے کی بھر پور اداکاری کی۔
 "میرے سنے سوٹ کا دوپٹہ تھا۔ ہائے یہ کس بد نظر نے کیا ہے۔" شازی رو دینے کو تھی۔
 "مجھے تو لگتا ہے کسی نے ہاتھ پونچھ ڈالے ہیں۔"
 باریک بینی سے پلو ہاتھ میں لیے جلدی اور گھبراہٹ میں اس نے جھانک لیا۔
 "کسی نے نہیں تم نے تمہارے علاوہ کون ہے اس وقت گھر میں۔" شازی خطرناک تیور لیے اس کی سمت بڑھی تھی۔ جبکہ سونی پھوپھی جی! بچا لیں۔ کی دہائی دیتی سرٹ بھاگ گئی۔

* * *

"تم جانتی ہو اماں نے کیا حکم صادر کیا ہے۔" شازی جلتی کلمستی چھت پر چلی آئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سونی کیوں تو کرسی سے بھری تو کرسی لیے چھت پر ہی بیٹھی ہوگی۔
 "میں نہیں جانتی۔" وہ کیوں کارس نکال رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ہاتھ لٹکائی رکھی تھی۔
 "تم جانو گی کیسے؟" شازی کا انداز بھرپور طنز لیے ہوئے تھا۔
 "کھانے کے علاوہ تمہارا ادھیان کب کسی اور چیز پر ہوتا ہے۔ کھانا اور سونا وہ ہی تو تمہارے شوق ہیں۔"
 "اور تمہیں میرے یہ ہی دونوں شوق ایک آنکھ نہیں بھالتے۔" وہ دہبھی سے اپنے کلم میں مصروف رہی۔
 "شوق تو ڈھنگ کے پاتنی کھانا اور سونا۔" شازی نے کھانے والی نظر سے کیوں تو کرسی سے بھری تو کرسی کو

دیکھا۔
 "مور کا کمر کرنا بے حساب بے شمار۔" وہ بھی جتا دینے میں ماہر تھی۔ "کلم چورا تیرے جیسے کا کلم بھی کرتی ہوں۔ انرجی ڈاؤن ہو جاتی ہے، جیسے تو کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی ہوں۔"
 "پھر بھی بے حساب کھانے کے باوجود جسم برماں نہیں آ رہا، ویری سیڈ۔" شازی نے تاسف کا برتا اظہار کیا۔
 "اور تم بغیر کھائے پیے پھٹنے کے قریب ہی چکی ہو۔"
 "تمہاری طرح کھایا یا سنا، تو نہیں ہو رہا نا، کھاتی ہوں تو نظر بھی آتا ہے۔" شازی نے ایک کیڑا اٹھا لیا۔
 "تمہارے گھر کے بارغ کے ہیں۔"
 "پالہ۔"
 "کون لایا۔" شازی نے بیٹھا رسیلا کیڑو منٹوں میں چٹ کر دیا تھا۔ اب وہ ایک اور اٹھانا چاہتی تھی۔
 "اماں بی نے جھوٹے ہیں گھر کی دیکھ دیکھ وہ ہی تو کرتی ہیں۔" وہ اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔
 "تو کرسی بائیں سے دائیں طرف منتقل ہو چکی تھی۔
 "ایک اور دوپٹہ۔" شازی نے لجاجت سے کہا۔
 "سوری! میں نے تین گلاس جوس پیتا ہے۔"
 "مگر یہ تو چارے سے بھی اوپر ہو جائے گا۔ بس بھی کرو، انہیں تمک لگا کر کھاتے ہیں۔" شازی کے منہ میں پانی بھر آیا۔
 "ایک گلاس تمہیں بھی ملے گا اور دو سرا پھوپھی جی کو۔" وہ ہاتھ کی مشین سے جوس نکال رہی تھی۔
 "اماں کے چیز کی مشین بھی جو اس نے سائز کے ہاتھ منگوائی تھی گھر سے، وہ بڑی مہارت سے ہینڈل گھا کر جو س نکال رہی تھی۔ ہاتھ کی مشین سے احتیاط کے ساتھ رس نکالنا پڑتا تھا تاکہ چھلکے کی کڑواہٹ جوس میں کھلنے نہ پائے۔
 "جیو، میری جان، ہزاروں لاکھوں برس۔" شازی اس عنایت پر کھل اٹھی۔
 "بدوعا تو نہ دو۔" وہ خواجوا دھناتی۔

"بدوعا نہیں رہتی، تم مجھے ایک کیڑو دے دو، یہ تو بڑے مزے کے ہیں۔" شازی نے لپٹاتی نظر سے اسے دیکھا۔
 "جوس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا، ہاں یہ چھلکے پڑے ہیں، انہیں کھانا چاہو تو شوق سے کھا سکتی ہو۔"
 "اور اس سے دو۔"
 "بھانگو کہاں سے جوس بھی نہیں دوں گی۔" اس نے دھمکیا۔ "تو بے تم جھت پر کرنے کیا آئی تھیں۔"
 "شکر ہے، تمہیں خیال تو آیا پوچھنے گا۔" وہ کلمس کر رہی تھی۔
 "بیٹاؤ۔" وہ اپنا کلم ختم کر چکی تھی۔ چھت پر لگی ٹوٹی کھول کر ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔
 "اماں نے آگے بڑھنے سے منع کر دیا ہے۔" شازی کو رونا آ گیا تھا، حج کارونا۔
 "تو نہ پڑھو۔" وہ ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتی بے نیازی سے بولی۔
 "آستین کی سپولن۔ کیسے منہ پھاڑ کر کہہ دیا ہے نہ پڑھو، جبکہ میں چاہ رہی ہوں تم اماں کو راضی کرو۔"
 "شازی پھاڑ کھانے کو دوڑی۔
 "پھوپھی جی ہرگز نہیں مانیں گی، اگر انہوں نے منع کر دیا ہے تو بس کر دیا۔ کوئی بھی انہیں منا نہیں سکتا، جی کہ زمین پر لوئیں لگا کر میسائلنگ سائز بھی نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔ سائز، شازی کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور پھوپھی کا بہت لاڈلا بھی تھا۔
 "وہ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔" شازی بسوری۔
 "مجھی خبر ہے، کب جارہے ہیں، ہم رشتہ دیکھنے، دہی بھلے اور فروٹ چاٹ کھانے۔" سونی نے چٹخارا لیا۔
 "بس تم تو کھانے پر مرقی رہنا۔" شازی جمل کر اٹھی۔ منڈر پر سے کپڑے اتارے۔
 "تو اور کس پر مولی۔" وہ جوس کا تیسرا گلاس چڑھاتے ہوئے بولی۔
 "وہ ہے نا، تیری رشتے کی خالہ کاسو تیلایا۔" شازی جسی خیزی سے مسکرائی۔

”کون؟“ وہ حیران ہوئی۔

”سہمی اور کون؟“ شازی ہنس رہی تھی۔

”کیوں اس نہ کہ۔“ وہ برامان لگی۔

”غصہ کھانے کی کیا بات ہے، مرنا ہی ہے تو سہمی پر مرنا کچھ حاصل بھی ہو ویسے ہے تو وہ دیکھنے کی چیز۔“

شازی نے آنکھ دیالی۔

”تم نے کب دیکھا ہے۔“ وہ بھنویں اچکا کر دیکھ رہی تھی۔

”ایک ہزار ایک مرتبہ تو دیکھا ہے۔ سہمی کی فوتگی پر قل اور دسویں والے روز چالیسویں کے بعد بھی خالہ

اور سہمی آتے رہے تھے تا تیری خبر گیری کے لیے۔“ شازی کپڑے سے کرنے کے ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے اسے بھی دیکھ رہی تھی جو جوج کسی سوچ کے زیر اثر دور بست دور پہنچی ہوئی تھی۔

”سہمی! اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آتنا سا مانتا تو بے شمار مرتبہ ہوا تھا۔ خوش مزاج اور شوخ و شریر سا خالہ کا سویتا بیٹا حسام سہیل، گھلتی رنگت، سیاہ آنکھیں، کھڑی ناک، جس پر اسے بڑا ہی مان تھا۔ ہر دفعہ اس پر نظر پڑتی تو وہ لمحہ بھر کو ضرور رک جاتا تھا اور پھر دانستہ کوئی نہ کوئی شریر سا جملہ بھی اچھا لگتا۔ اماں کی عیادت کے بہانے کئی مرتبہ خالہ کے ساتھ آیا تھا۔ خالہ، اماں کی دور کی گزن تھیں۔ اماں کو ان سے خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ بھی اماں سے ملنے آتی جاتی رہتی تھیں۔ جب سے وہ پھوپھی کے ساتھ آئی تھی خالہ نے چکر نہیں لگایا تھا۔

”تم تو سہمی کی تصویر میں گم ہو گئی ہو، بس! لوٹ آؤ اپنے حواسوں میں۔“ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے چمکی بجاتے ہوئے بولی۔

”نفع دور۔“ سہمی بری طرح سے جھینپ گئی۔

”ایک بات کہوں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے اجازت طلب کی۔

”برے منہ سے اچھی بات نکالنا۔“ سہمی نے وارننگ دی۔

”سنو تو۔“ شازی قدرے آگے کہنے لگی۔

”سنو تو۔“ شازی قدرے آگے کہنے لگی۔

”سنو تو۔“ شازی قدرے آگے کہنے لگی۔

”سنو تو۔“ شازی قدرے آگے کہنے لگی۔

”سنو تو۔“ شازی قدرے آگے کہنے لگی۔

کے ساتھ تیری خاص بے تکلفی ہے۔“

”کچھ خاص بھی نہیں۔“ سہمی نے بے نیازی دکھائی۔

”خوب بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ شاید اس کا مزاج ہی ایسا ہے اور پھر مجھ سے گالیاں سنتا ہے۔“

”اور گالیاں سن کر کیا کرتا ہے۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”فخوش ہوتا ہے۔ ہنستا ہے۔“ سہمی نے لا پرواہی سے کہا۔

”اچھا۔“ وہ معنی خیزی سے ہونٹ سیکڑنے لگی۔

”مجھے تو لگتا ہے۔“

”کیا؟“ سہمی بغیر اس کے کہے ہی سمجھ گئی تھی تبھی پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

”سہمی کو تجھ سے خاص قسم کا لگاؤ ہے۔“ وضاحت کرنا پسند کر دی۔ ”سہمی نے طنز یہ کہا۔

”بھئی صاف لفظوں میں کہوں گی تو تمہیں بظاہر تو برا لگے گا البتہ دل ہی دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔“ وہ کپڑے سے کھینچ لگی۔

”اب فرصت سے چارپائی پر پھسکا مارا بیٹھ گئی۔“

”سہمی نے انجان بننے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔“

”مجھے تو لگی پٹی آتی نہیں۔ صاف بات کہوں گی۔“

سہمی اور تمہاری خالہ کا اینٹ پتھر کاٹنے کا ایک پیر ہے تو وہ سراسر اسیر۔ شیر اور بکری ایک جگہ پر اکٹھے آتے رہے ہیں۔ یعنی تمہارے گھر۔ مال میں کچھ کالا تو ضرور ہے۔“ شازی نے مکاری سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”ہاں ہوں جاؤ گے۔ بس کی طرح دیلوں کو مت مارنا۔“ وہ دل کی بے قابو ہوتی دھڑکنوں کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے تو لگتا ہے۔ سہمی تجھ سے محبت کرتا ہے۔“

”غریب تمہارا ہاتھ مانگنے آئے گا۔ لکھو الو مجھ سے۔“ اور میں اتنی احمق ہوں۔ اپنا ہاتھ کاٹ کر اسے دوں گی۔ ہونٹ۔“ سہمی نے تھک کر کہا۔

”تم احمق نہیں ہو بلکہ احمقوں کی ملکہ ہو۔“ شازی

نے اپنا ہاتھ مانگا تھا۔ ”اماں کے پاس آئے گا۔ تیرا رشتہ مانگنے۔“

”اچھا۔“ سہمی نے طنز یہ لفظوں سے اسے دیکھا۔

”مجھے تو لگتا ہے۔ سہمی تیرے سے مشورے کرتا ہے روزانہ۔“

”یہی سمجھ لو۔“ وہ مزے سے پیر جھلانے لگی۔

”تو ذرا شازی! تم بھی ایک بات ذہن نشین کر لو کہ سہمی جیسے خوب رو تو جوان کو بھلا اگل کتنے نہ کاتا ہے کہ مجھ سے محبت کرنے کی حماقت کرے۔ اسے لوگوں کی بھلا کیا کمی ہے۔ جہاں بھی جائے۔“

”صنف نازک کو کھینچنا ہے۔ اپنی طرف۔ اماں کی وفات پر تو مجھے ہوش نہیں تھا البتہ۔“

”اور چالیسویں پر میں نے سہمی کے گرد اتنی ”بابلیوں“ کا جھگڑا دیکھا ہے۔ نا۔ اور بابلیوں کی ملاؤں تک لو اس پر قہا ہوتے ان گناہ گار آٹکھوں نے دیکھا ہے۔ مجھے تو لگتا تھا تمام خواتین برے دینے نہیں، سہمی سے روابط برنجانے کے لیے آتی ہیں۔“

”سہمی بے حد سنجیدہ تھی۔“

”ایسے لڑکے ہمارے گلی، گھلوں میں کسی ہیرو کی طرح پہچاننا لیتے ہیں۔“

”سہمی معاشی طور پر بہت کمزور ہے۔ اپنا گھر بھی نہیں، کرائے کا مکان وہ بھی ڈیڑھ کرے گا۔“

”شازی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔“

”تھیک ہے۔ ہم بھی سفید پوش لوگ ہیں۔ ابائی روڈ وہی کی چلتی دوکان ہے۔ یہ تین کمروں کا مکان ہے، لیکن ہے تو اپنا۔ سہمی تو ابھی تک کوئی کام وہام بھی نہیں کرتا۔“

”کام سے تو لگا ہوا ہے۔“

”بڑی معلومات ہیں۔ واہی واہ۔“ شازی گویا یہی سب سننے کے لیے سنجیدہ خاتم ہی ہوئی تھی۔ ”تمس نوعیت کے کام سے منسلک ہیں جناب!“

”خالہ کسی کا پوچھنے پر بتا رہی تھیں۔ رنگ سازی دوکان پر کام کرتا ہے۔“

”چلو اب تو ہماری اماں اعتراض کا کوئی نقطہ بھی نہیں اٹھا میں گی۔ لڑکا ہر روز گار ہے۔ رنج کے سوہنا ہے۔ ہماری سہمی کا دل سے طلبہ گار ہے۔“

”شازی کی زبان مان اسٹاپ چل رہی تھی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

”میں خواہوں اور خوش گمانوں میں گم رہے والی نہیں ہوں اور نہ ہی میں سہمی کے حوالے سے خواہوں کے تاج محل کھڑے کروں گی۔“

تا ان کے سوتیلے بیٹے نے تیرے لیے نکاح کا پیغام بھجوایا ہے۔ بتانا منظور ہے یا نہیں۔" شازی نے بالآخر دھماکا کر دیا تھا۔ ساتویں سیڑھی پر رکھے اس کے قدم ہی نہیں۔ پوری سونیا یا قرقر کر رہ گئی تھی۔



"کیا۔" اس کی دل کی دھڑکنوں نے اور دم مچا ڈالا۔

"میرا کان پھاڑنا ہے کیا۔"

"میں نے مجھے تیری رضامندی لینے کے لیے بھیجا ہے۔" وہ گاجر کترتی اس کے کان میں گھس کر چلائی تھی۔ سونیا کپڑے دھور رہی تھی۔ ششین کا بزرگ بھی بچے جا رہا تھا۔

"سورہ میں جس کام کے لیے آئی ہوں بس وہ ہی کروں گی۔ یہ کون سا معمولی کام ہے۔" وہ ست الو وجود تھی اور اس کی ساری سستی چچا کے گھر جا کر ہوا ہو گئی تھی۔

"کون سا کام؟" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"تمہاری رضامندی۔"

"تھیں کیوں بتاؤں۔" ان کی آن میں ڈھیروں لاج برس پڑی تھی گویا۔ شازی کو زور کی کھانسی آئی۔

کے لہجے میں واضح دکھ کی جھلک تھی۔ سونیا بھی رنجیدہ ہو گئی یہ مسئلہ تو ان جیسے معمولی مل کلاس گھرانوں کا لہجہ بننا جا رہا تھا۔

"تو اماں کی طرح بالوں کو لال مندی سے رنگتی کیوں نہیں۔ ایسے نیک مشورے تو تو اب کا کام ہیں۔ تم یہ بیڑہ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لو! سارے کو تر کو سینے سے لگائے قریب بڑی چارپائی پر بٹھے گیا تھا۔"

"کیسے کہاں گئے تھے صبح سے۔" شازی کو چھوٹے بھائی کی بد اخلاقت ہمیشہ کی طرح زہر لگی۔

"ہست دفعہ سمجھایا ہے بہنوں کے درمیان مت بولا کرو۔ مگر تمہاری عقل میں بات ساتی نہیں۔"

"کو تروں کے پیچھے خوار ہو رہا تھا کیا! تم جانتی تو ہو پھر بھی زخم اور جڑنے سے باز نہیں آتیں۔ سارے نے شاید کسی ڈرامے کا ڈیٹا لگا جھاڑا تھا۔ تپا سخت اشتعال میں آ گئی۔"

"کتاب کو ہاتھ مت لگانا۔ غلطی سے کہیں پاس ہی نہ ہو جاؤ۔"

"اس معاملے میں میرا سونیا تپا کا نقش قدم پر چلنے کا ارادہ ہے۔" سارے نے ششین بے نیازی سے کہا۔

"سونیا تپا کو تو بس چند لوگوں کی مسلمان ہی سمجھو۔"

شازی کا دھیان پھر سے بٹ گیا۔

"پر تم جا کہاں رہتی ہو۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"پیارے دلہن۔" جواب شازی کی طرف سے آیا۔

"ہائے سچی۔" وہ خوشی سے بھولا۔ "یہ کون سا ملک ہے؟"

"ہیں۔" سونیا اور شازی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"میرا لداخ اڑا رہی ہو۔" سارے برامان آیا۔

"ہماری مجال۔" ان دونوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"آہا! بروہس جا کر مجھے مت بھولنا۔" وہ ٹمٹک کر کہہ رہا تھا۔ "ناٹیاں اور چاکلیٹیں بھجوانا۔ ہو سکے تو کپڑے اور جوتے بھی۔ دل چاہا تو ایک کرکٹ کٹ بھی بھیج دینا۔ اپنی خوشی سے جو مرضی لے آیا کرنا۔ کبھی منع نہیں کروں گا۔ تمہارا دل توڑنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"بہن کر یہ برے ویرا! تیری آیا اٹلی یا فرانس نہیں جا رہی۔" سونیا نے اسے خوابوں کی دنیا سے بچھڑ کر باہر نکالا۔

"تو پھر کہاں جا رہی ہو۔" سارے نے ہونٹ پین کی انتہا کر دی۔

"سونیا پورہ جا رہی ہے۔ یعنی شادی کے بعد اپنی اماں کے گھر۔" شازی کے انکشاف نے سارے کو بد مزہ کر دیا تھا۔

"وہ تو کھل گیا۔" سونیا نے ہنسا شروع کر دیا۔

"اللہ کے لئے سونیا تپا کی جگہ تم ہی پیار کے دلہن و دلہان ہو جاؤ۔" وہ جاتے جاتے بھی اسے چرانے سے باز نہیں آیا۔

"تیری جان تو چھوٹ جائے گی۔"

"تیری جان نہیں چھوڑ کر جانے والی۔"

"بڑے بول مت بولو آیا! یہ نہ ہو کل ہی چاچی اور لیاقت بھائی تجھے لینے آجائیں۔" وہ چمک کر پلٹا۔

"میں تو جلیبی پر شہد لوار کر نکلے میں باتوں گا۔"

"قطعے منہ تیری اوقات کا۔" شازی جل بھن کر رہ گئی۔ تیرے جیسے بھائی ہوتے ہیں۔ ہونہ۔ بہنوں کا مان تم ہونگے؟"

"تمہارا نہ سہی سونیا تپا کا مان ضرور ہوں گا۔" وہ کالا کھڑے کرتے ہوئے بولا۔ "تپا! یہ تو بتاؤ تمہیں کس کے کھونٹے سے باندھا جا رہا ہے۔"

"بڑی بہنوں کا ذرا بھی لحاظ نہیں۔" سونیا نے تاسف سے ماتھا پیٹا۔ "بے شرم! ایسی باتیں تپاؤں سے نہیں پوچھتے۔"

"آچھا۔" وہ سچ شرمندہ ہو گیا۔ "سورہ آیا۔"

"سورہ کے بچے! اچل غسل خانے میں گھس۔

بدو کے جھیکے اٹھ رہے ہیں تیرے آس پاس سے۔"

شازی اسے گھسیٹ کر غسل خانے کی طرف لے گئی تھی۔ جبکہ وہ "سونیا تپا بچاؤ۔" کی گردان کیے چلا رہا تھا۔

خالہ نہ جانے کس دل کے ساتھ شمین کا سامان لے کر آئی تھیں۔ سامی کے ساتھ ان کا روایتی سا تعلق تھا۔ انہوں نے ہمیشہ ہی سامی کو اپنا سوتیلے بیٹا سمجھا تھا۔ سامی کے ساتھ انہوں نے کبھی بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اسے ذہنی طور پر ہمیشہ خارج کر لی رہی تھیں۔ غرض وہ سامی کے لیے بدترین سوتیلی ماں

ٹاہرت ہوئی تھیں۔ اور سنتے میں آیا تھا کہ سای کے مجبور کرنے پر ہی وہ سولی کا رشتہ لے کر آئی تھیں کہ اب وہ اسی سوتیلے بیٹے کے رحم و کرم پر تھیں جس کو تین تین وقت بھوکا رکھ کے اور گرمی دھپروں میں چھت پر کھڑا کر دیتی تھیں وہ بھی ننگے پاؤں۔ اور یہ سزا میں جو وہ سال تک سائی کا مقدر رہی رہتی تھیں۔ بہت اعلا اور قیمتی سامان نہیں تھا۔ مگر جو کچھ بھی تھا

بہت اچھا تھا۔ سولی کو سب کچھ پسند آیا۔ اور جب حال نے اسے بتایا کہ خریداری سائی نے کی ہے تو سولی کا دل نجانے کتنی ہی مرتبہ خوشی کے احساس سے جھومنا۔ حالہ بیمار تھیں ظاہر ہے وہ تو بازار جا نہیں سکتی تھیں۔ سائی کو ہی تمام بھاگ دوڑ کرنا پڑ رہی تھی۔ حالانکہ چھو بھی نے سائی کو فضول خرچی سے منع کر رکھا تھا۔ اسی شام سائی کا فون آیا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ فون چھو بھاکے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ شازی نے اپنے زونیز دماغ سے ترکیب ڈھونڈ ہی نکالی تھی۔ دوسرے ہی پل وہ چھو بھاکے کمرے میں پہنچ گئی تھی مگر چائے کی پیالی کے بغیر۔

”چائے لائی ہو۔؟“

”نہیں ابا۔ شازی گزری ہو۔“

”میرے موزے لینے ہیں۔ آج انہیں مت دھونا“ صبح تک سو تھیں گے نہیں۔ وہ اپنا حساب کتاب کر رہے تھے۔

”ہی ابا! موزے ہی لینے آئی تھی۔“ شازی بلاوجہ ہی مسکرائی۔ ”ابا! آپ کو چاچا رسول بخش بلا رہے تھے۔“

”تم نے بتایا کیوں نہیں۔ کون آیا تھا بلانے۔“ ابا کو سارا حساب کتاب بھول گیا۔ چاچا رسول بخش ابا کے قریبی عزیز از جن دوست تھے۔ بے چارے معذور تھے چلنے پھرنے سے قاصر۔ لہا شام کے وقت ضرورتوں سے ملاقات کی غرض سے جاتے تھے مگر سولی فون کو چھوٹا سا تالا لگا کر۔

”ٹپو آیا تھا۔“ وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھی۔

”اپنی ماں کو بتا دینا۔ میں جا رہا ہوں رسول بخش کی طبیعت خراب نہ ہو۔“ ابا فکر مند سے باہر نکل گئے۔ شازی نے جوش کے عالم میں ابا کا دروازہ کھولا۔ چالی یا آسانی مل گئی تھی۔ لکڑی کا لاکس۔ جھٹ سے کھل گیا۔ وہ بھاگ کر سولی کو بلا لائی تھی۔

”شازی! کیا مذاق ہے یہ۔“ وہ سر تپا کانپ رہی تھی۔

”سائی سے بات کرو۔ فافٹ آجا۔“ شازی زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر فون کے پاس لے آئی۔ اس نے سائی کا نمبر نہ جانے کہاں سے لیا تھا۔

”یہ لو کرو بات۔“ وہ ریسیور اسے زبردستی پکڑا کر خوب ننگ پر بٹھ گئی۔

”میں نہیں کروں گی۔“ اس نے ریسیور کو یوں پھینکا گویا کوئی ظالم سا اڑھا ہوا۔ فون سے سائی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ناچار شازی کو بات کرنا پڑی۔ اور وہ تان اشاپ شروع ہو گئی۔

”آپ کی خیریت پوچھنے کے ارادے سے فون کیا ہے۔“ شازی نے سائی کی کسی بات کے جواب میں چمک کر کہا۔

”جنتاب! وہ پاس ہی موجود ہیں مگر میں خفا تھا۔“ وہ گنگنا کر اسے مسلسل چڑا رہی تھی۔

”کیوں نہیں میں ضرورت بات کر داتی مگر حسابہ کے تیور بگڑے بگڑے ہیں۔“ وہ فون پر مڑے سے بولی تھی پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بغیر شروع ہو گئی ”سائی کہہ رہا ہے میں تیور درست کروں گا۔ ذرا ریسیور تو سجنوں کو پکڑاؤں۔ کرو بات۔“ شازی نے ریسیور اس کے کان سے لگا دیا۔

”تم پھو لو یہاں سے میں تمہارے سامنے بات نہیں کروں گی۔“

”لو۔ یاروں سے پرہ واری۔“ شازی چمک کر بولی پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے چلی۔

”ذرا جلدی سے باہر آجانا۔ ابا کے آنے سے پہلے“

”تم تو، فوج ہو جاؤ۔“ وہ وادنت پیش کر بولی۔

”ہماری جلی اور ہمیں ہی میاؤں۔“ شازی ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

”شکر ہے تمہاری آواز تو سنائی دی ہے۔“ امیر پیش میں سے سائی کی آواز سنائی دی۔ سولی کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی تھی۔

”تم نے دن کو بھی فون کیا تھا۔؟“ سولی کو کوئی بات نہ سوچھی تو بے تکاسا سوال جڑویا۔

”ہاں۔“

”شازی کے ساتھ مل کر بلا تکبھی تمہاری نے بنائی ہوگی۔“

”تو اور کیا۔“ وہ بغیر ہنچکنے کے اعتبار سے بولا۔

”گرو بات پھر۔“ کیا احسان عظیم کیا گیا تھا۔ سائی عیش عیش کر اٹھا۔ ”اس اور کچھ کھا کر مر ہی نہ جاؤں؟“

”اللہ نہ کرے۔“ وہ گھبرا اٹھی۔ ”کم از کم اچھا تو بول لیا کرو۔“

”میں برا بولتا ہوں۔ بد شکونی کی باتیں کرتا ہوں۔“ وہ تھک کر بولا۔

”تو اور کیا۔“

”تم ہی کسی اچھی بات سے آغاز کر لیتیں۔“ سائی نے نفیس سا شکوہ کیا۔

”میں فون رکھ رہی ہوں۔“ وہ گھبرا کر بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ارے۔ یہ غضب مت ڈھانا۔“ سائی فلی آواز میں چیخا۔

”کیا ہوا؟“ وہ اور بھی گھبرائی۔

”بھی فون مت رکھنا۔“ گویا التجا کی گئی تھی۔

”پھو بھا آجا میں گے۔“

”نہیں آئیں گے۔ شازی نے چاچا رسول بخش کے گھر انہیں بھیجا ہے۔ گیارہ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔“ وہ مطمئن تھا۔

”گیارہ بجنے میں صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔“ آنکھیں کھول کر گھڑی کی طرف دیکھو۔“ اس نے گویا ہتاکر کہا تھا۔

”آجھا۔“ وہ سچ گھڑی کی طرف دیکھ کر چونکا۔ ”بھی تو بات بھی نہیں کی؟“

”تو کرو نا۔“

”تمہیں میری خریداری پسند آئی۔؟“

”ہاں۔“

”صرف ہاں نہ۔“ وہ سورا۔

”ہاں ہاں ہاں۔“

”یہ بولی نا بات۔“ سائی کھل اٹھا ”ایک سوال کا اور جواب دو۔؟“

”کیا؟“ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

”تمہیں میرا ساتھ دل سے قبول ہے؟“

”جی۔“ اس نے اطمینان سے بھر اسانس لیا۔

”صرف سچی۔“ وہ گویا سچ کر رہ گیا۔

”جی جی جی۔“ سولی نے پھر سے گردن کی۔

”جیو میری جان! دل خوش کر دیا ہے۔ باقی کے دن سکون سے گزریں گے۔“ وہ چٹکا۔

”فون رکھ دوں؟“ سولی نے اجازت طلب کی تھی۔

”بھی سے۔“ وہ ناراضی سے بولا ”تم فون رکھو میں کل کرتا ہوں۔“

”نہیں پھر سچی۔“ وہ ہکلائی۔

”یار! ڈرتی کیوں ہو۔ پھو بھا کچھ نہیں کہیں گے میں نے ان سے پرہیشن لے کر دن کو فون کیا تھا مگر تم نجانے کہاں تفرق کرنے لگی ہوئی تھیں۔“

”میں پھو بھی جی کی دوا میں لینے سائے کے ساتھ اسٹور تک گئی تھی۔“ وہ تفرق کی ناراضی کے ساتھ تشریح کرنے لگی۔

”خود کاہم کے ہمانے نجانے کہاں کہاں آوارہ گردی کرتے ہو۔“

”یہ ہوائی کس دشمن نے اڑائی ہے۔“ وہ چیخا۔

”ہمارا دھیان آپ میں ہی انگار رہتا ہے جنتاب۔“ سولی تو کہہ کر بچھتا لگی تھی۔

”یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔“ وہ گویا کورنش بچا لایا۔ ”اور کیا کیا جانتی ہیں ہمارے بارے میں۔“

”بہت کچھ۔“ اس نے انحصار سے کلام لیا۔

”پھر بھی کیا کیا؟“ وہ جاننے کے لیے بے چین ہوا۔
 ”بھی کہ خوبصورت لڑکیوں کو تاڑتے ہو۔“
 ”یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟ سزا جھوٹ۔“ سہمی
 ماننے سے انکاری ہو گیا۔ ”میں نے تو صرف ایک لڑکی
 کو تاڑا تھا۔ اور وہ تم ہو۔ اپنے بارے میں تو تم اچھی
 طرح سے جانتی ہو نا۔“ اب وہ سولی کو پھینڈ رہا تھا۔
 ”کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔“ سونی نے
 مدد سے کے زیر اثر پوچھا۔
 ”مجھے تو لگتی ہو تم۔“ اس نے جان بوجھ کر بات
 ادھوری چھوڑ دی تھی۔
 ”مگر کیا؟“ وہ بھنکا کر بولی۔
 ”مگر آئینہ تو سچ ہی بولتا ہے نا۔“ سہمی نے معصوم
 بن کر کہا۔

”خود بڑے شہزاد عالم ہو۔“ وہ مل کھا کر رہ گئی تھی۔
 ”خبردار ہو آئینہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی۔“
 ”مجھے بھی تمہاری سڑی ہوئی باتیں سننے کا کوئی شوق
 نہیں۔“ وہ بھی سہمی تھا۔ کیوں پیچھے رہتا۔
 ”ہو نہ۔“ سہمی نے بھنکا کر فون شیخ دیا تھا۔ ادھر
 سہمی نے بھی یہی عمل دہرایا۔ یہ سہمی ان کی پہلی
 باضابطہ لڑائی۔ اس کے بعد لڑائیوں کا ایک سلسلہ
 شروع ہو گیا تھا۔ خوشگوار آغاز کا انجام ایسا ہی کھٹی
 ٹیٹھی لڑائیوں اور جھڑپوں سے آراستہ۔
 سونی کے مزاج میں حاکمیت تھی جو سہمی کو سخت
 ناپسند تھی۔ وہ ضدی بھی تھی۔ منہ سے نیکی ہریات
 منوالینا چاہتی تھی۔ ایک اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ اسے
 غصہ بھی جلدی آتا تھا۔ مگر اترنے میں بھی زیادہ دیر
 نہیں لگتی تھی۔ سوپل میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

شادی سے صرف چار دن پہلے خالہ چل بیٹیں۔
 سہمی کو سخت تپ چڑھ گئی کئی دن اس نے پھوپھی کے
 گھر کے چکر لگائے تھے ایک دن پھوپھی سے کھانے
 کتنا شروع کر دیے۔ شادی اور وہ گندم صاف کر رہی
 تھیں۔ پھوپھی گاجریں پھیل رہی تھیں۔ مرنے پانے

کے لیے سہمی پھوپھی کے قریب موڑھے رہ بیٹھا تھا۔
 ”سونی کی خالہ جنت کے باغوں میں سیر کریں، بیشہ
 پر جاتے جاتے بھی میرا کام بگاڑ کر رہی گئی ہیں اچھی بھلی
 تاریخ طے تھی۔ دعوت نامے تقسیم کر دیئے تھے۔
 میری خوشی برواشت نہ ہو سکی۔“ وہ جلا بھنا بیٹھا تھا۔
 ”پترا یہ تو اللہ کے کام ہیں۔ تمہاری اماں کا بلاوا آگیا
 تھا جانا تو تھا۔“ پھوپھی نے ساوگی سے اسے ٹھنڈا
 کرنا چاہا۔ شادی اور سونی اپنی ہنس چھپانے میں ہلکان
 ہو رہی تھیں۔

”اس وقت بلاوا آجاتا تو اچھا تھا۔ جب دھوپ میں
 میری کمر سینکا کرتی تھیں۔ سچ بتاؤں، پیسھی! بہت مارا
 کرتی تھیں۔ رات بھر بھوکا رکھتیں۔ دن بھر گدھے
 کی طرح جوتے رکھتیں۔ ایسا کٹھ کے وہ اپا تھے اب
 انہیں کیا کہوں۔ دونوں میاں بیوی جنت مکانی ہماری تو
 یہی دعا ہے۔ دونوں کی دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ پر
 میری بچپن میں مانگی بدوعامی عین شادی سے چار دن
 پہلے پوری ہوئی ہیں بطور میری سزا کے۔“
 ”اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ چار دن
 شادی آگے ہو گئی ہے تو اس میں بھی کوئی بہتری ہو سکتی
 ہوگی۔“ پھوپھی نے نرمی سے سمجھایا تھا پھر سولی سے
 مخاطب ہوئیں۔ ”سہمی کو گاجر کارس نکال دیئے مٹی!“
 ”اچھا پھوپھی!“ وہ خوشی خوشی اٹھنے لگی تھی۔
 کیونکہ گاجر کارس اسے خود بہت پسند تھا۔

”نہ پھوپھی! مجھے نہیں بیٹا۔“ سہمی نے منہ بتایا۔
 ”کیوں پترا!“ پھوپھی نے نرمی سے پوچھا۔ ”کیا
 چاہتے ہو گے؟“
 ”نہ پانے نہ پانی۔“
 ”تو پھوپھی!“ سہمی نے کھس کر پوچھا۔
 ”کھانا۔“
 ”واہ جی واہ۔“ شادی چھوٹی۔ ”تم ہماری برادری
 سے ہو یعنی کھانے پینے کے شوقین۔“
 ”جی نہیں۔“ سہمی نے ان کی خوش فہمی دور کی۔
 ”میں کھانے کے بعد کچھ نہیں کھانا اور کھانا میں کھا کر
 آ رہا ہوں۔“

”ہم نے تو کڑی ہی بھائی تھی۔ سوچا تھا تم کو کے تو
 کھائیں گے۔ چلو بھی سولی! ہم خود ہی کھا لیتے ہیں۔“
 شادی نے بے تابی سے ہاتھ جھاڑ کر کہا۔
 ”کڑی ہی کس نے بھائی۔“ سہمی نے گاجر کترتے
 ہوئے پوچھا۔
 ”میں نے۔“ جواب سونی کی طرف سے آیا تھا۔
 سہمی کو ادھر سے ہی جواب کی توقع تھی۔
 ”اور کیا کچھ بنانا آتا ہے؟“ بالقعدہ اشروپو کا آغاز
 ہو گیا۔

”دہی گوشت اور۔“ ابھی وہ مزہر سوچتے لگی تھی
 جب چوبارے سے سہمی نے جھاگ کر اقمہ دیا۔
 ”سہمی بھائی! مجھے سے پوچھیے۔ آپا کو سب بنانا آتا
 ہے۔ دہی گوشت، دھواں گوشت، بانٹی گوشت، ٹب
 گوشت، کڑی گوشت، فرانگ پن بینگن، بھنڈی
 بانڈی، ادولی گئی پالک، کوکر وال، کوکر پائے، کوکر
 میں پکائی جانے والی ڈشیز تھیں، تو کیا اب کباب
 تو بنے پر تلے جاتے تھے گولا کباب، پارو کباب، شیخ
 کباب، توپ کباب، بندوق کباب سب آتا ہے میری
 آپا کو بنانا۔“ بڑے فخر سے سینہ پھلا کر سہمی نے کہا تھا۔
 سونی اور شادی نے گویا ماتھا پٹیا تھا جبکہ سہمی بھائی تو گویا
 جھوم اٹھا۔

”میرے بھائی! مجھے ایک مشورہ تو دے۔“ سہمی
 نے سوچتے ہوئے کہا۔
 ”جی بھائی! بولیے۔“ سہمی پتنگ کی ڈور اپنے دوست
 کو تھما کر نیچے چلا آیا۔
 ”نیچوچ پلاننگ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کیا
 میں ایک ہوٹل نہ کھول لوں؟“
 ”ضرور کیوں نہیں۔“ سہمی نے نور و شور سے
 اثبات میں سر ہلایا۔
 ”کک کی تو ضرورت نہیں پڑے گی۔“
 ”تو اور کیا۔“ وہ سنجیدگی سے سر ہلانا رہا۔
 ”تمہاری آپا جو ہے۔ ہر فن مولا۔ جسے بندوق اور
 توپ کباب بھی بنانے آتے ہیں۔ وال کوکر اور پائے
 کوکر بھی بنا سکتی ہے۔ ٹب گوشت اور بانٹی گوشت

تمہاری آپا کے اضافی کمالات ہیں۔ تو پھر میرا تو فائدہ ہی
 فائدہ ہوا نا۔“ سہمی نے سنجیدگی کے ریکارڈ توڑے۔
 ”آپا ہوں میں کام کرنی اچھی لگے گی کیا۔“ سہمی
 نے بہت در سہمی کے بعد رہانے کی کوشش کی۔
 ”ابے کرے! اٹھ جا کر اپنا کام کر۔“ شادی نے
 جیل برائی تھی۔ وہ واقعی اٹھ کر بھاگ گیا۔
 ”تم کہاں کھسک رہی ہو؟“ سہمی نے نظر بجا کر کہن
 کی طرف جاتی سولی سے پوچھا۔
 ”بھوک لگی ہے؟“ وہ منمنائی۔
 ”ناشنا نہیں کیا تھا۔“ سہمی نے ہمدردی سے
 پوچھا۔

”کیا تھا۔“ سہمی نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”کیا کھایا تھا ناشتے میں۔“ اس نے سر سر سے
 انداز میں پوچھا تھا جبکہ سہمی تو تفصیل سنانے کے لیے
 بیٹھ گئی۔
 ”دو قرانی انڈے دو چھوٹے پرائٹھے۔ شادی اتنا
 سا پیٹھ لیتی ہے۔“ بالقعدہ دو انگلیوں کا دائرہ بنا کر دکھایا گیا
 تھا۔
 ”دو گلاس لسی بی تھی۔ پھر مجھے سخت پیٹہ آئی۔ مگر
 کام بھی تو ضروری تھے۔ برتن دھونے، صفائی کی کپڑوں
 کے ڈھیر کو استری کیا۔ پھر سو گئی صرف دس منٹ سونی
 تھی۔ بھوک نے جگا دیا تھا۔ سونجی کا حلوہ گرم کر کے
 جلدی جلدی سے کھایا۔ ایک کپ چائے پی۔ صبح کا بچا
 ہو اور اٹھا کھایا۔ پھر چکن کڑی بھائی۔ شادی نے بتایا تھا
 تم نے آتا ہے۔ پھوپھی نے کہا رس ملانی بھی ہتاؤ۔
 کھانا بنایا، گندم صاف کی، تمہاری باتیں سنی اور پھر
 سے بھوک لگ گئی ہے۔“

”ماشاء اللہ پیٹ ہے کہ کتنا۔“ سہمی نے کانوں
 کو ہاتھ لگائے۔
 ”لہذا کھایا یا کہاں جاتا ہے؟“ سہمی کا اشارہ اس کی
 صحت کی طرف تھا۔
 ”نظر لگانے والے بھی تو بہت ہیں۔“ وہ شادی کو
 چڑھا رہی تھی۔
 ”کیچ رہے ہو سہمی! یہ قدر ہے ہماری۔“

”غم نہ کھاؤ میری بہنا! ہماری قدر اتنی بھی نہیں۔“
سای خواتم خواہ جذباتی ہو۔
”کیس تو پولوں کی سلامی دوں تمہیں۔“ سونی بھنا کر
پلیں۔

”مجھے سلامی دینے سے زیادہ اہم کام مرغ کو حیرنا
پھاڑنا ہے۔“ آپ جا کر اپنا مشغل فرمائیے، چکن کڑائی
آپ کو پکا رہتی ہے۔“ سائی نے پچکار کر کہا۔
”تم تو گویا کچھ کھاتے نہیں سو مجھے ہو صرف۔“
سونی نے جواب دینا ضروری سمجھا۔
”اس رفتار سے تو تمہیں کھا سکتا۔“
”سونی کے ساتھ رہو گے تو ایسی ہی رفتار پکڑ
لو گے۔“ ستازی بھی سونی کے پیچھے چکن کی طرف بھاگی
تھی۔

”پھوپھی جی باہر دونوں کتنا کھاتی ہیں۔“
”تو اور کیا۔“ پھوپھی کو اپنے دکھڑے یاد آگئے تھے
کہ کس طرح ان دونوں کے باہر کت ہاتھوں کی بدولت
راشن ہفت بھر میں ہوا ہو جاتا ہے۔

سونی پھوپھی کے گھر سے رخصت ہو کر اپنی اماں
کے گھر آئی تھی۔ زندگی میں گویا رنگوں کی برسات اتر
آئی تھی۔ سائی کی بے پایاں محبت توجہ اور چاہتوں کے
سنگ وقت سبک خرومی سے گزرنے لگا تھا۔ کمی بھی تو
صرف اس ننھے منے وجود کی جوان کی خوشیوں کے
ستاروں کو قوس و قزح سے سجا دیتا۔
ایک معمول سے گزرنی زندگی کے سمندر میں
تلاطم بھلا کب اور کیسے آیا؟

صبح اور شام کی اس کہانی کے صفحات پورب سے
آتی ہوا سے پھڑپھڑائے تھے اور صفحہ قرطاس پر کچھ اور
ہی نئے انداز میں رقم ہونے لگا۔
ہمارے سر جھکائے آنسو پتی چپکے سے کسی اور
نکل گئی تھی اور خزاں نے نخواست سے پتہ آ کر تے
درختوں کے نوحوں کو سنا اور استہزائیہ ہنس ڈال۔
سورج اپنی نرم کرنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ صوب میں

تپش سی محسوس ہونے لگی تھی۔ دوپہل بھی آنگن میں
بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ اپریل کی آخری تاریخیں تھیں۔
موسم نے ایک دم ہی گروٹ بدل لی تھی۔ دن اور
راتیں نہ جانے کیوں اواسی کی پیٹ میں گم ہو کر رہ گئے
تھے۔

آج صبح سے سونی پر نامعلوم سی سستی سوار تھی۔
معمول کے کام بھی بس جیسے تیسے بنائے تھے۔ بڑے
دن ہوئے تھے اماں بی نے چکر تھیں لگایا تھا۔ ورنہ سونی
کی طبیعت اماں بی سے ملاقات کے بعد فریض ہو جاتی
تھی اور اماں بی کی گزارش اور درخواست تو سونی کے
ذہن سے نہ جانے کب کی پرواز کر چکی تھی۔ سائی سے
بات کرنا، مشورہ کرنا تو دور کی بات تھی ذہن میں اماں بی
کی التجا محفوظ ہوتی تو کرائے داروں کے بارے میں
سوچا جاتا۔

سائی نے آج دیر سے آنا تھا۔ آج پھر سے چناب
بازار کی دکانوں کا کرایہ ملنا تھا۔ سائی نے گھر کے لیے
ضروری سامان خریدنا تھا۔ سو وہ جا رہی تھی کہ سائی دو
تین گھنٹوں سے پہلے آنے والا نہیں۔

وہ کھانا تو کب کا بنا چکی تھی۔ چکن بریانی، گڑھی
کوڑھے اور شیشے میں کھیر ایک ہی تو سونی کا شوق تھا اچھا
اچھا پکانا اور ریح کے کھانا۔
رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ گلیاں سرشار ہی
سنسان ہو جاتی تھیں۔ پھولے گھنٹوں کے منت کش
لوگ ٹھکے ہارے بستروں پر لیٹے ہی خزانے لینے لگتے۔
مگر آج کچھ الگ اور انوکھی سی بات فضا محسوس کر رہی
تھی۔

گلی میں معمول سے ہٹ کر چمپل پہلے ہلکی ہلکی
سرگرمیاں، تاسف میں ڈوبی تو اڑیں، کسی کے پیچھے اور
چالنے کی چھٹاڑ بوجا بوجا، ورنہ میں ڈوبی سکیں! آپ ہیں۔
”یا رب! یہ معاملہ کیا ہے؟“ سونی بخش کے
ہاتھوں مجبور ہو کر بیرونی گیٹ تک چلی آئی، جھری میں
سے دیکھا تو بہت سے چہرے نظر آئے، تنویر بادی، خالد
بتول، چاندی، بے بے نعمت اور نہ جانے کون کون۔
سونی نے دروازے کا پٹ کھول کر بازار میں جھانکا

تھا۔ تقریباً ”بھی کے گھروں کے کواڑ کھلے تھے۔
مور تیں اور پچیاں جھانک رہی تھیں۔ کچھ جو بارے،
لگی ہوئی تھیں۔ سونی حیران ہی تو رہ گئی۔
”تنویر بادی! کیوں کھڑی ہیں؟“

”ارے سونی! تم کیسی ہو؟“ تنویر بادی نے سونی کو
دیکھ کر خوشی کا بے ساختہ اظہار کیا۔
”میں ٹھیک ہوں۔ آپ سب یہاں اس وقت
کیوں کھڑی ہیں، خیریت تو ہے؟“ سونی اپنے گیٹ کا
کواڑ کھولنے کھڑی تھی۔ تنویر بادی نے کچھ سوچا تھا پھر
جلدی جلدی اپنا دروازہ بند کر کے اس کے پاس چلی
آئیں۔
”او، تم بھی دیکھ لو، یہاں تو اچھا خاصا تماشا لگا
ہے۔“

”کیا ہوا؟“ وہ فوراً ہی حیران ہوئی۔
”کوڑھے نے اماں بی کے مہمانوں کو گھر سے نکال دیا
ہے۔“ تنویر بادی نے تاسف سے کہا۔
”کیوں؟“ سونی کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔
”کوڑھے سدا کی زبان دراز ہے، بے چاری ماں بیٹی پر
اسے گندے گندے الزام لگاتے ہیں، رات کے اس
پہر گھر سے نکال دیا ہے، سامان اٹھا کر گلی میں پھینکا کر
خود ایسی ایسی غلیظ گالیاں دینے لگی۔“ تنویر بادی نے
کانوں کو ہاتھ لگا کر دہرے گھمائے۔

”بڑی بے عزتی کی ہے کوڑھے نے ثروت بے چاری
کی ساری گلی، محلے کے سانسے۔“
”اماں بی کہاں ہیں؟“

”وہ تو بندرہ میں دن سے کسی نو اسی کی شاہی کے
سلسلے میں سکھ رہی ہیں۔“ تنویر بادی نے مزید اس کی
معلومات میں اضافہ کیا۔

”اور وہ مہمان کہاں ہیں؟“ سونی ساکت ہی تو رہ گئی
تھی۔ پشیمانی کے عمیس گڑھے میں گرتا اسی کو کہتے
ہیں۔ ”آنا“ فنا، اسے اماں بی کی درخواست کا خیال
آ گیا۔ ساتھ ڈھیروں شرمندگی نے کھیر لیا تھا۔
”بے بے نعمت کے گھر اب اس وقت بے چاری
کہاں جاتیں، صبح کو کہیں جانے کے لیے نکلیں گی۔“

تنویر بادی نے اسے آنسو سے لہریں لہریں سے دیکھا۔ سونی کی
لگی ہوئی تھی۔ علم زہر مجیدہ شرمندہ۔
”میں سونی ہوں، اماں بی نے ذکر تو کیا ہو گا۔ آپ
خالہ ثروت ہیں اور یہ آپ کی بیٹی سوہنی۔“ وہ ان کے
قریب ہی دوڑا لو بیٹھ گئی تھی۔ اس کے نرم ماتم سے
نے ان دونوں ماں بیٹی کو سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔
”آپ سونی ہیں۔“ دودھ اور ٹکاب سے گندھی
اس لڑکی نے اپنی غلابی آنکھوں سے سونی کی طرف
دیکھا تھا اور سونی تو اس کے حسن، جہاں سوز میں چند
پل کے لیے کھو گئی۔

”جی۔ اور میں آپ کو لینے کے لیے آئی ہوں۔“
فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ اب تو عمل کرنا باقی تھا۔
”ہمیں۔“ دونوں ماں بیٹی حیران رہ گئیں۔
”جی۔ اٹھیے، میرے ساتھ چلیے۔“ سونی اب
مسکرا رہی تھی۔ بے حد سادہ اور اجلی مسکراہٹ۔
”کہاں؟“ ان دونوں کے مودہ تن میں گویا جان پڑ گئی
تھی۔ پشیمانی آنکھوں اور اواس ہونٹوں پر شفق اتر آئی۔
”میرے گھر۔“ سونی نے کپڑوں کا تھیلا ہاتھ میں
پکڑ لیا تھا۔ سوہنی نے دوسرا تھیلا اور ماں کی دو اولوں کا
شاپر تھا۔ وہ ان ٹوٹی کھری دو عورتوں کو ساتیان دینے کی
غرض سے گھر لے آئی تھی۔ انسان درووں کے واسطے
ہی تو پیدا کیا گیا ہے، تخلیق کیا گیا ہے۔

”اس بے درو دنیا میں تیرے جیسے لوگ بھی موجود
ہیں بیٹی۔“ گھر آنے کے تیسرے دن بعد بھی ثروت
خالہ بے یقین تھیں، حیران تھیں، اور سوہنی
ششدر۔
”خالہ! اس گھر کو اپنا گھر سمجھے گا۔ مجھے اماں بی پر
پورا پورا اعتماد ہے اور میں آپ کا بھی اعتبار کرتی ہوں،
مجھے کسی وضاحت، تسلی یا سرٹیفکیٹ کی ضرورت
نہیں ہے۔ آپ اپنے دل سے سارے بوجھ اتار دیجیے،
میں ہی نہیں یہ پورا حملہ کوڑھے کی فطرت اور مزاج
سے بہ خنجر آگاہ ہے۔“ سونی نے حلاوت سے ان کی

تمام پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ جو اسے کوثر کے رویے کی وضاحت دینا چاہتی تھیں۔ محض آنسو پنی کر خاموش ہو گئیں۔

چند دنوں میں ہی سونی کی خالہ اور سوہنی سے اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے آنے سے گویا گھر میں رونق ہی اتر آئی۔ کسی بزرگ کی موجودگی بھی نعمتوں سے کم نہیں ہوتی۔ خالہ ثروت بہت کم گوئی سنجیدہ اور صوم و صلوة کی پابند خاتون تھیں۔ سوہنی میں بھی اپنی ماں کی عادتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ سولی کے ساتھ بہت جلد تھل مل گئی تھی۔

سای کو لالہ بی بی کی ان مہمان خواندگیوں کی اپنے گھر میں موجودگی خاصی کھلی تھی۔ پوری رات تقریباً ان دونوں کی بحث و مباحثے میں گزر گئی تھی۔ اور یہ اسی رات کی بات تھی جب سولی خالہ اور سوہنی کو گھر لے کر آئی تھی۔ سائی نے سنا تو تباہ کھا کر رہ گیا۔

”ہر ایک پر اعتبار کر لیا کرو نہ جانے کسے اٹھا کر گھر لے آئی ہو۔“

”مجھے پوری تسلی ہے تم فکر مت کرو یہ ہمیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا میں گی عزت دار شریف عورت کی حالت کی ستانی ہوئی جو ان بی بی کو لیے درود دھکے کھا رہی ہے۔ اور دنیا کو دیکھنے اور لطف لینے کے لیے ایک تماشال گیا ہے۔“

”تم مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔“ سائی سخت خفا تھا۔

”میں گھر میں کہاں ہوتا ہوں تمہیں تہاجان کرا کر کوئی نقصان پہنچا دیں تو پھر؟“

”ساری زندگی اگر رہنا چاہیں ہمیں ڈیرہ لگائیں تو پھر۔“ سائی نے طنز بھرے انداز میں کہا۔

”میرے دل میں اور گھر میں بہت جگہ ہے۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ سائی کو غصہ آ گیا۔ ”ہر کسی سے ہمدردی کرنے لگتی ہو، کسی دن سخت چوٹ کھاؤ گی۔“

”کبھی اچھی بات بھی منہ سے نکال لیا کرو۔“ وہ بھی برا مان گئی تھی۔ رات بھر سائی خفا ہی رہا تھا اور یہ کھلی سویرے سویرے وہیل میں جاتی رہی۔ خالہ کی بیٹھی طبیعت نے سائی کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ حالانکہ وہ بہت کم بولتی تھیں اور سوہنی کے حسن کو دیکھ کر تو اچھے بھلے بندے سدھ بدھ بھول جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

”لڑکی خوب صورت ہی نہیں معصوم بھی ہے۔ دھوکے باز تو نہیں لگتیں دونوں۔“ سائی کے اس تبصرے نے سولی کو غصہ دلانے کی بجائے مسکراتے پر مجبور کر دیا تھا۔

”سوہنی کے حسن کا جلا تو نہیں چل گیا۔“

”توبہ توبہ۔“ سائی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر۔

”میری ایسی مجال کہاں۔“ وہ بانیک کی مجال اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ سولی بھی ہنستے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

دھوکا کروں گی۔“ وہ بازار سے واپس آچکی تھیں۔ اب چکی منزل کے تحت پر ہی بیٹھی تھیں۔ سوہنی وہ بجے تک آئی تھی۔ پھر دوپہر کا کھانا کھانے ہی کھایا گیا۔ سولی انہیں الگ سے کھانا بھی پکانے نہیں دیتی تھی۔ دوپہر کے برتن وغیرہ سوہنی دھو لیتی تھی۔ سولی کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کی ذمہ داریاں کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی ہیں۔

ابھی وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں جب لالہ بی بی چلی آئیں۔ سوہنی بھی اسکول سے آئی تھی۔ ان دونوں نے چھٹ پٹ کھانا لگا دیا۔

”لالہ بی بی! آپ نے تو مجھ پر بڑی احسان کیا ہے۔“ سولی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کیسا احسان ہو گیا؟“

”خالہ اور سوہنی کو میرے پاس بھیج کر۔“

”میں تو تم خود ہی لے کر آئی ہو میں تو جنم جلی پر نہیں آئی تھی۔ بد بخت کوثر سے چاروں بھی برداشت نہ ہو سکا۔“ لالہ بی بی نے افسردگی سے کہا۔

”مگر ویسا تو آپ بنی ہیں۔“ خالہ نے محبت سے سولی کی طرف دیکھا۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ لالہ بی بی اور خالہ دونوں باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں جبکہ سولی اور سوہنی دونوں کمرے میں آگئیں۔ سوہنی کے ہاتھ میں۔ کیے کپڑے تھے جو وہ الماری میں رکھ رہی تھی۔ سوہنی جانے لگی تو اس نے روکا۔

”کیا کرو گی اوپر جا کر۔“

”سووں گی۔ آج تمہا کوٹ محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ سادگی سے بتانے لگی۔

”آپ ہی اور آج نہیں۔“

”سال سوا جاؤ۔“ سائی ثروت کو آئے گا، بلکہ خالہ کو بھی اور سوہنی۔ لالہ بی بی ہوں، خواہ مخواہ بیڑھیاں چڑھ کر اوپر چاٹیں گی۔ سوہنی اٹھنے لگی۔

”پہننے میں نا آب بھی آرام کر لیں۔ میں اور لالہ عصر کے بعد پیچھے آئیں گی، کھانا میں بنا لوں گی، آپ ترو مت پیچھے لگ۔“ وہ بولتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

”چائے بھی تم نے بنا لیا ہے، جلدی آجانا جنب۔“ سولی نے ہانک لگائی۔ کچھ دیر بعد لالہ بی بی کمرے میں چلی آئی تھیں۔

”سوہنی لالہ بی بی! میں نے سمجھا آپ چلی گئی ہیں۔“ سولی شرمندہ ہو گئی۔

”سوہنی سوہنی کی ضرورت نہیں۔ ویسے میں جانے لگی تھی سو چاہتے سے تمہیں دیکھ لوں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔

”بی بی! ثروت اور سوہنی تمہیں کیسی لگیں؟“

”بہت اچھی ہیں لالہ بی بی! میرا تو ان دونوں کی وجہ سے برا دل لگ گیا ہے۔ ورنہ تو سائی کے جانے کے بعد میرا دل کتنا ہی نہیں تھا۔“ وہ پر جوش سی بتانے لگی۔

”تمہیں کبھی بھی شکایت نہیں ہو گی، ثروت بہت بھلی عورت ہے، بیٹی بھی ماں کا دو سرا روپ ہے۔“ لالہ بی بی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے نرمی سے دیا۔

”سائی کو غصہ تو ہمیں آیا؟“

”غصہ تو آیا تھا مگر جلد ہی اتر گیا۔“ اس نے سادگی سے بتا دیا۔

گے اللہ بہتر فیصلہ کرے ان ماں بیٹی کے حق میں۔
 ”اماں بی بی میری تو خواہش ہے خالہ اور سوہنی بیوہ
 میرے پاس رہیں۔“ وہ خلوص دل سے بولی۔
 ”میں تو خوش نصیب ہوں اماں بی بی اگر کسی بے آسرا
 کو میری وجہ سے ٹھکانہ مل گیا ہے نہ جانے اللہ کو کوئی
 سی بھی ادا پسند آجائے۔“

”تمہاری ساری تمنائیں اور نیک خواہشات بارگاہ
 ایزدی میں قبولیت کا درجہ ہیں۔“ اماں بی بی آنکھیں
 نم ہو گئیں۔

”بیٹی! جانے والے کہاں رکھتے ہیں چار دن
 آزمائش کے تھے ثروت کی بھی اور ہماری بھی ہم تو
 ماں اس آزمائش میں پورا نہیں اتر سکے، قیل ہو گئے کیا
 تھا جو وہ دن کوڑ اور صبر سے کام لیتی۔ یوں انہیں محلے
 میں رسوا نہ کرتی۔ گھر سے نہ نکالتی۔“

”اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ کوثر بی بی یہ
 سنگین قدم نہ اٹھائیں تو میرے ذہن کی کھڑکی بھی شاید
 نہ ہی کھلتی۔ میں تو بھول ہی چکی تھی کہ آپ نے مجھ
 سے ثروت خالہ کے قیام کے متعلق کچھ کہا تھا۔“

”یہ رحم بھی خدا کسی کسی کے دل میں ڈالتا ہے۔
 ورنہ اس رات تماشائی تو بہت تھے پر کسی کے دل میں
 خوف خدا نہ جاگا۔“ اماں بی بی استغفار پڑھتی اٹھ رہی
 تھیں۔

”بیٹی! دروازہ بند کرو، ثروت بھی اوپر چلی گئی ہے،
 سہائی عصر کے بعد آجاتا ہے۔“
 ”جی۔ اگر کوئی کام نہ ہو تو۔“ وہ سلپرز اڑس کر اٹھ
 گئی۔

”تمہاری پھوپھی ٹھیک ہیں اب، کسی دن ان کی
 بھی عیادت کرنے جاؤں گی۔“ اماں بی بی گویا خود کلاہی
 کے سے انداز میں بول رہی تھیں۔

”پہلے سے بہتر ہیں۔“ وہ بھی ر سوچ سی کہنے لگی۔
 ”اس بے وفا شازی کا حل دیکھو، کبھی چکر لگانے کی
 توفیق نہیں ہوتی، کسی دن جاؤں گی میں سہائی کے
 ساتھ۔“ سوہنی گیسٹ بند کر کے اندر دلی جھسے کی طرف
 بڑھ گئی تھی۔

اوار کے روز سوہنی کی بھی چھٹی ہوتی تھی اور سہائی
 کی بھی۔ مگر اس روز خالہ اور سوہنی نیچے بالکل نہیں
 آئی تھیں۔ خالہ بہت سمجھ دار اور معاملہ فہم خاتون
 تھیں۔ اور سوہنی ان کی سمجھ داری کو دل ہی دل میں
 بہت سراہتی تھی۔

عام دنوں میں بھی سوہنی اپنا اور خالہ کارات کا کھانا
 اوپر لے جاتی تھی۔ جس روز سہائی لچ گھر میں آکر کرنا
 تھا اس روز بھی خالہ یا سوہنی اپنا کھانا نکال کر لے
 جاتیں۔ وہ ان کی تنہائی میں کبھی غل نہیں ہوتی
 تھیں۔ نہ ہی بلا ضرورت اوپر بیچے کے چکر لگاتی
 تھیں۔ سہائی کا سوہنی سے آہنا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔

چھٹی والوں سوہنی کا بہت مصروف گزارا تھا۔ سہائی
 کے فرمائشی پروگرام ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے
 تھے اور جب سے سوہنی نے اس کی ذمہ داریاں ہانڈ
 لی تھیں۔ سوہنی کافی آرام طلب ہو گئی تھی۔ کام نینے
 اور سمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اب بھی سہائی کے لیے
 چائے بناتے ہوئے اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ
 چھوٹ کر گرتے رہے۔

”سارا دن پینگ توڑنے کا یہ ہی نتیجہ ہے تمہیں
 کام کرنا بھول چکا ہے سوہنی۔“ وہ اس کا دل جلانے کے
 لیے معمول کے مطابق اپنا چہرہ بچن کے چہرے میں
 سجا کر کھڑا ہو گیا۔

”میں خالہ کو منع کرتا ہوں۔ اپنی بیٹی کو اوپر تک
 محدود رہیں۔ ورنہ سوہنی تو اور جی ناکارہ ہو جائے گی۔
 قریح کے پاس کھڑی ہو کر نواز لگائے گی۔ سوہنی اب بول
 تو نکالے۔“ سہائی نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ اتنا مت گھورو
 ذیلے پار نکل آئیں گے۔“

”میں ہو جاؤں تم ورنہ چائے ہرگز نہیں ملے گی۔“
 ”اس دھمکی سے ذرا پرہیز کیا کرو، میں خالہ سے یا
 ان کی دختر سے بناؤں گا۔ ویسے وہ تم سے زیادہ اچھی
 چائے بناتی ہے۔“ سہائی نے اسے چڑانا چاہا۔
 ”واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوہنی چائے بنانے تو

ملق تک خوشبو سے منک اکتا ہے۔“ سوہنی نے زور و
 شور سے ناسید کی۔
 ”یا حیرت! تم میری بات سے اختلاف نہیں
 کر رہی۔“ سہائی نے حیران ہونے کی ادا کاری کی۔
 ”ڈھنگ کی بات کرو گے تو اختلاف نہیں کروں
 گی۔“

”یہ چائے بناتی ہے یا جو شاندار۔“ سہائی مک چڑ کر
 چیخا۔

”چائے ہے ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔“
 بے نیازی سے بولی۔

”تمنی کل میں نہیں بیوں گا۔“ تم سلیب پر پٹ کر
 سہائی نے ناراضی سے کہا۔

”تو نہ پو۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”ضائع تو نہیں
 کروں گی۔“ سہائی مزے سے مک چڑ کر باہر نکل آئی۔
 ”مجھے اور بنا کر دو۔“ سہائی بھی اس کے پیچھے چلا
 آیا۔

”اب تمیں سمجھتے بعد ہی ملے گی۔“ وہ ٹی وی آن
 کر کے بیٹھ گئی۔

”یعنی جب تم خود پیو گی۔“ سہائی چیخا۔ ”یہ میری
 قدر ہے۔“

”شخو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارے لیے
 بناتی تھی بی لیتے۔“ وہ مزے سے چینل سرچنگ میں
 مصروف ہو گئی۔

”نھو۔ مجھے چائے بنا کر دو۔“ سہائی کے انداز میں
 حکم تھا۔

”سوہنی۔ میرا فورٹ ڈرامہ آرہا ہے۔“
 ”سوہنی! وہ حلقی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔“ ڈرامہ
 چائے سے زیادہ ضروری ہے۔“

”ہاں۔۔۔“
 ”ڈرامہ تم بھی نہیں دیکھ سکو گی۔“ وہ بھی سہائی تھا۔
 غصے سے بھنا کر اٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد لائٹ چلی گئی تھی۔

سوہنی اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔
 ”اتنا زبردست سین چل رہا تھا۔ احسن خان اور
 عائشہ خان بے حیائی کے ریکارڈ توڑ رہے تھے۔“

”سوہنی! سیر چہار ہاٹر کر سوہنی نیچے چلی آئی تھی۔
 ”کیا بات ہے؟“ سوہنی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”سہائی بھائی سے کہیں موٹر بعد میں ٹھیک کر لیں،
 تھوڑی دیر کے لیے میں سوچ آن کر دوں۔ میں یہ چادر
 استری کر لوں۔“ وہ لجاہست سے کہہ رہی تھی۔

”آف۔ تو یہ کارنامہ سہائی کا ہے، بد تمیز نہ ہو تو۔“
 سوہنی سمجھ کر کھڑی ہوئی۔ ”سہائی موٹر ٹھیک کرنے لگا
 ہے، تمہیں سہائی نے بتایا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ اماں کو بتایا ہے، وہ بالکل ہی میں کھڑی
 تھیں۔ سہائی بھائی کیراج میں مین سوچ کے بنوں کو
 چھیڑ رہے تھے۔ کہنے لگے کچھ دیر کے لیے لائٹ آف
 کرنے لگا ہوں، موٹر ٹھیک کرنی ہے، پانی ٹھیک سے
 نہیں آ رہا۔“ سوہنی نے اپنے مخصوص دھمکے لہجے میں
 سہائی کی کارستانی اس تک پہنچائی تھی۔ وہ کچھ بولنے
 لگی تھی، جب سہائی کو اندر آتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”دیکھ لیا ہے ڈرامہ، واپڈا والے بھی اچھے موقعوں
 پر ساتھ دیتے ہیں۔“ وہ مزے سے اسے چڑاتا صونے
 پڑھے گیا۔

”مگر لائٹ تو آپ نے آف کی ہے سہائی بھائی!“
 گھنٹیاں بجاتی اس آواز نے سہائی کو اپنی طرف متوجہ
 کیا تھا۔

”میرا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ گڑبڑا کر
 بولا۔ ”میں تمہیں لائن میں نظر آتا ہوں۔“

”میرا مطلب ہے آپ نے مین سوچ کے ٹن۔۔۔“
 ”کب؟ کہاں؟ کس وقت؟“ سہائی چیخا تھا، جبکہ
 سوہنی گھبرا کر بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

”تم نے مجھے کہاں دیکھا ہے؟“
 ”میں نے نہیں اماں نے دیکھا تھا۔“ وہ مستحالی۔

”اچھا۔ اچھا۔“ سہائی آئیں بائیں کرنے لگا۔
 ”تمہاری استری بھی بے موقع نہیں، جاؤ شاہاش، ایک
 کپ چائے بنا لاؤ۔“

”سوہنی چند! میرے لیے بھی، سہائی اپنے ہاتھ کی
 چائے میں ذرا مزا نہیں رہا۔“ سوہنی نے بھی ہانک لگائی۔
 وہ سر ہلا کر بچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کچھ شرم کرو۔" سہمی نے تاسف سے اسے دیکھا۔
 "تمہیں شرم آتی اسے چائے کا کتے ہوئے۔"
 "یہ خواتین کا شعبہ ہے۔" سہمی کو بات گھمانے میں کمال حاصل تھا۔
 "لنچ میں کیا بناؤں؟" وہ با آواز بلند سوچ رہی تھی۔
 "وال چاول بنالیں۔" سوہنی نے اسے دیکھ کر کپ رکھے چلی آئی تھی۔
 "تمہیں پسند ہیں؟" سوہنی نے پوچھا وہ سوچ رہی تھی کہ ساتھ چکن بنالے گی کیونکہ سہمی وال چاول دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔
 "جی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔ "دراصل اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ مسور کی وال کھانا چاہتی ہیں۔" سوہنی سخت شرمندگی کا شکار تھی۔ اپنی کوئی فرمائش ایسے لوگوں تک پہنچانا جن کے پہلے ہی بے شمار احساسات ہوں، اس قدر مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مگر وہ بھی کیا کرتی، اماں کی جب بھی طبیعت خراب ہوتی، کلا دکنے لگتا یا زکام، کھانسی کی شکایت ہوتی، وہ مسور کی وال پکواتی تھیں اور منٹوں میں بھلی چکنی ہو جاتیں۔
 "ٹھیک ہے، ابھی وال چاول بنالیتے ہیں۔ اور سہمی! تم چکن کھاؤ گے؟" سوہنی نے بغیر جرح کیے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اور سوہنی کی آنکھوں میں تشکر کی نمی چھلکنے لگی تھی۔ سیاہ ریشمی پلکوں پر انکی شبنم پر اک سرسری نگاہ ٹھہری تھی مگر سہمی لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گیا تھا۔ نگاہیں گویا ہتے سے انکاری ہو گئیں۔
 "سہمی! وہ چائے کی طرف متوجہ تھی۔ ساتھ ساتھ ہاتھ میں پکڑا میگزین بھی دیکھ رہی تھی۔
 "بناؤ نا پکین بناؤں یا کوئی سبزی وغیرہ۔"
 "لنچ میں تو کچھ ہلکا پھلکا ہی ہونا چاہیے، چکن وغیرہ کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں یہ ہی ٹھیک ہیں نا وال چاول۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
 چائے میز پر رکھی تھی سوہنی حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ مگر کچھ غور کرتی تو ضرور ٹھنک جاتی۔ سہمی کا رویہ معمول سے ہٹ کے تھا، چند لمحوں میں ہی الجھا دینے والا۔

"سہمی وال چاول کھائے گا یا حیرت۔" اب وہ سوہنی سے مخاطب تھی۔ "یہ کاپیٹ کیسے ہوئی۔" وہ سوہنی سے بوجھ رہی تھی۔ جو اس کی طرح ہی انجان تھی۔ اپنی ساہلی میں سوہنی حیران سمیل بہت سی واضح چیزوں کو بھی نظر انداز کر دیتی تھی۔
 * * *
 "سوہنی! یہ رکھ لو نا۔" وہ کپ سے پندرہ سو روپے ہاتھ میں دباے اصرار کیے جا رہی تھی۔
 "کیوں رکھوں؟" سوہنی کو غصہ آ گیا۔
 "ہم ادھر سے کھاتے ہیں، کرا یہ تک آپ لیتی نہیں، یہ پیسے تو رکھ لیں نا۔" سوہنی منتناتی۔ "اب میں تمہیں ایک جھانپیر لگا دوں گی۔"
 "پلیز سوہنی جی! اتنا زریار بند کریں، آپ یہ رکھ لیں، گیس اور بجلی کا بل ہی سہی۔" وہ ابھی تک اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔
 "چند! یہ پیسے میں نہیں لے سکتی، تم خالہ کی دو آئین منگو الیٹا۔ اپنے لیے جمع کرو، مشکل وقت میں کام آسے گا۔ رہا کھانے پینے کا سوال تو تم اپنے نصیب کا کھاتی ہو، اور کرایہ وصول کر کے میں نے کون سا محل کھرا کر لیتا ہے، ابھی تم انہیں سنبھال کر رکھو، تمہاری محنت کی کمائی ہے۔" سوہنی نے اس کی بھرانی آنکھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھا تھا۔ وہ اس سے پت کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
 "سوہنی جی! آپ کیا چیز ہیں؟ روم دل پری نیک شہزادی یا انسان کے روپ میں فرشتہ۔"
 "ارے، کچھ بھی نہیں ہوں میں بہت حقیر انسان ہوں۔" وہ ہنس پڑی۔ "چل آئی تو صاف کر۔" سوہنی بھی روتے روتے مسکرانے لگی تھی۔ دھوپ چھاؤں سے اس روپ کو سوہنی نے دیکھا اور دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔
 رات کو وہ سہمی کو آج کا تازہ ترین سوہنی کا کارنامہ بتا رہی تھی۔
 "تم نے پندرہ سو روپے لے لیے؟" سہمی نے

ناقابل فہم سے انداز میں پوچھا۔
 "ہاں۔" وہ محض سہمی کے تاثرات جانچنا چاہ رہی تھی۔ کبھی غلط بیانی کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔
 "اتنی سچ حرکت۔" سہمی کو گویا یقین نہیں آ رہا تھا۔
 "تم نے واقعی روپ لے لیے۔"
 "تو اور کیا؟"
 "مگر کیوں؟" سہمی کو بہت برا لگا۔ "اتنی معمولی سی رقم لیتے ہوئے تمہیں قطعاً شرمندگی نہیں ہوئی۔"
 "تمہیں۔" سوہنی اطمینان سے بولی۔
 "واہ جی واہ! ویسے تو بڑی اذیت دہی ہو۔" وہ طنزیہ بولا۔ "کیا سوچتی ہو گی۔"
 "کون؟"
 "سوہنی۔ میرا مطلب ہے سوہنی کی ماں یعنی خالہ ثروت۔" سہمی نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔
 "تو سوچتی رہیں۔" سوہنی لاپرواہی سے اپنے مساج میں سونف رہی۔ "صفت میں یہاں رہ رہی ہیں۔ کھانے ہیں، پانی، بجلی، گیس حتیٰ کہ فون تک استعمال کرتی ہیں۔ میں نے پیسے لے لیے ہیں تو کون سا قیامت آگئی ہے۔" سوہنی کو جھوٹ بولنے میں مزا آ رہا تھا۔ اپنے سینے دو سہمی کو چڑا رہی تھی یہ دیکھے بغیر کہ سہمی کی آنکھوں میں کسے کسے رنگ چھلک رہے ہیں۔ وہ سنگ رہا تھا، کبلی ٹکڑی کی طرح۔ جی چاہ رہا تھا، اس نیک پروین کو دو جھانپیر لگا دے۔ ویسے تو روم دل کی تقریریں کی جاتی تھیں اور اب یہ گھنٹیا حرکت نہ جانے کیا ثابت کرنے کے لیے کی تھی۔ صرف یہ جتانے کے لیے کہ وہ دو بے آسرا خواتین ان محترمہ کے مکان میں رہ رہی ہیں۔
 "تم۔" وہ کچھ سخت الفاظ بولتے بولتے لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ اپنے جذبات اور احساسات کی اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کیوں غصہ کر رہا تھا؟ سوہنی سے کیوں الجھ رہا تھا؟ اگر سوہنی نے پیسے لے بھی لیے تھے تو یہ سوہنی کا معاملہ تھا۔ اسے اس قدر جذباتیت دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟
 "میں نے اچھا کیا ہے نا۔" وہ کروت کے بل لپٹے

سہمی کو چھینڑ رہی تھی۔
 "بھاڑ میں جاؤ تم۔" سہمی نے تکیے میں منہ گھسا لیا۔
 "تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے حیران سے بولی۔ مساج کی مصروفیت ترک کر دی گئی تھی۔
 "کچھ نہیں۔"
 "سوئے لگے ہو؟" وہ پیار سے اس کے قریب جھکتے ہوئے بولی۔
 "ہاں۔" سہمی رکھائی سے بولا۔
 "اتنی جلدی۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ابھی صرف نو ہی تو بچے تھے۔ جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے فضول گفتگو کے چکر میں ایک دو بجاکر سوتے تھے۔
 "نیند آ رہی ہے۔"
 "مجھے ابھی باتیں کرتا ہیں۔" وہ ٹھنکی۔
 "مگر مجھے نہیں کرنا۔"
 "سہمی کے بچے! اٹھو نا۔" وہ اس کا بازو ہلا رہی تھی۔
 "سوئے دو، ورنہ میں دوسرے کمرے میں چلا جاؤں گا۔" اس نے گویا دھمکی دی تھی۔ سوہنی ششدر رہ گئی۔
 "تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ گے۔" وہ گویا بے یقین تھی۔
 "ہاں۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا۔
 "اس طرح کیوں بات کر رہے ہو۔" سوہنی روہانسی ہو گئی۔
 "مجھے اسی طرح بات کرنا آتی ہے۔" وہ چٹکا۔
 "سہمی! وہ دم بخود ساکت تھی۔ اور سہمی تکیے اٹھا کر دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ شادی کے ساڑھے تین سال میں پہلی مرتبہ کبلی مرتبہ نہ جانے کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ آخر سہمی کو ہوا کیا تھا؟ سہمی نے ایسا کیوں کیا؟ وہ بہت سے سوالوں کے درمیان چکرا رہی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ شازی انگلی پر کپڑے پھیلاتی
 سوہنی کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ سوہنی نے مشین لگا
 رکھی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ حلیم بھی پکا رہی تھی۔ خالہ
 سوہنی کے کپڑے سلانی کر رہی تھیں۔ شازی ابھی ابھی
 آئی تھی۔ بچہ بھی ساتھ تھا جسے دیکھ کر سوہنی دلوانی
 ہو گئی تھی۔ چوم چوم کر اسے رلا دیا تھا۔ شازی تو اس
 جیتی جاگتی چینی کی گڑیا کو دیکھ کر دم بخود تھی۔
 ”سوہنی ہے۔“ وہ عادل کو ہنسانے کی کوشش میں
 اوت پٹانگ کر رہی تھی۔
 ”سوہنی ہے رنج رنج کے سوہنی ہے۔ مجھے بھی نظر
 آ رہا ہے مگر یہ ہے کون؟“ شازی سنجیدہ تھی۔
 ”خالہ ثروت کی بیٹی ہے۔ اماں بی کی رشتہ دار ہیں۔
 اوپر کی منزل میں رہتی ہیں۔ کسووال سے آئی ہیں۔“
 ”اماں بی کی رشتہ دار یہاں کیوں رہ رہی ہیں۔“
 شازی دلی آواز میں بولی تھی۔ سوہنی نے اسے تمام
 تفصیل اور ساری روداد سنا دی۔
 ”تیرا داغ چل گیا ہے سوہنی!“ شازی نے اپنا ہاتھ
 پٹایا۔
 ”تجھے کیا ضرورت تھی انہیں اپنے گھر میں لے کر
 آنے کی۔“
 ”کیوں؟ کہاں دھکے کھاتیں یہ؟“ گوڑا بی نے گھر
 سے نکال دیا تھا۔ میرے خمیر نے گوارا نہیں کیا۔ وہ
 میرے دروازے کے سامنے سے گزر کر نعمت بے بے
 کے گھر بیٹھی تھیں۔ بے یار و مددگار آنکھوں میں
 آنسو اور چہرے پر ویرانی لیے تھیں تو سر تپا کاتب کر رہ
 گئی تھی۔ میرے دل نے فیصلہ کیا تھا اور میں نے دل کی
 مان لی۔ ”سوہنی بھی سنجیدہ ہو گئی۔“
 ”اور تو اس چلتی پھرتی قیامت کو گھر لے آئی۔“
 ”کہا مطلب؟“ وہ بھی ٹھنک گئی۔
 ”مجھے کبھی عقل نہیں آئی۔ بھوسہ بھرا ہوا
 ہے تیرے دل میں۔“
 ”میں سمجھی نہیں۔“ سوہنی سچ مانا تھی کے انداز

میں اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”تب تم سمجھو گی جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔“
 شازی نے ریں ریں کرتے عادل کو زور کا دھموکا جڑا۔
 ”ٹھل کر بناؤ۔“
 ”اس حسین صورت کو گھر میں رکھنے کی بھلا کیا تک
 بنتی تھی۔ آگ اور تیل کو آمنے سامنے یا قریب قریب
 رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“ شازی خطرناک حد
 تک سنجیدہ تھی۔
 ”سوہنی ایسی لسی لسی نہیں۔“ سوہنی سمجھ چکی
 تھی، جبھی روکھے سے لہجے میں بولی۔
 ”سوہنی میں بڑی خوبیاں ہوں گی بہت اچھی ہوگی،
 مگر مردوں کا بھلا کیا بھروسہ ایسی من موہنی صورت
 دیکھنے کے ساتھ ہی دل پانی بن کر بننے لگے اور تم
 بے عقل۔“ شازی دانت پیس کر رہ گئی۔
 ”تم سامی کو اس طرح کامرو سمجھتی ہو۔“ وہ ناراضی
 سے بولی۔
 ”مرد سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔“
 ”مگر سامی ایسا نہیں۔“ سوہنی اٹھ کر چلی گئی تھی۔
 واپس آئی تو ہاتھ میں کیلے تھے۔ اب وہ عادل کو کیلا کھا
 رہی تھی۔
 ”اسی خوش فہمی میں تم رہنا۔“ شازی جھکے انداز
 میں بولی۔ ”اور یہ محترمہ تمہارے گھر میں مانگا۔ انداز
 لیے کام کاج میں مصروف ہے۔“
 ”وہ میرا ہاتھ بنانے کے لیے ہے۔“ سوہنی سے بات
 نہیں بن پائی گی۔
 ”میری بات سنو۔ سوہنی اتم بہت سادہ طبیعت
 رکھتی ہے۔ لوگوں کے چلن سے کہاں واقف ہو۔“ وہ
 نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ ”پھر مرد ذات پر بھروسہ بھی
 نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے سامی ہے کہاں؟“ شازی پوچھ
 رہی تھی۔ اسی اثناء میں سامی اندر چلا آیا۔
 ”تم کہاں سے راستہ بھول آئی ہو۔“ سامی نے خود
 پر بڑی دقتوں کے ساتھ ہشاشت طاری کی تھی۔

”اور تم دونوں نے کبھی راستہ بھولنا بھی گوارا نہیں
 کیا۔“ شازی بھی بھلا کہاں چوکتی تھی۔
 ”سوہنی نے کبھی کہا نہیں۔“ وہ اس کے کندھے پر
 بندوق رکھے مسکرا رہا تھا۔ سراسر مصنوعی مسکراہٹ۔
 ”ایک ہزار مرتبہ تو اس مہینے میں کہہ چکی ہوں۔ یہ
 وزیر اعظم سے بھی زیادہ مصروف ہے۔“ سوہنی نے جتا
 کر کہا۔ اس بل سوہنی دروازہ کھولے اندر چلی آئی۔
 ”کھانا کادوں؟“
 ”ہاں۔۔۔“ سوہنی کسی سوچ میں گم تھی۔
 ”کیا پکایا ہے؟“ شازی تو دنگ ہی رہ گئی۔ جب
 اس نے سامی کے جملے نے چہرے کی طرف دیکھا وہ
 سوہنی کی بجائے سوہنی سے پوچھ رہا تھا اور اس کی
 آنکھوں میں حنا دھار کی سی چمک تھی۔
 ”سوہنی کیا انداز ہے؟ اسے کچھ دکھائی نہیں
 دیتا؟“ شازی نے تماشہ پریشان سی سوچے گئی۔
 ”حلیم اور روٹی۔“ سوہنی نے سادگی سے بتایا۔
 ”شازی کے لیے چار پانچ روٹیاں بنانی چھیں۔“ وہ
 شازی کو پھیر رہا تھا۔ اور اس کا موڈ دیکھ کر شگفتہ ہوا
 تھا۔ شازی دھک سے رہ گئی۔
 ”کچھ بیٹھا بھی بنالینا تھا۔ آخر ہمارے مہمان کپے
 لاہوری ہیں۔ حد سے زیادہ چٹورے۔“
 ”کسٹرو بنایا ہے۔ ڈبل روٹی کی پڈنگ بھی ہے۔“
 سوہنی عادل کو پیار کر رہی تھی۔
 ”شازی! سوہنی کے ہاتھ کا کھانا کھا کر یہیں ڈیرہ
 مت لگا کے بیٹھ جانا۔“ وہ ہنس رہا تھا۔
 ”سوہنی کے ہاتھ میں بھی بہت لذت ہے۔“ نہ
 جانے کیوں شازی نے روکھے سے انداز میں جواب
 دیا۔
 ”یہ لذت ہمیں تو محسوس نہیں ہوئی آج تک۔“
 سامی مذاق تو نہیں کر رہا تھا۔ اب کے سوہنی بھی چونک
 گئی۔
 ”تم نئے نئے ڈالنے چکھ رہے ہو اب تو کچھ یاد بھی
 نہیں رہے گا تمہیں۔“ شازی نے مسکرا کر طنز کیا۔
 ”یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ سامی نے فوراً تسلیم

کر لیا تھا۔
 ”سوہنی کے ہاتھ میں ذائقہ ہے اپنی سوہنی سے
 پوچھ لو یہ کبھی کوئی روئے نہ۔“
 ”ہاں۔۔۔“ سوہنی لب چل کر رہ گئی تھی، جبکہ
 سوہنی خود کو ڈھکس ہونا دیکھ کر منظر سے ہٹ گئی
 تھی۔
 کھانا کھاتے ہوئے سامی نے سوہنی کو پکارا تھا۔ جو
 آخری چپاتی رکھے جا رہی تھی شاید اوپر۔
 ”سوہنی اتم بھی آتا۔“
 ”میں اماں کے ساتھ کھاؤں گی۔“ وہ سنجیدگی سے
 بولی۔
 ”یار! مہمان کا ساتھ دو۔“ شازی ہنسی مزے کی گفتگو
 کرتی ہے۔ وہ بھی طنز ہے۔ ”سامی مزے سے کہہ رہا
 تھا۔“
 ”آجاؤ سوہنی! اتنے اصرار سے سامی کم کم کسی کو
 بلاتا ہے۔“ شازی نے پانی کا گلاس اٹھا کر کپوں سے
 لگا لیا۔
 ”دیکھا میں نہ کہتا تھا شازی سے زیادہ اچھے طنز تو
 کوئی کر ہی نہیں سکتا۔“ سامی نے گویا سرد ہنسی لیا۔
 ”آجاؤ یار! بیٹھو یہاں۔“ وہ جو تذبذب میں کھڑی
 تھی۔ لب کھلتے ہوئے بیٹھ گئی۔
 ”کیا لوگی گڑھی یا حلیم۔“ اس اپنائیت اور توجہ کو
 شازی کے ساتھ ساتھ سوہنی نے بھی محسوس کیا تھا۔
 ”میں کھاؤں گی“ آپ پلیز کھائیں۔“ سوہنی بڑی
 طرح گھبرائی۔
 ”کیا حلیم ہے تمہاری سنا ہے اسکول میں پڑھاتی
 ہو۔“ شازی نے سچ سے انداز میں پوچھا۔
 ”ہیم اے کیا ہے۔“ وہ بھی آواز میں بولی۔
 ”یہاں کب تک قیام کا ارادہ ہے؟“ شازی سے
 ایسے سوال کی نہ سامی کی توقع تھی نہ سوہنی کو۔
 ”جی۔“ سوہنی کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔
 ”میں نے کچھ غلط پوچھ لیا ہے۔“ شازی نے
 معصومیت سے فرما ”فرما سب کی طرف سے کھانا سامی
 کے چہرے پر واضح ناگواری جھلک رہی تھی۔

”جانتی نہیں تھی! وقت کیا فیصلہ کرتا ہے۔“ سوہنی کی آواز بھرا رہی تھی۔

”بڑا فلسفیانہ سا جواب ہے ماشاء اللہ سے۔“ شازی نے پھر سے طنز کا تیر پھینکا۔

”سوہنی! سوہنی تو لے آؤ، لگتا ہے شازی کو بیٹھے کی ضرورت ہے، میاں صاحب سے گزروی سی ڈوز لے کر آئی ہے۔“ سہمی نے بھی نفیس سا طنز کیا۔

”سنائے تمہاری پروموشن ہو گئی ہے۔“ یہ خبر سوہنی کے لیے جی جی کا دھماکہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر پلٹ میں گر گیا۔

”لگتا ہے تم نے سوہنی کو یہ خوش خبری نہیں سنائی۔“ شازی چبا چبا کر بولی۔

”دراصل میں۔۔۔“ وہ رک سا گیا۔ ”سربراہان نے چاہ رہا تھا اسے۔“ صاف لگ رہا تھا۔ سہمی نے بات بتائی ہے۔

”آجھا۔“ شازی کھانا کھا چکی تھی۔ بلکہ اس نے کھایا کہاں تھا محض خانہ بری کی تھی اور زندگی میں شاید پہلی مرتبہ وہ کھانے کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ذہن تو کئی دلوں سے منتشر تھا۔ اس کے میاں نے ابھی کل شام اسے بتایا تھا کہ سہمی پر اپنی ڈیپلر سے کسی مناسب سے گھر کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مگر کس کے لیے؟ کیوں؟ آخر کیا وجہ تھی؟ پوری رات وہ سو نہیں پائی تھی۔ صبح ہوتے ہی سہمی کی بڑبڑاہٹ کی پروا کے بغیر وہ بھاگی چلی آئی تھی۔ اوہر آکر اس کا دل غ اور گھوم چکا تھا۔

جانتے سے وہ صرف اتنا ہی بولی تھی۔

”سوہنی! میں تیرے لیے دعا کر سکتی ہوں۔ اور ضرور کروں گی، کرتی رہوں گی، تیرے آئینے سے دل کو کبھی نہیں نہ پہنچے سہمی کی طرف سے تو کبھی نہیں۔“

”شازی! رک جا، میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ سوہنی لب کھلتے ہوئے درخواست کر رہی تھی۔

”میں رک نہیں سکتی، میری سہمی کے مزاج کو تو تم جانتی ہو، گھر میں سو طرح کے بکھیڑے ہیں۔ چلتی ہوں اب اپنا خیال رکھنا۔“

”عادل کو میرے پاس بھجو دو۔“ اس کی ہٹکا ہٹ متاثر سوچوں کی عکاسی کر رہی تھی۔

”تھک کرے گا تمہیں، بہت چڑھا ہوا ہے آج کل۔“ شازی بیچے کے کپڑے سمیٹ رہی تھی۔

”وانت نکال رہا ہے؟“

”شاید۔“ وہ خود بھی سخت پریشان تھی اور سوہنی کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی مگر سوہنی کو بے خبر رکھنا بھی کہاں کی عقل مندی تھی۔ بہت دیر سوچنے کے بعد شازی آنگن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ سوہنی بھی چیران سی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ ابھی تو شازی جانے کے لیے بے چین تھی مگر اب۔۔۔

”سوہنی! جو کچھ میں تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں، قہقہے سے سننا، صبح سے الفاظ ڈھونڈ رہی ہوں، مگر کیا کروں، سمجھ نہیں آ رہا کہ کیسے کہوں۔“ شازی کی تمہید میں لرزا دینے والے انکشاف کی بو سے ماحول پر سانسوں کو بوجھل کر دینے والی کثافت چھا گئی تھی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو شازی!“

”سہمی! ان دونوں گھروں میں رہا ہے۔ برابر ہی ڈیپلر سے بات کر رہی ہے اس نے۔ کیوں کس لیے؟ کیا تمہیں نہیں خبر؟ سہمی کو گھر کی کیوں ضرورت ہے؟“ شازی نے پورے نرم الفاظ میں وضاحت کی تھی۔

”گھر دیکھ رہا ہے۔“ سوہنی بے یقین سی بے یقین تھی۔

”تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے؟“ شازی پوچھ رہی تھی۔

”لڑائی۔“ سوہنی تو ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”لڑائی۔“ اس لڑائی تو ہوئی تھی مگر روزانہ ہی لڑائی تو ہوتی رہے، سہمی کی کھٹی میٹھی، ٹیکھی، گزروی ہماری جھڑپوں سے تم بھی تو واقف ہو، بات نہ جانے کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ میں نے بھی غصے میں سہمی سے کہہ دیا تھا کہ وہ میرے گھر میں رہتا ہے، یہ گھر میرا ہے، میرے اماں کا۔ اس کے ابا تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑ کر گئے تھے، میں بس اتنی سی بات ہوئی

کئی مرتبہ ہماری اسی موضوع پر نوک جھوک ہوتی رہی ہے، یہ کوئی ایسی سیریس بات تو نہیں تھی جو سہمی الگ گھر دیکھ رہا ہے۔“ سوہنی کا دل غ گویا سوچ سوچ کر دکھنے لگا تھا۔

”بات کچھ اور ہے سوہنی، مزید کیا کہوں چلتی ہوں، اس کے ابو آگے ہیں شاید۔“ اسکول کی آواز سن کر شازی اس کے رخسار چوم کر اٹھ گئی تھی، جبکہ سوہنی میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ شازی کو گیت تک چھوڑ ہی آئی۔ اللہ حافظ، ہی بول رہی تھی۔ بے جان سی چارپائی پر بیٹھی رہ گئی۔

سوہنی معمول سے ہٹ کر تیار ہوئی تھی۔ اس کے اسکول میں لکھنؤ اور فنکشن کی مناسبت سے اس نے تیار کر رکھی تھی۔ سوہنی کی اٹھان اتنی اچھی تھی کہ کچھ بھی پہن لیتی ہیں دیکھنے کو جی کرتا۔

وہ بیڑھیاں اتر کر بیٹھے آئی تھی۔ سوہنی ٹھنک کر سے بغور دیکھ رہی تھی۔ گورا رنگ، ریشمی بال اور تھکے نقوش، بلاشبہ وہ حسین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ سوہنی کی نظریں اب سہمی پر مرکوز تھیں۔ جو دنیا بھلائے سوہنی کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھے جا رہا تھا، سوہنی کے دل کی دھڑکن رک رک کر چلنے لگی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ سہمی کو اس سے یہ پوچھنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ سوہنی کو یہ بات شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”اسکول جا رہی ہوں۔“ وہ ساہگی سے بولی۔ سوہنی کو ایک دم یہ ساؤل بناوٹ لگنے لگی تھی۔

”اتنی تیاری کے ساتھ۔“

”جی۔“ اسکول میں تقریب ہے۔“ وہ چادر اوڑھ رہی تھی۔

”سوہنی! میں نے گزرا شہرت بنا دیا ہے۔ بس سہمی میں لاپچی فرائی کر کے شہرت اہل بیچے گا اور پھر چاول ڈال کے دم دینا ہو گا۔“ وہ سوہنی کو گڑوا لے چاول بنانے کے متعلق بتا رہی تھی۔ سوہنی کا ذہن تو کہیں اور تھا۔

اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ وہ تو بس سہمی کو دیکھ رہی تھی، دیکھے جا رہی تھی۔

”آؤ، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ سہمی بائیک کی چابی اٹھانے کے لیے کھڑا رہا تھا۔

”سوہنی! میں چلی جاؤں گی۔“ سوہنی گھبرائی۔

”کیسے جاؤ گی۔ اتنا بن سنور کر، میں چھوڑ آتا ہوں۔“ سہمی نے کب سے تکلف کی حد دو پار کر لی تھیں۔ سوہنی نے توجہ ہی نہیں دی۔ اپنے سامنے سب کچھ دیکھتی رہی، سہمی کے مذاق چھینچھاڑ، وہ سہمی کا مزاج سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی تھی۔ سہمی کی توجہ، سوہنی کا کھانا، گھبرانا، سر جھکانے پاس سے گزر جانا، سہمی کی تشنہ سی نظریں۔ پورے بٹے چلے جا رہے تھے۔ منظر واضح ہو رہے تھے۔ وہ دونوں برابر کھڑے تھے۔ ایک ساتھ باہر جا رہے تھے۔ سہمی اور سوہنی، ایک ساتھ چلتے ہوئے بہت کھل لگ رہے تھے، منظر بھر پور تھا۔ اس میں کسی سوہنی کی گنجائش نکلتی تھی کیا؟ وہ سوچوں کی بھول بھلوں میں گم تھی۔ وہ حیران تھی، ساکت تھی، غمزہ تھی، تشنہ تھی۔

”سوہنی! سوہنی! پتہ۔“ اماں بی کی آواز اس کے بہت قریب ابھری تھی۔

”اماں بی!“ سوہنی نے کھوئی کھوئی نظروں سے اماں بی کو دیکھا تھا۔ دو سرے ہی پل وہ ان کے شفیق وجود میں گم سسک رہی تھی۔

”سوہنی! میری بیٹی! کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے۔“ اماں بی بری طرح سے گھبرا گئیں۔

”تیسرا دل پھٹ رہا ہے اماں بی!“ وہ روئے جا رہی تھی۔

”میری بیٹی! کیا ہوا ہے۔“ اماں بی خود بھی رونے لگیں۔ ان کا دل تو ویسے بھی بہت کمزور تھا۔

”میں لٹ گئی ہوں اماں بی! میرا اعتبار، میرا یقین، میں برباد ہو گئی۔“ وہ سسک رہی تھی۔

”ثروت! او ثروت! نیچے آ۔“ اماں بی نے بلند آواز میں خالہ ثروت کو آواز دی تھیں۔ دو سرے ہی لمحے خالہ بھی جلدی سے بیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئیں۔

”دیکھ میری بیٹی کو کیا ہوا ہے۔“ اماں بی بی پھپھک پھپک کر رہی ہیں۔

”سوئی! میری بیٹی! آنکھیں کھولو۔ اماں بی بی یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے۔ میں پانی لانی ہوں۔“ خالہ چمن کی طرف دوڑیں۔

”ہائے یہ سہمی کہاں گیا۔“ اماں بی بی سخت پریشان تھیں۔ سوئی کی حالت دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئی تھیں۔

”شاید باہر نکلا ہے۔“ خالہ بھی گھبرا کر بولیں۔

”تم باگشئی کو فون کرو۔“

”اماں بی بی! مجھے تو نمبر نہیں آتا۔“ خالہ بے چارگی سے بولیں۔ ساتھ ساتھ سوئی کے منہ پر پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد گھر لوٹو لوگوں کے استعمال سے اسے ہوش آ گیا تھا، مگر وہ مسلسل رو رہی تھی اور اس کا روتانا دونوں خواتین کی سمجھ سے بالاتر تھا۔



”یہ پندرہ سو روپے۔“ سوہنی پھر سے مٹھی میں چند نوٹ دبائے کھڑی تھی۔

”پھر پیسے اٹھا لائی ہو، کتنی مرتبہ سمجھایا ہے۔ اب میں تمہیں سچ سچ دو لگاؤں گی۔“ سوئی ٹھکی ٹھکی آواز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں پہلے والی پشاشت مشقورہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیسے سہمی سے وہ سب کچھ کہہ ڈالے جو اس کے دل کا نامور بن رہا تھا۔ وہ سب کچھ وہ سارے خدشات، خوف، شکوک جنہوں نے سوئی کی راتوں کی نیندیں اڑا کر رکھ دی تھیں۔

”سوئی بیٹی! یہ میری تنخواہ کے پیسے نہیں۔“ وہ انگلیاں موڑے کہہ رہی تھی۔

”تو پھر؟“ اب کے سوئی چونک گئی۔

”سوئی بیٹی! یہ پیسے مجھے سہمی بھائی نے دیے ہیں۔ وہ اسکول مجھے چھوڑنے کے لیے گئے تھے تاہم اس دن اس وقت مجھے سمجھ نہیں آئی۔ میں حیران بھی تھی اور خوف زدہ بھی ہو گئی۔ ارد گرد کے لوگوں کے سہجے

ہونے کا خدشہ تھا۔ اسی لیے خاموش ہونا پڑا۔ مگر مجھے ان پندرہ سو کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ سہمی بھائی نے مجھے یہ پیسے کیوں دیے تھے۔ انہوں نے کہا مجھے سخت شرمندگی ہے سوئی نے تم لوگوں سے گھر میں رہنے کی یہ حقیر سی رقم وصول کی ہے۔ مجھے سوئی کی ذہنیت سے گھن آئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سوئی تم لوگوں سے گھر میں رہنے کا کر ایہ لے گی۔ یہ پیسے انہوں نے اسی لیے لوٹائے تھے۔ یہ میں ان سے کہہ ہی نہیں سکتی کہ آپ نے تو آج تک ان پانچ مہینوں میں ایک روپیہ تک نہیں لیا۔ سہمی بھائی کو غلط فہمی ہوئی تھی، مجھے تو۔“ سوہنی اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی، مگر سوئی کو لگا وہ کچھ اور سن نہیں پائے گی۔ اس کی ساتھیوں مفلوج ہو جائیں گی یا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس دل میں کوئی نیزہ اترتا تھا یا بھلا وہ سمجھ نہیں پاتی تھی، مگر یہ جو آتش فشاں ابل رہا تھا اسی رات ہی گویا پھٹ پڑا۔ اس کے پھٹنے ہی سوئی کی پوری عمارت پورے قد سے زمین بوس ہو گئی تھی۔ بھرم کا بلکا سا بلوریں شیشہ نہ جانے کب ٹوٹا تھا۔ سوئی حاسم سہیل کو آج کی رات اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ تو ایک تباہ شدہ عمارت ہے، ٹوٹی پھوٹی ریزہ ریزہ عمارت۔

اس نے بھی نہیں چاہا تھا کہ وہ سہمی کے گھر جان تک ہاتھ کرے۔ مگر جب مان، اعتبار اور اعزاز کا خون ہوا تو اس سے رہا نہیں گیا تھا۔ وہ بچہ بچی تھی اور پھرے دریا جا ہی تو بچاتے ہیں۔

”تم نے میرے ذرا سے مذاق کو نہیں سمجھا۔ تمہان گئے کہ سوئی اتنی کھٹیا اتنی ہی پست ذہنیت کی ہو سکتی ہے کہ خالی ہاتھ ان دو عورتوں سے اس گھر میں رہنے کا خراج لے لے گی۔ تم نے ایسا سوچا، یقین کیا اور سوہنی تک پہنچ گئے۔ یہ پندرہ سو لوٹائے، جو وہ ابھی مجھے دے کر گئی ہے۔ اور تم نے سہمی! مجھے ذلیل کر دیا۔ رسوا کر دیا۔ دو کوڑی کا کر دیا۔ اس لڑکی کے سامنے جو میرے اور تمہارے لیے قطعاً اجنبی ہے۔ جس سے میں نے انسانیت کا رشتہ جوڑا۔ کل رات جب ان کے سر پہنچی تو میں صبح کا پیغام لیے ان ماں بیٹی کے پاس

شکوہ مجھے ان سے نہیں تم سے ہے۔ تم نے سہمی کو توڑا اور تم نے سہمی! مجھے پوری کی پوری سونیا کو توڑ کر رکھ دیا۔“ وہ چلا رہی تھی۔ رو رہی تھیں۔

”سہمی شرمندہ کہاں تھا۔ وہ تو وہاں رہا

بات کھل گئی ہے تو کچھ اور بھی سن لو۔ میں سوہنی کی شادی کرنے لگا ہوں۔ تمہارے اس محل پر آ کر دووں گا۔ چار سال سے ذلیل کر رہی ہو، اس محل پر رہنے کے طعنے دے رہی ہو۔ بہت جاہلیت پسندی تم میں۔ عرج تک مجھے شوہر نہیں سمجھا۔ میری ماں کے نزدیک اہمیت ہی کیا ہے۔ ہمیشہ جتنا ہی رہیں، ان سے تمہیں اس گھر کا۔ اپنے باپ کی سات ماں کا، لعنت بھیج رہا ہوں میں ہر اس چیز پر جو مجھے مارے۔ تو سوئی! تم نے مجھے عزت دی، نہ تھی۔ محبت کا سوال کرنا ہی بے کار ہے، مجھے اسے کسی عورت سوٹ ہی نہیں کرتی۔ خود اتنی ضدی بد مزاج۔“ وہ اس کے وجود کے پرچے اڑا رہا تھا۔ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل رہا تھا۔

”کی محبت اس کی وفا کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔“

”تم سوہنی سے شادی کرو گے۔“ سوئی کو لگا تھا اس کے دل کی اس پھٹ جائے گی۔

”اماں۔“ وہ اصل انداز میں بولا۔

”مجھے جھوڑو گے؟“ سوئی ایک دم پتھر ہو گئی۔

”نہیں۔“ یہ فیصلہ بھی شاید وہ پہلے سے کر چکا تھا۔

”اس کے لیے بغیر سوئے سمجھے بولا۔“

”اس کے لیے گھر ڈھونڈ رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”سوہنی سے بات کر لی۔“ وہ گویا اپنے ضبط کو آزما رہی تھی۔

”نہیں، مگر مجھے یقین ہے، اسے اعتراض نہیں ہو گا، کیونکہ اس کے پاس کوئی اور آپشن جو نہیں۔“ وہ بے غور سے کہہ رہا تھا۔ اس پر غور جتنا بھی تھا۔ اس کے دل میں گویا آخری نیزہ بھی اتر گیا۔ وہ بڑے

تمہیں سے گندھی ہوئی تحریریں اور اس اور عین قارئین کے لیے ایک نم گسار کہانی



وہ غائب ہونا چاہتا تو حاضر ہو جاتا حاضر ہونا چاہتا تو غائب ہو جاتا ایک مزید حواس کی داستان حیرت شکنی، پھلجھڑیاں اور تماشے

حاضر غائب
اظہار کلیم ایم اے

قیمت: 300/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

ضبط سے مڑی پٹی اور اور مسکراوی سے مسکراہٹ اور اس میں چھپی "ہار" حسام سہیل نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس "ہار" کو سونہ نے تسلیم کر لیا تھا۔ جبھی تو وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی اور اسی ہار میں جیسے نوے دروازے میں کھڑی سونہنی نے بھی سن لیے تھے۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس عورت نے اسے نوچا کھوٹا کیوں نہیں دھکے کیوں نہیں دیے، گھر سے کیوں نہیں نکالا۔



"میں سوہنی ہوں، ماں نے میری صورت دیکھ کر سوہنی نام تجویز کیا تھا۔ میں سوہنی ضرور تھی مگر نصیب اتنے سوہنے نہیں تھے۔ آپ کو سب بتاتی ہوں، آج اگر کچھ نہ کہا تو بھی نہ کہہ پاؤں گی۔" وہ جس سے مخاطب تھی وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"اپا مرگے تو چچاؤں نے گھر بدر کر دیا، مانی کے آنگن نے پناہ دی، محبت بھی ملی اور نفرت بھی، حقارت اور ذلت کا پلڑا ہمیشہ ہماری رہا، زندگی میں سکھ بہت کم دیکھے ہیں، دکھوں سے بھری ایک طویل داستان ہے، نہ آپ کے پاس وقت ہو گا، نہ میرے پاس، مختصر یہ کہ مانی کی مہربانی سے میں نے اپنے واحد شوق کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا، میں نے تعلیم حاصل کی، جاگ کرنا چاہی تو ماموں کی غیرت جاگ اٹھی، سرکاری نوکری مل رہی تھی مگر بعض حاسدوں نے روڑے اٹکا دیے، پھر مانی مر گئیں، گھر والوں کے روپے بدل گئے، لہجے بدل گئے، چہرے بدل گئے، حتیٰ کہ شکلیں بدل گئیں، ہمیں گھر بدری کا حکم نامہ مل گیا۔ اماں مجھے بڑوں میں چھپائے اماں کی پناہ میں لے آئیں، سب نصیبی نے یہاں بھی پیچھا کیا، ذلت اور ہر سے ملنا ہی نصیب میں لکھا تھا۔ اماں کی غیر موجودگی میں جو کچھ کوڑ بھانسی نے کہا تھا، پاک زبان ایسے گندے الفاظ بولنے کی بہت کہاں سے پکڑے، گھر سے لٹکانا ازل سے ہمارے مقدر میں تھا۔ جب اپنوں نے مان نہ بخشا، تحفظ نہ دیا تو غریبوں سے کیسے ملے۔"

بس لاج آ رہی تھی کہ چلی سے کیسے گزریں، ہر دار میں اپنی جوان بیٹی کا ہاتھ پکڑنے میں مل رہی تھی، شرمندگی سے باؤں بھاری تھے، محلے کی گلی بل بل تھی، جہاں سے گزرتا تو تھا ہی، تماشا تو اہل محلہ دیکھنے چکے تھے، کچھ اور سین دیکھنا باقی تھے۔ کسی عزت دار گھرانے کی عورت نے کوڑ کھول کر ان درو کی ماری دو عورتوں کو پناہ کا سندیر نہ دیا۔ سلی گلے بھی توڑ جاتی ہے۔ کون نیکیوں کے ڈھول بجائے، ایک بوڑھی عورت ترس کھا گئی۔ اس بے بس ماں کی جوان بیٹی پر اسے رحم آیا۔ اس نے کہا رات کے اس پیرمت اسٹاپ تک جاؤ، صبح سویرے لٹکانا میرے گھر رات گزار لو، ہم لٹنے پٹنے چل دیے، یہ نہیں بتا تھا، یہ نہیں خبر تھی کہ سنگ دلوں کی اس دنیا میں آجینے جیسا نازک، حساس، شفاف اور بے انتہا نرم دل رکھنے والی ایک لڑکی بھی ہے۔ اسی محلے کے کسی گھر سے اٹھ کر ہمیں لینے کے لیے آجائے گی۔ یہ انہونی ہو گی۔ ہم پناہ گھر میں آ کے محفوظ ہو گئے۔ میری ماں حیران تھی۔

گھر میں رہتے ہوئے بے انتہا اچھا وقت گزارا۔ مگر رات بھی تو تعاقب میں رہتا ہے، ہمیشہ آپ کو شاید پتا نہیں، عورت کی نگاہ ہر رنگ کو پہچان لیتی ہے۔ میں نے آپ کی نظر کے بدلنے رنگ دیکھے اور جان گئی اس گھر سے کوچ کرنے کا وقت آیا ہے۔ آپ نے کیسے سوچا، سہا سہا بھائی، میں آپ سے شادی کروں گی، تمہی نہیں دنیا میں آخری مو بھی آپ بچے تو میں سوچا حسام کا حسام سہیل کبھی اس سے نہ پہچنتی۔ ایک عورت ہی دو سہری عورت کو پناہ کرتی ہے، بھلا کون ہے، عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ مگر میں سوچا، کا نہ دل اجازت سکتی ہوں، نہ گھر میں اس کے آجینے سے دل کو کیسے توڑوں؟ کیا یہ دل پھر کسی درو کے مارے کسی مظلوم پر ترس کھائے گا؟ رحم کھائے گا؟ احسان کرے گا؟ اعتبار کرے گا؟ اعتماد کرے گا؟ مجھے سوچنا حسام کے دل کو توڑنا ہے، نہ مان کو، نہ اعتبار کو۔

سہا بھائی! ہم نے سلمان باندھ لیا ہے۔ ابھی

حال کے لیے نکل رہے ہیں۔ ہماری زمین کافی صلہ ہے۔ دو حصال سے مکان میں سے بھی حصہ ملا ہے۔ سر چھپانے کو جبکہ مل گئی اور کیا چاہیے، زندگی سفر میں کوئی ہم سفر بھی مل جائے گا، ان شاء اللہ۔

جاہتی ہوں، آپ کی کچھ اور غلط نہیں، بھی دور ہوں۔ آپ نے سوچا جی سے بولا کہ وہ آپ سے نہ کہتی ہیں، نہ عزت، آپ پر حکم چلاتی ہیں، آپ کو عزت نہیں دیتیں۔

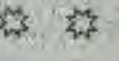
آپ کیسی نگاہ رکھتے ہیں حسام سہیل، اجو بات اور نفرت کو پرکھ نہیں سکتی۔ جانیں نہیں سکتی، کیا دنیا جی کے ہر پرائداز میں محبت نہیں چھلکتی۔ وہ عورت سر یا محبت سے اس کے دل جیسا دل تو ہونڈنے سے بھی نہ ملے۔ آپ اس کے دل سے نکل کر کہاں جائیں گے۔ وہ آپ سے محبت کرتی ہیں۔ بے تماشا، بے حساب، اس عورت کی عظمت پر میرا تو ہنسی، جس نے ایک دفعہ بھی میری طرف انگلی نہیں اٹھائی، کچھ پر کچھ نہیں اچھلا۔ میرے وجود کو گندا نہیں کیا۔ ایسی باہمت اور صابر عورت خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں۔ آپ بلند بخت ہیں۔ اپنے بخت کو پیستیوں کے حوالے نہ کریں، اسے بد ہی رہنے دیں۔ لوٹ جائیے کہ محبت بہت وسعت دیتی ہے، معاف کرنے کا ظرف رکھتی ہے اور آپ گلے ضرور ہیں، صرف گھڑی دو گھڑی کے لیے مگر نیکے

وقتی پسندیدگی محبت نہیں ہوتی۔ محبت وہ ہے جو آپ کو اپنی سولی سے سے آپ کا آسنا، سدا سلامت رہے، ہم سے کچھ غلطی ہو گئی ہو تو ہمیں معاف کر دیجیے گا۔ رب را کھلا، وہ چلی گئی تھی۔ ایک بھولی سے قندیل اس کے ہاتھ میں تھا، سہا کی اور سولی کی ہمت میں سے سوہنی نکل گئی تھی ہمیشہ کے لیے۔



سوہنی نے کہا تھا حسام، صبر ضرور ہے، مگر بکا نہیں، گلنے والے کو ایک موقع تو ملنا چاہیے، اور میں نے

یعنی سوچا حسام نے اسے سہا کی کو معاف کر دیا تھا، مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، اگر سہا کی کو معاف نہ کرتے والا اور بھی بھلا ہے، سہا کی کو معاف کرنا اور میں اپنے سہا کی کو بھی معاف کرنا چاہتی تھی۔ بے شک مجھے سوچنا حسام کو حسام سہیل سے محبت ہے، بے تماشا محبت، اور سوہنی نے ٹھیک کہا تھا کہ عورت ہی عورت کی اور عورت ہی ہوتی ہے، خود ایک عورت ہو کر دوسری عورت کا گھر اجاڑتی ہے اور کبھی کبھی یہ ہی عورت دوسری عورت کا گھر بچاتی بھی ہے۔ بہت کم لوگ سوہنی کی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہاتھ آئی نعمت کو محض کسی دوسرے کی خوشی کی خاطر ٹھکرانے والے، غرض سے پاک، حد سے دور بہت دور، خود غرضی جن کی فطرت میں نہیں ہوتی۔ بہت کم لوگ قربان ہونے والے، خود موسم کی طرح پھل پھل کر بھٹک جانے والوں کو گھر کی راہ دکھانے والے، سہا کی اور حسام لوگ۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھول کر کمرے میں موجود اس جس کو پاپا ہر نکتے کا راستہ دے دیا تھا، جو بہت دنوں سے میرے کمرے کی فضا کو بو بھل کیے ہوئے تھی۔



خواتین ڈائجسٹ
 کی طرف سے
 بہنوں کے لیے ایک اور ناول
تسلیمیاں پھول اور خوشبو
 راحت جہیں
 قیمت --- 225/- روپے
 محلہ ---
 پتہ --- 37، اورنگ آباد، لاہور

سائلگرہ صبر



نازیہ بیگم

پاک لکچر ہاؤس

دلو اور گیر کھاگ نے رات کا ایک بجایا ایمین
نہند کے بوجھ سے بند ہوتی آنکھوں کو ہتھیلیوں
رگڑا تو صحن کا داغی دروازہ قدر سے واضح دکھائی دے
جس پر وہ تقریباً پہنچے چار گھنٹوں سے نظریں تہمت
پینچی تھی۔

چلتے تاروں کے جھرمٹ میں آخری تاروں
چاند ماحول کو ملگنا سا اجالا بخش رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سا
چھایا ہوا تھا۔

آخری پہر میں داخل ہوتی رات کے اندھیرے میں
برآمدے کی بیڑھیوں پہ بیٹھے بیٹھے وہ گلے بگا ہے اب
یوں لے کو سرا سبتکی سے دیکھنے لگتی یہ سرا سبتکی
وہ اس اس خوف کا پرتو تھے جو اس وقت اس کے ذہن
وا عصاب پہ نیچے گاڑے بیٹھا تھا۔

”لنڈ خیر کرے تمہارے ابو ابھی تک نہیں
لوئے۔ پشست پہ ماں کی نظر میں ڈوبی آواز سن کر وہ
ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارادہ لائٹ آن
کرنے کا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسے کاموں میں دیر سویر
ہو ہی جاتی ہے۔“ اندھیرے میں وہ ماں کے چہرے سے
تاثرات کا اندازہ لگانے سے قاصر تھی تاہم اس وقت
وہ ان کے اوہام و خدشات جانتی تھی۔

رات اگر دن بھر کام سے سدا ہونے والی تھکاوٹ کو
دور کرتی ہے رات ہوتے ہی اگر بچوں میں خوشبو اور
پھلوں میں رس بڑنا شروع ہو جاتا ہے تو یہ رات
خوف و تھمائی کا ایک استعارہ بھی ہے کلاٹ کے آن
کرستے ہی حضور ماجوں نے ایمین کے خوف کو قدرے
خفیف سا کر دیا تھا۔

”مٹی کیوں جلائی ہے، نوراً“ بند کرو۔ کیوں بلاؤچ
جس کیوں کو جس میں جیتا کر رہی ہو؟ مسرت نے
بے چین ہو کر بیٹی کو ٹوکا۔ نہیں یوں لگا یہ رو سنی ان
کے دکھ کو سب پر عیاں کر دے گی جسے وہ اندھیرے کی
اوٹ میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تھمائی
منظر باندہ انداز میں صحن کے چکر لگاتے ہوئے انہوں
نے دروازے کو امید بھری نظروں سے دیکھا۔



لیکن ہر بار کی طرح نظر پوسی کا بوجھ لے کر بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی کسج کے ہر کرتے دانے کے ساتھ انہیں یوں لگانا کا دل کسی گہرے پاتال میں گرنا چلا جا رہا ہے۔

”دیکھ کر نہ کریں ہمسایوں کو ویسے بھی علم سے کہ ہم ماں بیٹیاں کئی سالوں سے ایسا رت جگا متالی آرہی ہیں۔“ وہ سخی سے بولی۔

بیمار ماں اور مصلح باپ کی پریشانی نے پورے گھر کے معمولات کے ساتھ ساتھ اس کی پریشانی کو بھی خاصا متاثر کیا تھا۔ آج بھی اس نے مسرت کی بنیادی طرح کی بدولت کالج سے چھٹی کی تھی۔

خوش مزاج و خوش باش احسان احمد جو اپنی زندگی کی تمام تر کامیابیوں کا سہرا اپنی شریک حیات کے سر باندھتے چلے آ رہے تھے اب پھولی مٹی کو تابیوں پہ مسرت کو بلا تکلف سب کے سامنے جھاڑ دیتے اور گھر بھر ڈنڈہ داروں اور اولاد کی تعلیم و تربیت جیسی کٹھن مزاج اور خوش اخلاق مسرت شوہر پہ آیا غصہ بیٹیوں کو بے دریغ ڈانٹ ڈپٹ کر اتار لیتیں ایمن تو بڑی ہونے کے سبب ماں باپ کے بدلے ہوئے روٹیوں کی وجہ جانتی تھی۔ لیکن حمزہ اور نمرو صغریٰ کے سبب ڈری سہمی رہتی تھیں۔ پرسکون و طمانیت بھرا گھر کا ماحول ہر وقت کی کل کل سے کھنچاؤ کی زد میں آ گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ انتظار موت سے بدتر ہوتا ہے۔ جب کل عالم فطرتی نیند کے مزے لوٹ رہا ہوتا تو یہ دکھ اور لذت سے بوجھل اس مرگ مسلسل کو جھیلنے ہوئے پورے صحن میں چلے پیر کی ملی کی طرح چکر کاٹی رہتیں۔

”جاؤ تم جا کر سو جاؤ“ کئی رات ہو گئی سے کل کالج بھی جانا ہے تم نے۔“ مسرت جمالی پہ جمالی تھی ایمن کو دیکھ کر نرمی سے بولیں۔

”نہیں میں بیس ٹھیک ہوں ویسے ہی رات کئی ڈھلے۔“ ایمن کی بات اور صوری ہو گئی تھی۔ گھر کا داخلی دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور احسان احمد کھٹکے تھے

انداز میں داخل ہوئے تھے ان کے پیچھے یا سردا دل ہوا۔

یا سر۔ ان کا اکھوتا پٹلا ان کی انتہائی خشوع و خضوع سے مانگی ہوئی دعاؤں کا ثمر۔

تھکی ہوئی جینز کے اوپر شوخ رنگ کی شرٹ جس کے صرف نیچے کے دو بٹن بند تھے اوپر سے سارا گریبان کھلا ہوا تھا۔ گلے میں دو تین زنجیریں لٹک رہی تھیں تو دونوں کلائیوں میں رنگ برنگے برہمسلشس اور مینڈز جڑھے تھے۔ دائیں رخسار پہ نیو کھدا تھا۔ اس طرح پورے جسم پر اس کی ٹیوٹ اور ایکٹریٹسوز کے نیوڈ بنے ہوئے تھے۔ منہ پان کھلنے کی وجہ سے سرخ جب کہ براؤن آنکھوں میں وحشت بھری تھی۔

مسرت کی توجان میں جان آگئی تھی اسے دیکھ کر تیر کی طرح اس کی طرف لپکیں۔

”یا سر! میری جان تم کہاں تھے تمہارے ابو تمہیں شام سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کچھ کھلایا بھی ہے یا صبح کے ٹیٹے۔ سارا دن گزارا ہے اپنا جیلہ دیکھو کس ڈگر پہ تم جا چکے ہو۔“ مسرت اسے ساتھ لگا کر روڑیں۔ طرح طرح کے ستائے وہم بیٹے کو سامنے بیچ سیلا مت پا کر اڑ پھو ہو گئے تھے۔

”بجائے پھیر جڑنے کے اسے سینے سے لگا رہی ہو پوچھو اس لوفر سے کہاں آواہ گریاں کرنا پھر رہا تھا۔“ احسان احمد غصے سے دھاڑے۔

کشتی رنق لڑتے لڑتے ان کے قوی جواب دینے لگے تھے۔ اوپر سے اٹھتے بیٹے کی بے راہ روی اور غیر ذمہ دارانہ روش نے تو ایسا کڑی تیز کے رکھ دی تھی۔

”جھاڑو آسے بولیں۔ رات کا وقت ہے آواز دور تک جائے گی۔“ مسرت نے گھبرا کر کہا۔

”ہر نہ اب جتنی بدنامی ہوئی تھی ہو چکی لٹیاریا تو دوب چکی ہے دوست حمزہ ہمسائے جس کو دیکھو اس کیمنے کی حرکتوں کی طرف توجہ دلانے چلا آ رہا ہے جیسے میں نے تو اس کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہوں۔“ احسان احمد نے غصے سے مٹھیاں بھیج کر شہر بار لگا ہوں سے یا سر کو دیکھا جو سخت آگے ہونے

انداز میں گلے میں بڑی زنجیر کو انگلی پہ لپیٹ رہا تھا جیسے کسی بات میں اس پہ خاصی گراں گزر رہی ہوں۔

”مما جڑوے اسنو کر کلب میں جوئے کی بازی لگانے بیٹھے تھے۔ چرس گو کین شراب ایسا کون سا لہر ہے جو وہاں نہیں چل رہا تھا۔ مسرت بیگم! میں تیار ہوں آج آخری دن ہے میری برواشت کا اس روز روز کے ”سرج آپریشن“ سے سخت ٹک گیا ہوں۔“ نگلی اٹھا کر وہ سخت تیسہبی انداز میں بولے۔

”مجھے کیوں سنا رہے ہیں کیا میں چاہتی ہوں میرا بیٹا غلط صحبت میں پڑ کر اپنی صحت و جسم کا نقصان کرے۔“ مسرت روڑیں۔

ہر دفعہ کی طرح یا سر کی ہلکی ہلکی باتوں اور سرکش رویے کا الزام انہوں نے مسرت کے سر رکھ دیا تھا اولاد اگر دنیا میں کامیابی اور دین کی سعادتیں سمیٹے تو کر ڈنٹ والہ دین کو جانا ہے۔ ہاں اگر اولاد برے طور طریقے اپنائے تو مردود الزام ہاں ہی ٹھہرائی جاتی ہے۔ یہ سنا کر مسرت نے کانٹوں میں چکا ہے۔

”ہر بار تم آڑے آجاتی ہو ورنہ میں تو اسے کب کا چلا کر چکا ہوتا یہ پانچواں اب مزید میرے گھر میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اسے کو اپنا کہیں اور ٹھکانہ بنا لے۔ بلکہ کہیں اور کہیں اپنے لیے لگنے ایک نمبر کے ٹنڈے دوستوں کے پاس مستقل رہائش پذیر ہو جائے۔ کندہم جنس باہم جنس پرواز۔“ وہ طنز سے لہجے میں بولے۔

”تو میں نے کب کہا ہے کہ آپ میرے پیچھے آئیں میرے دوست اچھے ہیں یا برے آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ ان کے ماں باپ ان کا یوں دیکھا کرتے نہیں پھرتے اور نہ ہی ان کی یوں ہر وقت عدالت لگائے رکھتے ہیں۔“

احسان ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے کسی کلب یا پکچر ہاؤس میں دوستوں کے نرختے میں نشے میں مدھوش اجانک جا لیتے اور خوب جھاڑتے جھاڑتے اسے گھر لے آتے تو اگلے دن اس کے دوست مسخرانہ انداز میں اس کا سواگت کرتے۔

”لو! وہ گیا فیڈر۔“ ماں کی چڑی اور باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے والا وہ ماں کا منہ کا کا کا کوئی ایک شخصہ لگا۔

”آرے وہ کس کی جیب سے کوئی چوسنی وغیر وہ نکل گئے۔“ دوسرا آواز لگا تو سب ہاتھ پہ ہاتھ مار کر تھمبہ لگاتے۔

”آرے یار تو اپنے ماں باپ کو بتا آئیں نہیں تو اب بڑا ہو گیا ہے۔ کیوں تجھے لڑکوں کی طرح قید رکھنا چاہتے ہیں۔ مرد بچہ ہے، جی ہلانے کو اگر یار دوستوں کے پاس ذرا بیٹھ بھی گئے تو بھلا کون سا آسمان ٹوٹ پڑا۔“ تلخجہ ہمدردانہ اور انداز نمکساری لیے ہوتا ایسے میں یا سر کا سکی اور شرمندگی کے مارے برا حال ہوتا ساں باپ کی روک ٹوک اور نگرانی سے اپنی شخصتی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف لگتا۔

”ہاں تمہیں یوں اپنے سروں پہ خاک ڈالنے کے لیے چھوڑ دیں خوش ہو رہا تھا کہ بٹا پیدا ہوا ہے جو بڑا ہو کر میری بیک بون بنے گا لیکن تم تو میری کمر توڑنے پہ تلے بیٹھے ہو۔ بس میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں اپنے رنگ ڈھنگ سنوار لو ورنہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کروں گا۔“ بلند فشار خون کے سبب آواز یک دم بڑھ سی گئی تھی۔

”آپ اتنی ٹینشن نہ لیں سدا ہر جائے گا۔ یہ تو عمری پونسی لغزشوں کا ارتکاب کیے بغیر کب گزرتی ہے۔“ شوہر کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر مسرت نے لپکا بھلا کا انداز اپنا دینا تو بیٹے کا سرکش و بے لحاظ رویہ دیکھ کر ان کا پتلاں خون کے آنسو رو رہا تھا۔

”یہ فصل تسلیاں مجھے نہ دو۔“ تھری گھوڑی اور نوجوان اولاد برتری سے ہاتھ پھیرا جاتا ہے۔ میں اس کی ابتدائی حرکتوں کو نظر انداز کیے گیا انتہی جتنا“ آج یہ میرے من کو آ رہا ہے۔ اگر پہلے روز سے ہی اس کے ساتھ گریہ کشتن روزاول والا معاملہ روا رکھا جاتا تو آج یوں پالی سر سے اوپر نہ ہو چکا ہوتا۔

بزرگ کہتے ہیں کہ لڑکوں اور خرگوش کو کان سے پکڑنا چاہیے ورنہ ان کے ہاتھ سے نکلنے کے امکانات

بڑھ جاتے ہیں میری ذرا سی ذانت ڈپٹ اور سرزنش
تمہاری ممتاز کاری ضرب لگاتی تھی تب ہی تو یہ حال
ہے اس کا۔

انہیں نئے سرے سے تلو آیا وہ اپنے آپ کو ایسے
بارے ہوئے جواری کی طرح محسوس کر رہے تھے جو
ساری جمع پونجی لگا چکا ہو۔ مسرت تو تڑپ اٹھی تھیں
اس الزام پر۔

”خدا گواہ ہے پچیس سالہ ازواجی زندگی میں کبھی
جو میں نے اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتی ہوئی اور
اولاد انسان کی سب سے بڑی آزمائش ہوتے ہیں
خدا نے بزرگ و برتر کو ہم گناہ گاروں کی آزمائش
مطلوب ہے تو ٹھیک ہے یہ نصیب کے عارضی
اندھیرے ہمیں بھی منظور ہیں اس کی رضا ہماری
رضا؟“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

مسرت کس حد تک وفا شعار بیوی اور ذمہ دار ماں
تھیں یہ احسان احمد باخوبی جانتے تھے۔ بس اشتعل
اور بے بسی کے احساس سے مغلوب ہو کر انہیں سخت
ست سنا بیٹھے تھے۔ اولاد کے حوالے سے انہوں نے
خود انتہائی محدود آمدنی میں بھی ”کھلاؤ سونے کا نوالا اور
دیکھو شیر کی آنکھ سے“ والا اصول ساری زندگی اپنانے
رکھا تھا۔ تعلیم اور انداز و اطوار میں ذرا برابر بھی
بے ضابطگی پاتے تو وہیں گوشالی کر لیتے۔ انتہائی منظم و
متوازن ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود بھی نجانے
یا سر کب اور کیسے غلط صحبت کا شکار ہو گیا تھا۔ کلج
لائف شروع ہوتے ہی اس کی شخصیت بے لگے ماں
پاپ کی تربیت کے رنگ ماند پڑنے لگے تھے۔ کلج و
اکیدی سے غیر حاضر ہونے کے ساتھ ساتھ اب نوبت
راتوں کو گھر سے غائب رہنے تک آچکی تھی۔

زور زبردستی دھونس دھمکی جب خرچ کی بندش
غرض کوئی بھی گرقابل اصلاح ثابت نہ ہو پایا تھا۔
”میرا بیٹا بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا ملک و قوم کی خدمت
کر کے ماں باپ کا خوب نام روشن کرے گا۔“ مسرت
بچپن میں اس کے لڑا اٹھاتے ہوئے انتہائی بن سے
کہتی تھیں۔

”جی نہیں ہمارا بھائی پائلٹ بنے گا۔ آکاش کی
وسعتوں کو نمانے گا۔“ امین اپنی دھونس جماتی۔
”لیکن آئی! مجھے تو سوچنا بہت پسند ہیں سفارت
کرتے ہوئے۔“ تمہارے بھی تو بھائی کے حوالے سے
ڈھیر سارے خواب دیکھ رکھے تھے۔
”گرے بھی! تم لوگوں کے بڑے بڑے اور منگے
خواب میری چھوٹی سی ہٹی کی آمدنی انورہ نہیں
کر سکتی۔“

احسان احمد ہنستے ہوئے مسخ و سپید صحت مند یا سر
کو بانہوں میں بھر لیتے۔
”میرا بیٹا ڈاکٹر یا انجینئر بنے نہ بنے لیکن اچھا انسان
ضرور بنے گا“ انسانیت کا پیش رو صدق و صفا کی
تصویر۔“

ان کے ایقان بھرے لہجے سب بیک زبان آئیں
بولے۔ لیکن اب ایک ایک کر کے سارے خواب
چکنا چور ہوتے جا رہے تھے۔

”یا سر! تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو ہم سب کا
مستقبل تمہارے وجود سے جڑا ہے کیوں ہمارے
خوابوں پر سیاہی پھیرنا چاہتے ہو۔“ مسرت روٹتی
ہو جاتی تھیں۔

”میں کوئی غنڈہ ہوں یا موالی ہوں یا کسی کی گروں
کالی ہے میں نے بھرتہ خوری کا الزام بھی مجھ پر جو یوں
آپ سب میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے تھے ہیں۔“ وہ ہری
طرح بڑا جاتا۔ آنکھوں میں لالہ اور زبان میں ادب کا
نام و نشان تک باقی نہیں تھا۔

”برائی صرف خوری چکاری اور قتل و غارت تک
محدود نہیں ہوتی بڑے دوستوں کی صحبت پر بھائی سے
فرار پات بے بات کا ملم گلوچ یہ کسی شریف خاندانی
بیٹے کو ایسا زیب دیتے ہیں۔ جن بدنام زمانہ تفریح
کے ڈوں پر تمہارے بچے لٹکتے دوست سے جاتے ہیں
اپنی چھٹی سات نسلیں کھنگال لو کسی ایک مرد نے وہاں
سے گزرنا تک گوارا نہ کیا۔ تمہارے باپ داوانے
غربت میں ٹیک ٹائی کھائی ہے ان کی برسوں کی بی بی بھائی
عزت میں رہنے پر تے ہو خدا کے واسطے یا سر!

یہ زور یہ ساری متنی سرگرمیاں صرف اپنی پر بھائی پر
احسان بولے۔
مسرت کا آنسوؤں میں ڈوبا لہجہ التجائی سا ہو جاتا
تھان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا آخر ان سے ایسا کون
سا گناہ سرزد ہوا تھا جس کی پاداش میں ایسے ناخلف اور
باقران بیٹے سے خدا نے انہیں نواز دیا ہے۔

تین بیٹیوں کے بعد زرینہ اولاد کی خواہش جہاں
انہیں دن کا بیشتر وقت عیالوت میں مصروف رکھتی
وہاں یہ خواہش انہیں مزاروں اور گاہوں اور آئینے
مکھرن کے آستانوں پہ پہنچنے لگی تھی۔

ان کی دعا میں مستجاب ہو ضرور ہوتی تھیں لیکن
شاید مالک و جہاں کو اس نعمت کے ذریعے آجانے کا
ارادہ تھا۔ مسرت کو نہیں یاد کہ حقوق اللہ کی ادائیگی کے
ساتھ ساتھ کبھی ان سے حقوق العیالوت کو ماہی ہوتی
ہو گی۔ بلکہ وہ انہیں جہاں خانگی ذمہ داریوں میں اتنی الجھی
تھیں کہ سب سے زیادہ نماز کے لیے وقت نکالنا دشوار ہونا
انہیں مسرت گھر کا نظام بہترین طریقے سے چلانے کے
ساتھ ساتھ نا صرف فرض بلکہ نقلی عبادات کا بھی
خصوصی اہتمام کیا کرتیں۔ صدقات و خیرات میں کبھی
جلل سے کام نہ لیتیں محلے والے احباب و دوست
سب ان کی مہمان نوازی و بیانت داری خوش اخلاقی
کے گرویدہ تھے۔

اور احسان احمد! اجنت ایمان داری اور کسب جلال
کے تمام اصولوں پہ عمل کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی
کریانے کی دکان کو چند سالوں میں ایک بہت بڑے
جزل اسٹور کی شکل دے چکے تھے۔

ایسے میں دونوں میاں بیوی رہ رہ کر یہی سوچا کرتے
کہ آخر ان کی کون سی لغزش اللہ کی ناراضی کا سبب بنی
ہے جس کی بنا پر ان کا اکلوتا اولاد بیٹا ان کی عزت کی
دھجیاں کھیرنے پہ تیار ہوا ہے۔

”امی! وہ میں نے ڈونگے میں امیر رنگرز رکھی تھیں
اب وہاں نہیں۔“ اس سکول یونیفارم پہنے عمرو

گھرائی ہوئی کپڑوں میں داخل ہوئی تو پر اٹھا تو سے
اندازے ہوئے مسرت نے جو تک کر اسے دیکھا۔

”ایسا مہلا ہے وہاں نہیں ہیں اچھی طرح
دیکھو۔“ وہیں نہیں رکھی ہوں گی۔ ذرا توجہ اور دھیان
سے ڈھونڈو۔“ مسرت کی گھبرائی صورت دیکھ کر مسرت
نے دانستہ ہانکا پھلکا انداز اپنا دیا اور نہ فکر مند تو وہ پہلے ہی
سے تھیں۔ احسان انہیں روز کے خرچ کے علاوہ
دکان سے حاصل ہونے والی آمدنی ان کے ہاتھ میں
تھارتے تھے اور بوقت ضرورت واپس لے لیتے
تھے اچھی کل جو ضرورت پڑنے پر انہوں نے جمع شدہ
رقم احسان احمد کے حوالے کی تو انہیں یوں محسوس ہوا
کہ چار پانچ ہزار روپے کم پڑ رہے ہوں۔ شوہر سے
تذکرہ کرنا اپنی شامت بلوانے کے مترادف لگا۔ سو
چپ رہیں۔ وہ پہلے ہی یا سر کی ٹالافقیوں اور غیر
ذمہ دارانہ حرکتوں پہ تھے ہوئے تھے۔ اس نقصان پر
مسرت کے ہی گتے لے ڈالے کہ رقم کو ایسی غیر محفوظ
جگہ پر رکھنا ہی کیوں تھا جو کوئی آسانی سے ہاتھ صاف
کر گیا ہے۔

اب جو عمرو کے منہ سے اس کی گولڈ کی امیر رنگرز کی
گمشدگی کا سنا تو پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔

”امین! تم ایسا کرو خود جا کر شیٹ کا ایک ایک
ہر تہن کھنگالو۔ ہو سکتا ہے اس نے ڈونگے کی بجائے کسی
اور برتن میں پالیاں ڈال دی ہوں۔“ کسی خیال کے
تحت انہوں نے امین کو مخاطب کیا تو وہ آخری نوالہ منہ
میں رکھ کر سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
لیکن بایوں کا نہ ملنا تھا نہ ملیں۔

”تمہیں اتنی لاپرواہی سے کام لینے کی کیا ضرورت
تھی۔ بھلا برتنوں میں کبھی کسی نے زیور رکھے ہیں جو یہ
جہالت تم کر بیٹھیں۔“ مسرت غصے کے وہ عمرو پر برس
پڑیں۔

”امی! صرف ایک دن کے لیے اتنا پار پیس ورنہ تو
میں انہیں ہر وقت پینے رکھتی ہوں۔ کل اسکول کے
فنکشن میں ڈریس کے ساتھ کے میچنگ ٹاپس جو
پہنے تھے۔ ان رنگ ٹیبل کی بجائے ڈونگے میں اس

لے رکھی تھیں کہ کہیں صفائی کے دوران بے دھیانی میں اوہراوہرنہ ہو جائیں۔ "حمزہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی جب کہ آنکھیں جھللائی تھیں ان ائیرنگز سے تو ویسے بھی اسے طبی لگاؤ تھا کیونکہ ابونے اسے میٹرک میں اسے پلس گریڈ لینے کی خوشی میں گفٹ کی تھیں۔ تب ہی تو وہ انہیں ہر وقت پینے رکھتی تھی۔

"اچھا چھوڑو گزشتہ راصلو آئندہ راصتیاط میں اپنی بیٹی کو اور بالیاں ہونا دوں گی ذرا اس مایہ نجران سے نکل آئیں تو بس آئندہ کبھی یوں تسلل اور کلمہ چوری سے کام نہیں لینا ممکن ہے بالیاں تم نے ڈونگے میں نہ رکھی ہوں۔ فی الوقت مقام تمہاری یادداشت سے محو ہو گیا ہو۔" بیٹی کو مغموم دیکھ مسرت نرم پڑ گئیں۔ لیکن حمزہ کی بالیاں ان کے لیے پریشانی کی تمہید ثابت ہوئیں۔ آنے والے چند دنوں میں ایمین کی سیونگ مسرت کی گولڈ چین اور نموہ کی عیدی کے دو ہزار روپوں کو یوں کسی نے اٹھایا کہ وہ چور کے نشانات ڈھونڈتے رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے والی چوریوں پہ کس کو دھر کر ٹھکانی کریں۔ پہلے تو مسرت بلا تردد جھجک۔ روپے بے یونسی ورازی میں ڈال دیتی تھیں۔ سلاک لگانے کا تو انہیں خیال ہی کبھی نہیں آیا تھا کون سا وہ جو اسٹ فیملی سسٹم کا حصہ تھے۔

احسان صاحب سے بات کرنے کا سوتے ہی ان کے حواس جواب دینے لگے تھے کیونکہ وہ بھی کچھ اسی قسم کی پریشانی میں مبتلا تھے۔

"میری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا آخر گلے سے بیسے عاتب کیوں ہوتے چلے جا رہے ہیں میں ٹھیک ٹھاک حساب رکھتا ہوں پھر پتا نہیں کیوں آمدنی کم پڑ رہی ہے۔" وہ کافی الجھن کا شکار تھے کاروبار میں کافی آثار چڑھائو آتے رہے تھے۔ لیکن مسرت نے انہیں یوں پریشان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فکر اور پریشانی نے تو جیسے ان کا پیچھا لے لیا تھا ایسے میں انہیں گھر میں چیزوں اور نقدی کے عاتب ہونے کے متعلق بتانا ہوا ان کی پریشانی کو دو چند کرنا تھا۔ اور اساوہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں۔

"یا اللہ ایہ آزمائش کا کون سا رنگ ہے؟ کس گنہ کی تو ہمیں سزا دے رہا ہے۔" وہ بلک بلک کر رو پڑیں۔ "امی پلیز حوصلہ رکھیں میری دوست عاصمہ کی امی ایک عامل بیبا کے پاس جاتی ہیں۔ چور جو بھی ہو گا وہ پایا پتا کر لیں گے۔" حمزہ سے ماں کا یوں رونا دیکھا نہیں گیا تھا۔

"امی! آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ اس چوری میں کہیں "مانجھے" کا ہاتھ نہ ہو۔" کافی دیر خاموش بیٹھی ایمین بولی تو لہجہ گہری پراسراریت لیے ہوئے تھا "انداز بھی کافی معنی خیز تھا۔"

"کون ماجھا؟" مسرت بری طرح چونکیں۔ پھر سرگوشی کے انداز میں ہولے سے خود گلای کی۔ "ماجھا ہاں معراج دین۔" پھر غصے سے چیخ اٹھیں۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں ایمین! کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہی ہو۔ جھلا ماجھا یہاں کہاں سے آ گیا ہے تو پندرہ سال پہلے۔" کچھ کہتے کہتے وہ لب بھیج گئیں۔ حمزہ نے ماں کے چہرے پہ ابھرتے اضطرابی تاثرات کو حیرانی جب کہ ایمین نے کچھ ترجم بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

* * *

"ہرے یہ کے ساتھ لے آئیں آپ؟ شام کو دکان سے واپسی پہ احسان احمد کے ہراؤں سالہ کمزور نحیف لڑکا ہاتھ جوڑتی ہے۔ پوچھتے ہمارے پاس۔"

"ورا تسلی سے کلمہ تو سب بتاتا ہوں۔ پہلے تم مانجھے کے کمرے کو آؤ۔" مسرت بیٹے ہورے ہیں اور کچھ کھانے کو بھی دیا۔ جہاں نہیں بے چارے نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ اور بیٹے! وہ بولتے ہوئے لڑکے کی طرف مڑے۔

"تم گھبراؤ نہیں یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ بلا جھجک یہاں کی ہر چیز استعمال میں لاسکتے ہو۔" شائشی شفقت سے کھیرائے شربائے لڑکے کو چار پائی پہ بٹھا کر خود منہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں چلے گئے۔

"آخر پتا تو چلے یہ کون ہے؟ کس کا بیٹا ہے؟ اور میدھا اسے گھر کیوں پکڑ لائے ہیں۔" کھانا ان کے سامنے رکھتے ہوئے مسرت نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے تھے۔

دراصل بچے کا پھنار انا لباس نکلے بدرنگ بیروں میں ٹوٹی ہوئی چپل لہجھے ہوئے غلطی سے بال اور فاقہ فاقہ صورت دیکھ کر انہیں فطری تجسس ہوا تھا۔

"ہرے بھی! میرے سامنے جو صدیق صاحب ہیں انہو مو باکل والے ان کی کسی عزیز کا بیٹا ہے۔" باب اس کی پیدائش کے ایک سال بعد ایک حادثے میں چل بسا۔ اب ان خاتون نے عقد چل کر لیا ہے۔ سو تیار باب اس مسکین کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہیں۔ خدا ترسی سے کام لیتے ہوئے صدیق صاحب اسے اپنے گھر لے آئے اور ساتھ وہاں پہ بھی لگا لیا۔ اب قسمت کی ستم ظریفی دیکھو۔ اصدق کارا وہ مع فیملی دینی میں سکونت اختیار کرنے کا بن گیا ہے۔ اور یہ جوان ایک بار پھر بے سائباں ہو گیا۔ مجھ سے تذکرہ کیا تو میں نے دکان پہ رکھ لیا۔ مجھے بھی ایک اسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ یوں سمجھو کلم بھی بن گیا اور خدمت خلق کا ایک وسیلہ بھی نکل آیا۔ اب فنانٹ اسے انسانوں والی جون میں لے آؤ۔" احسان احمد نے رمانیت سے بات مکمل کی۔ اور مسرت کا تو خمیر ہی محبت بہر روی اور نیک دلی سے اٹھا تھا۔ لپک کے بازو تھلا اور غسل خانے میں لے جا کے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ ہاتھ دھویا۔ نرینہ اولاد نہ ہونے کے سبب گھر میں مردانہ لباس تو موجود نہیں تھا۔ کھانا کھلا کر توجہی کارمنٹ شاپ لے لے جانے کے دو تین ریڈی سیٹ سوٹ دلوا دئے۔ چند گھنٹوں میں مانجھے کی توہینت ہی بدل گئی تینوں بچیوں کو بھی گھر میں یہ اضافہ اچھا لگا۔

"واہ بھی! اپنے مانجھے صاحب تو پچھانے نہیں جا رہے۔" احسان احمد نے شکستگی سے چھیڑاؤ شرماسا گیا۔

"ماجھا؟ یہ کیا نام ہوا؟ بچے کا کوئی بھلا سا نام تو ہو گا۔" باب کا کیا نام ہے؟" مسرت نے تڑی سے پوچھا۔

"جی وہاں پنڈتوں میں سب مجھے ماجھا کہتے ہیں پر اہل کہتی ہے ابے نے میرا نام معراج دین رکھا تھا۔" ڈھیمی آواز میں ہوا۔

"معراج دین یعنی دین کی بلندی ہا شاء اللہ کتنا پیارا اور مبارک نام ہے۔ اللہ تمہیں دین کی سر بلندی میں بد فرما۔" مسرت کدائی تو چلو حالات کی عطا کر رہی تھی لیکن اچھے بھلے نام کو لے کے بگاڑ کر رکھ دیا۔ "مسرت کی ممتا کا پالہ لباب بھرا ہوا تھا۔ باب کی شفقت اور ماں کی محبت سے محروم معراج دین جی بھر کر جام محبت سے سیراب ہونے لگا۔

پڑوسی عزیز اور احباب جو بھی معراج دین کو دیکھتا ان میاں بیوی کی فیاضی اور دسعت قلبی کی داد دینے بغیر رہ نہ پاتا۔

"ارے بھی یہ احسان صاحب جیسا ہی دروند اور سخی دل انسان کسی قیم کو اپنے بچوں جیسا کھلا پلا سکتا ہے۔ ورنہ آج گرانی کے دور میں تو اپنی اولاد بھی بھاری پڑ رہی ہے۔"

"مسرت کی دریاوی اور ملتساری پر تو کوئی کلام نہیں ہے۔"

انہیں خود نمائی کا نہ مرض لاحق تھا نہ کسی ستائش کی تمنا بلکہ ان کی اس چھوٹی سی تنگی کو سب نے یوں سراہا کہ یہاں دل ڈھیر ساری طمانیت سے لبریز ہو جاتا۔ معراج اسکول سے واپس آکر گھر کے چھوٹے موٹے کام نبھانے کے بعد دکان پہ گاہک بھگتے میں احسان احمد کا ہاتھ بنا دیتا۔

بھر پور خوراک بہترین لباس اور پرسکون شائستہ باجول میسر آتے ہی بدن میں توانائی اور چستی بھر آتی تھی۔

کٹھوم۔ معراج دین کی ماں پہلی نظر میں تو اسے اپنا بیٹا ہی ماننے سے انکاری ہو گئی تھی۔ کہاں وہ سوکھا چرخ پتیکے گاہوں اور ابھری آنکھوں والا ماجھا جس کے میلے بدبو دار چلیے کو دیکھ کر صرف کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔ اور کہاں یہ صحت مند مسلتے سے بات کرتا ہوا صاف تھرا معراج دین۔ کٹھوم کو لگا کہ وہ اپنے بیٹے کے

لیے جس قسم کا مستقبل چاہتی تھی وہ اسے یہاں مل سکتا ہے۔ ان میاں بیوی کا شکر کرے اور کرنے کا اسے کوئی اور طریقہ سمجھ میں نہ آیا سوائے اس کے کہ جھولیوں بھر دے اور انہیں دے۔ اور انہیں بھی صرف یہی دعا میں تو مطلوب تھیں۔

”اللہ آپ کو آپ کے بال بچوں کو سدا سکھی رکھے ہمیشہ شاد رہیں۔ مجھ غریب ماں پہ بڑا احسان کیا ہے جو میرے یتیم بے سہارا بچے کو اپنی چھت تلے جب تک وہی ہے۔“ آنسو پونچھتے ہوئے کلثوم عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

”احسان کیسا؟ یہ تو انسانیت کا تقاضا ہے۔ ہم معراج دین کو نہ سنبھالتے تو کوئی اور سنبھال لیتا یہ جو ہر روز لاکھوں روہیں وجود میں آ رہی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں سے مکمل مایوس نہیں ہوا ہے۔ اس زمین پہ اچھائی اور نیکی کا وجود کہیں نہ کہیں تو ہے۔ بس تم دعا کرو اللہ اپنے فضل سے ہمیں ایک بیٹے سے نواز دے۔ ہمارے پاس اس کی تمنا رہتیں موجود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ صرف ایک بار ہی سہی اپنی نعمت سے نواز دے۔“

تم غم زدہ ہو اولاد سے دوری کا دکھ جھیل رہی جو اور اللہ اپنے دکھی دلوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ مہربانی کر کے ہمارے لیے بھی دعا کرو۔“ مسرت کے نرم کچے میں ایک درخواست سی تھی۔

”اللہ آپ کی سب مرادیں پوری کرے۔ مجھ غریب دہا جو پر آپ نے بڑا احسان کیا ہے۔ میرا مرد بڑا تھڑولا ہے جی! یہ غریب تو کلٹے کی طرح اس کی آنکھوں میں چبھتا ہے۔ کتنا ہے اپنی اولاد کی تو رولی پوری نہیں پڑ رہی، دوستوں کے بچے کو کہاں سے گھاؤں میں پوکب کے گزر گئے، مکے کے نام پہ صرف ایک بھائی ہے جو دور ایک جھوک میں رہتا ہے۔ بے چارہ غریب جو ہے سو ہے پر ہے بڑا دل کا بادشاہ۔ میرے بچے کو رضا و خوشی سے اپنے پاس رکھ لیا۔ پر ادھر کو میرا دل ہی نہیں ہانتا میرے تینے سارا دن لو فرنگے پھرتے رہتے ہیں گھر سے ہرگز نہ ہوتا وقت

جوئے اور نشے کے تھڑوں پہ گزرتا ہے۔ گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول ہے۔ جس کا منہ انہوں نے کبھی نہیں دکھا۔ بس سارا دن گھر میں اینڈے کے بعد نشہ پورا کرنے کے لیے کبھی کسی کی بکری چرائی اور کبھی یا ہر بڑے شہتیر اور کڑیاں بیچ آئے۔ میرا بھائی بڑا تنگ آیا ہوا ہے اپنی اولاد سے۔ میں گھبراتی تھی کہ میرا بھابھا بھی وہاں رہتے ہوئے کہیں ان کا رنگ نہ اپنا لے لوں ماں چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا چوراچکا اور اٹھالی گیا رہے۔ بڑی سخت پریشان تھی میں۔ آپ نے میری ساری درد سہی ختم کر ڈالے۔ اب مجھے کم از کم اتنی تو تسلی ہو گئی ہے میرا بچہ اچھے لوگوں کے ہاتھوں میں مل رہا ہے۔ جو اسے برے اور بھلے کی شناخت کروا میں گئے۔ یہ بڑا ہو کر نہ کسی کا گلا کاٹے گا نہ کسی کو گھانا دے گا۔“ کلثوم نے جھولی کو دعاؤں سے خالی کیا اور تسلی اور بے فکری سے معجور دل لیے وہاں سے رخصت ہو گئی۔

اب اس کی دعاؤں کی تاثیر تھی یا اللہ کو ان کی اس بے لوث نیکی کا صلہ دینا مقصود تھا پورے نو سال بعد یا سرنے ان کے آگن میں آنکھ کھولی تو انہیں یوں لگا جیسے خدا نے عزوجل نے اپنی نعمتیں ان پہ تمام کر لی ہوں خوشی کے جس رنگ سے انہیں آشنا ملی۔ اس سے پہلے وہ اس رنگ سے نا آشنا تھے۔

یا سرنے پاؤں اٹھانا اور وقت بے دوڑنا شروع کر دیا۔ انھوں جماعت کے طالب علم معراج دین کو ناشناسا احسان اجرا کا بیٹا ہی سمجھ بیٹھتے تھے جس نے ان کی تربیت کا خوب پاس رکھا تھا۔ اپنی شاکست عادات اور فرماں بردار نظرت سے گھر کے ساتھ ساتھ معراج دین نے سب کے دلوں میں بھی خوب جگہ بنالی تھی۔ اس دن احسان احمد کو مٹان روانہ ہونا تھا۔ وکان کا سامان لینے کے لیے حسب سابق پورے اعتماد سے وکان معراج کے حوالے کی۔

کاروبار تو پورے زوروں پہ تھا لیکن آمدنی دن دن تنگتی جا رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب

دو ادھر ادھر تک رہا ہے تو منافع تو دور کی بات اصل رقم بھی ان کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ اور ایسے میں مسرت کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایسے موقع پہ شوہر کی دلجوئی کیسے کریں جب کہ وہ خود بھی آج کل ہاتھ اسی قسم کے کرائس سے گزر رہی تھیں۔ چار پارچ سو کی گندگی کا تو خاص نوٹس نہیں لیا۔ لیکن جب دس دس ہزار کے دو بانڈہ لہاری سے غائب دیکھے تو وہ چکر لگا رہ گئیں۔

ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو شکست کی زد پہ رکھیں سارے تو اپنے ہی بچے تھے۔ زیادتی ہر چیز میں نقصان دہ ہوتی ہے۔ جد سے زیادہ اعتبار اور بھروسہ بعض اوقات مثبت نتائج لانے کی بجائے جذبات و احساسات کے نازک شیشے کو یوں نہیں پہنچاتا ہے کہ سر گزر جاتی ہے لیکن دراڑیں بھر نہیں پاتیں کسی کو جانچے پرکھے بغیر جب کسی پہ بھروسہ اور یگانہ کار بوجھ ضرورت سے زیادہ لاد دیا جائے تو اسے صرف خسار ہی آتا ہے۔

مسرت کو لگا تھا کہ یہ بے یقینی اور صدماتی کیفیت ان کی جان لے لے گی۔ اور سمجھ تو احسان احمد کی بھی نہیں آ رہا تھا کہ خدا کے لباس، تعلیم اور پیار و محبت انہیں کون سی بنیادی ضرورت نہیں تھی جنہیں مہیا کرنے میں انہوں نے معراج اور اپنے بچوں میں کوئی فرق روا رکھا ہو۔ پھر کیوں معراج نے چوری جیسی روئیل حرکت کی۔

”تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی تو مانگ لیتے یہ گھناؤنی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں بولو معراج؟“

ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولتے ہوئے مسرت نے اس کا بازو زور سے جھنجھوڑا تھا۔ شرمندگی کے بوجھ سے گردن جھکا کے معراج اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پارہا تھا کہ وہ غیض و غضب کی آگ میں جلنے احسان احمد کا سامنا کر سکے۔

جب ملازم لڑکے نے ہینکلے ہوئے انہیں یہ بتایا تھا کہ اس نے متعدد بار معراج کو گئے میں ہے

نکالتے اور احسان احمد کی غیر موجودگی میں چند آوارہ لڑکوں کے ساتھ ان بیٹوں سے عیاشی کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے لڑکے کو بری طرح جھاڑ دیا تھا کہ وہ احسان احمد کے معراج کے ساتھ غیر معمولی التفات کی وجہ سے حسد کی بنا پر معراج کی کردار نشی کر رہا ہے۔ مزوم شناسی کے سارے دعوے بودے نکلے تھے۔ سارا ماں بھروسہ کر چکی ہو گئی تھی۔

”آج سے اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ سچ ہے نالی کی اینٹ اگر چھوڑے میں لگ بھی جائے تو دور سے اپنی اوقات بتانی رہتی ہے۔ غربت جہالت اور تنگ دستی کے کچھڑے سے نکل کر تمہیں تعلیم اور شعور کے جوہر سے اس لیے نہیں آراستہ کیا تھا کہ مار آستین اور تنگ انسانیت ثابت ہو۔“ احسان احمد کالج سرد اور انداز بے لگ تھا۔

”بھائی صاحب! اس نامراد کو معاف کر دیں۔ اس کم ذات کو اس چھت کی قدر معلوم نہیں۔ مائے کے گھر دو وقت کی روٹی تو کھالے گا۔ سونے کے لیے کچی ٹوٹی پھت بھی مل جائے گی۔ پر پند کی جہالت اس سے دونوں جہاں برباد کروا دے گی۔ آپ کو رب واسطہ اپنی مہربانی کی چادر اس کے سر سے نہ چھینیں۔“ کلثوم بری طرح گزرتا رہی تھی۔ مسرت کا دل لمحہ بھر کو لیجا لیکن شوہر کے پتھر لیے تاثرات کو دیکھتے ہوئے لب کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔

”چل بد بخت! صاحب کے پاؤں پکڑے بے حیا تو کی کمینوں کی اولاد ہے تب ہی تو یہ سلکھ آرام تجھ سے ہضم نہیں ہوا۔“ دونوں ہاتھوں سے بری طرح سینے کے بعد کلثوم معراج کو ہینٹتے ہوئے احسان احمد کے پاس لے آئی۔

”چل معافی مانگ۔ کم بخت جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید نہیں کرتے۔“ سوکھے کالے ہاتھوں سے ایک زوردار چھڑ معراج کے چہرے پہ رسید کیا۔

”معاف کرویں بھائی جان! جاوید لوگوں کے گھر میں آکر وہ زبردستی مجھے پکڑ کھانے لے جاتے تھے۔“

ہوں۔ بس مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔“ ندامت سے چور احسان احمد کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے معراج پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

”ہرگز نہیں سبے اعتباری کی مرہم خود بہ لگا چکے ہو اب مزید کوئی نقصان اٹھانے کا میں متحمل نہیں ہو سکتا“ آج میری بچیاں چھوٹی ہیں۔ کل کو بڑی ہوں گی۔ بھیڑ کے بھیس میں بھیڑیے کو میں اپنے گلے کا محفوظ و تمکبان کیسے بنا سکتا ہوں۔ ویسے بھی آج میرا یا سر کم سن ہے۔ ہو سکتا ہے کل کو وہ تمہاری صحبت میں رہ کر یہ چوری چکاری سیکھ لے۔ میری تو کل کمالی میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اپنی کل پونجی کو اپنے ہاتھوں کیسے ڈوبوں تم نے میرے بھروسے کا خون کیا ہے۔ مجھے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کیا ہے۔ اب میں شاید ہی کسی پر اعتماد کر سکوں۔ تمہاری صورت دیکھ کر مجھے اپنا نقصان یاد آجاتا ہے۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔“

سکھ چین کے درخت کے نیچے رات کو برسنے والی ہلکی سی پھوار سے صحن کے نشی حصوں میں اونچ بھر کئی چھوٹے چھوٹے تالاب سے بن گئے تھے۔ پتوں پہ نلکے شبنم کے شفاف ابدار قطرے ”تپ“ کی آواز سے پانی میں گرتے تو ٹھنڈے سج خاموش ماحول میں ہلکی سی مدھر موسیقی پھیل جاتی۔

دن کا اجالا تیزی سے پچھم کی سمت سمٹ رہا تھا۔ تلخے اندھیرے میں شکستہ قدموں سے کلثوم کے پیچھے معراج دین نے وہ بیٹی پار کی تھی یا شاید مجھے نے اتن سے سرفنی غائب ہو چکی تھی۔ ایمن کو لگا یہ روشنی اتن سے نہیں بلکہ ان کے گھر سے رخصت ہو گئی ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔

”کسی تیمم اور بے سہارا کے سر پر ہاتھ رکھتے، دو وقت رونی کھلانے، تن ڈھانپنے اور سر چھپانے کو چھت فراہم کرنے سے خدا خواستہ ہم خدائی کا درجہ نہیں پالیتے۔ پروردگار کی عطا کردہ بے بہا نعمتوں سے اگر تھوڑا سا حصہ اپنے زیر سایہ پلٹے والے کسی تیمم اور بے گھر خرچ بھی کر دیتے ہیں تو یہ خناس ہمارے ذہنوں میں کیوں سا جاتا“ اگر یہ سب ضروریات زندگی ہم فراہم نہیں کریں گے تو اس بشر کے جسم کاروں سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ یہ تو قدرت کی طرف سے تفویض کردہ ایک ذیوبنی ہوتی ہے۔ جس کو برضا و رغبت سر انجام دینے سے اللہ تعالیٰ ہمارے کھاتے میں اس دنیا کی آسائشیں، مسرتیں اور راحتیں رقم کر دیتا ہے۔ جب یہ ذیوبنی ترک کر دیں تو لامحالہ قدرت کو بھی کھاتہ بند کرنا پڑتا ہے۔“

”آئی امی کی دعا کا نام ہو گیا ہے۔ دوا آپ دوسری گی یا میں کھلا دوں؟“ معراج اندر داخل ہوئی تو وہ چونک کر غیابوں سے باہر نکلی۔

”میں میں خود دیتی ہوں، تمہیں ٹائم ٹیبل کا علم نہیں ہے۔“ وہ کتاب شہادت میں رکھتے ہوئے بولی تو عمر واپس ہوئی۔ وہند کلتی چھٹ چکی تھی۔ مشرق کی گود سے نکل کر بلکہ زرد اور ٹھنڈے سورج کو اس نے نظر بھر کر دیکھا جواب آسماں کے سینے پہ سج چکا تھا۔

”ہم سب گارڈین ہیں۔ کیرنگر ہیں۔ ہمارے دفتروں گھروں میں ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جو دو تین ہزار روپے کے لیے ہماری خدمت کرتے ہیں۔ ان کا رزق ہمارے رزق سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ کون ہے جس کا شکر ہمارے رزق کو وسعت دے رہا ہے۔ مگر پھر ہمارا تکبر ہماری نخوت ہمارا غور ہمیں ڈنگ مارتا ہے اور کسی کمزور لمحے میں ہم ذریعے کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں۔ پھر ان ساری آسائشوں، نعمتوں کا سورج اس شخص کے ساتھ ہمارے گھنڈوں سے رخصت ہو جاتا ہے۔“

”کسی تیمم اور بے سہارا کے سر پر ہاتھ رکھتے، دو وقت رونی کھلانے، تن ڈھانپنے اور سر چھپانے کو چھت فراہم کرنے سے خدا خواستہ ہم خدائی کا درجہ نہیں پالیتے۔ پروردگار کی عطا کردہ بے بہا نعمتوں سے اگر تھوڑا سا حصہ اپنے زیر سایہ پلٹے والے کسی تیمم اور بے گھر خرچ بھی کر دیتے ہیں تو یہ خناس ہمارے ذہنوں میں کیوں سا جاتا“ اگر یہ سب ضروریات زندگی ہم فراہم نہیں کریں گے تو اس بشر کے جسم کاروں سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ یہ تو قدرت کی طرف سے تفویض کردہ ایک ذیوبنی ہوتی ہے۔ جس کو برضا و رغبت سر انجام دینے سے اللہ تعالیٰ ہمارے کھاتے میں اس دنیا کی آسائشیں، مسرتیں اور راحتیں رقم کر دیتا ہے۔ جب یہ ذیوبنی ترک کر دیں تو لامحالہ قدرت کو بھی کھاتہ بند کرنا پڑتا ہے۔“

”آئی امی کی دعا کا نام ہو گیا ہے۔ دوا آپ دوسری گی یا میں کھلا دوں؟“ معراج اندر داخل ہوئی تو وہ چونک کر غیابوں سے باہر نکلی۔

”میں میں خود دیتی ہوں، تمہیں ٹائم ٹیبل کا علم نہیں ہے۔“ وہ کتاب شہادت میں رکھتے ہوئے بولی تو عمر واپس ہوئی۔ وہند کلتی چھٹ چکی تھی۔ مشرق کی گود سے نکل کر بلکہ زرد اور ٹھنڈے سورج کو اس نے نظر بھر کر دیکھا جواب آسماں کے سینے پہ سج چکا تھا۔

”ہم سب گارڈین ہیں۔ کیرنگر ہیں۔ ہمارے دفتروں گھروں میں ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جو دو تین ہزار روپے کے لیے ہماری خدمت کرتے ہیں۔ ان کا رزق ہمارے رزق سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ کون ہے جس کا شکر ہمارے رزق کو وسعت دے رہا ہے۔ مگر پھر ہمارا تکبر ہماری نخوت ہمارا غور ہمیں ڈنگ مارتا ہے اور کسی کمزور لمحے میں ہم ذریعے کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں۔ پھر ان ساری آسائشوں، نعمتوں کا سورج اس شخص کے ساتھ ہمارے گھنڈوں سے رخصت ہو جاتا ہے۔“

”کسی تیمم اور بے سہارا کے سر پر ہاتھ رکھتے، دو وقت رونی کھلانے، تن ڈھانپنے اور سر چھپانے کو چھت فراہم کرنے سے خدا خواستہ ہم خدائی کا درجہ نہیں پالیتے۔ پروردگار کی عطا کردہ بے بہا نعمتوں سے اگر تھوڑا سا حصہ اپنے زیر سایہ پلٹے والے کسی تیمم اور بے گھر خرچ بھی کر دیتے ہیں تو یہ خناس ہمارے ذہنوں میں کیوں سا جاتا“ اگر یہ سب ضروریات زندگی ہم فراہم نہیں کریں گے تو اس بشر کے جسم کاروں سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ یہ تو قدرت کی طرف سے تفویض کردہ ایک ذیوبنی ہوتی ہے۔ جس کو برضا و رغبت سر انجام دینے سے اللہ تعالیٰ ہمارے کھاتے میں اس دنیا کی آسائشیں، مسرتیں اور راحتیں رقم کر دیتا ہے۔ جب یہ ذیوبنی ترک کر دیں تو لامحالہ قدرت کو بھی کھاتہ بند کرنا پڑتا ہے۔“

”آئی امی کی دعا کا نام ہو گیا ہے۔ دوا آپ دوسری گی یا میں کھلا دوں؟“ معراج اندر داخل ہوئی تو وہ چونک کر غیابوں سے باہر نکلی۔

”میں میں خود دیتی ہوں، تمہیں ٹائم ٹیبل کا علم نہیں ہے۔“ وہ کتاب شہادت میں رکھتے ہوئے بولی تو عمر واپس ہوئی۔ وہند کلتی چھٹ چکی تھی۔ مشرق کی گود سے نکل کر بلکہ زرد اور ٹھنڈے سورج کو اس نے نظر بھر کر دیکھا جواب آسماں کے سینے پہ سج چکا تھا۔

”ہم سب گارڈین ہیں۔ کیرنگر ہیں۔ ہمارے دفتروں گھروں میں ایسے بے شمار لوگ ہوتے ہیں جو دو تین ہزار روپے کے لیے ہماری خدمت کرتے ہیں۔ ان کا رزق ہمارے رزق سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ کون ہے جس کا شکر ہمارے رزق کو وسعت دے رہا ہے۔ مگر پھر ہمارا تکبر ہماری نخوت ہمارا غور ہمیں ڈنگ مارتا ہے اور کسی کمزور لمحے میں ہم ذریعے کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں۔ پھر ان ساری آسائشوں، نعمتوں کا سورج اس شخص کے ساتھ ہمارے گھنڈوں سے رخصت ہو جاتا ہے۔“

”کسی تیمم اور بے سہارا کے سر پر ہاتھ رکھتے، دو وقت رونی کھلانے، تن ڈھانپنے اور سر چھپانے کو چھت فراہم کرنے سے خدا خواستہ ہم خدائی کا درجہ نہیں پالیتے۔ پروردگار کی عطا کردہ بے بہا نعمتوں سے اگر تھوڑا سا حصہ اپنے زیر سایہ پلٹے والے کسی تیمم اور بے گھر خرچ بھی کر دیتے ہیں تو یہ خناس ہمارے ذہنوں میں کیوں سا جاتا“ اگر یہ سب ضروریات زندگی ہم فراہم نہیں کریں گے تو اس بشر کے جسم کاروں سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ یہ تو قدرت کی طرف سے تفویض کردہ ایک ذیوبنی ہوتی ہے۔ جس کو برضا و رغبت سر انجام دینے سے اللہ تعالیٰ ہمارے کھاتے میں اس دنیا کی آسائشیں، مسرتیں اور راحتیں رقم کر دیتا ہے۔ جب یہ ذیوبنی ترک کر دیں تو لامحالہ قدرت کو بھی کھاتہ بند کرنا پڑتا ہے۔“

”آئی امی کی دعا کا نام ہو گیا ہے۔ دوا آپ دوسری گی یا میں کھلا دوں؟“ معراج اندر داخل ہوئی تو وہ چونک کر غیابوں سے باہر نکلی۔



بدن دے زندگی کا ہر انداز

مینٹو

TOUCH ME
Minto
CALCIUM fluoride toothpaste

کالسیئم اور فلورائیڈ سے دانت مضبوط
Extra Whitening سے
دانتوں پر اونگھی چمک اور سفیدی
تھلمہ Tartar کنٹرول
بازوہ واش سے بچتی ساتھی

Extra Whitening

www.pakfundpa.com

کپڑے دھوتے ہوئے کئی بار یا سر کی جیب سے اسے لٹکا اور سگریٹ کے پیکٹ ملے تھے۔ اس باپ کو ان کے ضبط سے زیادہ نہ آزمائے۔ یہ سہلہ کرتے ہوئے اس بات کو اس نے اپنے تک ہی محدود رکھا تھا لیکن تاکہ کے۔

گنہگار نفس کا گھوٹا، جس کی لگا میں شیطان کے ہاتھ میں تھیں اور نفسانی خواہشات کا تازیانہ۔ اسے سگریٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس پر سوار یا سر دکان پر باپ کی اور گھر پر ماں بہنوں سے نظر بچا کر بڑی صفائی سے بھی زیور تو کبھی نقدی اڑا لیتا تھا۔ اب یا سر کی بد قسمتی یا ان کی بد قسمتی۔ یا سر کو دراز میں سے پیسے نکالتے ہوئے مسرت نے خود کو دیکھ لیا۔

پھر وہ دن اور آج کا دن مسرت تو چار پائی کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایمین کے ذمے گھنٹہ دو گھنٹہ بعد ماں کو دوامیں کھلانا اور وقت سے پہلے بوڑھے ہوتے باپ کو سہارا بنا ہوا تھا۔

”ابھی ابو کی اس حالت کے ذمہ دار تم ہو۔ گھر، دکان، سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ کیوں اپنے سر جوڑی کا گناہ لے رہے ہو۔“ شدید غم و غصے میں اس نے یا سر کا گریبان پکڑ کر کئی جھٹکے دے ڈالے تھے۔

”یہ سب کچھ کرنے پر آپ خود مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ ترسنا ترسنا کر چند روپے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں کہ جاؤ لالی باپ لے لیتا جیسے میں کوئی فیڈر پیتا پیچہ ہوں۔“ وہ تنگ روئے زاری سے کہتا۔

ایمین کو یوں محسوس ہوا کہ گیا وقت کسی نہ کسی شکل میں لوٹ کر ضرور آتا ہے۔ سب کچھ وہی ہے بس ماں جیسے کی جگہ پر اب یا سر ہے۔ خاندانی و عجیب الطور فین جس کی رگوں میں ٹنک اور عبادت گزار ماں باپ کا خون دوڑ رہا تھا نہ کہ کسی کی کہیں کا ہاں اتنا فرق ضرور تھا کہ چوری پکڑے جانے کے بعد ماں جیسے کی نگاہیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں اور ماں جیسے بد قسمت کے قطرے چمک رہے تھے۔

لیکن یا سر نے آنکھوں میں سے خون اور دھنسا لیا کا

تازے اپنی سستی میں مگن تھا جسے ہر بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کی ماں موت کو ہاتھ لگا کر واپس آئی ہے۔ باپ کے شانے دن دن جھکتے چلے جا رہے ہیں اور ہستی مسکراتی بہنیں ایک دم سے خاموش کیوں رہنے لگی ہیں۔

”تمہارے ابو ابھی تک یا سر کو نہیں لائے؟“ مسرت نے انتہائی نحیف آواز میں دریافت کیا۔ اندر کو دھنسی آنکھوں میں وحشت اور ویرانی کا پیرا تھا۔

”آجائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے دو اکاچھوچھو ان کے منہ کی طرف بڑھایا۔ ”یا سر اگر وہ پیسے نہ چراتا تو تمہارے جینز کی کئی چیزیں خرید لیتے۔“ مسرت یا سیت سے بولیں تو ایمین ان کو دوبارہ لٹاتے ہوئے سختی سے بولی۔

”کون سا شادی سر پر آئی کھڑی ہے۔ بس آپ ٹھیک ہو جائیں۔ سالانہ آتا رہے گا۔“ اس کے سسرال والے تین سال قبل منگنی کی انکو بھی پھانسا کر شادی کی تاریخ لینا شاید بھول گئے تھے۔ خود منہ سے کہنا اپنی بیٹی کی توقیر خود گھٹانے کے مترادف لگا تھا۔ سوچ رہے تھے۔ زندگی کو نجانے کہاں کہاں سے انہیں آزمانا مقصود تھا۔

”واقعی سچ کہتی ہو، بیسوں کا لیا ہے ہاتھوں کی میل کا کیا غم کرنا۔ دو ماں اور خیر جیسے کی پیدائش پر ماں محسوس کرتی ہے وہ سب کچھ تو منی میں مل چکا ہے۔ کونوں پر کیا مہنگا نہیں اشریاں بولٹ چکی ہیں۔“ چند الفاظ بولنے سے مسرت کی سانس پھول گئی تھی۔

”ایمین، یہاں ایک کپ چائے کا پلاؤ اور دو سراسو سٹری بھی لٹکا کر دو۔ یہ والا کو کمر میں پھرنے سے یوں نم ہو گیا ہے جیسے ابھی پھولوں تو چند قطرے پانی کے نکل ہی آئیں گے۔“

سوئیٹر کے اوپر کوٹ، سر اور منہ کو مفلتر سے اچھی طرح دھوئے کے باوجود احسان احمد سردی سے کپکپاتے رہتے اندر داخل ہوئے۔

”آجئے آپ یا سر کہاں ہے؟ میرے بچے نے ساری رات نہ جانے کہاں ٹھنڈ میں گزار دی ہوگی؟“

جاں بلب مریض جس طرح چند حیات بخش قطرے جسم میں جانے سے اپنے اندر توانائی محسوس کرتا ہے ویسے ہی مسرت شوہر کو سامنے پا کر اس خیال سے بے تابی سے اٹھ بیٹھیں کہ صبح منہ اندھیرے کے نکلے یا سر کو ضرور ساتھ لے آئے ہوں گے۔ فریمن ہی سہی پراکھوتے بیٹے کے رات بھرنا رہنے سے ان کی ممتا کس کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی یہ وہی جانتی تھیں۔

ایمین کو باپ پر بے طرح زور آیا۔ جب ہر نفس پڑیوں میں کودے کو بڑا بڑا بڑی سردی سے بچنے کے لیے کسی پر حدت مقام پر موسم کی سختی سے بچا ہوا تھا۔ اس کا باپ چاہے کڑا کے کی سردی ہو یا چلچلائی گرمی، اپنے پیسے کو ڈھونڈتے ہوئے حق برداری ادا کر رہا ہوتا۔ آپ نے بتایا نہیں یا سر آخر کہاں تھا ساری رات۔

”ایمین کے پاس۔“ صوفے کی پشت پر سر رکھے بے تاثر نظروں سے چھت پر نجانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ مسرت کو ان کے الفاظ اور انداز اجنبی سے لگے۔ وہ ہمیشہ یا سر کو اس کے چند دوستوں یا کسی تقریبی پوائنٹ سے ”بازویاب“ کرا لاتے تھے لیکن یہ نام ان سنا سا لگ رہا تھا۔

”کون ایمین؟“ ”ہے ایک قوم لوٹ کی بھنگی ہوئی بیوی۔“ احسان احمد کے منہ سے سرسراہٹ آواز میں نکلے یہ الفاظ من کرا نہیں یوں لگا کہ جیسے پاؤں سے لے کر سر تک ان کے پورے جسم کو کسی نے تیز دھار آلے سے چیر ڈالا ہو۔ وہ بے دم سی ہو کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئیں۔

”کاش بولا! آپ اس دن مانجھے کو گھر سے نہ نکالتے بے شک اس غلطی پر ہار پیٹ لیتے لیکن اسے ویرانی کی سزا نہ دیتے۔“

بہت ممکن ہے ہمارے گھر کے اندر بقول کلثوم کے اس کا دو سرا ٹھکانہ اس کے اس کا صبر ہو گا۔ ماںوں کے بیٹوں کی محبت میں وہ کران کار لگنا اپنا ہوئے وہ معراں دین کی جائے جہاں چوریا قمار باز، چکا ہوں۔

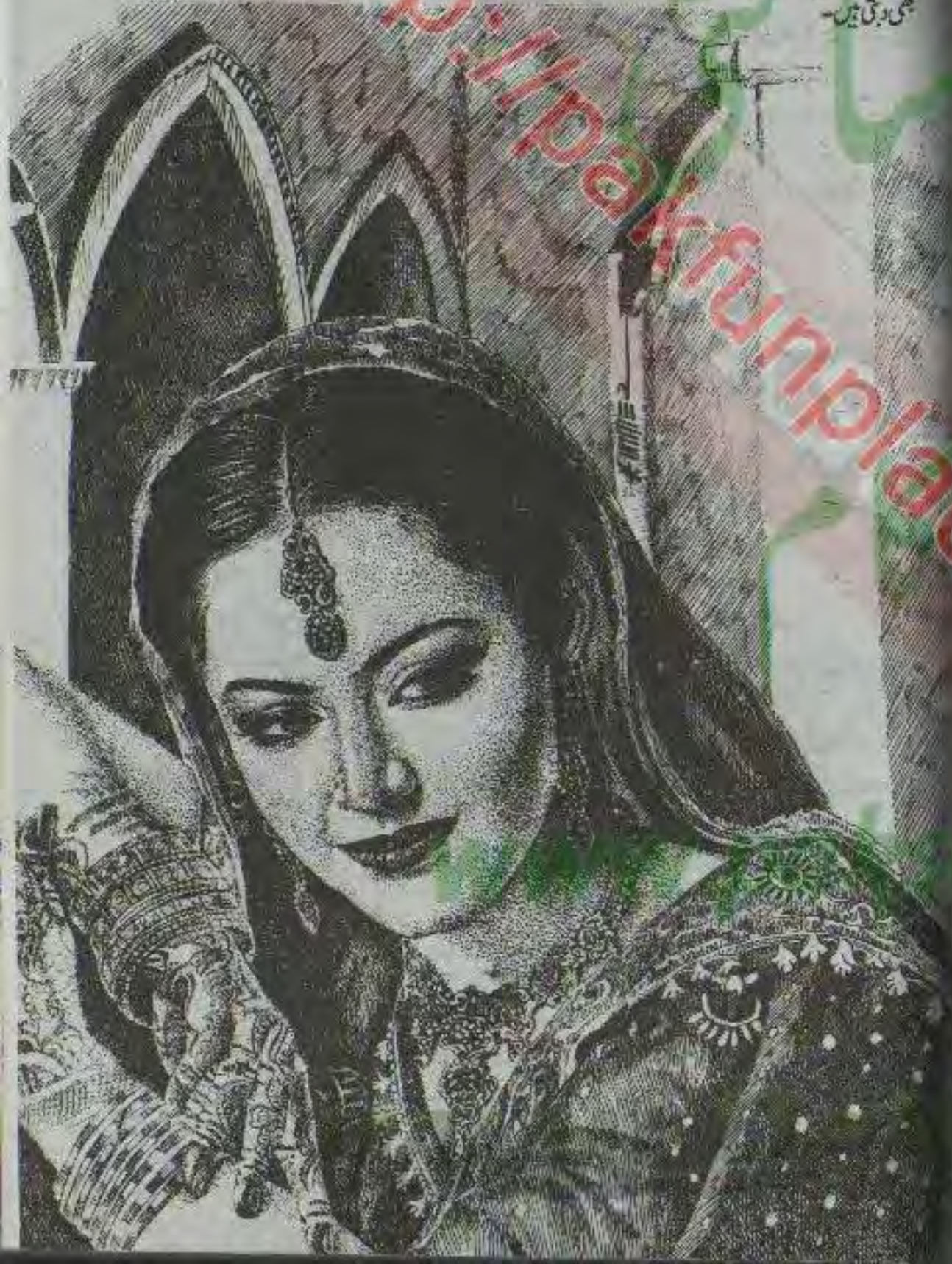
کاش بولا! آپ اپنی سربالی کا دائرہ وسیع کر لیتے معراں کو معاشرے کا ایک فیصد اور باعزت فرد بنانے کا قدرت نے آپ کو موقع دیا تھا۔ لیکن اپنے غصے اور بڑائی کے زعم میں اگر وہ موقع آپ نے اپنے ہاتھ سے گنوا دیا۔“

ایک دکھ بھری نظر وہ بے حس و حرکت بڑے باپ پر ڈال کر حسب سابق یا سر کے لیے کھانا نکالنے چن چن میں چلی آئی۔

نافرمان اولاد ہاتھ کی چھٹی انگلی کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ساتھ لگی رہے تو بد نما دکھائی دیتی ہے۔ جو اگر کاٹا جائے تو دور ہوتا ہے اور ایسے ہی درد کا لامتناہی سلسلہ قدرت نے بھی احسان احمد کی زندگی میں رقم کر دیا تھا۔ اکلوتے و نافرمان بیٹے جیسا بد نما دھبہ ان کی زندگی کے حسن کو گناہ کا تھا۔ خود احتسابی کے عمل سے خود کو بار بار گزارنے کے باوجود ایسی کوئی بھی ”خطا“ نہیں مل سکتی جس کی اللہ نے انہیں اتنی سخت ”سزا“ دے دی تھی۔ پھر یہ سوچ ایک گونہ دل کو تسلی دیتی کہ اللہ اپنے ”عبادت گزار“ اور ”بااخلاق“ بندوں کو سزا تو نہیں البتہ آزما ضرور لیتا ہے۔ لیکن وہ کبھی یہ جان ہی نہیں پاتے کہ کسی سیم ہو بے کس کی غلطی پر صبر و تحمل سے کام لیں کی بجائے ”سزا“ دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس پر غصہ اور چشم پوشی کا دروازہ جب بند کرتے ہیں تو ہماری زندگی میں کھپ اندھیرا اور آتا ہے۔ اس بند دروازے کے پیچھے ہی ہمارے نصیب کی خوشیاں آسمان میں اور راحتیں رہ جاتی ہیں۔ اور ہم اپنی تاریک زندگی میں ٹٹول ٹٹول کر انہیں تلاش کرتے رہ جاتے ہیں۔

منصور حسین ایک خوب اور میٹرک پاس آدمی ہے، اہل سہارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری
مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا حکم دیا، اس نے سب کچھ دیکھا اور وہ مایوسی
سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور مہجے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت بکا آدمی ہے، اس نے
کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بہ قول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت محروسہ ہے اور اس کا تین سو دو سوا کو
بھی دیتی ہیں۔



سائلگرہ مغربہ

نبیلہ عزیز
درد

ساتویں قسط

بڑی حویلی کے تمام کمین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے
بہت ہی متاثر ہے۔

مدحہ اور نبیلہ جیات دونی، من بھائی ہیں، مدحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلنڈ کی رنگینوں میں کھل
سورہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحہ پاکستان جانے
سے انکار کر دیتی ہے، جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ
اندرونی اندر رہنا چاہتا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے، بسی اور
مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ٹھہرے میں چائے پیتے ہوئے پڑا ہوا
جاتا ہے، ہراسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، گاسی خوشی میں وہ کام کی بہت پرچھا بھول جاتا ہے۔



”دل اور شاہ آپ ہی ہیں نا؟“ کسی نے اس کے عقب سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور وہ اس جالی بچپانی کی آواز پہ ایک جھٹکے سے پلٹا تھا۔

”نیل؟“ اس کی آواز اور لمبے سے خوشی کا رس ٹپک رہا تھا۔

”دل اور! وہ دونوں یکدم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے تھے۔

”کیسا ہے شزاوے؟“ دل اور اس کو جھپٹتے ہوئے بولا تھا۔

”دیکھ لو کیسا ہوں؟“ نیل نے ہنس کر جواب دیا ان دونوں کی اس قدر محبت بھری اور جذباتی ملاقات پہ کئی لوگوں نے باقاعدہ ٹھہر کر ان کی اس ملاقات کا سینہ دیکھا تھا۔

”ماشاء اللہ پہلے سے جوان ہو گیا ہے۔“ دل اور کا جملہ نیل کو قہقہہ لگانے پہ مجبور کر گیا تھا۔

”تیری سہیلی باتیں تو مجھے یاد رکھنے پہ مجبور کرتی ہیں۔“ نیل شرارت سے بولا۔

”اس بات کا بھی حساب لے لوں گا تم سے تم یہ بتاؤ مدیجہ اور آئی کہاں ہیں؟“ دل اور اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ ابھی اندر ہیں، سامان کی چیکنگ ہونی ہے ابھی۔“ نیل نے اشارہ کیا۔

”یار چیکنگ میں تو تم لوگوں کا سارا سامان خراب ہو جائے گا میں کچھ کرتا ہوں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا نیل نکالا اور کسی کا نمبر ڈائل کیا تھا اور واقعی اس کی سفارش کام آئی تھی ان کا سامان چیکنگ کے عذاب سے بچ گیا تھا اور وہ لوگ جلدی باہر آگئے تھے۔

”بھائی بس! مدیجہ بڑے والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی تھی۔

”میری گریبا۔“ وہ سینے سے لگی مدیجہ کا سر تھپتے ہوئے نرمی سے مسکرایا تھا اس وقت اگر اس کے کولیکز اسے دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہ دل اور شاہ ہے جو کورٹ میں کھڑا ہوتا تھا تو لفظوں کی جگہ آگ اگلتا تھا اور سننے والے دم سادھ جاتے تھے۔

”کیسی ہو؟“ وہ اس کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”بس ٹھیک ہوں، آپ سنا میں کیسے ہیں؟ اور آئی کہاں ہیں؟“ مدیجہ نے ہنول شاہ کا پوچھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں میری جان، اماں اسلام آباد میں ہیں، ان کے کالج میں آج کل ایگزام ہو رہے ہیں اس لیے مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکیں۔“ دل اور نے اس کو جواب دیا اور آگے بڑھ کے فائزہ بیگم سے ملا۔

”اسلام علیکم آئی۔“ اس نے ان کے سامنے سر خم کیا تھا اور انہوں نے دل اور کی پیشکش قبول کر لی تھی۔

”جیتے رہو، خوش رہو اللہ عمر دراز کرے۔“ انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔

”آمین۔“ نیل نے شرارت سے آمین کہا۔

”بچو! تم سے تو میں بعد میں بات کروں گا ابھی گھر چلو بڑی ہوا لگ گئی ہے۔“ دل اور مدیجہ کے ہاتھ سے سامان سے لدی ٹرائی دھکیلتا ہوا آگے بڑھا دوسری ٹرائی نیل دھکیل رہا تھا وہ لوگ وہاں سے اپنے گھر کی ضرورت کے لیے کالی سامان لے کر آئے تھے۔

”لایے صاحب۔“ گلاب خان لپک کے قریب آیا۔

”نیل صاحب کی پیلپ کرو۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”اسلام صاحب۔“ گلاب خان نے نیل کو سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔“ نیل سمجھ گیا کہ وہ دل اور کا لازم ہے۔

”لایے صاحب میں رکھتا ہوں گاڑی میں۔“ گلاب خان نے ٹرائی کے ہینڈل اس کے ہاتھ سے قحام لیے تھے۔

”گلاب خان میں نے دین ہائری ہے تم اس دین میں سارا سامان لے کر نیل صاحب کے گھر پہنچو گاڑی میں فوراً رانیو کر لوں گا۔“ دل اور نے سامان زیادہ دیکھ کر گاڑی بک کر والی تھی۔

”جی صاحب جیسے آپ کا حکم۔“ گلاب خان سعادت مندی سے بولا۔

”چلو رکھو او سامان گاڑی میں۔“ دل اور نے اپنی ٹکرائی میں سارا سامان احتیاط کے ساتھ گاڑی میں رکھوایا تھا۔

”یار ہر چیز کے معاملے میں بہت کھیرنگ ہو تم۔“ نیل کے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہا ہا ہا۔ میں دوست تو دوست دشمن کی بھی بڑی کھیر کرتا ہوں۔“ وہ قہقہہ لگاتا ہوا اپنی گاڑی کی سمت بڑھا اور نیل اس کی گاڑی کے قریب آکر ٹھہر گیا تھا۔

”تو جناب نے آج کل ”سرف“ تو کھی ہوئی ہے؟“ نیل سلور کلر کی چھماتی ہوئی گاڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بس جو غریبوں کو پسند آجائے۔“ وہ عاجزی سے کہتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا دوسری سائیڈ سے دروازہ کھول کر نیل بھی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔

”ویسے یار یہ براڈ گرینڈ کروزر پچھرا اور سرف میں کوئی خاص فرق تو نہیں ہے؟“ نیل واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا اس گاڑی کی سب سے بھی براڈ اور لینڈ کروزر جیسی ہی تھی۔

”بے شک فرق نہ ہو لیکن یار پیسے کا اور نام کا فرق تو ہے نا؟“ دل اور مسکرا کر فرق سے آگاہ کیا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے، پاکستان میں چیزوں کا کھانا زیادہ ہی ہوتا ہے چاہے وہ موبائل فون ہو، چاہے گاڑی، چاہے لکیوں کے پنڈ بیک۔ بس سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی چیز باتوں سے منفرد نظر آئے۔“ نیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

”ایک بات کہوں نیل؟“ دل اور نے گاڑی روڈ پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”کہو۔“

”ماہور پاکستان کا دل ہے اور دل میں آگرائیسی باتیں مت کرو کہ دل کو ناگوار گزرے، اس لیے بہتر ہے کہ کوئی اور بات چھیڑو۔“ اس نے بڑی نرمی اور بڑے طریقے سے نیل کو سمجھایا تھا۔

”لوہ۔ یعنی سچے اور کیا کستانی ہو؟“ نیل معنی خیزی سے بولا۔

”یہی سمجھ لو اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

وہ دونوں اتنے عرصے بعد ملے تھے اس لیے ان کی باتوں کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ جبکہ پچھلی سیٹ پہ فائزہ بیگم کے ساتھ بیٹھی مدیجہ چپ چاپ لاہور کے مناظر دیکھ رہی تھی سڑکوں پہ خاصی چمک پھل اور گھما گھمی تھی سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا تھا جو وہ لوگ فلموں اور ڈراموں میں دیکھتے تھے وہی سڑکیں، وہی راستے وہی لوگ، وہی بازار۔

”آف! اب یہاں ان لوگوں کے ساتھ رہنا بڑے گا؟ جن کو کسی بھی چیز کی تمیز نہیں ہے؟“ اس سے سوچ کر ہی کوفت اور بے زاری ہونے لگی تھی وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر رہ گئی۔ دل اور اس کی بے زاری صورت دیکھ کر یو مرس سے ہی دیکھ چکا تھا اور کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے نیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عبداللہ کیسا تھا؟“

”فٹ فٹ ہے یار۔“

”اور نگارش بھائی؟“

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ ساری فیملی ہمیں ایسے پورٹ سی آف کرنے آئی تھی۔“ نیل نارمل سے انداز میں بولا اس

نے یہ بھی نوٹ نہ کیا کہ دلی آور نے عید اللہ اور نگارش بھابھی کا حال احوال پوچھ لیا ہے، لیکن زری کا کیوں نہیں پوچھا وہ بھی تو عید اللہ کی نیلی کا حصہ تھی؟

”اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے پاکستان چکر لگانے کا؟“ دل اور گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

”زری کی اسٹڈی کمپلٹ ہو گئی تو پھر ہی کوئی پروگرام بنے گا اس کا زری اور نگارش بھابھی کو اکیلے چھوڑ کر تو نہیں آسکتا وہ۔“ نیلی نے اندازاً جواب دیا تھا۔

”ہوں یعنی ابھی کچھ عرصہ لگے گا؟“

”ہاں یقیناً۔“ نیلی نے اس کی بات کی تائید کی۔

”خیر تم آگے ہو تو وہ بھی آجائے گا یا زندہ صحبت باقی۔“ اس نے منہ ہٹتے ہوئے کہا۔

”ویسے یا ایک چیز کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔“ وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

”کس چیز کا؟“

”تیرے پہلو میں کوئی گوری میم نہیں ہے اس لیے۔“ اس نے افسردگی اور باپوسی کا اظہار کیا۔

”جب تو لندن سے آیا تھا تو کیا تمہارے پہلو میں گوری میم بھی؟“ نیلی نے گھور کے پوچھا۔

”یا رہا یہاں کیا لڑکیاں مر گئی تھیں جو میں گوری میم کو لے کر آتا؟“ دل اور چڑانے والے انداز سے بولا۔

”یعنی تمہارے لیے یہاں لڑکیاں زندہ ہیں اور میرے لیے مر گئی ہیں؟“ نیلی نے اس کی بات کا مطلب افہم

کیا۔ جواباً وہ ایک بار پھر فلک شکاف قہقہہ لگا کر ہنسا تھا آج اس کی دلی خوشی کا اظہار اس کے قہقہوں سے ہو رہا تھا۔

”دلی اور باز آجا۔“ نیلی نے گھور کے کہا یہ ان کا آپس میں بات کرنے کا ایک مخصوص اشارہ تھا۔ دل اور

نے رہا کسی ایریا میں پہنچتے ہوئے ان کے گیٹ کے سامنے ہارن دیا تھا۔ چونکدار نے فوراً سلام کرتے ہوئے گیٹ

کھول دیا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

سب ملازم دل اور کی بدایت پہ ان کے انتظار میں ڈرائیو سے پر ہی کھڑے تھے ان کے گاڑی سے اترتے ہی

انہوں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔

”شکر ہے تیری ذات کا جس نے اتنے سالوں بعد ہمیں اپنے گھر کی چار دیواری دیکھنی نصیب کی ہے۔“ فائزہ

بیگم نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت اشک کے آنسو

تھے۔ لیکن ان سے چند قدم دور کھڑی مدیحہ اس گھر کے ملازموں کو اور اس گھر کے روبرو کھڑی لڑکیوں سے دیکھ

رہی تھی اس کا چہرہ بالکل سرو سپاٹ ہو رہا تھا یہی وہ گھر تھا جو اس کے باب متاز حیات نے اپنی کمالی سے بنایا تھا اور

یہی وہ گھر تھا جہاں اس کی ماں فائزہ حیات دلین بن کے آئی تھیں اور اس گھر سے گھر والے سے بہت ارمان وابستہ

کیے تھے اور بہت سے خواب سجائے تھے، لیکن اتنے ڈھیر سارے خوابوں میں سے صرف دو خواب زندہ رہ پائے

تھے۔

ایک نیلی حیات اور ایک مدیحہ حیات اور ان دونوں کے سوا باقی سارے خواب مر گئے تھے، بکھر گئے تھے، کرجی

کرجی ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کے خوابوں کے باغ کو سنبھلنے والا خود باغی ہو گیا تھا اور اب یہی دھڑکا انہیں بیٹی کی

طرف سے بھی لگا رہتا تھا۔

”نام اندر چلے پلین۔“ نیلی نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے انہیں سوچوں کے گرداب سے نکالا۔

”چلو۔“ وہ آنکھوں کی نمی پونجی ہوئی اس کے ساتھ اندر آگئیں دل اور مدیحہ کے ساتھ بیٹھا ہاتھیں کر رہا

تھا۔

وہ بیڈ پہ نیمہ اور از سے لیٹے تھے جب دروازے پہ بلکی سی دستک ہوئی۔

”بس کم ان۔“ ان کی اجازت سے علیز سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

”علیز ہے۔“ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”اسلام علیکم پیلا۔“

”و علیکم السلام اور ہر بیٹھو یہاں۔“ انہوں نے بیڈ پہ اپنے قریب بیٹھے کا کہا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں ٹھیک ہوں، دون آفس نہیں گیا اس لیے آج آفس میں فارغ نہ کر بھی سکتی ہو گئی ہے۔“

”تو آپ کوئی ٹیبلٹ لے لیتے؟“

”نہیں بیٹا ٹیبلٹ کی ضرورت نہیں ہے چائے سے ہی سکتی ہو جاوے گی۔“

”آپ آرام کریں میں جلی جاتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”بیٹھو میری جان بیٹھو اور یہ جاؤ کہ کس کام سے آئی ہو؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا دیا تھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھڑکت کر لوں گی۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”گلی میری طبیعت کو کچھ نہیں ہو اب اس ذرا سی سکتی ہے وہ بھی اتر جائے گی تمہارا کیا کہنے آئی ہو؟“ انہوں نے

اس کا ہاتھ تھپکا۔ علیز نے۔ ان کے چہرے کو دیکھنے لگی وہ اسی کی طرف متوجہ تھی۔

”پاپا وہ میں نے آپ کو بتانا تھا کہ۔“

”ہاں ہاں اور بیٹا؟“

”وہ میرے ایگزامز ہونے والے ہیں میری ایک کلاس فیلو نے بتایا ہے کہ پیپرز کی ڈیٹ شیڈ آگئی ہے شاید

بیک شہدیک پہلا بیچ ہوگا؟“ علیز نے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کی۔

”پھر۔۔۔؟“ وقار آندھی کو بھی سن کر کافی پریشانی ہوئی تھی۔

”پاپا کیا میں اب کالج نہیں جاسکتی؟“ علیز نے کافی سے ہونے انداز میں پوچھا تھا۔

”ارے نہیں بیٹا کیوں نہیں جاسکتی؟ ان شاء اللہ تم کالج ضرور جاؤ گی۔“ وقار آندھی نے اسے تسلی اور دے دی

لیکن اندر سے خود بھی فکر اور پریشانی میں گھر گئے تھے۔

”تم پیپرز کے روز کالج جاؤ گی یا پھر سہلے بھی؟“

”پاپا پیپرز سے پہلے ہونے والے پیپرز تو زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ لیکن تو آئینڈ کرنا ہی ہوں گے؟“ علیز نے خود بھی

پریشان اور تذبذب کا شکار تھی کہ آج کل کے مسئلے کے بعد اسے جانا چاہیے یا نہیں۔

”سب سے پہلے تو تمہاری گاڑی کا مسئلہ ہے آذر فارغ نہیں تھا اور نہ وہ ہی شوروم چلا جاتا، خیر اس کام کے لیے تو

تھوڑا تاخیر نکال ہی لے گا، لیکن اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ہے تمہارے لیے ڈرائیور رکھنے کا۔ خیر پاپا کافی

بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب اس حادثے کے بعد تو اور بھی کمزور ہو گئے ہیں ان کی عمر اب گھر بیٹھنے کی ہے ڈرائیور تک

کرنے کی نہیں۔“

”لیکن پاپا کسی نئے ڈرائیور کے ساتھ کیسے سب کچھ مینج ہوگا؟“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ نیا ڈرائیور رکھنا یا اس پہ اعتماد کرنا آسان بھی نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہوگا؟“ علیز نے فکر مند تھی۔

”کچھ ہوتی جائے گا تم جاؤ آرام کرو اور جاتے جاتے آذر کو میرے بیڈ روم میں بھیج دو۔“ انہوں نے علیز سے

کو دیا سے بھیج دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد آذر ان کے سامنے تھا۔

”بیٹھو۔“ وہ دائیں دیوار والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”قاریغ تھے تم؟“

”جی قاریغ ہی تھا۔“

”تیند تو نہیں آ رہی؟“

”نہیں۔“

”ڈانیاں کہاں سے؟“

”جانے پھو کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔“

”آج کل بڑی انڈر اسٹینڈنگ سے تم دونوں میں؟“ وہ پھینڈنے والے انداز سے بولے۔

”کیا نہیں ہوتی چاہیے؟“ وہ بھی ہنس کر آیا۔

”ارے کیوں نہیں بیٹا ہوتی چاہیے اور ضرور ہونی چاہیے تم دونوں بھائی ہو گزن ہو اور یہ رشتہ بہت ہی

خوب صورت رشتہ ہے جو دت تم سے چھوٹا ہے اور زین و انیال سے چھوٹا ہے اس لیے تم دونوں کی انڈر

اسٹینڈنگ ان کے ساتھ تو ہو نہیں سکتی تھی اس لیے بہتر ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھ لو ویسے بھی و انیال

بہت سمجھ دار اور سعادت مند لڑکا ہے ہر اونچ کچ بھگتا ہے۔“ وقار آندھی اس کی تعریف کر رہے تھے۔

”ڈیڈ آپ کی بات درمیان میں ٹوکنے کے لیے سوری لیکن پلیز آپ وہ بات کریں جس کے لیے مجھے یہاں بلا یا

ہے۔“ آذر سانسلی سے بولا۔

”بور ہو گئے ہو؟“

”نہیں بور نہیں ہوا بس لیٹ ہو گیا ہوں۔“ آذر نے رمان سے کہا۔

”لیٹ کس لیے؟“

”آفس کا کچھ ضروری کام بنانا تھا۔“

”بیٹا آفس کے کام کے علاوہ بھی اور بہت سے ضروری کام بنانے والے پڑے ہیں۔“

”کون سے کام؟“ آذر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”علی زے کے لیے نئی گاڑی نکلوانی ہے اس کے لیے کسی ڈرائیور یا کسی گارڈ کا بندوبست بھی کرنا ہے اس

کے ایگزامز سرپہ آگئے ہیں۔“ وقار آندھی نے اپنی پریشانی بیان کی۔

”کیا مطلب؟ کب ایگزامز ہیں؟“ آذر چونک گیا۔

”ٹیکسٹ بک۔“

”اوہ! یہ تو واقعی پر اہم ہو گئی ہے۔“

”اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ اس پر اہم کا کوئی حل نکالو۔“

”کیا اس حادثے کے بعد علی زے ذہنی طور پر کالج جانے کے لیے تیار ہے؟“ آذر کو پتا تھا کہ وہ اندر سے کتنی

ڈری سہمی ہوئی۔

”یقیناً تیار ہی ہوگی وہ خود میرے پاس آئی تھی کہ اس کے ایگزامز کی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے۔“

”گاڑی کا مسئلہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے جب تک شوروم سے گاڑی نکلے گی تب تک گھر سے کوئی اور گاڑی بھی

استعمال میں لائی جاسکتی ہے اصل مسئلہ تو ڈرائیور کا ہے۔“

لیکن ڈیڈ یہ کام تو مبارک خان بھی کر سکتا ہے؟“ آذر بات کرتے کرتے ان سے سوال کر بیٹھا۔

”مبارک خان یہ کام کر تو سکتا ہے لیکن اگر اسے علی زے کی گاڑی ڈرائیو کرنے پر مامور کر دیا تو حویلی کے اور

آفس کے بہت سے کام رک جائیں گے اس نے بہت سارے داریاں اٹھا رکھی ہیں۔“ وقار آندھی بھی اپنی جگہ ٹھیک

ہی سوچ رہے تھے جو کام مبارک خان انجام دیتا تھا وہ کوئی اور ملازم نہیں کر سکتا تھا۔

”تو پھر اپنی جلدی کوئی نیا ملازم ملنا بھی تو بہت مشکل کام ہے اور یہی کوئی اعتماد کا بندہ؟“ آذر اور وقار آندھی کی

پریشانی ایک ہی تھی۔

”بس بندہ اعتماد کا ہو۔“

”یہ کام بھی مبارک خان کر سکتا ہے۔“ وقار آندھی کا دھیان اس آدمی کی طرف چلا گیا جسے کافی روز پہلے

مبارک خان کوئی کام دلانے کی غرض سے اپنے ساتھ لے کر واپس آیا تھا۔

”مبارک خان؟ وہ کیسے؟“

”اس کے پاس کوئی آدمی ہے اسے کام کی ضرورت ہے ایک بار مجھ سے مل بھی چکا ہے نام بھی بتایا تھا اس نے

لیکن میرے ذہن سے محو ہو چکا ہے میرے خیال میں وہی بندہ ٹھیک رہے گا؟“ وقار آندھی فیصلہ کر چکے تھے۔

”کون آدمی ہے؟ کچھ بتائیے؟“

”وہ بھی بتا چل جائے گا۔ میں مبارک خان سے کہتا ہوں وہ صبح ہی اسے بلا لے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ بلا لیجئے گا لیکن پہلے ساری تسلی کر لیجیے گا۔“ آذر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

”اور گاڑی۔“

”گاڑی کا کام آپ برسوں پہ رہنے دیں ہو سکتا ہے کہ مجھے کل کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑے۔ البتہ میں

کل گاڑی کی بند کڑوا دوں گا۔“ آذر نے انہیں تسلی دی۔

”آذر بات سنو۔“

”جی ڈیڈ۔“

”اوسر آؤ۔“

”جی کہیے؟“

”اتنے دن ہو گئے تم نے کوئی بات نہیں بتائی؟ کیا بنا اس معاملے کا؟“ وقار آندھی قاریغ والے معاملے کا پوچھ

رہے تھے۔

”ڈیڈ! مجھے کوئی بات بتا چلتی تو میں بتاتا؟ فی الحال تو کوئی سراہا تھا نہیں آ رہا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”وہ دھڑکے جو خیر و بایا کو ہسپتال لے کر گئے تھے ان کا کچھ پتا چلا؟“ وقار آندھی نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ آذر ٹھٹک چکا تھا یہ بات تو اس نے چھپائی تھی ان سے۔

”کیا تم نہیں بتاؤ گے تو ہمارا دشمن بھی نہیں بتائے گا؟“ انہوں نے اپنے موبائل کی طرف اشارہ کیا یعنی وہی

سیس جان کے نمبر بھی آیا تھا۔

”اوہ۔“ اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔

”نہ ان لڑکوں کا پتا چلا ہے اور نہ ہی ہسپتال کے ریسپشن سے کال کرنے والے آدمی کا۔“ ان لڑکوں نے اپنا

نام دیتا غلط لکھوایا تھا۔ آذر اور و انیال اندر ہی اندر کافی بھاگ دوڑ کر چکے تھے لیکن ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں

ہوا تھا اور اب گزشتہ دو دن سے ہر طرف سکون ہی سکون نظر آ رہا تھا دو دن سے کوئی سیسج اور فون کال موصول

نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی اور ایکشن سامنے آیا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا تم زیادہ مینشن نہ لو اور آرام کرو۔“

”اوس کے گڈ نائٹ۔“ آذر ان کو گڈ نائٹ کہتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

”لگتا ہے زیرو میٹر ہے۔“ سامم نے پاس سے گزرتی لڑکی کو دیکھ کر خباثت سے کمنٹ پاس کیا تھا۔

”کیوں تو اچھے تر ہے کیا؟“ کامی نے آنکھ دبا کر کہا تھا۔

”یار اتنا تجربہ تو ہو ہی گیا ہے کہ گاڑی کو دیکھ کر ہی اس کی خوبی اور خامی کا پتا چل جاتا ہے۔“ سامم نے فخریہ بولا۔

”پھر تو تمہیں انجینئرنگ کی ڈگری ملنی چاہیے؟“ جووت اور کامی ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسے تھے۔

”میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔“ سامم نے مائیگی تھی۔

”چل کامی یار اسے جو توں کا ہار پہنا۔“ جووت نے شان بے نیازی سے کہا۔

”تیری تو۔“ سامم جووت کو مارنے کے لیے لپکا۔

”لوئے سامم رک ایک اور آئی ہے۔“ کامی نے دور سے آتی لڑکی کو دیکھ کر اشارہ کیا۔

”لوئے لو فر تجھے شرم نہیں آتی لڑکیوں کو تاڑتے ہوئے؟ گھر میں ماں ہمیں نہیں ہیں کیا؟“ وہ لڑکی قریب آچکی

تھی اس لیے کامی کی آواز سن چکی تھی جووت اور سامم یکدم اس کی اچانک درگت پہ منہ چھپاتے ہوئے اپنی ہنسی روکنے لگے۔

”میں نے تمہیں کب تاڑا ہے؟“ کامی نے حیرانی سے اور معصومیت سے پوچھا۔

”تو کیا اپنی اماں کو تاڑ رہے تھے؟“ وہ لڑکی خاصی مردار قسم کی لڑکی تھی وہ ان لڑکوں کو دیکھ کر ڈرنے پہنچوانی

نہیں تھی۔

”جووت سامم؟“ اس نے ان دونوں کو پکارا۔

”ہو نہہ الفتنے کہیں کے سزا ک چھاپ۔“ وہ ان تینوں پہ خونخوار سی نظر ڈالتی آگے بڑھ گئی تھی۔

”ہا ہا ہا ہا۔“ وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے اس کے دامیں بائیں آنکھڑے ہوئے تھے۔

”سامم یہ زیرو میٹر بھی یا سکیڈ پنڈ؟“ جووت نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو چلتا پھر تار آگتھی یار۔“ سامم نے شرارت سے کامی کو دیکھا وہ اپنا سر کھجا رہا تھا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ہر کام میں اپنا ایک اسٹینڈرڈ رکھنا چاہیے۔ جب ہمیں ہماری کلاس کی لڑکیاں ریلوے

میں بھی سجائی مل جاتی ہیں تو ہمیں ادھر ادھر منہ مارنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟“ جووت نے اس کو بھانڈا۔

”یار میں نے اسے کب چیخڑا تھا؟ میں نے اس سامم کو دعوت دی تھی۔“

”چل یار تم نے نہیں چیخڑا، لیکن وہ تو تمہیں چیخڑ گئی ہے نا؟“ جووت نے مذاق اڑایا۔

اتنے میں اس کا سیل بجنے لگا۔ پیٹ کی پچھلی پاکٹ سے سیل نکال کر دیکھا تو اس کی آٹھیں چمک اٹھی تھیں۔

”کس کا فون ہے؟“ سامم اور وہ کی نے بیک وقت پوچھا۔ جووت نے سیل ان کے سامنے کر دیا۔

”اوہو بیٹھے بیٹھے قسمت جاگ اٹھی ہے۔؟“

”ہیلو؟“ وہ کال اٹینڈ کرتے ہوئے بولا۔

”کہاں ہو؟“

”جہاں بھی ہوں تمہارے انتظار میں ہوں؟“ وہ لہجہ کو گہر جانتے ہوئے بولا۔

”انتظار ختم سمجھو۔“ وہ ہنسی تھی۔

”جی؟ جووت جکا۔“

”ہاں مجھے پک کرنے آجاؤ۔“ وہ تیار ہو گئی تھی۔

”اور پک کرنے کے بعد؟“ اس نے استفسار کیا۔

”جہاں تم لے جاؤ۔“

”جیسی رہو خوش رہو میں آ رہا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

سامم چالی کہاں ہے؟“ جووت بائیک پہ سوار ہوتے ہوئے بولا۔

”تمہاری پاکٹ میں۔“

”ارے میں یار میں فلیٹ کی چابی کا پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”تم اسے لے کر فلیٹ پہ جاؤ گے؟“

”نہیں میں اسے لے کر حویلی جاؤں گا۔“

”بکسی کسی لڑکی کو لے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔“ سامم نے گھورتے ہوئے چالی اس کے حوالے کی تھی۔

”تھینک یو۔“ اس نے کہتے ہوئے بائیک اشارت کی۔

”یار ہمیں اکیلے چھوڑ کے جا رہے ہو؟ ہمارا ٹائم کیسے گزرے گا؟ ہمیں بھی ساتھ لے جاتے؟“ کامی نے فریاد

کی جووت ہنساتھا۔

”ایک دو اور زیرو میٹر دیکھ لو۔“ اس نے چوٹ کی اور بائیک اڑالے گیا تھا۔ لیکن کامی کی آہیں اتنی پراثر

تھیں کہ وہ دل کی حسرتیں دل میں ہی لے کر رہ گیا تھا اسے آڈر کی کال آئی تھی۔

”کہاں ہو؟“ آڈر کا لہجہ سنجیدہ اور دو ٹوک تھا۔

”وہ شخص۔“ جووت نے بمشکل جواب دیا۔

”ہو بیس کیوں؟“

”وہ اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا۔“ اس نے بات بتائی۔

”دوست سے تم بعد میں مل لینا پہلے خیروبابا کے پاس ہسپتال پہنچو۔“

”کیوں خیریت؟“ جووت ٹھنکا۔

”ہاں خیریت ہی ہے، دراصل میں کام کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں اور مبارک خان کو ڈیڑے گھر بلوایا ہے

اس لیے خیروبابا کے پاس اور کوئی بھی نہیں ہے۔“

”اور وہ انیال بھائی؟“ جووت نے کسی امید کے تحت استفسار کیا۔

”کیا تمہیں پہلے ساری ڈیٹیلز دیکھا کرواؤں پھر تم آؤ گے؟“ آڈر کو غصہ آ گیا تھا۔

”سن۔ نہیں آپ ٹینشن نہ لیں میں آ رہا ہوں۔“ جووت کو مانتے ہی نہی۔

”میں ہسپتال میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔“ آڈر نے کہہ کر کال بند کر دی اور جووت کو بھر کے رہ گیا۔

”یہ نہ گئی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔“ وہ با آواز بلند کہتا اپنی بائیک اشارت کرتے ہوئے ہسپتال کے

لیے واپس مڑ گیا تھا اور اگلے چند منٹوں میں وہ ہسپتال میں آڈر کے سامنے کھڑا تھا۔

”تم نے شام تک ہسپتال میں خیروبابا کے پاس رہنا ہے۔“

”اور شام کے بعد؟“ جووت اپنی عادت کے مطابق بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”شٹ اپ۔ میں تم سے کوئی ہنسی مذاق نہیں کر رہا کہ تمہیں اس وقت بھی شرارت سوجھ رہی ہے؟ خیروبابا کی

حفاظت اور تمار داری ہمارا فرض بنتا ہے ان کی یہ حالت ہماری وجہ سے ہوئی ہے ان کی ذاتی کوئی دشمنی نہیں گئی

کسی سے ایک دن کی ذمہ داری نہیں نبھاسکتے تم؟ شرم آئی چاہیے تمہیں۔“ آڈر کا غصہ عود کے آیا تھا۔ جووت

کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

”میرا سوری بھائی۔“

”ہو بہو! سوری۔“

”بس یونہی منہ سے نکل گیا! میری سوری۔“

”اپنا منہ بند رکھا کرو۔“ آذر نے وجہ اور بات بے بہات غصہ نہیں کرتا تھا لیکن جب کرتا تھا تو۔

”میں شام تک نہیں بلکہ کل میرے آنے تک بیٹھ رہو گے اور خیر و بایا کا ہر طرح سے خیال رکھو گے، کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“ آذر نے اسے سزا کے ساتھ ساتھ وارننگ بھی دی تھی۔

”آپ جب تک کہیں گے میں بیٹھ رہوں گا۔“ وہ سوہن سے انداز میں بولا تھا۔

”ٹھیک ہے، یہ رکھ لو، کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ آذر نے اپنے والٹ سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اسے تمھاری اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ جو دت پیسوں کو دیکھتا رہا اس کا انہا والٹ پیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے بھلا ان پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن آذر اس سے بڑا تھا اس کا فرض تھا کہ وہ ہر چیز کا دھیان رکھتا، سو اس نے یہی کیا تھا۔ جو دت سر جھٹک کر اندر خیر و بایا کے پاس آ گیا وہ وہاں کے زیر اثر سو رہے تھے۔

آج کا دن منصور حسین کے لیے بہت ہی مبارک دن تھا شاید؟ وہ پی سی او سے مبارک خان کو فون کرنے آیا تھا اور جیسے ہی مبارک خان نے اس کی آواز سنی فوراً خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”اے منصور حسین توجلدی حویلی پہنچ میں تجھے کب سے فون کر رہا ہوں مگر تیرا نمبر ہی نہ تھا۔“ مبارک خان کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ منصور حسین نے اپنا موبائل بیچ دیا ہے۔

”کیا میرے لیے کام مل گیا؟“ منصور حسین کے لہجے میں بھی خوشی پور آئی تھی۔

”جھومل گیا ہے بس ایک بار صاحب سے ملنا ضروری ہے۔“

”ارے میں مل تو چکا ہوں تیرے صاحب سے؟“

”منصور حسین وہ ملنا اور تمھاری ملنا اور ہے۔“

”کیوں کیا اب میری ان سے رشتہ داری ہونے والی ہے؟“

”ف یار منصور حسین ایک تو تیری زبان بھی تلوار ہے تلوار ہمیں کاٹ دینے کو تیار۔“ مبارک خان سر پیٹ کے بولا تھا۔

”تو کام کا بند ہے، تجھے نہیں کاٹے گی۔“ منصور حسین نے اسے تسلی دی۔

”اچھا چھوڑ اس بات کو تو یہ بتا حویلی کب پہنچ رہا ہے؟“ مبارک خان سارا کام جلدی جلدی بتایا چاہتا تھا اس کی یہی کوشش تھی کہ منصور حسین کو جیسا بھی سہی بس کام مل جائے۔

”تو فون رکھ میں ابھی پہنچا۔“ اس نے فون بند کر دیا اور پھر حویلی کی طرف چل پڑا تھا ایک اسٹاپ تک اسے رکشا کا سہارا لینا پڑا پانی رستہ اس نے پیدل طے کیا تھا اور جب وہ بڑی حویلی کے سامنے پہنچا اس کی پیشانی سے مینے کے قطرے گزر رہے تھے۔

”لوئے خانماں خراب تو پھر آیا ہے؟“ عارف نے اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

”آیا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں۔“ اس نے چہرہ کر جواب دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے؟“

”مطلب اپنے صاحب سے بوجھ۔“

”صاحب نے بلایا ہے؟“ عارف کو حیرت ہوئی۔

”پہلے ایک گلاس پانی پلاؤ پھر بتا ہوں۔“ وہ آج پھر عارف کی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

”دیکھ منصور حسین تیری وجہ سے ہمیں بھی ڈانٹ پڑتی ہے اس روز آذر صاحب بھی خفا ہو رہے تھے تو بس یہاں سے۔“ عارف نے بے مروتی دکھائی۔

”آج تو یہاں سے نکلنے سے پہلے یا تو مر کے جاؤں گا یا پھر مار کے۔“ منصور حسین آج مرنے مارنے پہل گیا تھا۔

”یار بڑا ظالم انسان ہے تو۔“ عارف نے اسے کھورا۔

”ظالموں کے ساتھ ظالم ہونا ہی پڑتا ہے۔“ اس نے عارف کو خوشخوار نظروں سے دیکھا۔

”اے یار یہ لوپانی ہو اور جان چھوڑو۔“ عارف نے اسے پانی کا گلاس تھمایا۔

”شکریہ۔“ اس نے گلاس فوراً خالی کر دیا تھا۔

”اب اندر اطلاع کرو کہ منصور حسین آیا ہے۔“ اس نے نیا حکم جاری کیا۔

”لیکن۔۔۔“

”جو کام کہا ہے وہ کرو۔“ اس نے عارف کو ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”مگر تاہوں۔“ اس نے اندر اثر کام سے اطلاع کر دی تھی۔

”آہ اندر پہنچو۔“ مبارک خان کی طرف سے اجازت ملی۔

”تم اندر جا سکتے ہو۔“ عارف نے اشارہ کیا۔

”بس شکریہ۔“ منصور حسین مسکرا کر کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور اس جنت نما حویلی میں قدم رکھتے ہی اس کی مجال بچھ اور ہو گئی تھی وہ اتنی بڑی حویلی کو جیسے مگر ٹکڑو دیکھ رہا تھا۔

”ادھر آ جاؤ صاحب مروان خانے میں ہیں۔“ مبارک خان سامنے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا وہ اسے اپنے ساتھ لے کر مروان خانے میں داخل ہوا تھا۔

ادارہ خواجین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مرقعہ

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

خوبصورت مہمانی

- ☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 450 روپے
- ☆ درو کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 500 روپے
- ☆ اے وقت گواہی دے، راحت جمیل قیمت: 400 روپے
- ☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 250 روپے
- ☆ امرنیل، عمیرہ احمد قیمت: 550 روپے

مکتبہ علامہ عثمان ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

۴ سلام علیکم صاحب۔ منصور حسین نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔
”و علیکم السلام“ آؤ بیٹھو یہاں۔ وقار آندی اس کی آواز پہ چونکے تھے اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے
اخبار رول کر کے سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔
”جی! میں نہیں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بیٹھنے کی بجائے کھڑے رہنے کو ترجیح دی تھی۔
”آئی دیر کہاں کھڑے رہو گے؟ بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
”جی شکریہ۔“ منصور حسین کو بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

”کیا نام بتایا تھا تم نے؟“
”منصور حسین۔“
”تعلیم کتنی ہے؟“
”میرنگ فیل۔“ اس نے کھرا جواب دیا۔
”کرتے کیا ہو؟“
”ٹوکری تلاش۔“
”اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟“
”اس کے علاوہ فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”کتنے عرصے سے بے روزگار ہو؟“ وقار آندی ایک ایک بات پوچھ رہے تھے۔
”جتنے عرصے سے آپ کی حویلی کے چکر کاٹ رہا ہوں۔“ اس کے نئے نئے سے جوابات پہ وقار آندی نے
مبارک خان کی طرف دیکھا تھا جو اباً مبارک خان نے انہیں تسلی رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔
”رہتے کہاں ہو؟“

”یہیں لاہور میں رہتا ہوں۔“ اس نے پتہ بتایا۔
”کیا کام کر سکتے ہو؟ اگر تمہیں کوئی بڑی ذمہ داری سونپی جائے تو؟“
”ذمہ داری بھرا کر دکھاؤں گا صاحب! شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔
”ڈرائیونگ کر لیتے ہو؟“

”جی صاحب! آٹھویں بند کر کے ڈرائیونگ کرنے کا نہیں گے تو وہ بھی کر لوں گا! جو عرصہ ایک ڈرائیور کے ساتھ
واسطہ رہا ہے۔“ اس نے ان کی تسلی کرائی۔
”ڈرائیونگ سیکھنا سیکھنا ہے تمہارے پاس؟“
”صاحب ہر چیز کلاسٹنس ہے آپ سیکھیں تو سہی۔“ اس نے سب سے ٹھیک سے کہا۔

”ہوں یہ تو اچھی بات ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تمہارا ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ایک گارڈ کے فرائض بھی سر
انجام دو۔ تمہیں ہمہ وقت ہماری بیٹی کے ساتھ رہنا ہو گا اس کی حفاظت کرنی ہوگی اور اس کے لیے تمہیں اپنے
ساتھ ریوالتور بھی رکھنا پڑے گا۔“ وقار آندی نے اپنی گود میں رکھا ریوالتور اٹھا کر سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ منصور
حسین نے چونک کر وقار آندی اور پھر مبارک خان کو دیکھا تھا۔

”یہ کیسی ٹوکری مل رہی تھی اسے؟“ اس کی نظر ریوالتور پہ آکر ٹھہری تھی!!!
وہ کافی گہری میڈ سور ہی تھی جب کسی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل پہ رنگ ہونے لگی تھی اور اس کی گہری نیند

کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا اور پھر یکدم چونک کر اٹھ بیٹھی تھی پاکستان سے بی بی
جان کی کال تھی۔

”سلام علیکم۔“ کال ریسیو کرتے ہی سلام کرنے کی عادت بھی اس نے کسی خاص بندے سے سیکھی تھی۔
”و علیکم السلام بیٹا کیسی ہو؟“ بی بی جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”میں ٹھیک ہوں بی بی جان آپ کیسی ہیں؟ اور بابا کیسی ہیں؟“ وہ نیند سے اٹھتے ہی اپنی ماں کی آواز سن کر خوش
ہو گئی تھی۔

”میرے بیٹے کو بڑی جلدی خیال آگیا ہے اپنی ماں اور اپنے بابا کا حال پوچھنے کا؟“ ان کی متنا شکوہ کر بیٹھی۔
”ایم سو ری بی بی جان دراصل کج کل انگریزوں کی بہت زیادہ مصروفیت ہے، لیکن آج سڑے تھا میں رات کو
ارادہ کر کے سوئی تھی کہ صبح اٹھ کر کب کو کال منور کروں گی، آئی سو ری بی بی جان میں کج آپ کو کال کرنے والی
تھی۔“ اس نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ہاں! بیٹا اب ماں بابا کی اہمیت رہ گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں، آگے بچھڑے کے دنوں
میں تو انہیں ٹائم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پہ زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ
ہو گئی۔

”خیر جہاں بیٹا تمہیں پتا ہے؟“ وہ اس کی شرمندگی بھانپتے ہوئے بات ہی بدل گئی تھی۔
”اٹھنے کا شکریہ ہے، وہ بھی ٹھیک ہیں آپ کی بات کرواؤں ان سے؟“ زری نے آہستگی سے پوچھا۔
”نہیں؟“
”بی بی جان؟“

”کیونکہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے نمبر پہ فون کیا تھا وہ ابھی سو رہا ہے اس کی بیوی نے فون اٹھایا
تھا۔“

”اس کی بیوی آپ کی بہو ہوتی ہے بی بی جان۔“ زری نے باور کروایا تھا۔
”کیسی بہو؟“ انہوں نے تعجب سے کہا۔
”وہ کبھی نہ سنی نہ ہی کوئی بات کی ہمارا تو اس سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔“ بی بی جان کے لہجے سے ان
کی غلطی اور ناراضی نمایاں تھی اور زری جانتی تھی کہ یہ سب کیوں ہے؟ اور کب تک ہے؟

”بی بی جان کسی سے کوئی واسطہ بناتا ہے کیوں کسی سے طے بغیر غلط اندازے لگانے سے تو نہیں بناتا؟“
زری نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
”ہاں جب سے تجھے انگلینڈ کی ہوا لگی ہے، تجھے اپنی ماں کے اندازے بھی غلط لگنے لگے ہیں۔“ ان کے انداز کی
غلطی ہنوز تھی اور زری ان کی مصوم سی بات پہ مسکرا دی تھی۔

”انگلینڈ میں بندے کو ہوا نہیں لگتی۔ یا تو برف لگتی ہے یا بارش۔“ اس نے بی بی جان کو چھیڑا تھا۔
”بس بس مجھے بھلائے بھلائے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اپنے لہجے میں جھنجھالی لاتے ہوئے بولیں۔
”میرے بی بی جان میں کیوں آپ کو بھلانے لگی؟ آپ یہ بتائیں کہ باقی سب کیسے ہیں؟ کوئی گاؤں کی نئی
ٹماہی؟“ زری مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی اسے پتا تھا کہ ابھی وہ بھل بھی جائیں گی۔
”باقی سب بھی ٹھیک ہیں اور گاؤں میں تو آئے روز نئی ٹماہی ہوتی ہی رہتی ہے کسی کے گھر خوشی اور کسی کے گھر
نئی۔“ وہ بات کرتے کرتے آہ بھر کے بولی تھیں۔

”کیوں بی بی جان خیریت تو ہے نا؟“ زری کو ان کے لہجے میں افسردگی کی جھلک نظر آئی تھی۔
 ”بس بیٹا زمانہ ہی ایسا آیا ہے اب تو اپنی ہی بیٹیوں سے خوف آنے لگا ہے۔“ وہ واقعی اندر سے ڈری ہوئی لگ رہی تھیں۔

”ہوا کیا ہے؟“ زری کو بے چینی ہوئی۔
 ”ہوٹا کیا ہے بیٹا؟“ زری نے زہریلی گولیاں کھا کر خود کشی کر لی ہے چار بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی اب چاروں بھائی بھی بیٹھے رو رہے ہیں اور ماں باپ بھی۔“ زری نے سوچا کہ کیا نام تھا اس کا ہاں یاد آیا، لیکن نام تھا۔ زری نے ذہن پہ زور ڈالا اور سب یاد آ گیا تھا۔

”لیکن بی بی جان زلیخا تو بہت اچھی لڑکی تھی بہت سلجھی ہوئی اور عقل مند تھی۔“ زری کے دل کی اسکرین پہ زلیخا کا خاکہ نمودار ہو چکا تھا وہ زری کی ہم عمر ہی تھی اور کئی بار زری سے ملنے حویلی بھی آئی تھی۔
 ”بیٹا یہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا؟ سب سے پہلے ہندے کی عقل ہی تو مارتی ہے اور رفتہ رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے۔“ زری نے زلیخا کو کھانسی سے روکا اور کہا کہ ”بھئی گھر والوں کی خاطر کسی ان چاہے کی ڈولی میں بیٹھ کر بس فرق اتنا ہے کہ زلیخا نے کسی کی ڈولی میں بیٹھنے والی خود کشی نہیں کی بلکہ گولیاں کھا کر خود کشی کر لی ہے۔“ بی بی جان کی بات زری کے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔

”لیکن بی بی جان زلیخا کی مطلقاً تو اس کے بچا کے بیٹے کے ساتھ ہو چکی تھی نا۔“ زری کو اک اک بات یاد آ رہی تھی۔
 ”بیٹا جس کے ساتھ ملتی ہوئی تھی اس کے ساتھ محبت نہیں ہوئی اور جس کے ساتھ محبت ہوئی تھی اس کے ساتھ ملتی نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ نہ ملتی کی ڈولی میں بیٹھی اور نہ محبت کی ڈولی میں۔“ بی بی جان بتاتے ہوئے افسردہ ہو رہی تھیں۔

”اس کے گھر والوں کو اس کی محبت کا پتا تھا۔“
 ”سب پتا تھا ماں باپ کو بھی اور بھائیوں کو بھی، لیکن سب کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے بیاہ کر ہی رہیں گے اور وہ بھی انہی کی اولاد بھی اس کی بھی ایک ہی ضد تھی یا ڈولی یا جنازہ۔ آج اس کا جنازہ نہ اٹھتا تو ڈولی اٹھتی تھی۔ آخر کسی ایک کی ضد تو پوری ہوئی ہی تھی اپنی بات کے لیے بھی تھے اور آج بھی پورے ہیں ہنسا نہیں اپنی پار پہ رو رہے ہیں کہ اس کی جیت ہے۔ کیا ہوتا اگر مان جاتے؟ کونج کی طرح کرا لاتی پھری تھی ان کے سامنے بڑی کوئی بھی تو نہیں مانا تھا۔ اب نہ ماننے کا نام کر بھی رہے ہیں تو اس تنٹولی کے کس کام کا؟“ بی بی جان نے بے دل کے پچھو لے پھوڑتی تھیں اور زری چپ سا دھسے سب سن رہی تھی۔

”بس بیٹا اپنی چیزوں سے ڈر لگتا ہے اور اللہ سے دعا کرتی ہوں جیسے پہلے ایک بچی کے فرض سے فارغ کیا ہے اب دوسری بچی کے فرض سے بھی فارغ کرونا زمانہ بڑا ظالم ہے، اب کیا ہو جائے کچھ پتا نہیں چلتا۔“ وہ زری کے لیے دعا کر رہی تھیں۔ زری کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔
 ”زری۔“ انہوں نے اس کی چپ محسوس کرتے ہوئے پکارا تھا۔

”بی بی جان؟“
 ”چپ کیوں ہو گئی ہو؟“
 ”زلیخا کو سوچ رہی تھی۔“
 ”چھوڑ بیٹا ایسی باتوں کو دل پہ نہیں لیتے۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”دل کی باتوں کو دل پہ نہ لیں زلیخا کیسے کریں؟ آج محبت کے قبیلے کا ایک فرد مر گیا تو کیا اس کا افسوس بھی نہ

کریں؟“ زری کے لہجے میں اسی طرحی تھی بی بی جان کو خود زلیخا کی موت پہ بے پروا دکھ اور افسوس تھا اس لیے مزید بکھنڈہ کہا۔
 ”بی بی جان کیا محبت اتنی ہی نامراد ہوتی ہے؟“ اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔
 ”نامراد ہوتی ہے بھی تو ہندے کو قبر میں لے جاتی ہے، چاہے سوئی ہو یا بے ماہیوال، یہ کسی کو بھی نہیں دیکھتی نہ چڑھتی جو الٹی نہ کالے بال نہ گوری رنگت نہ سرخ ہونٹ، بس سارا کچھ مٹی میں لے جاتی ہے اور پیچھے تم اور ماتم چھوڑ جاتی ہے یا پھر اپنا نام۔“ بی بی جان تو آج نہ جانے محبت کے کون سے بچے اور بچڑے سے تلی ہوئی تھیں۔ اور زری کا تو خود محبت کے قبیلے سے تعلق تھا وہ بھلا کیا کر سکتی تھی محبت کے خلاف تو بالکل بھی نہیں!

بی بی جان نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا لیکن زری کا دھیان پھر بھی نہیں ہٹا وہ مسلسل زلیخا کے متعلق اور بی بی جان کی باتوں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔
 ”بی بی جان آپ کی بیٹی بھی محبت کی بیماری سے لگا بیٹھی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے کون سی خود کشی کرنی ہے؟“ وہ خود کھلائی کے سے انداز میں بولی تھی۔ اور اٹھ کر باہر نکل آئی۔ لیکن سے برتوں کی کھڑکی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نگار ش اٹھ چکی تھی شاید!

”گڈ مارننگ بھائی۔“ زری نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 ”گڈ مارننگ سوٹ ہارٹ۔“ نگار ش نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے زری کا گال چھوا تھا۔
 ”اب بھائی۔“ زری کسمنائی۔

”کیوں؟“
 ”مٹے ٹھنڈے ہاتھ ہیں آپ کے۔“ اس نے اپنے گال کو سسلا یا۔
 ”اب میں گرم ہاتھ کہاں سے لاؤں؟“ نگار ش کے انداز میں شرارت تھی۔ لیکن زری نے ان کی شرارت پہ کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔
 ”گیا بات ہے زری؟“ نگار ش نے آنچ دیھی کرتے ہوئے پوچھا وہ آلیٹ بنا رہی تھی۔
 ”کچھ نہیں بھائی۔“ زری آگے بڑھ کے اپنے لیے چائے بنانے لگی۔
 ”زری۔“ نگار ش نے اس کے ہاتھ سے ٹی۔ کچھ کا پیکٹ تھام لیا تھا وہ سہوٹ چائے بنا رہی تھی۔
 ”جی بھائی؟“
 ”بات کیا ہے؟“
 ”بی بی جان کا فون آیا تھا۔“
 ”پھر؟“

”گاؤں کے ڈیو موچی کی بیٹی زلیخا نے آج خود کشی کر لی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی آواز جیسے لرز رہی تھی۔
 ”کیوں؟“ اس نے خود کشی کیوں کی ہے؟“ نگار ش کو پریشانی ہوئی تھی۔
 ”ہو ان لڑکی خود کشی کیوں کرتی ہے؟“ انہوں نے نگار ش سے سوال کیا تھا۔
 ”یعنی محبت کی وجہ سے؟“ نگار ش سمجھ گئی تھی۔
 ”ہاں ایک اور نسل محبت کے سر۔“ زری نے بولی۔

”یہ غلط ہے زری ایسا نہیں کرنا چاہیے ان لڑکوں کو اپنی زندگی کے متعلق سوچنا چاہیے یہ حرام موت ہے، کیا حاصل ہوتا ہے ایسا کر کے؟“ نگار ش نے مخالفت کی تھی۔
 ”بی بی جان بتا رہی تھیں کہ یہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا سب سے پہلے ہندے کی عقل ہی کو مارتی ہے اور رفتہ

رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے، آپ خود سوچیں جس بندے کی عقل ہی مر جاتی ہے وہ اپنی زندگی کے متعلق کیسے سوچ سکتا ہے؟ اسے کیسے احساس ہو سکتا ہے کہ یہ حرام موت ہے؟ وہ تو حاصل اور لاحق حاصل کی فکر سے بھی بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے؟ زری نے بھی دل کے پھپھو لے پھوڑے تھے۔

”بس پھر بھی کیوں گی کہ یہ سب غلط ہے غلط کیا ہے اس لڑکی نے۔“ نگارش نے مر جھکا۔

”دعا کیجئے بھابھی یہ غلط کام آپ کی زری کو نہ کرنا پڑے۔“ زری ان کے ہاتھ سے پکٹ لے کر دوبارہ چائے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”بالکل ہو گئی ہو تم؟“ نگارش کو شاک لگا تھا۔

”تمہیں مر جائے تو بندہ پاگل ہی ہو جاتا ہے غالباً۔“

”اسٹاپ اس آئندہ ایسے بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“

نگارش نے اسے جھڑکا۔

”ڈونٹ ڈری بھابھی ابھی اس محبت کے ور سے اتنی مایوس نہیں ہوں میں ابھی امید باقی ہے اس باقی ہے دعا کیجئے محبت میں میرا مقدر بھی آپ جیسا ہی ہو جو چاہا وہ پالیا۔“ اس نے نگارش کے ہاتھ تھام کے کہا تھا اور نگارش اپنی گہری نظروں سے زری کے چہرے کو کھوجنے لگی تھی۔

”بات کروں تمہارے بھائی سے؟“

”کیسی بات؟“

”تمہارے رشتے کی تمہاری شادی کی۔“

”مگر اس میں بھائی بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ اور جو کر سکتا ہے وہ تو اتنی دور بیٹھا ہے، لا تعلق اور انجان، کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں آیا اسے۔“ زری کے لبوں پہ شکوہ چل گیا تھا۔

”ان شاء اللہ اسے ہی خیال آئے گا بس ہمارے پاکستان جانے کی دیر ہے سارے خیال وہی کرے گا۔“ نگارش نے اسے تسلی دے کر ہلایا۔

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ وہ گہری سانس کھینچ کے بولی تھی۔

”آمین مدحیہ کی کوئی کال وغیرہ آئی۔“ فریڈے کو وہ لوگ گئے تھے اتنے دن ہو رہے ہیں؟

”نہیں مدحیہ کی تو نہیں نیل اور فائزہ آئی کی کال آئی تھی عبد اللہ بھائی بتا رہے تھے۔“

”مدحیہ نے کیوں نہیں کی؟“

”اس کے پاس اپنا ذاتی نمبر نہیں ہے اس لیے۔“

”اوہ اچھا۔“ نگارش اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اور زری بھی ان کے قریب بیٹھی چائے کا کپ تھامے باتوں میں مشغول ہو گئی تھی۔

”وائٹ سٹی چلو گی۔“ نگارش نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”بہتر شاپنگ کرنے، آج تم فارغ ہونا؟“

”نہیں بھابھی آج موڈ نہیں ہے۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”موڈ کہاں ہے؟“

”اپنے گاؤں کے دنو موچی کے گھر میں۔“ اس کے جواب پہ نگارش جو کی اور پھر چپ ہو گئی تھی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ زری کا پورا دن اب اسی بات کے زیر اثر اس اور افسرہ گزرے گا وہ چاہے کچھ بھی کرے۔

وہ نماز پڑھ کے چپ چاپ چھت پہ آئی تھی اور اکیلی ہی چھت پہ ٹھلنے لگی۔ ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے تنہائی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تو ہاتھ نہ ٹھک گئی تو چھت پہ رکھی جا رہی تھی لیٹ گئی اور نظر آسمان کے نظاریوں سے جا بھی تھی۔ آسمان کا کشادہ سینہ روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس سینے سے چاند کی سورت غائب تھی۔

”اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ باقی ہر چیز کو بے فکر کیں بنا دیا ہے؟“ وہ ستاروں کی ٹٹماتی روشنی دیکھ کر سوچنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

”چاند رات کو بے فکری سے نکلتا اور دن چڑھنے سے پہلے غائب ہو جاتا ہے۔ سورج دن کو بے فکری سے طلوع ہوتا اور شام کو ڈوب جاتا ہے نہ کوئی ٹھکراؤ کوئی جھجکتا بس ایک سی لگی بندھی روٹین۔ لیکن انسان کا ہر دن پہلے دن سے مختلف ہوتا ہے اور ہر رات بھی رات ہوتی ہے نئی فکریں اور نئی سوچیں لے کر۔ انسان ہر روز نیا کان ہوتا رہتا تھا اور باقی ساری کامیابیوں کا سہارا بے فکر رہتی ہے۔“ وہ ستاروں کو دیکھتے ہوئے نجانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی کہ نیچے ان کے دروازے پر دستک ہو گئی۔

”کون ہے؟“ یہ آواز ایمن کی تھی۔

”دروازہ کھولو۔“ باہر سے عدیل کی آواز سنائی دی۔

”بھائی آگے بھائی آگے۔“ سونیا اور عدیلہ اندر سے بھاگتی ہوئی نکلی تھیں ایمن نے دروازہ کھول دیا تھا اور جیسے ہی عدیل اندر داخل ہوا وہ دونوں اس سے لپٹ گئیں وہ دونوں پھولی جو تھیں۔

”کیسی ہو میری جان۔“ عدیل ان کے بال سلالتے ہوئے بولا۔ ایمن اس کے ہاتھ سے شاپر وغیرہ تھام چکی تھی۔

”آپ کیا لے کر آئے ہیں بھائی؟“ ان دونوں نے اشتیاق سے پوچھا اور عدیل ان کی مصومیت پہ مسکرا دیا۔

”تم لوگوں کے لیے کھانے کی چیزیں لے کر آیا ہوں میری جان، مریم سے کہو کہ تمہیں ہلینوں میں نکال دے۔“ اس نے سونیا کا سر تھکا۔

”میں نکال لاتی ہوں۔“ ایمن نے کچن۔ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ مریم کہاں ہے؟“ عدیل چونکا اب وہ بھی مریم کی غیر موجودگی کو ٹس کر چکا تھا۔

”وہ تو شاید اوپر چھت پہ ہیں۔“

”کیوں؟“

”بس ایسے ہی نماز پڑھی تو اوپر چلی گئی۔“

مریم نے قریب آتے ہوئے جواب دیا وہ نیچے اتر آئی تھی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

عدیل کو اپنی جنتی بہن کی طرف سے فکر ہوئی تھی۔

”جی بالکل ٹھیک ہوں دن میں شاید کپڑے دھوتی رہی ہوں اس لیے تھکن ہو گئی ہے۔“

”چھا! کیا تمہیں بھی تھکن ہوئی ہے؟“ عدیل نے خفگی سے کہا تھا وہ جانتا تھا کہ مریم دن بھر کاموں میں مصروف رہ کر اپنی فراغت کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

”پر قسمتی سے انسان ہی ہوں، تھکن ہو بھی سکتی ہے۔“ وہ منہ بنا کر کہتی ایمن سے شاپر وغیرہ تھام کے کچن کی

طرف بروھی۔

”آج اتنی تو طبیعت کس لیے؟ خیر تو ہے؟“ عدیل کے بغیر نہ رہ سکا۔
”خیر ہی ہے آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے سر جھٹک کر کہا۔

”یہ وائٹ ڈالا شاپر تم رکھ لو تمہارے لیے ہے۔“ اس نے مریم کو اشارہ کیا وہ ہاتھ میں پکڑے شاپر زمین سے وائٹ شاپر دیکھنے لگی۔

”بھی رہنے دو بعد میں دیکھ لینا۔“ عدیل کا اشارہ وہ سمجھ گئی تھی لیکن اندر سے حیران بھی ہوئی تھی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ وہ سب کے سامنے دیکھنے سے منع کر رہا ہے؟ پھر عدیل امی ابو کی طرف آ گیا اور مریم ان سب کو فروٹ چاٹ وغیرہ ہلہلوں میں نکال کر دینے لگی۔ اور کافی دیر بعد کمرے میں آئی تو عدیل بھی آ گیا۔
”یہ کیا ہے بھائی؟“ بالا خراس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”تمہارے لیے سوٹ ہے۔“ گوجرا نوالہ میں کپڑوں کی بہت اچھی ورائٹی تھی اور کافی سستے بھی تھے یہ سوٹ پونہمی تمہارے لیے پسند کر لیا سوچا اگر دوبارہ آتا ہوا تو امین اور عدینہ وغیرہ کے لیے لے کر آؤں گا۔“ عدیل اپنی کہہ رہا تھا اور مریم اپنی سوچ رہی تھی اس کے سامنے انتہائی نفیس سا شیفون کا سوٹ تھا اور دھیان فاطمہ کی برتھ ڈے کی طرف تھا دل جو تو ذکر کرنے میں لگا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے پسند نہیں آیا؟“ عدیل نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں۔ نہیں بھائی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بہت خوبصورت سوٹ ہے تھینک یو سوچ۔“ مریم کے دلخ پہ برکھی سوچوں کا بوجھ قدرے کم ہو گیا تھا اور عدیل بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہو گیا تھا پھر اس کا سر پھٹکتے ہوئے منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔



”ریو الوور؟“

”ہاں یہ ریو الوور تم رکھو گے۔“ وقار آندھی نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”لیکن صاحب اس کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ منصور حسین ناگجھی سے پوچھ رہا تھا۔
”اس کو رکھنے کی ہی تو ضرورت ہے اور اگر ڈیوٹی کے وقت تمہیں علیحدے کی گاڑی کے ہمراہ اس کوئی بھی مشکوک آدمی نظر آئے اسے گولی مار دینا۔“ انہوں نے اسے اجازت دی تھی۔

”واقعی گولی ماروں؟“ وہ حیرت سے دوہرا کر بولا تھا۔

”ہاں بھائی گولی مار دینا۔“ وہ بھی زور دے کر بولے تھے۔

”مگر کوئی مر گیا تو؟“

”تو مر جائے تو دشمن کے ساتھ رعایت کرنا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنے کے برابر ہوتا ہے۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں بھی اسی بات کا قائل ہوں کوئی رعایت نہیں کوئی گنجائش نہیں۔“ منصور حسین نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”مجھے اپنی بیٹی کی زندگی سے زیادہ کوئی زندگی عزیز نہیں۔“ وقار آندھی کے چہرے پر سختی اتر آئی تھی۔ منصور حسین اور مبارک خان ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

”ریو الوور چلا سکتے ہو؟“

”چلا کر دکھاؤں؟“ اس نے ہاتھ جمع کر ٹیبل پہ رکھا ریو الوور اٹھا لیا تھا اور پھر ریو الوور کی نال میں ہلکی سی پھونک

ماری تھی۔

”نہیں یہاں نہیں، حویلی میں خاتکی آواز سے سب پریشان ہو جائیں گے۔“ انہوں نے منع کر دیا۔
”نشانیہ کیسا ہے؟“

”جب ریو الوور چلاؤں گا نہیں تو میرے نشانے کا پتا کیسے چلے گا؟“ منصور حسین نے سبے دلی سے کہا تھا۔
”اسے کلا لائنس ہے؟“ انہوں نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔

”جی صاحب ہے تو سسی پر رہنمو کروالے والا ہے۔“

”تو کروادو؟“ امی چند دنوں میں تو ضرورت ہے۔“

”کروالوں گا سر، لیکن پاس لائنس کی فیس بھرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں ابھی۔“ اس نے اصل مسئلہ بیان کیا تھا۔

”ڈونٹ وری مبارک خان تمہارے ساتھ جائے گا اور سارا کام کروادے گا۔ مبارک خان نے اپنا لائنس بھی رہنمو کروانا ہے شاید؟“ وقار آندھی نے مبارک خان کی سمت دیکھا۔

”جی صاحب میں نے بھی آج اور کل میں ہی کروانا ہے۔“ مبارک خان نے فوراً تائید کی تھی۔

”تو ٹھیک ہے پھر منصور حسین کو بھی ساتھ لے جانا۔“

”جی لے جاؤں گا۔“

”تمہارا آئی ڈی کارڈ کہاں ہے؟“

”صاحب صاحب صاحب۔“ منصور حسین نے جیب سے شناختی کارڈ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا وہ اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔

”صاحب اس کے پاس موبائل بھی نہیں ہے ہم اس سے رابطہ کیسے کریں گے؟“ مبارک خان نے گئے ہاتھوں ایک اور کمی بیان کی تھی۔

”وہ بریف کیسے اٹھا کر ادھر رکھو۔“ وقار آندھی نے کاؤچ پہ رکھے بریف کیس کی سمت اشارہ کیا تھا مبارک خان نے بریف کیس اٹھا کر ان کے سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا انہوں نے بریف کیس کا پاس ورڈ پریس کیا اور لاگ اوپن کر لیا تھا پھر ایک موبائل سیٹ بعد چارجر کے نکال کر منصور حسین کے سامنے رکھا۔

”یہ موبائل تمہارے لیے ہے اسے تم رکھو گے، سیم کارڈ ہم خود ایشو کروا کے دیں گے اور ہاں موبائل چوبیس گھنٹے آن رہنا چاہیے، فیل چارجر، فیل سگنل، فیل کریڈٹ، کسی چیز میں بھی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔“ انہوں نے دو ٹوک سمجھایا تھا۔

”ان شاء اللہ صاحب کوئی کمی نہیں آئے گی، موبائل ہی نہیں میں خود بھی چوبیس گھنٹے آن رہوں گا۔“ اس نے وقار آندھی کو تسلی دی تھی۔

”مبارک خان سوٹ کو اور نر صاف کروادے گا تم وہاں شفٹ ہو جانا اپنا کوئی سلمان لانا چاہتے ہو تو وہ بھی لے آتا۔“ وقار آندھی فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے بریف کیس بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔

”تو کری پکی ہے نا صاحب؟“ منصور حسین نے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔

”ان شاء اللہ۔“ انہوں نے بھی اسے تسلی دی تھی اور وہاں سے چلے گئے تھے۔ منصور حسین اور مبارک خان پیچھے اکیلے رہ گئے۔

”شکر یہ مبارک خان۔“ منصور حسین اس کا مشکور ہوا۔

”کس بات کا؟“

”نوکری دلانے کا۔“

”نہیں منصور حسین نوکری تم نے خود اپنے بل بوتے ہی ہے ورنہ صاحب کہاں اتنا دھیان رکھنے والے تھے تم نے ہمت نہیں ہاری بار بار دروازے پہ آتے رہے۔“ گرج مبارک خان بھی بڑا خوش ہو رہا تھا چلو ایک غریب کا تو بھلا ہوا نا؟

”ضرورت مجھے تھی میں نے بار بار آنا تو تھا ہی؟“ منصور حسین نے خوشی اور افسردگی کے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

”چلو تمہیں چھوڑ آؤں۔ مبارک خان نے اشارہ کیا۔

”کہاں؟“

”تمہارے گھر۔“

”آج یہ عنایت کیوں؟“

”آج تم حویلی کے ملازموں کی لسٹ میں شامل ہو چکے ہو اس لیے۔“ مبارک خان نے مسکرا کے کہا تھا۔

”بڑے خود غرض ہو؟“ منصور حسین نے گھور کے کہا۔

”کام میں خود غرض ہونا ہی پڑتا ہے۔“

”چلو یہ تو وقت کی بات ہے بچے۔“ منصور حسین اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا اور ہریار کی طرح اس بار بھی وہ بڑی حویلی کی پر غور بلند دیوالا اور مضبوط عمارت کو دیکھ کے رہ گیا تھا بڑی حویلی کے احاطے میں نظر دوڑاتے ہوئے اس کی نظروں میں عجیب سی حسرت ہوتی تھی عجیب سے خواب ہوتے تھے۔

”مبارک خان۔“ اس نے کسی خاتون کی آواز پہ چونک کر دیکھا تھا حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے بنی بیڑھیوں پہ آسیہ آندی کھڑی تھیں۔

”جی بیگم صاحبہ؟“ وہ مودب سا ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”فانس ہو؟“ انہوں نے اک نظر منصور حسین کو دیکھ کر مبارک خان سے پوچھا۔

”آپ حکم کریں بیگم صاحبہ۔“

”فریزر میں آؤں کریم نہیں ہے، علیزے کے لیے آؤں کریم لے آتا۔“

”جی لے آؤں گا، صاحبہ نے کہہ دیا تھا مجھے۔“ وقار آندی کو آسیہ آندی سے بھی زیادہ بے یقینی کی نظر تھی وہ دن میں ایک بار آؤں کریم ضرور کھاتی تھی اس لیے فریزر میں ہمہ وقت آؤں کریم موجود رہتی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ انہوں نے کچھ دور کھڑے منصور حسین کے متعلق پوچھا۔

”علی زے بی بی کا نیا ڈرائیور ہے اور گاڑی بھی۔“ مبارک خان نے تعارف کر دیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ منصور حسین نے آگے بڑھ کے سلام کیا وہ ان کی فرم و پیشی پر وقار شخصیت سے حیرتاً متاثر ہوا تھا۔

”و علیکم السلام کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی منصور حسین۔“ اس نے احتیاطاً ”جو اب دیا تھا۔“

”صاحب سے ملاقات ہوئی؟“

”جی صاحب سے مل کر ہی آرہے ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ سر ہلا کر کہنے لگیں لیکن یہ سوتے پہ مجبور ہو گئی تھیں کہ وقار آندی نے اتنے جوان جہان آدی کو کام پہ کیسے رکھ لیا ہے؟ وہ تو اتنے تنگ ملازموں کے حق میں ہی نہیں تھے۔

”ہمیں اجازت ہے؟“ مبارک خان نے اجازت چاہی۔

”ہوں ماجاؤ تم لوگ۔“ انہوں نے اجازت دی اور پلٹ کر اندر چلے گئیں۔

”یہ کون ہیں؟“ منصور حسین نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بڑی بیگم صاحبہ ہیں، علیزے بی بی کی امی ہیں۔“

”تمہاری علیزے بی بی کیا چیز ہیں آخر؟“ اس نے مبارک خان کو دیکھا۔

”علی زے بی بی وہ چیز ہیں جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ مبارک خان مسکرا کے بولا۔

”یعنی دیر اور لازم ہو گیا ہے؟“ جو اب بھی ہنس رہا تھا۔

”بچ کے منصور حسین وہ وقار آندی کی بیٹی ہیں۔“

”صرف دیکھنے کی ہی تو بات کی ہے۔“ منصور حسین نے ذہن معنی کہا۔

”دیکھنا بھی سوچ سمجھ کے۔“

”اوتے تم سنبھال کے رکھو اپنی علیزے بی بی کو ہمارے دیکھنے کے لیے اور بہت ہیں۔“ منصور حسین نے شاہانہ انداز میں کہا تھا۔

”ہاں بس یہی ٹھیک ہے۔“ مبارک خان نے ہاں میں ملائی اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

اس کی گاڑی نے اسے بھرتی گیٹ سے اندر روش پہ آرکی تھی۔ وہ ڈور کھول کے نیچے اتر آیا تھا لیکن ابھی ڈرائنگ روم میں پہنچایا تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھا تو نمیل کا نمبر نظر آیا تھا۔

”السلام علیکم۔“

”جو علیکم السلام“ مجھے میرے گھر میں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے ہو؟ پلٹ کر کوئی خبری نہیں لی؟“ نمیل نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

”یعنی تمہیں تمہارے گھر میں چھوڑ کر خود بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہتا؟“

”تو اس میں کیا قباحت تھی؟“

”اپنا گھر ملازموں کے حوالے کر دیتا؟“ دل آور نے استہزائیہ پوچھا۔

”کر دیتے۔“

”کر دیتا ضرور کر دیتا، لیکن اگر کبھی تم میرے لیے اپنا بزنس اپنے کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے پاکستان آئے ہوتے یاد کرو، کبھی میرے لیے پاکستان آنے کا سوچا۔“ دل آور نے ایک ہی جملے میں اگلے پچھلے حساب بے باق کر دیئے تھے نمیل ٹھنک کے رہ گیا تھا۔

”یہ کیا گم رہے ہو تم؟ اب تم میرے ساتھ میرے والا برتاؤ کرو گے؟“

”میں تمہارے ساتھ تم سے بھی برابر تاؤ کروں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

”اچھی کڑی سزا؟“

”میں نے سزائیں دینا اور سزائیں دلانا ہی تو سیکھا ہے۔“ دل آور کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

”بس بس مجھے ڈراؤ مت اور میرے گھر پہنچو۔“ نمیل نے سر جھٹک کر کہا تھا اسے پتا تھا کہ جب دل آور کا لہجہ عجیب ہوتا ہے تو پھر وہ خود بھی سیریس ہو جاتا ہے۔

”کیوں؟“

”یار اتنے سارے کام ہیں۔“

”میں نہیں آسکتا۔“

”کیوں یار؟“

”میں اسلام آباد کے لیے نکل رہا ہوں۔“

”خیریت؟“

”ہوں اماں سے ملنے جا رہا ہے۔“

”یار ان سے تو میں نے بھی ملنا تھا؟“

”میں بھی تم اپنا گھر سیٹ کرو پھر ان سے بھی مل لینا۔“ دل اور نے مشورہ دیا۔

”گھر سیٹ کرنے کے لیے ہی تو تمہیں بلایا ہے۔“ نبیل نے منہ کی طرف سے بولا۔

”کیوں کیا مسئلہ ہے؟“

”کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں نا؟ اتنے سارے مسئلے بکھرے پڑے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ اپنے لیے گاڑی نکلوانی ہے، مدیہ کے لیے گاڑی نکلوانی ہے، اپنے لیے نام کے لیے اور مدیہ کے لیے موبائل فون کے سم کارڈ لینے ہیں، اپنا بینک اکاؤنٹ اوپن کروانا ہے، گرنسی چیچ کروانی ہے بلکہ اور بھی ہزاروں کام ایسے بڑے ہیں جن کے بغیر ہم بے کار بیٹھے ہیں۔“ نبیل نے کاموں کی لسٹ گنوائی۔

”ایک دن صبر کرو، کل تمہارے سارے کام ہو جائیں گے میں کل واپس آ جاؤں گا۔“ دل اور نے اسے تسلی دی۔

”یار اس میں صبر کی بات کہاں سے آئی یہ سب ضرورت کی چیزیں ہیں اور ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں“

”صرف لینڈ لائن نمبر کا سامرا ہے۔“ نبیل نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

”اچھا میں ایک کام کرتا ہوں گلاب خان کو تمہاری طرف بھیج دیتا ہوں تم اس کے ساتھ کسی بھی موبائل کمپنی کی فرنیچر میں جاؤ اور اپنی مرضی کے نمبر ایڈسٹ کروالو، اگر کیش کی ضرورت ہے تو وہ بھی بھیج دیتا ہوں اور کچھ دن کے لیے میری دوسری گاڑی بھی تم اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے نبیل کے مسائل کا مختصر اور فوری حل سوچا تھا۔

”لیکن یار۔“ نبیل نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن کس لیے؟ میں بھیجتا ہوں گلاب خان کو چھوٹے موٹے کام نمٹالو، باقی میں آ جاؤں تو پھر کراؤں گا۔“ دل اور نے اسے ہدایت دی۔

”کل آ جاؤ گے؟“

”ہوں!“

”اوکے بھیج دو گلاب خان کو۔“

”وہ تو میں بھیج دیتا ہوں لیکن وہ بیان رکھنا اس کی گل تمہارے گھر میں ہے تو ڈیوٹی دیر کی تسلی کی ضرورت ہوگی انہیں۔“ دل اور کالجیہ شرارتی تھا اور نبیل بدک گیا تھا۔

”کیا کہا؟“

”میں نے کہا ہے کہ دو دن کل سے چھڑے ہوئے ہیں انہیں ملنے کا موقع دے دینا۔“ وہ اپنی شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔

”بڑا ایکسپرنس ہے دو دنوں کے ملنے اور چھڑنے کا۔“ نبیل نے ذہنی انداز سے پوچھا۔

”یہ بحث پھر کبھی سنی۔“ دل اور نے ہل دیا۔

”دل اور ہے!“

”جی میری جان؟“

”نیل رہے ہو؟“

”میں یار بس بحث لمبی ہو گئی تو میں لیٹ ہو جاؤں گا اس لیے پھر کبھی۔“ دل اور سنجیدہ ہو گیا تھا اور نبیل کو یہ ہوتا پڑا۔

”خیر کب تک راز کو راز رکھے گا، کبھی تو سامنے آئے گا نا؟“ نبیل نے دل اور کی دی۔

”جب آئے گا تب دیکھا جائے گا۔“

”اوکے اللہ حافظ۔“ نبیل نے کہہ کے فون رکھ دیا تھا اور دل اور موبائل کو دیکھتا نبیل کی بات سوچتا رہ گیا تھا۔

”یار اس ماہ کا ڈائجسٹ کس کے پاس ہے؟“ حرمت اندر داخل ہوتے ہی کافی غلٹ بھرے انداز میں استفسار کر رہی تھی۔

”انوشہ کے پاس۔“ جویریہ نے لا پرواہی سے کہنے ہوئے ڈائجسٹ کو نا محسوس طریقے سے کیشن کے نیچے چھپا دیا تھا۔

”لیکن انوشہ تو کہہ رہی تھی کہ نہ کول کے کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔“ حرمت نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اسی کی خاص بات ہے اس ماہ کے ڈائجسٹ میں؟“ جویریہ آنکھیں منکا کے بولی تھی کول مدحت اور اینہ اپنی مسکراہٹ بشکل روک پالی تھیں۔

”وہ سلسلہ دار ناول کی لاسٹ قسط آئی تھی۔“

”تو تو پڑھا ہے؟“ جویریہ نے بے ساختہ کہا تھا۔

”میں؟“ نہیں کیسے پتا؟ تم نے پڑھ لی ہے؟“ حرمت ٹھک گئی۔

”جس ابھی پڑھنے والی تھی کہ تم آگئیں۔“ کول نے آہستگی سے لقمہ دیا تھا۔

”کیا کہا؟“ حرمت چیخ اٹھی اور جویریہ فوراً کیشن کے نیچے سے ڈائجسٹ چھٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

”وہ بکھرے حرم میں قسط پڑھنا شروع کر چکی ہوں، پہلے مجھے پڑھ لینے دو پھر تم پڑھ لینا۔“ جویریہ حرمت اور انوشہ تینوں ہی ڈائجسٹوں کی دیوالی تھیں ہر جیسے تینوں نے باری باری ڈائجسٹ منگوانا ہوتے تھے اور جس میں سے جو ڈائجسٹ منگواتی تھی اس میں سے اسی کی اجارہ داری ہوتی تھی۔ اس بار حرمت کی باری تھی سارے ڈائجسٹ اسی نے منگوائے تھے اسی لیے اسی کی اجارہ داری تھی۔

”میں نے اپنے سارے پیسے صرف اس ایک قسط کے لیے ہی تو خرچ کیے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ ابھی نہ پڑھوں؟“ حرمت نے تھملا کے کہا تھا۔

”یار تھوڑی دیر بعد پڑھو گی تو بھی تمہارے پیسے پورے ہو جائیں گے۔“ جویریہ نے اسے تسلی رکھنے کا کہا۔

”تو پھر وعدہ کرو جب تک میں قسط نہ پڑھ لوں تم کوئی بھی بات ڈسکس نہیں کرو گی، اس طرح سارا چارم ختم ہو جاتا ہے۔“ نجائے کیوں اور کیسے حرمت مان گئی تھی ورنہ وہ ٹائمر کے معاملے میں بے حد کرپزی تھی۔

”اوکے وعدہ۔“ جویریہ نے خوشی خوشی وعدہ کیا تھا۔

”چلو تم بیٹھو میں تب تک پڑھ لوں۔“ جویریہ خاصی خوش ہوئی تھی اور حرمت اپنی بے چینی پہ کنٹرول کرتے ہوئے کول کے قریب ٹیبلور کیشن پہ ٹک گئی تھی۔

”کیا ملتا ہے ان ٹائمر اور ڈائجسٹوں سے؟“ کول نے تعجب سے پوچھا۔

”جو آج کل کے معاشرے سے نہیں ملتا۔“ حرمت نے دو ٹوک کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب ان ناولوں اور ڈائجسٹوں سے ہمیں نصیحت ملتی ہے، زندگی جینے کا تھوڑا بہت، صحت ملتا ہے، سب سے بڑی بات کہ چند لمحوں کی خوشی اور راحت ملتی ہے۔ جو آج کل حقیقت کی دنیا میں بالکل نہیں ہے۔“ حرمت کے جواب میں کول واقعی چپ ہو گئی تھی۔

”یہ سب انسانوی باتیں ہیں یار۔“ مدحت نے سر جھٹک کر تمسخرانہ کہا تھا۔

”تمہارے سمجھنے اور میرے سمجھنے میں بہت فرق ہے یار تم ہر چیز کو ٹیپوٹری لیتی ہو اور میں ڈیپٹی۔“ حرمت نے اپنی بات کو حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ مدحت بڑے سکون سے بیٹھی اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کی تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔

”حرمت۔“ باہر سے ثروت بیگم کی آواز سنائی دی تھی۔

”جی ہاں؟“

”وہ نیچے ڈائیال آیا ہے اسے کھانا نکال دو۔“ انہوں نے کول کے بیڈروم کا ڈور کھولتے ہوئے اسے کام سونپا۔

”ڈائیال کو کھانا؟“

”ہاں وہ عانتہ باجی اور انوشہ مارکیٹ تک گئی ہیں انیکسی میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے اسے کہا کہ کھانا کھا کر لی جائے۔ جاؤ وہ انتظار کر رہا ہوگا۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”اس بات کو بھی ڈیپٹی بیچے گا۔“ مدحت نے پیچھے سے آواز دی تھی اور حرمت اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ وہ کچن میں آئی تو ڈائیال واقعی انتظار کر رہا تھا لیکن شکر تھا کہ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ احمد بھی بیٹھا ہوا تھا احمد شاید ابھی ابھی آتا تھا پانی کی بوتل سے پانی تبدیل کر رہا تھا اور ڈائیال اس کے ساتھ محو گفتگو تھا حرمت نظروں کے حصار سے بچ گئی تھی ورنہ وہ ڈائیال کی چپ اور بولتی آنکھوں سے مخالف ہو جاتی تھی۔

”بیگم صاحبہ آج کھانے میں کیا پانا ہے؟“ ملازمہ ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں ہی چلی آئی تھی۔

”قیمہ کر لے۔“ بتول شاہ کے لہجے میں حکم تھا۔

”آج اتنے دنوں بعد میرا بیٹا گھر آ رہا ہے تو کھانا بھی اسی کی پسند کا ہوگا۔“

”لیکن بیگم صاحبہ وہ قیمتہ کر لے؟“

”تم جا کر مسالا تیار کر دے قیمتہ اور کر لے ابھی آجائیں گے، مشکور لے کر آئی ہوگا۔“ بتول شاہ نے حکم جاری کیا تھا آج وہ اس کی آمد کا سن کر بہت خوش ہوئی تھی اور کالج بھی نہیں گئی تھی اس بار وہ کافی دنوں بعد آ رہا تھا۔ اور وہ وہ کافی دنوں سے اس کے لیے اداس بھی ہو رہی تھی لیکن وہ اپنے کاموں میں بڑی تھلائی لیے اسے آنے کا نہیں کہا تھا لیکن آج جب اسے فرصت ملی تو اس نے سب سے پہلے ابا سے ملنے کا ہی سوچا تھا اور فون کر کے انہیں اطلاع بھی دے دی تھی انہوں نے اس کا بیڈروم از سر نو صاف کر دیا اور ملازمہ کو اس کی فیورٹ ڈشز بنانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا پورا دن بیٹے کی آمد کی تیاریوں میں ہی گزارا کیا تھا شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب گیسٹ پمپ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا وہ تیز قدموں سے راہداری عبور کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی اتنے میں وہ بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”السلام علیکم املاں۔“ وہ ان کے سامنے جھک گیا اور بتول شاہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے اسے سینے سے لگایا۔

”میری جان جیتے رہو خوش رہو۔“ وہ اس کے کندھوں اور بالوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھی اور دوبارہ پھر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ ان کے دونوں ہاتھ جوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں دیکھتی ہوں تو جوان ہو جاتی ہوں، سارے نم بھول جاتی ہوں۔“ ان کی آواز میں نہیں آنکھیں بھی ٹپکتی تھیں اور دل اور شاہ ان کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اندر لے آیا تھا۔

”یہ دن آپ کے اداس ہونے کے دن نہیں ہیں یہ تو آپ کی خوشی کے دن ہیں خوش رہا کریں اور اللہ کے رنگ دیکھتی جائیں۔“ اس نے ان کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا اور ان کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے لکڑی دی تھی۔

”میری خوشیوں کے دن تو اسی روز ختم ہو گئے تھے جس روز باہر شاہ کی موت ہوئی تھی۔“ بتول شاہ کے لہجے میں دکھ کی ہوک اٹھ رہی تھی دل اور نے لب بچھنے لیے اور سر جھٹک گیا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بتول شاہ کو اپنے آپ کو کشتوں کرنا پڑا کتنی غلطی کر رہی تھی وہ کہتا تھا وہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا میں جارتی ہیں؟“

”تمہارے لیے جس لے آئی تھی۔“

”ارے نہیں املاں آپ تمہیں میں لے لوں گا یا پھر ملازمہ کو آواز دے دیجیے۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔

”ملازمہ کو کیوں؟ میں خود لے کر آتی ہوں۔“ وہ نرمی سے کہہ کر کچن میں چلی گئی تھی اور چند منٹ کے وقفے کے بعد اس کے لیے انار کا جوس لے آئی تھی۔

”آپ یہ پلاسٹک پیئیں۔ اور یہ بتائیں کہ آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں؟“

”میں کمزور لگ رہی ہوں؟“ وہ حیرت سے بولیں۔

”وہ نہیں میں تو اپنے آپ کو بالکل فٹ محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ مسکراتے لگیں۔

”نکلا ہے آپ کالج کو زیادہ ٹائم ہوتے رہی ہیں؟“

”ارے چھوڑو نام کو تم یہ بتاؤ نیل اور مدیحہ کیسے ہیں؟“ بتول شاہ نے سر جھٹک کر استفسار کیا تھا۔

”وہ بھی فٹ فٹ ہیں، نیل آپ کو یاد کر رہا تھا آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”ہاں میری بات ہوئی تھی فائزہ بھابھی سے وہ پاکستان آکر بہت خوش ہیں اللہ کے بڑے شکرانے ادا کر رہی تھیں۔“ بتول شاہ نے کل فائزہ بیگم کو باقاعدہ خود فون کیا تھا اور اتنے سالوں بعد وطن واپس آنے پر مبارکباد دی تھی۔

”ہاں نیل بھی بہت خوش ہے۔“ دل آور نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور مدیحہ؟“

”مدیحہ بھی ٹھیک ہے بس پہلی بار پاکستان آئی ہے اس لیے اسے ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کچھ عرصہ لگے گا۔“ اس نے مدیحہ کی ناخوشی کا جواب دیا۔

”عبداللہ اور اس کی فیملی کیسی ہے؟“ وہ دل آور کے چہرے کو غور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

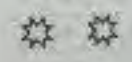
”وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں عبداللہ سے بھی بات ہوئی رہتی ہے۔“ اس نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور جوس کا گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

”زری سے بھی بات ہوتی ہے؟“ ان کے اس اچانک اور گہرے سوال پہ دل آور نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔

”السلام علیکم املاں۔“ وہ ان کے سامنے جھک گیا اور بتول شاہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے اسے سینے سے لگایا۔

”میری جان جیتے رہو خوش رہو۔“ وہ اس کے کندھوں اور بالوں پہ ہاتھ پھیر رہی تھی اور دوبارہ پھر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



سائیکہ خیر



اصفہ عیسیٰ قاضی

سائیکہ خیر

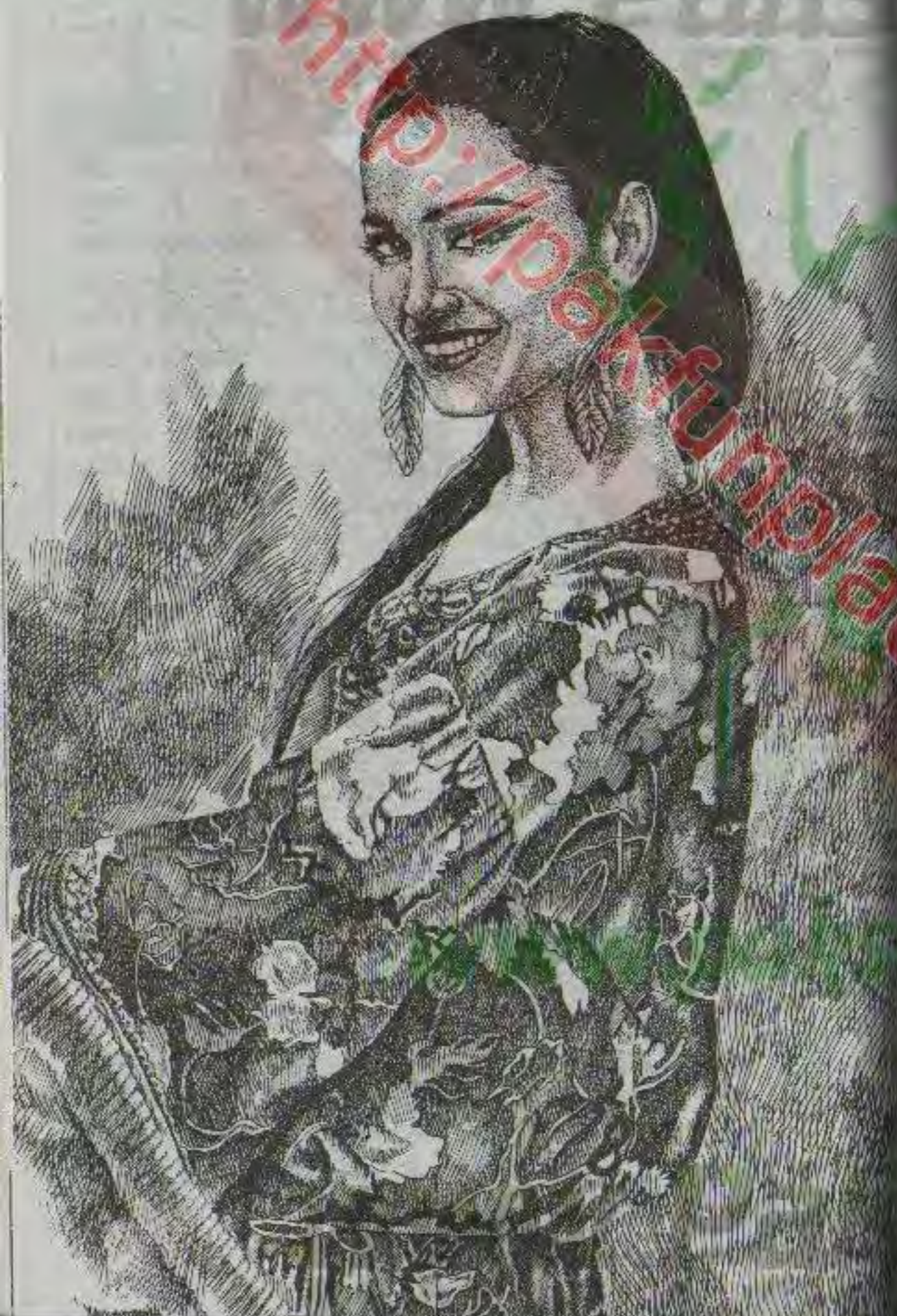
اس نے شعور کی وہ بلینز پر قدم رکھا تو ہر لڑکی کی طرح اپنے دل میں خوابوں کا نگر آباد کر لیا وہ چاندنی راتوں میں جتنوں کے سنگ بھاگنا چاہتی تھی مگر اس کی زندگی میں ماہ تمام طلوع ہی نہ ہو اور رات تیرہ و تار ہی رہی۔ وہ اپنے ہاتھ سے قسمت کی روشن گیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے خوابوں کی تعبیر سے بھی گئی۔

وہ بھی عام دنوں میں ایک عام سا دن تھا جب وہ حسب معمول باہر سلجھانے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو مانگ نکالتے ہوئے دم بخود سی رہی تھی اس کے سیاہ بالوں میں چاندی کا پہلا تار نمودار ہو چکا تھا وہ کتنی دیر بے یقینی کے عالم میں آئینے کے سامنے کھڑی رہی اور شہادت کی انگلی سے اپنی مانگ کو ٹٹول کر ایک بار پھر بغور جائزہ لیا مگر بالوں میں اتنی سفیدی التباس نظر نہیں حقیقت تھی وہ گہری سانس لے کر چھپے ہٹ گئی۔

انگلیوں کی پوروں پر اپنے سن پیدائش سے لے کر اب تک کا حساب لگایا تو وہ زندگی کی پونلی میں عمر کا تیسواں سکہ پھینک چکی تھی۔ اسے یکدم بے مائتگی کے احساس نے آن گھیرا۔ اسے اپنی خوب صورتی اپنی تعلیم بے وقعت کھنے لگی۔ اس کی طبیعت جو کھل اور ملول تھی وہ سرشام بستر میں دیکھی لالہ نے رات کے کھانے کے لیے آواز دی تھی وہ سرلی بن گئی اس کی بھوک جیسے مری گئی تھی اس رات اماں اور ہائے اس کے بغیر بے دلی سے چند نئے کھانے اور سو گئے وہ پانگ پر چت لیٹی چھت کے شہتیر برکتے چکھے کو دیکھتی رہی۔ خند اس کی آنکھوں سے گترا کر گزر گئی تھی۔ اس نے خند دھانے کے لیے جانے کتنی بار گروٹ بنا اور سر کے نیچے رکھا تکیہ درست کیا مگر بے سوا خاڑی کی طویل اور تاریک رات اس کی بے بسی پر سکرانی رہی۔ اس کے دماغ پر سوچوں کی بلیغ فار تھی۔

”تو کیا یہ طے ہے شہریانو کہ باقی عمر بھی اس بلینز گزر جائے گی۔“ اس کی پرچھا میں نے بیجھتا ہوا سوال کیا تھا وہ لرزی گئی۔

”تو پھر اپنے دل کی نہ سن شہریانو! خواہشوں کے پیچھے



بھاگے گی تو بے نیل مر اور ہے گی اب ایک ہی راستہ ہے وہ ہے بھوتے کا راستہ۔ "وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

سرونی کے باوجود اس کے ہاتھ پر پیندہ سا آگیا۔ اس کی چمپنی رنگت زردی پر گئی۔

"تو کیا اب سمجھ لیا جائے کہ شہر بانو کے دروازے پر دستک دینے والا اب کوئی ہاتھ بھی ہلائی نہیں رہا۔" اسے تلخ حقیقتیں گھیرے ہوئے تھیں۔ جاڑے کی تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔ یہاں تک کہ کمرزدہ زمین پر سورج نئے ڈیرہ جمایا۔

شہر بانو کی شرعی آنکھوں کی سرخی اور پونوں کی سوچن اس بات کی گواہ تھی کہ گزشتہ رات اس کی پلکیں کتنی دیر آپس میں پوست رہی تھیں مگر اس رات جگنے نے اس پر بہت کچھ عیاں کر دیا تھا۔ دل و دماغ میں جاری رہنے والی کشمکش میں بالآخر منطق کی فتح ہوئی اور دل کی سیاہی نے شکست تسلیم کر لی اس نے سچ ناشتے سے قبل ہی اپنے خالہ زاد اکبر کے حق میں فیصلہ سنایا۔

"تو جگ کہہ رہی ہے شہر بانو؟"

اماں نے روٹی کی چٹکیر کو سروپوش سے ڈھانپتے ہوئے بے یقینی اور خوشی سے سامنے پیڑھی پر ساکت بیٹھی شہر بانو کی طرف دیکھا وہ خاموشی سے چولہے کے اندر جلنے والے سرکنڈوں کو دیکھتی رہی جیسے اب کسی بھی بات کا جواب دینا غیر ضروری تھا۔ اماں کے چہرے سے اطمینان اور خوشی پھوٹ رہی تھی اللہ نے اپنی ضد چھوڑ کر اکبر کو ہرائی کی سند بخش ہی دی تھی وہ جو شہر بانو کے لپا کی طرف سے تین رشتے ٹھکرائے جانے کے بعد بالکل مایوس ہو چکی تھیں ایک بار پھر کھل اٹھیں شہر بانو پیڑھی کو پیچھے سرکا کر اٹھی اور مرے مرے قدموں سے باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

چند ہفتوں بعد اس کی رخصتی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ گھر میں مسکھیاں اکٹھی ہوئیں اور بابوں کی رات گھر کے در دیوار ڈھولک کی آواز اور شکر کے گیتوں سے گونجنے لگی۔ اکلوتی اولاد ہونے کے سبب اماں اس کی شادی کے تمام چاؤ پورے کرنا چاہ رہی

تھیں۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے شہر بانو کے لیے مندی کا وہ پتہ تیار کیا تھا۔ گریب کے باریک سبز دپٹے پر انہوں نے بڑی نفاست سے نقیشتیں — میں پرو کر سلنے اور ستارے ٹانگے تھے گاؤں کی مسکھیاں اسے پھیر رہی تھیں مگر وہ تخت برے حس و حرکت بیٹھی اپنی ہتھیلی پر لگی مندی کی گول ٹکلیا کو دیکھے جا رہی تھی اسے ڈھولک کی تھاپ سنائی دے رہی تھی نہ اس تھاپ پر لبوں سے ادا ہونے والے گیتوں کے بول جن میں دعائیں کلمات کے ساتھ ساتھ اس کی نئی ازواجی زندگی کا نقشہ کھینچا جا رہا تھا۔

ایسا بھی نہ تھا کہ اس نے اپنے دل میں کسی اور کو جگہ دے رکھی تھی۔ مگر جرج سے اکبر کے لیے بھی وہ دل کو راضی نہ کر پائی تھی۔ وہ اپنے گاؤں کی واحد لڑکی تھی جو میٹرک تک تعلیم حاصل کر پائی تھی۔ ورنہ گاؤں کی لڑکیاں سینے پر ونے اور گھرداری کو ہی اپنا زیور اور مان سمجھتی تھیں۔ اماں نے اماں کی مخالفت کے باوجود اسے شہر کے ہائی اسکول بھیجا۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی تعلیم کی ادنی سی سند نے اس کے گن میں مزید اضافہ کر دیا۔ جو نسلی اس نے میٹرک کیا لوگوں کو امام بخش کے گھر کی بہری بھی نظر آگئی۔ پہلا پتھر آیا تو اماں پھولے نہ سمائی۔ رشتہ پڑواری کے گھر سے تھا۔ لڑکا اگرچہ ان بڑھ تھا۔ مگر باپ کی طرف سے ایسی بھی ناجائز سرکاری اراضی پر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اماں ہاں کرنے پر آمادہ تھیں۔ مگر اماں نے پڑواری کی زمینوں کو حرام کی گمانی کہ گزشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ شہر بانو! اماں کے ٹھیلے پر خوش تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ابھی خوشامیسنوں کے خوابے لیا تھا۔ مگر اس کی خواہش تھی کہ اس کا جیون سا بھی زیادہ نہ سہی اس کے جتنا تو چھوٹا تھا۔ کتابوں نے اسے اچھے اور برے کا فرق سمجھا دیا تھا۔ وہ جانتے بڑھنے اور انتخاب کرنے کے عمل سے خود گزرنا چاہتی تھی۔ مگر یہ اختیار ابھی اس کے ہاتھ تک نہیں پہنچا تھا۔ اماں اور اماں بالائی بالا آنے والے رشتوں کو دیکھتے بڑھتے اور کوئی نہ کوئی بھی نکال کر کور اس کا جواب دے دیتے۔ اماں کو شہر بانو کے لیے کوئی بھی

لڑکا موزوں نہیں لگ رہا تھا۔ اماں کبھی کبھی سخت کوفت میں جگا ہو کر جڑی جاتیں۔

"کب تک آپ ہر رشتے میں ایسے ہی نقص نکالتے رہیں گے۔ آخر ایک نہ ایک دن تو یہاں ہتا ہے یہی کو کل کو عمر زیادہ ہو گئی تو لوگ دروازے سے واپس پلٹ جائیں گے۔"

"فکر نہ کریں بخت اپنی شہر بانو کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ میں کچھ دیکھ کر ہی اسے یہاں لگا۔ ایسے گھر میں جہاں وہ خوش رہے، آسودہ رہے۔" اماں حقے کی چلم بھرتے ہوئے اطمینان سے بولے اور اماں کے اگلے سوالوں پر حے کی نے منہ میں ڈالے لاپرواہی سے گزر گزرتے رہے۔

شہر بانو نے جسے ہی اپنی شادی کا ذکر سنا انجانے میں پھر ایسا ہوا کہ وہ بھی خواہشوں کے کچے دھاگوں سے خواب بننے لگی چرتانے میں ایک ان چھوا سپنا اور پانے میں امنگ تھی۔ وہ یہ خوش رنگ اور ڈھنی سر پہ اوڑھے گھر کے کچے آٹکن میں فلا چھیں بھرتی اور رات کو اپنے اوپر پھیلا کر سپنوں کی پہلو دار رفاقت میں ایسے گھومتی کہ خبر ہی نہ ہوتی کہ کب پو پھٹی اور رات اپنی تمام تر تاریکی سینے چلتی رہی۔ نیند اس کی سہلی تھی۔ وہ اس کی انگلی تھاے ایسے جہاں لے جالی جہاں صرف محبت کی گلابی روشنیاں تھیں۔ نفرت کا گھور اندھیرا کہیں نہ تھا۔ خود زخمی کی بارش میں بھیگتی شہر بانو اس بات سے بے خبر تھی کہ اس بارش کے بعد طویل خشک سالی تھی۔

اٹھارہ سال کی شہر بانو بیک جھپکتے جب زندگی کی اٹھائیسویں پیڑھی پر پہنچی تو اماں کی پیشانی پر فکر کی لکیوں اور اماں کی ٹھنڈی آہوں میں اضافہ ہو گیا۔ مہینوں گزر جاتے، کوئی گھر میں نہ جھانکتا، اماں کے دوسرے خدشوں میں اور پھر خدشے یقین میں بدلنے لگی۔ انہیں لگا شہر بانو کا تو خیر چہرہ اپنی آب و تاب گھور رہا تھا۔ وہ گھنٹوں گہری سوچ میں ڈوبی شہر بانو کو دیکھتی

ادارہ خواتین اور بچٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	عنوان	برائوں
500/-	آئندہ یاس	برائوں
600/-	راحت بیگم	زرد سوم
500/-	رعانہ گارعدان	زمنی اک روشنی
200/-	رعانہ گارعدان	خوشبو کا کوئی گھر نہیں
400/-	خانیہ چوہری	شہر دل کے دروازے
250/-	خانیہ چوہری	حیرت نام کی شہرت
450/-	آسیر مرزا	دل ایک شہر بنوں
500/-	فاخرہ انوار	آنجنوں کا شہر
500/-	فاخرہ انوار	ہول مہلاں تیری گھیاں
250/-	فاخرہ انوار	جہاں اے رنگ کالے
300/-	فاخرہ انوار	یہ گھیاں یہ چارے
200/-	غزالہ عزیز	تینا سے عورت
350/-	آسید ذاتی	دل آسے مٹھو والا
200/-	آسید ذاتی	گھر بنا جائیں خواب
250/-	نوزہ یاسین	دکھ کو خندگی سمائی سے
200/-	بٹری سید	اماں کا چاند
450/-	انسان آفریدی	رنگ خوشبو ہا ہا دل
500/-	رضیہ جمیل	درد کے قافلے
200/-	رضیہ جمیل	آج کلن پر ہائے نہیں
200/-	رضیہ جمیل	درد کی منزل
300/-	نیم حور قریشی	سحر سے دل سے سارا
225/-	سیدہ خورشیدی	تیری ماہ میں زلگی
400/-	ایم سلاطین	شام آرزو

تمام ناولوں کے لیے درخواستیں
ادارہ خواتین اور بچٹ کی طرف سے
کراچی، پاکستان
تلفون: 3322634

رہتیں اور وہ اپنی شفاف ہتھیلی کی ابھی کیسوں کو جو شاید اب معدوم ہوتی جا رہی تھیں ایسے میں اس کے خالہ زاد اکبر کا رشتہ آگیا عام سی شکل و صورت والا ان بڑھ اکبر علی اہل کے لیے تاریکی میں امید کا جگنو تھا۔ مگر لایا کو وہ بچپن سے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اسکول کی ابتدائی جماعتوں سے پیچھا چھڑا کر وہ اکثر گاؤں کے اوباش لڑکوں کی صحبت میں پایا جاتا، چھوٹی موٹی چور بازاری تو اس کا معمول تھا۔ باپ نے اسے راہ راست پر لانے کی ہمت کو شش کی ٹمکرہ بھی تھک ہار کر چپ سادہ پایا سنا تھا ان دنوں وہ شہر میں کسی سینٹری اسٹوری پر ملازم تھا اور سینٹری کا اکثر سامان اکبر علی کی بیضک میں پایا جاتا جس کا مالک کو علم ہی نہ تھا۔

اماں نے زور دیا تو باپ ہو گئے مگر جسے ہی شہر مانو کو اس رشتے کے بارے میں علم ہوا وہ شکوہ کنٹن سی ماں کو دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ ”مایا بھیرا“ کیا صرف تیری نازوں پلی شہر مانو کے لیے ہی رہ گیا تھا۔ اماں چوری بن گئیں۔

”آپ خالہ سے کہہ دیں ابھی اتنا برا وقت بھی نہیں آیا شہر مانو کے لیے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں اتنا کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اسے نہیں معلوم اماں نے خالہ سے کیا بات کی مگر کچھ دن بعد آئینے میں اپنے بالوں میں ڈیرہ ڈالتی سفیدی کو دیکھا تو لرز سی گئی۔ عمر روال کا پیرہ اپنے تیس چکر مکمل کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس چکر میں پس جاتی اپنے دل پر جبر کر کے اس نے اکبر علی کو چہون ساکھی کے طور پر چن لیا۔

رخصتی کے وقت وہ ماں کے گلے لگ کر بہت روئی، باپ نے سر ہاتھ رکھا تو بس اتنا ہی کہا۔

”آنکھ کے سارے آنسو اور ہری چھوڑ جانا شہر مانو کہ زندگی کے کسی موڑ پر تیری آنکھیں نہ بھیکیں۔“ اس نے ایسا ہی کیا سوائے خوابوں کی اوڑھنی کے وہ سب کچھ باپ کی دلہن رہی چھوڑ گئی۔ مادی چیزیں اس کے سامنے اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ سو وہ اس کے شمار میں نہ تھیں۔ اہم تھے تو بس اس کے کچھ خواب جس میں اس نے اب رنگ بھر رہے تھے۔

جلد عروسی کو وہ بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ بھی تو نیا نہیں تھا اس کے سوا گت کے لیے سوائے اس کے جینز کے فرنیچر کے نیا اگر کچھ تھا تو صرف اکبر علی اور وہ ابھی کمرے میں وارد نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے مسخ جوڑے پر نظریں جمائے ایک بار پھر آنے والی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اب کی بار اس کی سوچ کا محور و مرکز صرف اکبر تھا۔ مرلیا محبت جیون ساکھی کا جو خیالی خاکہ اس نے کب سے ذہن میں بسا رکھا تھا وہ اکبر علی کو اس میں فٹ کرنے لگی۔ ایک بار اس کی استالی نے بتایا تھا کہ ”جہاں محبت نہ ہو وہاں سمجھوتا چلتا ہے“ اور وہ خود کو سمجھوتے کے لیے تیار کر چکی تھی۔ کمرے کا چونی دروازہ چرچا ایا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ بند دروازے کا ایک دروا کر کے اندر داخل ہونے والا اکبر تھا۔ سوکھا سزا سناٹا سا اکبر علی! شہر مانو نے دوبارہ ذرا تار مسخ جوڑے پر نظریں جما دیں۔

اس کا دل دھڑکا تھا نہ ہاتھ ٹھنڈے بڑے تھے کہ سمجھوتے کے بندھن میں دل نہیں دھڑکتا صرف خون جلتا ہے۔ وہ یونسی سا گت و جاہد بیٹھی رہی اماں نے کہا تھا ”اکبر دل کا بہت اچھا ہے وہ اپنی محبت سے تیرا دل جیت لے گا۔“ اور وہ اسی امید پر تو آئی تھی۔

”سنا تھا تو نے خالہ کو صاف انکار کر دیا تھا میرے لیے پھر اچانک راضی کیوں ہو گئی۔“ وہ ہانگ پر بیٹھے ہوئے سیاٹ لہجے میں گویا ہوا۔ شہر مانو نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”بڑا غور تھا میں اپنی چار جماعتوں پر۔“ وہ استہزائیہ انداز میں کہہ کر شہر مانو کو دیکھنے لگا۔ تعلیم کا پہلا طلعہ اس کی طرف اچھلا گیا تھا۔ خوابوں کی اور مٹی کا پہلا کچا دھاگہ ٹوٹا سارا تانا بانا ابھنے لگا تھا۔ ایک اور بھاری رات اس کی منتظر تھی۔ اکبر علی اس کے حسن و اخلاق کے قصیدے کی بار دھتا وہ تو اس کا مان خاک میں ملا کر چلا گیا تھا۔ وہ شہر مانو کو بلور کر آگیا تھا کہ ایک عورت کی لوقت کیا ہے۔ گلابی رو شہنیاں گھور اندھیرے میں کم ہو گئی تھیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی رو

نہ سکی کہ آنکھوں کا پانی تو وہ گھر کی دلہن رہی چھوڑ کر آئی تھی۔ اور خشک آنکھیں لڑکی کے سمبھی ہونے کی علامت تھیں۔ اماں نے ٹھیک کہا تھا اکبر دل کا برا نہیں تھا۔ وہ صرف زبان کا برا تھا۔ وہ لفظوں کے نشتر سے شہر مانو کی روح کو بچو کے نکاتا رہتا اس کے دل کو چھیدنا اور حفظ اٹھانا۔

وہ ان مردوں میں سے تھا جو عورتوں کے ہزار اٹھانا اپنی ہتک سمجھتے تھے اور سپاس گزاری کو ان کا ذرا مسو شہر مانو پہلی سماعت میں ہی جان گئی تھی کہ اس کے ذمے فرائض کیا ہیں محقوق کا تو ذکر ہی کیا۔

اس نے اپنے آپ کو اکبر علی کی سرور کی اور تحویل میں دیا تو خود کو فراموش کر دیا۔ وہ ایک خود کار مشین کی طرح گھر کے کاموں اور اکبر کی خدمت میں جتی رہتی، ذرا سی بھول چوک ہوتی تو فوراً ”چار جماعتوں کا طمانچہ اس کے منہ پر مارا جاتا اور وہ اس طلعے کی جلن ہفتوں محسوس کرتی اور لڑھکتی رہتی۔ کبھی کبھی اس کے اندر کی دلہن شہر مانو جاگ جاتی تو نکلنے لگتی۔ خواہشوں کی آبی اوڑھنی میں چھپنے کے لیے جسے وہ لڑکھن سے بنتی آتی تھی، کسی شام جب وہ تھکی ہاری برآمدے کی سیڑھیوں پر ملول سی بیٹھی ہوتی تو اس کا دل چاہتا کہ اب کے اکبر علی گھر میں داخل ہو تو اس کے پشت پر بندھے ہاتھوں میں بازو موقیے کے ٹھہرے ہوں جن کی مسک سارے آنکھوں میں پھیل جائے۔ وہ شہر مانو کے سامنے جھک کر محبت سے پوچھے۔

”بہا میں تیرے لیے کیا لایا ہوں؟“ اور وہ دھیرے سے ہنس کر کہے۔

”تیرے گھر میں داخل ہونے سے پہلے مجھے بتا چل گیا تھا۔ خوشبو چھپ سکتی ہے بھلا؟“ مگر ایسا حقیقت میں کبھی نہ ہوا اکبر علی موقیے کے پھول لایا نہ اس کے بالوں میں سجائے نام نہ لانا کو یہ بات کبھی نہ بھولی کہ شہر مانو نے اس کو پہلی بار مسترد کر دیا تھا۔ شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد وہ اس کو میکے لے کر گیا تھا۔ اسی کے بیچ صاف کرتی اماں خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ شہر مانو کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ اکبر اسے کچھ دن

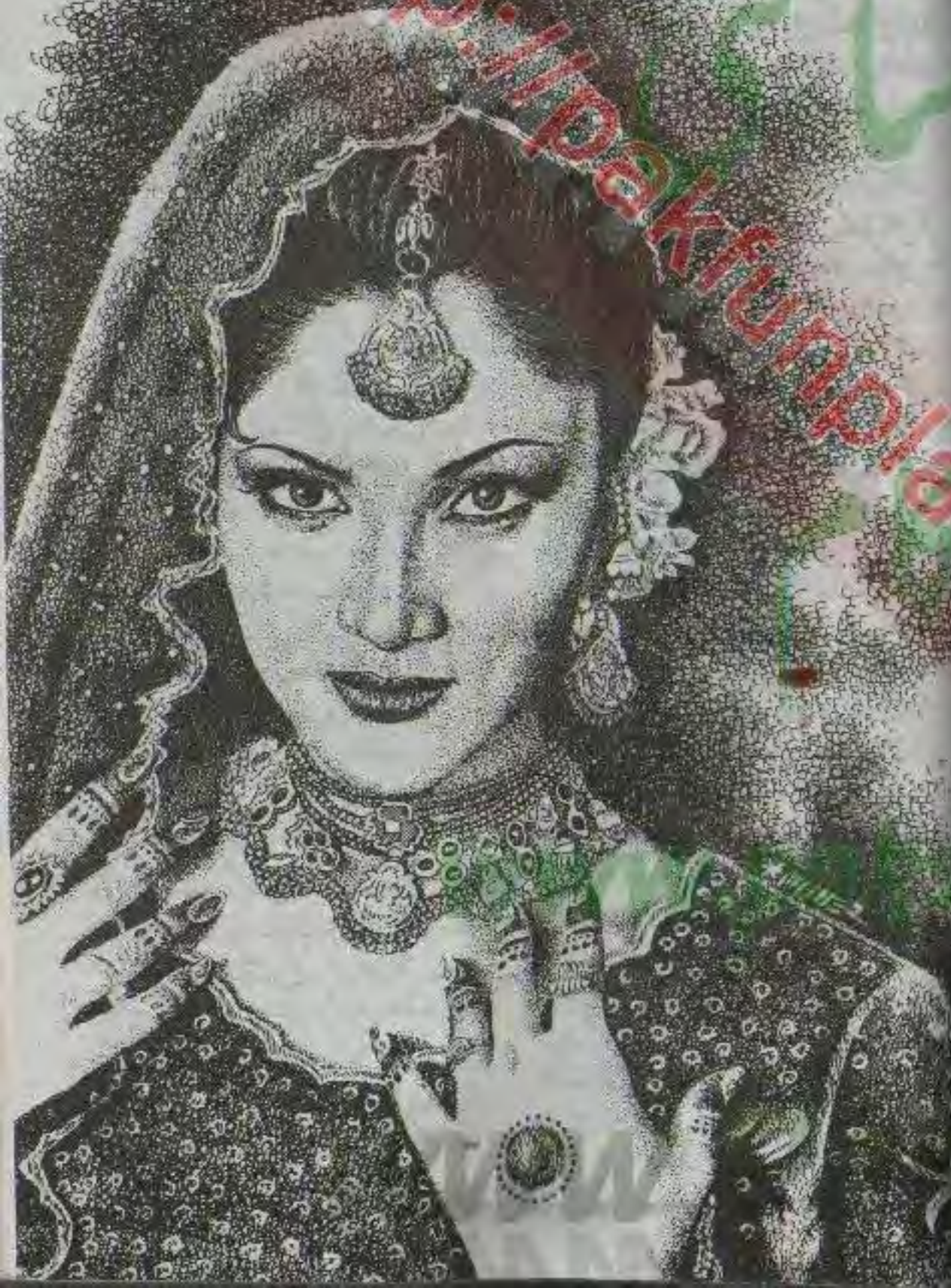
کے لیے چھوڑ کر جا گیا۔ ”تو خوش تو ہے اکبر کے ساتھ؟“ رات اماں نے اسے ٹوٹا۔

”بہت خوش ہوں اماں آپ سچ کہتی تھیں وہ دل کا بہت اچھا ہے۔“ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اور اندھیرے کے باعث اماں اس آنکھوں کی نمی دیکھنے سے قاصر تھیں۔

”میں کہتی نہیں تھی بانو کے ابا یہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے، آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں، کہتی ہے اکبر بہت خیالی رکھتا ہے اس کا بس اسی طرح خوش رہے میری بیٹی۔“ دوسری شب صحن میں لیٹے ہوئے اماں ابا کے کان میں سرگوشی کر رہی تھیں اور ساتھ والی چارپائی پر بازو سر پر رکھ کر بیٹی ہوتی شہر مانو تخی سے مسکرائی۔

”کاش تیری شہر مانو خوش ہوتی اماں۔“ یہ باتیں بھی کتنی خوش قسم ہوتی ہیں اولاد کی خوشیاں ان کی خشک آنکھوں سے اخذ کرتی ہیں، انہیں کیا معلوم جن بیٹیوں سے رخصتی کے وقت وہ ہمیشہ خوش رہنے کا عہد لیتے ہیں وہ کبھی حرف شکایت لب پر نہیں لاتیں، چاہے ان کے خوابوں کی نازک رکابیاں بیچ چور اے میں ہی چھوڑ دی جائیں اور ان کی کرسیاں چٹتے چٹتے نازک پورس و نگار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

اماں کے اطمینان پر اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ کسی کی نظر پڑتی اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ ڈالے۔ صبر اور سمجھو تا عورت کی جنم گھٹی میں ہونا ہے اور شہر مانو کو اب تمام عمر اس کا بھر م رکھنا تھا۔



سائیکہ خبریں



وچ چھوٹی کتاب کی سائز کی ریڈ کورواں ڈائری تھی جس کے چلنے صفحوں کے درمیان ایک گولڈن ٹکر کا پتہ اس طرح سے پھنسا تھا جیسے کوئی لکھتے لکھتے کسی کام سے اٹھ کر گیا ہو۔ انہوں نے ڈائری کھول کر پہلے صفحے کو دیکھا جس پر بیچہ کا نام لکھا تھا۔ وہ اور بھی حیران ہو گئے۔ بیچہ ڈائری لکھا کرتی تھی یہ بات نور الہدیٰ کے لیے نئی تھی۔ انہیں کبھی بھی بیچہ کی اس عادت کے بارے میں پتا نہیں چل سکا بلکہ یہ بات تو کسی کے بھی علم میں نہیں تھی۔ شاید۔۔۔ بابا جان کے علم میں بھی یہ ایک تجسس سا ہوا تھا کہ وہ اس ڈائری میں کیا لکھتی تھی۔ دیکھنا تو چاہیے انہوں نے سوچا اور جوتے اتار کر آرام سے نیم دراز ہوتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر بیڈ کے سائڈ ٹیبل پر رکھا لیپ روشن کیا اور ڈائری کھول کر پڑھنے لگے۔

نور الہدیٰ جانتے تھے بیچہ کی زندگی میں کئی خلا تھے اور انہیں لگتا تھا کہ بیچہ نے ان خلاؤں میں جینا سیکھ لیا تھا اور ایسا لگنے کی وجہ بھی تھی۔۔۔ نور الہدیٰ نے ہمیشہ اسے پرسکون دیکھا تھا۔

وہ ایسے شوپیس کی طرح لگتی تھی جیسے لوگ ڈرائنگ روم میں سجا کر کھول جاتے ہیں پھر یہ تو بتا رہا تھا ہے کہ ہمیں کبیس ایک شوپیس رکھنا تھا مگر کب کرات دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور وہ شوپیس بھی کبھی اس بے توجہی کا گلہ نہیں کرتا۔۔۔ بابا جان نے کبھی بھی بیچہ کو شوپیس سے زیادہ کی اہمیت نہیں دی۔۔۔ وہ آس پاس سے اڑتا کلن ہے۔۔۔ وہ کس حال میں ہے یہ جاننا ضروری نہیں۔۔۔ نور الہدیٰ کو لگتا تھا بیچہ نے شوپیس کی طرح ہی بابا جان کے ”نولٹ“ والے رویے کو قبول کر لیا تھا لیکن۔۔۔ بیچہ شوپیس نہیں تھی اس نے کبھی کہا نہیں تھا مگر اسے بابا جان کی بے توجہی کا گلہ تھا اور اپنی تھمائی سے شکایت۔

بابا جان کو حاوی رہنا پسند تھا اور بیچہ کے مزاج میں پسائی تھی۔ جب بھی اس کا آہٹا سامنا بابا جان کی سخت گیری سے ہوا اس نے بہت آسانی سے ہار مانتے

سعدیہ راجپوت



پانچویں قسط

مکمل ناوا

ہوئے قدم پیچھے لے لیے اور گراؤ کے امکانات کم کرنے کے لیے اس نے بابا جان کے مزاج کو اپنا لیا تھا لیکن اپنی ذات کی نفی نہیں کر پائی جس نے اس کے اندر کشمکش کو جنم دیا تھا اور یہی کشمکش بلیچہ کی زندگی کی سب سے بڑی تکلیف تھی اور نور الہدی نے اس کی تکلیف کو آج جانا تھا۔ جب اسے اس دنیا کو چھوڑے جو بیس گھنٹے سے زیادہ گزار چکے تھے بلیچہ کی اواسی بلیچہ کی ناراضی بلیچہ کی محرومیاں اب جب کہ نور الہدی اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بلیچہ کی ڈائری کو پڑھ کر ہی نور الہدی کو بلیچہ کی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن قدرت اچانک ہی بلیچہ پر مہربان ہو گئی اور وہ جو ٹھنڈی ہوا کے جھوکے کے لیے ترستی تھی اس کی زندگی میں ایک ساتھ دو دو روزن کھلے تھے۔ ایک نور الہدی فاروقی اور دو سرا وجدان مصطفیٰ نور الہدی اس نام کو پڑھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں تو بھی احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ بلیچہ کی زندگی میں کوئی اور بھی ہے۔

”یہ شخص مجھ سے وہ سب کرا لے گا جو میں کبھی کرنا نہیں چاہتی۔ جسے کرنے کی مجھ میں ہمت بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں دائرے میں قید ہو گئی ہوں جس بھی راستے پر قدم بڑھاؤں گی اس کے آخری سرے پر وجدان کو ہی کھڑا پاؤں گی۔“ بلیچہ کبھی کسی کے لیے بے اختیار بھی ہوتی تھی۔ نور الہدی کو یقین ہی نہیں آیا۔ پھر بلیچہ کے آگے آگے کا بل نور الہدی پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ گیا۔

نور الہدی کے لیے ایک ایک لفظ میں حیرتوں کا جہاں آیا تھا۔ وہ بے اختیار ہی صفحے ملتے چلے گئے اور آنکھیں پھیل گئیں مگر وہ فون گل۔ وہ درک گئے۔ آگے گئے سادہ تھے نہ بھی ہوتے تو نور الہدی میں اب اور ہمت نہیں بچی تھی ڈائری ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڑر جا گری۔ انہیں ایک دم سے ہوا میں آستین کی کمی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر بالکونی میں آگئے۔

”تو کیا بلیچہ وجدان سے محبت کرتی تھی۔“ نور الہدی نے تھک کر بالکونی کی گول سے ٹیک لگا لی اور سر جھکا کر بائیں کندھے سے ذرا نیچے اپنی شرٹ پر کاغذ کے اس نشان کو دیکھا جو بلیچہ کی آنکھ سے بہہ کر ان کی شرٹ میں جذب ہو گیا تھا۔ ان کے داغ پر چھائی دھند بھٹنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نشان پر انگلیاں پھیرتے ان کا ذہن بہت تیزی سے ٹانے ہائے جوڑ رہا تھا۔

ایگزیشن کی رات بلیچہ نے بابا سے وجدان کا ذکر کیا تھا اور ان کی ناراضی کے اظہار پر اس نے کھل کر وجدان سے محبت کا اعتراف کیا تو بابا جان نے اس پر نور الہدی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ مسلط کر دیا۔ بے شک وہ اس بارے میں نور الہدی کا عندیہ بہت دن پہلے لے چکے تھے لیکن بلیچہ کو یہ فیصلہ سزا کی صورت ہی ستایا گیا تھا۔ اب نور الہدی کو سمجھ آ رہا تھا کہ بابا جان نے صرف تین دن کے وقفے سے تاریخ کیوں طے کی تھی۔ وہ بلیچہ کو موقع نہیں دینا چاہتے تھے لیکن بلیچہ نے کسی موقع کا انتظار نہیں کیا اور زندگی میں پہلی بار وہ بابا جان سے اختلاف کی ہولناکی کرتے ہوئے وجدان سے ملنے جا پہنچی۔

اگر وجدان اس دن اسے مل جاتا اور اس کا ساتھ دینے کو تیار بھی ہوتا تو باپ بچی کے بیچ سرورجک کا آغاز ہو جاتا۔ اس جنگ میں جیت کس کی ہوتی کہنا مشکل ہے لیکن پھر بلیچہ کسی بڑی جیت پر وجدان سے دستبردار نہیں ہوئی لیکن وہ وجدان سے نہیں مل پائی اور جب گھر آئی تو سب رشتے دار اس کی مٹکتی میں شرکت کرنے پر آمادہ تھے۔ بلیچہ کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے وہ جو ساری عمر خود پر چڑھ کر کے بابا جان سے بلا مقابلہ ہار مانتی آئی تھی پہلی بار اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے فیصلے کے مخالف اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن قسمت نے اسے اسی فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر اس رات وہ ذہن کس کا تھا۔ نور الہدی سوچنے لگے اور سوچتے

سوچتے ان کے ذہن میں تبصرا کا ہوا۔ ”میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ بلیچہ کو خوش رکھیے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان کا خیال رکھے بغیر آپ رہ ہی نہیں سکتے۔“ انہیں وہ لڑکا یاد آیا جس نے شادی کی رات اسٹیج پر آکر انہیں مبارکباد دی تھی۔ نور الہدی سوچنے لگے انہیں ”ہادی بھائی“ کہہ کر بکارنے والا اجنبی کون تھا جو انہیں اتنی گہرائی سے مانتا تھا۔ نور الہدی کو یہ بھی یاد آیا کہ یہ وہی لڑکا تھا جس نے بلیچہ کے جنازے میں شرکت کی تھی۔ سب لوگ کندھا بدل کر بیٹے جا رہے تھے مگر وہ شخص تمام راستے بلیچہ کی میت کو کندھے پر اٹھائے چلتا رہا اور جب بلیچہ کی تدفین مکمل ہو چکی تو انہوں نے آفاق کو اس سے کہتے

”کیا تم یہاں کچھ دیر ٹھہرنا چاہو گے۔“ اس نے کہا۔

”مجھے روح سے غرض تھی اور یہاں جسم رکھا ہے۔“ ٹھہر کر کہا کروں گا۔ آو آفاق اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ ”وہ کون ہو سکتا ہے جسے بلیچہ کے مرنے پر اتنا دکھ ہوا تھا۔ اچانک ہی ان کے ذہن میں ایک اور جھماکا ہوا۔ وہ حیرتی سے چلتے ایڑل کے سامنے آگئے۔ اپنی یادداشت میں محفوظ چہرے کو نور الہدی نے پورٹریٹ سے ملا کر دیکھا اب شک کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔

وہ شخص وجدان مصطفیٰ ہی تھا اور اگر وہ شادی کی رات قصر فاروقی میں آیا تھا تو مٹکتی کی رات بلیچہ کے لیے آنے والا فون بھی اسی نے کیا ہو گا۔ ”میرا اس وقت تک بات بلیچہ کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔“

نور الہدی نے اپنا چکرانا سر دونوں ہاتھوں میں تمام کر پال منھیوں میں جکڑ کر بھیج ڈالے۔ جو بیس گھنٹوں سے ایک ہی سوال ان کے ذہن میں چکر رہا تھا۔

”بلیچہ کیوں مر گئی۔“ انہیں جواب مل گیا تھا۔ ”کیوں بلیچہ۔۔۔ کیوں۔“ وہ درد کی شدت سے چلا

”تم جانتی تھیں کہ اس کے بغیر مر جاؤ گی تو کیوں کی یہ خود کشی ایک بار تو کہا ہوتا تھا میں وجدان چاہیے۔ خدا کی قسم میں وجدان لاؤں گا۔ کہا تھا تم سے تمہاری سکر اسٹ مجھے اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔“ اسے اعتبار نہیں کیا تا۔ ایک بار تو آنا کر نہیں۔ کیوں مجھے اندھیرے میں رکھا۔ کیوں؟“ نور الہدی جیسا مضبوط انسان جو بلیچہ کو قبر میں اتارتے ہوئے نہیں رویا اب دیوانوں کی طرح چلا رہا تھا۔ قصر فاروقی ان کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

”سب سے کہا وجدان کے بغیر مر جاؤ گی۔ ایک بار تو مجھ سے کہا ہوتا میں نے کب تمہاری خواہش کی تھی۔ کہا تھا کہ دل نہ مانے تو اس رشتے کو توڑ دو پھر کیوں خود کو میرا پابند سمجھا۔“ آنسوؤں سے روئے وہ فرش پر بیٹھ گئے۔

”میرے اور آپ کے بیچ ایک بس بیکار کا فاصلہ ہے۔ میرا نام لے کر بلائیے گا میں آ جاؤں گی۔“ بلیچہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی تھی اور بے اختیار اسے پکارنے لگے۔

”لوٹ آؤ بلیچہ تمہارے بغیر جینا بہت مشکل ہے۔“ نور الہدی ٹرپ ٹرپ کر رہے تھے اور رو کر ٹرپ رہے تھے۔

”تمہاری خوشی کے لیے میں اپنا دکھ بھی سہہ لیتا مگر یہ کیسی سہوں کہ تمہارا دکھ میری خوشی بن گیا۔ تم کو کھنچ لیتی رہیں اور میں خوش ہوتا رہا یہ احساس مجھے عمر بھر چین نہیں لینے دے گا۔“ چمکتی ہوئی چاندنی میں دونوں ہتھیلیاں فرش پر نکلے سر جھکا کر روتے اس شخص کو پھر واقعی عمر بھر چین نہیں آیا۔



وجدان صبح کا نکلا ہوا تھا اور اب رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اس کا کچھ پتا نہیں تھا ویسے رات کو دیر سے آتا اب اس کی روشنی میں شامل تھا اور گھر والے بھی اس روشنی کے عادی ہو چکے تھے اس لیے کھانے

کے بعد چائے پی کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے بس عائشہ ہی وجدان کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ گیارہ بجتے کے بعد وجدان نے گھر میں قدم رکھا۔ دروازہ کھول کر اندر آتے وجدان کو دیکھ کر عائشہ کو لگا انہوں نے وجدان کے ہونے کو دیکھا ہو۔ یوں تو کئی دنوں سے وہ خود کو بھلائے ہوئے تھا لیکن اس وقت اس کی حالت بدترین ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں بے گانگی لے اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ گروجم کر بلیک پنٹ شرٹ کارنگ خاکستری لگنے لگا تھا۔ عائشہ آخریاں تھیں ان کا دل بیچ گیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے وجدان۔“ وجدان نے انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کا بے جان آثار دیکھ کر وہ کٹ گئیں۔

”ایسے کیا دیکھ رہا ہے چل ادھر آ۔“ وہ اس کا بازو پکڑ کر اسے صوفے پر لے آئیں۔

”اچھا طریقہ ہے ماں کو پریشان کرنے کا۔ یہی ضد ہے تاکہ بیچہ سے شادی کرنی ہے یہ لے۔“ انہوں نے اس کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”غلطی ہو گئی کہ تیری بات نہیں مانی۔ تو جیتا میں باری اب خوش۔“ وہ بول کر خود ہی مسکرائیں۔

”اب صبح مجھے اس کے گھر لے جانا اس کے ماں باپ سے شادی کی بات کروں گی اور اس وقت تک چوکھٹ نہیں چھوڑوں گی جب تک وہ ماں نہیں کر دیتے۔“ انجانے میں ہی انہوں نے بھڑکتی آگ پر پیٹرول کی بارش کر دی تھی۔ چپ بیٹھے وجدان کے اندر پلا کے طوفان اٹھے تھے اور وہ ان سے بے خبر کہہ رہی تھیں۔

”میں اپنے بیٹے کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں تب تک تم نما کر پڑے بدل لو ٹھیک ہے۔“ وہ چھوٹے بیچے کی طرح اسے پکڑ کر بوتلیں کھانا گرم کرنے لگیں۔

کاشور اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہا تھا۔
 ”آپ مجھ سے شادی کریں گی۔“
 ”آپ یا تو یا گل ہیں یا دیوانے۔“

”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار میرے بارے میں سوچ لیجیے گا۔“ کیا التجا تھی۔
 ”فیصلہ کرنے کا اختیار کبھی مجھی میرے پاس نہیں رہا۔“ اور کیسی بے بسی تھی۔

”آپ ایک بار اور لاہیر پری جاسکتے ہیں۔“ میں پورا دن آپ کا انتظار کروں گا۔“ مگر وعدہ وفا نہ ہوا۔
 ”بیچے میری طرف سے تحفہ ہے۔“ عشق آتش کیسا اٹو کھا تحفہ تھا۔

وجدان نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر سر گھٹنوں سے لگا دیا مگر آوازیں رنڈنہ ہوئیں۔

”بہت چاہا ہے اسے۔ اتنا کہ اب اس چاہت سے دستبردار نہیں ہوا جاتا۔ اس سے الگ ہونے کا خیال میرے جسم سے بصر کھینچ رہا ہے۔“ وجدان کو کفن میں لٹی بیچہ کا چہرہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا۔
 ”میں قیامت تک آپ کا انتظار کروں گا۔“

قیامت تک کا انتظار اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ وجدان نے تیز ہنسی کی آواز سنی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ ہانپوں میں سر جھکا کر دھرا ہوا بیٹھا رہا۔ اس بار چوڑیاں کھینچنے کی آواز سنائی دی تھی وجدان نے سر اٹھا کر دیکھا تو اسے لاؤنج کے کھلے دروازے سے باہر بیچہ کے پاس چاندنی میں ڈھلا ایک پیکر دکھائی دیا۔ بیچہ کوئی ہاتھ بڑھا کر بارش کے قطروں کو چھیدیں بر جذب کرتا ہے وہ بیٹھلی کو کبھی الٹی کھینچ کر سامنے اپنے ہاتھ پر چاندنی کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

وجدان کی طرف اس کی پشت تھی اور اس کے لمبے گھنے بال پوری طرح اس کی کمر کو ڈھک رہے تھے پھر وجدان پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا مگر حیرت کی وجہ سے اس کا نام وجدان کی زبان سے چند سیکنڈ کی تاخیر کے بعد سرسرائی ہوئی آوازیں نکلا۔

”بیچہ۔“ وجدان کی آواز اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ وہ بیچہ ہی تھی مسکراتی نگاہوں سے ہکا بکا بیٹھے وجدان کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنا ہاتھ اس کی طرف اٹھا دیا جیسے اسے ہاتھ تھامنے کی دعوت دے رہی ہو۔ وجدان بے تاب ہو کر اٹھتا تیزی سے باہر آ گیا پھر جیسے ہی اس نے بیچہ کا ہاتھ تھامنا چاہا وہ شرارت سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ کر ہنسی ہوئی پلٹ کر بھاگی۔

”رکے بیچہ۔“ اس نے آواز دی۔ بیچہ نے پلٹ کر تو دیکھا مگر رکی نہیں اور بھاگی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔
 ”بیچہ پلیز رگ جائیں۔“ وجدان اسے آواز دینا خود بھی گیٹ کی طرف لپکا۔ وہ گیٹ سے باہر نکلا تو بیچہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے سامنے کھڑی شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وجدان چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور وہ مسکراتے ہوئے قدم پیچھے کی طرف لینے لگی۔

”میں کب تک آپ کو بلا رہوں گا اور آپ کب تک مجھ سے دور بھاگی رہیں گی۔“ اب بس کر دیں۔“ وہ بہت کھمکھم کر شکایت کر رہا تھا مگر بیچہ اٹنے پھریں چلتی رہی پھر اچانک ہی وجدان نے اسے روکنے کے لیے لپک کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا اور وہ تیزی سے پیچھے ہٹتی پلٹ کر بھاگنے لگی۔ وجدان بھی اس کے پیچھے دوڑنا چلا گیا۔

عائشہ کھانے کی ٹرے لیے لاؤنج میں آئیں تو وجدان وہاں نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا تو کھلے دروازے سے انہوں نے وجدان کو گیٹ کی طرف بھاگ کر جاتے دیکھا۔ وہ اسے آوازیں لگاتیں دروازے تک آئیں مگر وہ گیٹ سے نکل چکا تھا۔ واپس پلٹ کر انہوں نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ پر آ گئیں۔ انہوں نے سر باہر نکال کر دیکھا تو وجدان بھاگتا ہوا کسی گلی میں مڑ رہا تھا۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں وارننگ دی تھی۔ وہ یکدم پیٹیں اور جتنا تیز دوڑ سکتی دوڑتی ایسے کمرے میں آ گئیں اور سوتے ہوئے

مصطفیٰ عظیم کو بھیج دو اللہ

”اچھے مصطفیٰ صاحب! وجدان کو روکیں وہ کہیں چلا گیا ہے۔“ وہ آگاہیں ملے اٹھ بیٹھے۔

”وجدان آ گیا۔“ انہوں نے کچھ اور ہی سوال کیا۔
 ”ہاں اور چلا بھی گیا ہے۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔“ مصطفیٰ صاحب میرے بیٹے کو میرے پاس لے آئیں۔“ وہ اصل صورت حال کو سمجھ نہیں پائے تھے بس اتنا سمجھ آیا کہ وجدان گھر آیا تھا اور پھر چلا گیا اب عائشہ چاہ رہی ہیں کہ مصطفیٰ عظیم اسے گھر لے کر آئیں۔ وہ بہت سے سوال کرنا چاہتے تھے کہ وجدان کیوں اور کہاں گیا ہے اور اگر چلا گیا ہے تو پریشانی کی کیا بات ہے واپس آجائے گا مگر جس طرح عائشہ مصطفیٰ کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے انہیں احساس ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اور ان کے پاس سوال کا وقت نہیں انہیں فوراً وجدان کے پیچھے لکھنا چاہیے۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نائٹ ڈریس پہنے ہی سلیم پیر پاؤں میں اڑتے وہ باہر بھاگے۔ عائشہ بھی باہر آ گئیں اور اپنے کمرے کے ساتھ والا دروازہ پیتے ہوئے منزل کو آوازیں دینے لگیں۔ مصطفیٰ عظیم ان کی طرف دھیان دیے بغیر باہر نکلتے چلے گئے۔ ان کی اور منزل کی کاریں پورج میں کھڑی تھیں اور وجدان کی بانٹیک بھی اس کا مطلب وہ پیدل ہی گیا ہے۔ تیزی سے سوچتے وہ اس کی تلاش میں خود بھی پیدل ہی نکل پڑے۔ دروازہ کھول کر منزل نے اپنی ماں کے حواس باختہ چہرے کو دیکھا تو فکر مندی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے امی؟“

”وجدان کہیں چلا گیا ہے۔ جاؤ منزل اسے ڈھونڈ کر لے آؤ۔“

”کہاں چلا گیا ہے اور پریشان کیوں ہو رہی ہیں وہ بیچہ نہیں ہے واپس آجائے گا۔“

”میرا دل کہہ رہا ہے منزل وہ واپس نہیں آئے گا تم جا کر اسے لے آؤ۔ تمہارے ابو بھی گئے ہیں۔“

”کیا کچھ ہوا ہے جو وہ چلا گیا۔“ منزل کو یہی سمجھ

میں آیا کہ شاید وجدان کی ماں باپ سے کوئی بات ہوئی ہے اور وہ جھگڑا کر کے چلا گیا۔ ورنہ عائشہ اتنا پریشان کیوں ہوتیں۔

”مجھے نہیں پتا کہ کیا ہوا ہے لیکن کچھ ہوا ضرور ہے جب وہ آیا تو اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے ویر مت کرو منزل جاؤ جا کر اپنے بھائی کو ڈھونڈو۔“ وہ رونے لگیں تو منزل کے پیچھے کھڑی حیران ہوتی انبیہہ آگے نکل کر ان کے پاس آئی اور انہیں ساتھ لگا کر چپ کرنے لگی۔

”امی پلیز آپ رو میں تو مت میں جا کر اسے لاتا ہوں۔“ ان کے رونے پر اس نے پریشان ہو کر کہا پھر اندر سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

گاڑی لے کر گلیوں میں گھومتے منزل کو وجدان تو نہیں ملا لیکن مصطفیٰ عظیم مل گئے اس نے کار روک کر انہیں ساتھ بٹھالیا پھر دونوں باپ بیٹے گلیوں کو چھوڑ کر مین روڈ پر وجدان کو تلاش کرنے کے لیے نکل گئے وہ گھنٹے کی تلاش کے بعد وہ نامراد لوٹ آئے۔

”وجدان نہیں ملا۔“ عائشہ کے سوال پر مصطفیٰ عظیم کو لگا وہ اچانک ہی بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ شکستہ انداز میں گرون جھکا کر بیٹھ گئے۔

”انتظار کر کے دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے صبح تک وہ خود ہی آجائے۔“ انبیہہ نے مرحصائے چہروں پر امید جگائی چاہی۔

”میں وجدان کے دوستوں کو فون کرتا ہوں۔“ کسی کو مخاطب کیے بغیر کہہ کر منزل اٹھا اور نیلیفون اسٹینڈ سے ڈائری اٹھا کر اس میں سے وجدان کے دوستوں کے نمبر تلاش کرنے لگا۔ سب سے پہلے اسے آفاق کا نمبر نظر آیا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”نہیں منزل بھائی وجدان یہاں تو نہیں آیا بلکہ میں نے خود اسے آپ کے گھر ڈراپ کیا تھا۔“

”اچھا۔“ ان کی آواز ست ہو گئی۔

”منزل بھائی ایسا کرتے ہیں میں آپ کی طرف آجاتا ہوں پھر مل کر اسے ڈھونڈتے ہیں۔“ آفاق واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

”بقی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ ابو اور میں اسے تلاش کر رہے ہیں پھر تمہاری اپنی سہیلی کرانسس سے گزر رہی ہے۔ امی نے بتایا تھا تمہاری کزن کے بارے میں سن کر واقعی افسوس ہوا۔“ آفاق لب کاٹنے لگے۔

”اچھا میں باقی دوستوں کی طرف زانی کرتا ہوں شاید وہاں مل جائے اور اگر وہ تمہاری طرف آئے تو فون کرو پتا۔“

”جی منزل بھائی ویسے کہنے کی ضرورت نہیں میں سمجھ سکتا ہوں آپ اس وقت کتنے پریشان ہوں گے۔“

”اللہ حافظ۔“ دوسری طرف سے لائن ڈس کنیکٹ ہو گئی تو آفاق نے ریسیور کرڈیل کر ڈال دیا۔

سیرا کو اچانک ہی وہ بہت تھکا ہوا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کے پاس آئی اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ آفاق اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

”سمجھ نہیں آ رہا یہ سب کیا ہو رہا ہے پہلے بیچہ کی طرف سے بری خبر ملی اب وجدان کی طرف سے دوسرا لگ گیا ہے۔“

”کیا ہوا۔“ سیرا نے سہم کر پوچھا۔

”وجدان گھر سے چلا گیا ہے۔“

”تو کیا ہوا واپس آجائے گا۔“

”تم سمجھ نہیں رہی ہو وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے مجھے تو ڈر ہے کہ وہ کبھی کوئی حماقت نہ کر بیٹھے۔“

آفاق پریشان تھا وجدان کے لیے اور جب کچھ نہ سوچا تو گاڑی لے کر وجدان کی تلاش میں نکل پڑا۔



بابا جان کو بیچہ کے مرجانے پر اتنی حیرت نہیں ہو رہی تھی جتنی اسے زندہ ہونے پر ہو رہی تھی۔ سر چیخڑ کی پشت سے لگا کر بیچہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے لٹ جانے کا سوگ مناتے رہے۔ نیا دن طلوع ہو رہا تھا لیکن بابا جان کی زندگی کے اندھیروں کو روشن کرنے

جتنی طاقت اب کسی سورج میں نہیں تھی۔ دستک دے بغیر نور الہدی دروازہ کھول کر اندر آئے تھے اور چلتے ہوئے بابا جان کے سامنے جا کھڑے ہوئے بابا جان نے ان کی طرف دیکھا اور انہوں نے بابا جان کے بچکے چہرے کو۔

”آپ کیوں رو رہے ہیں بابا جان۔“ انہوں نے حیرت سے استفسار کیا۔

”بیٹی کی موت کا دکھ تو آپ کو ہو نہیں سکتا کیا یہ خوشی کے آنسو ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ ان کی تو جیسے کسی نے گرون پر چھری پھیر دی ہو۔

”مر جاؤ گی تو تمہیں اندر صوفوں پر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے دفن آؤں گا۔“ نور الہدی ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ بابا جان نے سانس تک روک لیا۔

”بہت شوق تھا آپ کو اسے دفن کرنے کا کہجے اسے دفن کر کے کیا لگ رہا ہے۔“ وہ نور الہدی کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن نور الہدی کو ان پر رحم نہیں آیا۔

”کیا آپ مجھے اس کا گناہ بتائیں گے جس کی پاداش میں آپ نے اس پر زندگی حرام کر دی۔“

”بس کرو نور الہدی۔“ وہ برداشت نہیں کر سکے۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور کرتا بھی کیوں آخر وہ میری بیٹی تھی۔“ نور الہدی جج کر بولے۔

”بیٹی تو میں آپ سے پوچھتا چاہتا ہوں بابا جان کہ آخر وہ آپ کی بیٹی تھی پھر کیوں آپ نے اپنی ہی بیٹی کو مار ڈالا۔“ بابا جان حیرت کی زیادتی سے گنگ رہ گئے پھر اس الزام پر سر پٹا۔

”چاہو تو مجھے جان سے مار دو نور الہدی لیکن مجھ پر اتنا بھیانک الزام مت لگاؤ۔ میں نے بیچہ کو نہیں مارا اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

”اور بیچہ کو ہارٹ اٹیک کیوں ہوا تھا۔“ وہ برہیلے لہجے میں سوال کر رہے تھے۔

ایک کا سبب بنی۔“ مسرود آواز اور بے تاثر چہرہ۔ ان دو چیزوں کے ساتھ بابا جان نے بہت سے لوگوں کو بے بس کیا تھا آج وہ خود ان دونوں کے آگے بے بس ہو گئے تھے۔ ان کا واپس ہاتھ دونوں ہاتھ میں لے کر دھیرے دھیرے کہنے لگے۔

”بیچہ کیوں مر گئی۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے آپ کو ایک اعتراف کرنا ہے اور اس اعتراف کے بعد ہو سکتا ہے بیچہ تو آپ کو معاف کر دے لیکن بابا جان میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ قیامت تک تو کیا اس کے بعد بھی میں آپ کو معاف نہیں کروں گا۔“

اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں اور اٹھ کر باہر نکل گئے۔ بابا جان ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھے پھر ان کا دھیان اپنی گود میں رکھی ڈائری کی طرف گیا۔ انہوں نے ڈائری اٹھا کر کھولیں پھر پڑھنے لگے۔

ڈائری کیا تھی ان کے جرائم کی فہرست تھی۔ انہیں لگا وہ کٹہرے میں کھڑے ہیں اور تندہ تیز لہجے والا وکیل بھری عدالت میں ان کے جرائم کی فہرست پڑھ کر سنا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو قید تھالی بخشی تھی۔ انہوں نے ہر قدم پر اس کے جذبات مجروح کیے اور آخر بات وہاں تک آچنی جہاں انہوں نے بیچہ کو ایسے دورا ہے کی طرف دھکیل دیا جہاں آکر بیچہ پر زندگی مشکل اور موت آسان ہو گئی۔ الزام کڑے تھے لیکن بابا جان کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ ہر الزام سچا تھا اور ہر جرم حقیقت اعتراف کے سوال اور کیا راستہ تھا۔ ڈائری ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گود میں گری پھر سرک کر ان کے پیروں پر اوندھی جا پڑی۔

بچھتوے سے زیادہ لذت کسی احساس میں نہیں اور اعتراف سے زیادہ کرب انگیز کچھ نہیں ہوتا۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ چلانے لگے۔

”میں نے بیچہ کو مار ڈالا۔ میں نے اپنی ہی بیٹی کی جان لے لی۔ کوئی ہے جو مجھ جیسے ظالم باپ کی گردن اتار دے جس نے اپنی لولاد کا خون کیا ہو۔ مار ڈالا میں نے اپنی بیٹی کو اپنی بیٹی کا قاتل ہوں میں میری بیچہ میرے ہاتھوں مر گئی تو کون مجھے مار ڈالو۔“ ان کی آواز

کمرے کی دیواروں سے لگرا کر گونجتی ہی رہی۔

”وہ جو اندر ہیں۔“ اس نے پگھلنے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ چھوٹے نے ڈر کے مارے تالا ہاتھ سے چھوڑ دیا اور دروازے سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”دروازے پر تو تالا ہے پھر کوئی اندر کیسے جائے گا۔“ چاچا بولا۔

”وہ دروازے سے نہیں گئیں۔“

”پھر۔“ چاچا نے چونک کر پوچھا۔

”وہ وہاں سے اندر گئی ہیں۔“ چاچا اور چھوٹے نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا تو ہنس پڑے۔

”اوتے وہ یہاں سے اندر گئی ہیں کمال ہو گیا۔“

چاچا نے اس روشن دان کی طرف دیکھ کر ہنسنے ہوئے کہا۔ جس میں سے کوئی بچی بھی مشکل سے گزرتی اور اس کی باتوں سے تو لگتا تھا وہ کسی خاتون کا ذکر کر رہا ہے۔

”ہاں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”تم انہیں بتانا نہیں کہ میں یہاں ہوں اگر انہیں بتا چلا تو وہ بھاگ جائیں گی۔“

”چل نہیں بتاتے رہا مارے ملنے پر تو پابندی نہیں ہے اوچھوٹے تالا کھول۔“ وہ بدستور مذاق اڑاتے ہوئے چھوٹے سے بولا جس نے تالا کو کھول دیا لیکن دروازہ بھڑار نہ دیا۔

”تو اسی لیے چھوٹا ہے۔“ چاچا اس کے خوف پر اسے ملامت کرتا پگھلنے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

چھوٹا بھی خوفزدہ ہوتا ہوا اندر آیا پھر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ اس نے کچھ کا ساما کر لیا اور چار پائیاں باہر پھیلانے لگا۔

پگھلنے کے دروازے میں ہو کر اندر جھانکا پھر انہیں نہ پا کر وہ پگھلنے میں چلا گیا۔

”وہ کمال چلی گئیں۔“

”اوپر آیا یہاں کوئی نہیں ہے۔“

”نہیں وہ ادھر ہی نہیں میں نے خود دیکھا تھا وہ سڑک کر اس کے یہاں آئیں پھر تندور پر چڑھ کر انہوں نے روشندان سے اندر چھلانگ لگالی۔ وہ ضرور مجھ سے

چھپ رہی ہیں۔“ اس نے کہا پھر پٹلیں اٹھا کر دیکھا اور نگلاں جھاڑتا ہوا انہیں ایسے تلاش کرنے لگا جیسے سوئی ہوں۔

”دیکھ روشندان سے چھلانگ لگا کر اندر آئی تھی اب روشندان سے چھلانگ لگا باہر چلی گئی ہوگی۔ ایسا کر تو اسے باہر جا کر ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔“ اس نے پکڑ کر کہا۔

”اور وہ بھی ان کو نہ پا کر ایسے ہو گیا تھا۔ وہ باہر آ گیا اور سڑک پر آنکھیں جھماکھا کر دیکھا جیسے اندازہ کرنے لگا کہ وہ کدھر گئی ہوں گی پھر ایک سمت پانچن کر کے وہ دوڑ پڑا۔ جوتے نہ جانے کب اس کے پیروں سے نکل گئے تھے ویسے بھی رات بھر بھاگنے کے بعد اب اس کے زخمی پاؤں ہونے کے قابل رہے بھی نہیں تھے وہ سڑک پر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔“

”چاچا کون تھا۔“ چھوٹے نے سوال کیا۔

”باقی تھا بے چارہ۔“ چاچا نے کہا کہ چار پائی اٹھالی چھلانے کے لیے باہر لے آیا۔



رات اتفاق کے آنے کے بعد ساجد بھی جلد ہی پہنچ گیا تھا ساری رات وجدان کی تلاش جاری رہی۔ دستکبھ ہوئی رہی فون بجتے رہے مگر لا حاصل۔

”اتنا تو بتا دو عائشہ کہ آخر ہوا کیا تھا۔“ مصطفیٰ عظیم کے لہجے میں بھی تنہا تھی۔

”کتی بار کہوں مصطفیٰ صاحب کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جب گھر آیا تو پہلے سے ہی پریشان تھا بلکہ وہ تو کئی دنوں سے میسر والے معاملے پر اب سیٹ تھا مجھ سے دیکھا نہیں گیا اور اس سے کہا کہ وہ میسر سے شادی کر لے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے پھر میں اس کے لیے کھانا لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا اور بس اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ لیکن اتفاق کو بہت کچھ معلوم تھا اس نے میسر کے نام پر ان کو دیکھا پھر سر جھکا کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

”ابو میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں اسپتالوں میں بھی دیکھ لینا چاہیے ہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔“ کچھ دن پہلے

”نہیں وہ ادھر ہی نہیں میں نے خود دیکھا تھا وہ سڑک کر اس کے یہاں آئیں پھر تندور پر چڑھ کر انہوں نے روشندان سے اندر چھلانگ لگالی۔ وہ ضرور مجھ سے

”ابو میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں اسپتالوں میں بھی دیکھ لینا چاہیے ہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔“ کچھ دن پہلے

”ابو میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں اسپتالوں میں بھی دیکھ لینا چاہیے ہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔“ کچھ دن پہلے

”ابو میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں اسپتالوں میں بھی دیکھ لینا چاہیے ہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔“ کچھ دن پہلے

کے واقعے کو نظر میں رکھتے ہوئے منزل نے کہا تو ساجد تائید کرنے لگا۔

”پالنگل کھانگ کما منزل بھائی ہمیں اس امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“

”دو پھر چلیں۔“ اتفاق کھڑا ہوتے ہوئے بولا تو باقی بیویوں بھی فوراً ہی اٹھ گئے پھر شہر کا کوئی اسپتال اور کلینک ایسا نہیں بچا تھا جہاں ان لوگوں نے وجدان کو تلاش نہ کیا ہو۔ لیکن وہ کہیں نہیں ملا گھر لوگے پر ان کے مایوس چہروں کو دیکھ کے عائشہ نے نم آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے مصطفیٰ صاحب میں ماں ہوں پھر بھی جس وقت سے آپ گئے ہیں مستقل دعا کر رہی تھیں کہ کاش میرے بیٹے کا ایک سیدنت ہو گیا ہو۔ اور آپ باپ ہو کر بھی بیٹے کو لیے بغیر آ گئے ہیں۔“

مصطفیٰ عظیم نے ان کی طرف دیکھا پھر نظر جراتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کسی خیال کے تحت منزل نے انہیں کو مخاطب کیا۔

”انہی تم ذرا دھیان سے وجدان کے کمرے کی تلاش کرو شاید وہ اپنا کوئی سرانچ چھوڑ گیا ہو۔“

”آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں یہ کام کر چکی ہو اور مجھے اس کے کمرے سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی البتہ۔“ اتنا بول کر وہ چپ ہوئی تو منزل فوراً بولا۔

”کیا ہے؟“

”وجدان کا NIC اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور چیک بک وغیرہ سب غائب ہیں۔ میں نے باقی جگہ بھی چیک کیا ہے مگر کہیں نہیں ملے۔“ وہ جو کہنا چاہتی تھی سب مل میں سمجھ گئے۔

”اس کا مطلب وجدان اپنے ضروری ڈاکو منٹس اور چیک بک ساتھ لے گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو وہ جہاں بھی گیا ہے یقیناً وہاں ہی کے ارادے سے نہیں گیا۔“

ساجد پریشان کن لہجے میں بولا مصطفیٰ عظیم تو کچھ کہنے کے لائق ہی نہیں رہے تھے اور عائشہ بھی روپے میں منہ چھپا کر سکھنے لگیں۔ اتفاق نے انہیں سے پوچھا۔

”اس کے استعمال کی چیزوں میں سے اور کیا کچھ

”اس کے استعمال کی چیزوں میں سے اور کیا کچھ

”اس کے استعمال کی چیزوں میں سے اور کیا کچھ

”اس کے استعمال کی چیزوں میں سے اور کیا کچھ

”اس کے استعمال کی چیزوں میں سے اور کیا کچھ

عاقبت ہے۔
 ”اور تو کچھ بھی نہیں۔ اس کے کپڑے جوتے اور باقی سلمان سب اپنی جگہ پر ہے بلکہ مجھے اس کا وارث بھی اس کے بیڈ کے ڈرائز میں رکھا ملا تھا اور تو اور وہ بیڈ کی تصویریں بھی گھر پر چھوڑ گیا ہے۔“
 ”بیڈ کی تصویریں؟“ ایک دم ہی اتفاق کے حلق سے حیرت بھری آواز نکلی۔

”ہاں۔“ لفظ نے کہا پھر ایک لفافہ آگے بڑھاتے ہوئے۔
 ”یہ مجھے وجدان کی کتابوں میں رکھا ملا تھا۔“ اتفاق سے پہلے منزل نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے کر تصویریں نکالیں اور ایک تصویر پکڑ کر باقی مصطفیٰ عظیم کے ہاتھ میں دے دیں۔ ساجد نے ان کے ہاتھ سے وہ تصویریں لے کر ایک اتفاق کو دی اور ایک خود دیکھنے لگا۔ چلی نظر میں ہی وہ پہچان گیا کہ یہ وہ تصویریں تھیں جو وجدان نے اس کے گھر سے کھینچی تھیں مگر اسے ترسوا ہوا یہ کیسے معلوم ہو کہ یہی بیڈ ہے۔ عاقبت مصطفیٰ نے تصویروں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے وہ یقیناً یہ تصویریں پہلے ہی دیکھ چکی تھیں۔
 ”تم کسے کہہ سکتی ہو کہ یہ بیڈ کی تصویریں ہیں؟“ مصطفیٰ عظیم نے وہ سوال کیا جو سب کے ذہنوں میں تھا۔

”میں بیڈ سے مل چکی ہوں۔“ اس نے ہم پھوڑا تھا۔ سب کے منہ حیرت سے کھل گئے منزل نے سر راتے لہجے میں پوچھا۔
 ”کب؟“ وہ بتانے لگی۔

”جس دن وجدان کا ایک سڈنٹ ہوا تھا وہ وجدان سے ملنے گھر آئی تھی اور اس نے خود بتایا تھا کہ وہ بیڈ فاروقی ہے پھر اپنا نمبر دے کر کہا تھا کہ وجدان سے کہوں اسے کل کر لے لیکن میں نے اس سے نمبر لے کر بھاڑ دیا۔“

”ویسے اب تو یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ وجدان گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“ بے دل سے بیڈ کی تصویر پھیل پڑا لے منزل کے لہجے میں ایسی تھی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں پولیس کی مدد لینی چاہیے شاید وہ اسے ڈھونڈ سکیں۔“ مصطفیٰ عظیم کے چہرے پر درانی مستقل ڈیرہ ڈال چکی تھی وہ کمزور سے لہجے میں کسی کو مخاطب کے بغیر بولے تھے۔

لاؤنج میں بیٹھا ہر شخص ان کے اندر کی جھلک کو محسوس کر کے سر جھکا گیا پر شانی سے ہونٹ کاٹتے ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وجدان سے ان کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ سانحہ واقعی بہت عظیم تھا۔ شوہر کو نا امید ہوتے دیکھ کر عاقبت کی اپنی طاقت بھی کمزور پڑ گئی تھی انہوں نے اپنی آنکھوں کو جھلکنے سے باز رکھنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی ان کو روتے دیکھ کر منزل کی افسردگی گہری ہو گئی۔ اسے بیک وقت وجدان پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کے لیے بڑے بھائی کی طرح پریشان بھی ہو رہا تھا مصطفیٰ عظیم طویل خاموشی کے بعد ٹھکے ہوئے لہجے میں بولے۔

”تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا ہے عاقبت۔“ انہوں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بے بسی سے بولیں۔

”مگر میں تو اجازت دے چکی تھی مصطفیٰ صاحب پھر کیوں؟“ بات ادھوری پھوڑ کر وہ آسویں پٹنے لگیں۔



”دھڑکنس ختم جاتی ہیں ماسٹرس رگ جاتی ہیں مگر وقت نہیں رگتا۔“ نور اللہ دی نے سوچا آج بیڈ کا سوئم بھی ہو گیا تھا۔

”تم بہت بڑے ہو جاؤ ہو نا منیر حسین ایک بات بتاؤ گے۔“ بابا جان پر چھٹی جگہ بیٹھے بابا جان نے اپنے بارے میں منیر حسین سے سوال کیا۔
 ”میں بھائی صاحب۔“ وہ بولے۔

”اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے باپ کو یہ حق ہوتا ہے کہ اگر چاہیں تو اپنی اولاد کے قاتل کو معاف کر دیں لیکن اگر باپ ہی اپنی اولاد کا قاتل ہو تو خون کون معاف کرے گا۔“ منیر حسن ان کے سوال پر

حیران ہوتے بولے۔
 ”مجھے کیا ہاں۔“
 ”اور اگر میں پہلے ہی مر چکی ہوتی۔“
 ”آپ اس طرح کی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں بھائی صاحب۔“

”کیونکہ میں معافی مانگنا چاہتا ہوں لیکن جن کا گناہگار ہوں نہ مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہے اور نہ ان سے معافی مانگنے کی امید۔ میں جانتا چاہتا ہوں کہ ان کے سواہ کون شخص ہے جو مجھے جان کر سکتا ہے۔“ ایک دم ہی ان کی آواز میں لرزش آئی اور آگے سے آنسو بہنے لگے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے نور اللہ دی نے اپنے منہ سے کچھ لہجے اور لا تعلق سے گردن موڑ کر وہ سنی طرف دیکھنے لگے۔

”ایسا کیا گناہ لیا ہے آپ نے؟“ منیر حسن حیرت سے پوچھ رہے تھے۔ بابا جان نے اپنے کانپتے ہونٹوں سے لڑکتے لہجے میں بولا۔

”میں نے بیڈ کو قتل کیا ہے۔“ اس انکشاف کو سن کر سب منہ کھولے حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔
 ”آپ جانتے ہیں بھائی صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ افتخار سرسرائی آواز میں بولے۔

”ہاں مگر تم نہیں جانتے افتخار کہ کیسے میں نے اپنی خود پسندی ضد اور ہٹ دھرمی کا سلو پوائزن وے کر بیڈ کو مار ڈالا، کیسے اپنے فیصلے کی الٹی چھری سے اس کی شہہ رگ کاٹنی ہے، کس طرح اپنی انا کے ہاتھوں اس کے دل کا گلا گھونٹا ہے۔ ایک بل کی موت نہیں دی اسے بل بل اس کے جسم سے کھینچی ہے۔ تریا تریا کر مارا ہے اسے اپنی بیٹی کو لہجہ کوہ کی لذت بخشی ہے۔“ نور اللہ دی کے لیے ان کا اعتراف بھی ناقابل برداشت تھا وہ غیر محسوس انداز میں اٹھے اور باہر نکل گئے۔
 ”لیکن کیوں؟“ افتخار حسن حیرت سے سوال کر رہے تھے۔

”آخر بیڈ سے کیا گناہ سرزور ہوا تھا۔“ بابا جان تڑپ کر بولے۔
 ”میری بیٹی معصوم تھی افتخار حسن اس کے نام

اعمال میں کوئی گناہ درج نہیں۔ ہاں۔ مگر میں نے محبت کو اس کا گناہ چاہا۔“
 ”محبت؟“ آمنہ خالہ نے دوہرایا۔
 ”ہاں محبت کسی بیٹی نے محبت کی تھی۔“
 ”کس سے۔“ بابا جان نے بڑی مہملی کو دیکھا اور کہا۔

”وجدان مصطفیٰ سے۔“
 ”کیا؟“ سمیر اور اتفاق کے سوا ہر شخص شاکڈ رہ گیا تھا بے ساختہ سب کی نگاہوں میں بیڈ کا جنازہ اٹھانے وجدان کا چہرہ گھوم گیا۔

”میں بیڈ کی شادی نہیں کر رہا تھا افتخار بلکہ اپنی بیٹی کی موت کا وقت دن اور تاریخ طے کر رہا تھا۔“ ان کی آواز اکھرنی اور وہ کانپتے لہجے میں بولے۔
 ”اور وہ گھوڑا موت نے ایک بل کی بھی تاخیر نہیں کی۔“ پھر وہ بلند آواز میں روتے ہوئے بے بسی سے کہنے لگے۔

”میری بیڈ کو کوئی ڈھونڈ لائے میں اس کے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگنا چاہتا ہوں۔“
 افتخار حسن کا اپنا دکھ کچھ کم نہیں تھا جس کے چہرے میں اپنی مرحومہ بسن کا عکس دیکھتے تھے وہ آئینہ ٹوٹ گیا تھا۔ انہیں خود بھی بیڈ سے بڑی محبت تھی وہ جب بھی بابا جان کو دیکھتے تھے انہیں ان پر ترس آتا تھا۔ اللہ نے کتنی دیر سے اولاد دے کر کتنی جلدی واپس لے لی تھی مگر اب ان کے دل میں بابا جان کے لیے کوئی ہمدردی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ یوں بے حس نگاہوں سے انہیں روتے ہوئے دیکھ رہے تھے جیسے ان کے آگے تماشا چل رہا ہو۔

”کس امید پر معافی کی بات کرتے ہیں بھائی صاحب۔“ وہ سروں کے لیے بولے۔
 ”جب آپ نے اپنی ہی بیٹی کی بے گناہی نہیں بخشی تو کوئی آپ کے گناہ کیسے بخش سکتا ہے۔ مجھ میں تو اتنا ظرف نہیں کہ اس بے حس پر ترس کھاؤں جس نے اپنی اولاد پر ترس نہیں کھایا۔ کیا آپ میں اتنا ظرف ہے کہ خود پر ترس کھائیں خود کو معاف کر

سکیں۔ ”باباجان نے مجرموں کے انداز میں سر جھکا لیا۔
 ”جب آپ خود کو معاف نہیں کر سکتے تو بتائیں کوئی
 اور آپ کو کیسے معاف کرے گا۔“ وہ رکے پھر ٹوٹے
 ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔

”میں جانتا تھا آپ خود پسند ہیں اپنی اپنی ضد
 آپ کو ہر چیز سے پیاری ہے مگر میں سوچتا تھا آخر آپ
 یلیمہ کے باپ ہیں جو کچھ اس کے لیے آپ کے دل میں
 ہے کسی کے دل میں نہیں ہو سکتا میں متنازع صحیح تھا جو
 سنگ دلی یلیمہ کے لیے آپ میں تھی وہ اور کسی میں
 نہیں۔“ وہ بول کر چپ ہو گئے تو باباجان کہنے لگے۔

”رک کیوں گئے افتخار مرنے والی سے تمہارا خون کا
 رشتہ تھا کو سوچتے دے دے کر مار ڈالو۔ ہاتھ اٹھاؤ
 اور بدعا مانگو میرے لیے۔ کوئی ایسی سزا منتخب کرو جس
 سے میری روح کا نپ جائے۔“

”سزا کا انتخاب ہو چکا ہے بھائی صاحب۔“ آمنہ
 خالہ شعلہ بارنگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”اب آپ عمر بھر خود کو کو سیں گے۔ اپنے خالی
 دامن کو پھیلا کر خود کو بد دعائیں دیں گے۔ آپ کا
 نقصان آپ کو یاد آ کر آپ کی روح کو تڑپائے گا آپ
 کا گناہ جتنا بڑا ہے اس کے لیے یہی سزا مناسب ہے کہ
 آپ عمر بھر خود سے معافی کی بھیک مانگتے رہیں اور عمر بھر
 خود کو معاف نہ کر سکیں۔“ باباجان کا چہرہ لٹھے کی مانند
 سفید پڑ گیا تھا۔ افتخار حسن اٹھ کھڑے ہوئے تو سب
 ان کی تقلید میں اٹھ کر جانے لگے۔

”تم مجھے معاف کیے بغیر نہیں جا سکتے افتخار۔“ وہ
 حواس باختہ سے اٹھ کر ان کے پاس آئے۔

”اور میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“ افتخار
 حسن نے ہمیشہ انہیں احرام دیا تھا۔ ان سے بات
 کرتے ہوئے ہمیشہ نظر جھکا کر رکھتے تھے مگر آج ان کے
 دل میں باباجان کا احرام ختم ہو چکا تھا وہ بد حالگی سے
 بول کر ان کا ہاتھ جھٹکتے آگے بڑھ گئے۔

”رک جاؤ منیر حسن۔“ باباجان نے اب کے ان کا
 بازو تھاما۔

”آپ کس رشتے سے مجھے روکتے ہیں بھائی

صاحب۔ میری بہن کو گزرے برسوں بیت گئے
 آج اس کی بیٹی بھی مر گئی۔ اب آپ کا ہم سے
 واسطہ جائے بھائی صاحب اللہ آپ کو آپ کے عذاب
 مبارک کرے۔“ وہ سختی سے ان کا ہاتھ جھٹک کر ہاتھ
 نکل گئے اور ان کے پیچھے یلیمہ کی ممانیاں، خالہ اور لڑائی
 کزنز بھی اب قصر فاروقی میں ان کا کھار کھا تھا۔

نور الہدی لان میں نکل رہے تھے ان لوگوں کو
 اندر سے نکل کر گاڑیوں میں بیٹھتے دیکھ کر وہ حیرتیز چلے
 پورج میں آگئے۔ افتخار حسن بیٹھنے کے لیے دروازہ
 کھول چکے تھے۔

”ماموں جان۔“ نور الہدی نے پیچھے سے آکر
 دروازہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ افتخار حسن پلٹ کر انہیں دیکھنے
 لگے۔

”بولو نور الہدی۔ ویسے لگتا تو نہیں کہ اب سننے کو
 کچھ باقی بچا ہے۔“ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی
 نور الہدی خود کو مجرم سمجھنے لگے انہوں نے سر جھکا لیا
 اور صفائی دینے کے انداز میں آہستہ سے بولے۔

”میں لاعلم تھا ماموں جان۔“
 ”جانتا ہوں۔“ ان کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

نور الہدی ان کا چہرہ دیکھ کر تپتی انداز میں بولے۔
 ”مجھ سے اپنا رشتہ مت توڑیے ماموں جان۔“

”تم سے میرا رشتہ ہی کب تھا؟“ وہ اچانک ہی
 سفاک ہو گئے۔

”اور جس سے رشتہ سادہ اب نہیں رہی۔ ہاں
 موت باقی تھی لیکن اب موت تمہارے کا جو صلہ کہاں
 سے لائیں۔“ نور الہدی اب قصر فاروقی میں
 میرے لیے کچھ نہیں بچا سب ٹھکانے لگ چکا ہے۔“

”آپ باباجان سے ناراض ہیں۔“
 ”معم نہیں ہو۔“ انہوں نے پلٹ کر سوال کیا۔
 ”ہوں۔“ ہونٹ دبا کر بولتے وہ سراقہ میں ہلانے
 لگے۔

”لیکن انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“ وہ نور
 الہدی کو دیکھ کر کہنے لگے۔

”اللہ حافظ۔“ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے

نور الہدی دو قدم پیچھے بٹے اور وہ گاڑی نکال کر لے
 گئے وہ کھڑے پورج کی نشین کو کھورے تھے پھر انہیں
 جان کا خیال آیا تو اندر آگئے مگر ان کے قدم انٹرنس
 آگے نہ جا سکے گلاس وال کے دوسری طرف
 آج میں باباجان اپنے سر کو بالوں میں چھپائے بیٹھے یلیمہ
 کا دل طلب کر کے کہہ رہے تھے۔

”معم کیا مجھ سے منہ موڑ کر ملی گئیں ہر کوئی مجھ سے
 ۔ موڑ رہا ہے۔۔۔ یہ کیسی روایت ڈال گئی ہو۔۔۔ یہ کسی
 راہے کہ کوئی مجھے سزا کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔۔۔
 سزا ملتی ہے نہ معافی۔ کفار سے اول ہو۔“

نور الہدی بت کی طرح اسے کھڑے تھے۔ ان کے
 دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ ایک طرف ان کا دل
 ہاتھ رہا تھا کہ جا کر باباجان کو دیکھ لے میں دوسری طرف جی
 رہتا تھا ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں۔ ایک
 است آگے کو پہنچ رہی تھی دوسری پیچھے کو۔ وہ کشمکش
 کے سوچ سوچ کر ان کا دل غصے لگا تو بے
 کسی سے دل ہی میں دل میں باباجان کو مخاطب کر کے
 بولے۔

”فکر مت کریں باباجان میں آپ کو سزا دیں گا۔
 ہی سزا جو آپ نے عمر بھر یلیمہ کے ساتھ روا رکھی۔“
 اور بڑی بے اعتنائی سے وہ چلتے ہوئے باباجان کے پاس
 سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ روتے ہوئے بابا
 جان نے سراسر انہیں دیکھا اور حیرت سے سوچنے
 لگے۔

”بے حسی کی صفت نور الہدی میں تو نہیں تھی۔“

”ہکاش تم نے پہلے بتا دیا ہوتا اتفاق تو شاید یہ سب نہ
 ہوتا۔“

”تب بھی یہی ہوتا آیا ابو۔ آج پھوپھا جان کی جو
 حالت ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ یلیمہ اب اس دنیا
 میں نہیں لیکن اگر وہ زندہ ہوتی تو پھوپھا جان کسی بھی
 نسبت پر وجدان کو قبول نہیں کرتے ان کی سخت طبیعت

کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور رو گئی یلیمہ تو کون
 نہیں جانتا کہ اسے مارنے کا شوق تھا۔ جب وہ ہی
 ہتھیار ڈال چکی تھی تو آپ کیا کر لیتے۔“ افتخار حسن
 جانتے تھے وہ صحیح کہہ رہا ہے اس لیے چپ سے ہو گئے
 ۔ لیکن منیر حسن مطمئن نہ ہو سکے۔

”پھر بھی اتفاق نہیں بتانا چاہیے تھا شاید کوئی
 راستہ نکل پاتا۔ یلیمہ نے کون سا کسی گئے گزرے کا
 انتخاب کیا تھا۔ وہ آخر کس ہیں پر وجدان کو رہ جھکٹ
 کرنے۔ بس ایک ذرا ان کی اتا ہی تو تھی۔ ٹوٹ
 جاتی۔“

”اتفاق صحیح کہہ رہے ہیں چلو واقعی کوئی راستہ
 نہیں تھا۔ یلیمہ کبھی بھی پھوپھا جان کی مرضی کے بغیر
 وجدان سے شادی نہیں کرنی اور پھوپھا جان بھی اس کی
 اس کمزوری سے واقف تھے پھر بھلا وہ رضامندی دیتے
 ہی کیوں بلکہ صحیح تو یہ ہے یلیمہ کی اسی کمزوری نے ہی
 پھوپھا جان کی اتا کو آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ میں مانتی
 ہوں ان کا رویہ یلیمہ کے ساتھ ہمیشہ ہی ناروا رہا لیکن یلیمہ
 نے بھی تو کبھی پلٹ کر شکایت نہیں کی۔ پھر وہ کیوں
 احساس کرتے۔“

”اب ان باتوں کا کیا فائدہ جتنا زکر کرو گے اتنا ہی دل
 جلے گا بس اب ختم کرو اس قصے کو۔“ چھوٹی ممالی کے
 لیے صحیح یہ ٹاپک بہت تکلیف دہ تھا وہ جھنجھلا کر بولیں۔

”اتفاق مجھے وجدان کے پاس لے جاؤ۔ نہ جانے
 کس حال میں ہو گا۔“ افتخار حسن فکر مند سے ہو گئے
 تھے۔ اتفاق ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔“ اتفاق نے نظر جھکا لیا۔
 ”کی تو بتا نہیں چل رہا کہ وہ کس حال میں ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ آمنہ خالہ نے ٹھنک کر پوچھا۔

”وجدان پر رسول رات سے لا پتا ہے۔“
 ”کیا کہا؟“ بڑی ممانی سہم کر بولیں۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وجدان گھر سے چلا گیا
 ہے۔ برسوں جب میں اسے قبرستان سے لے کر آیا تو
 اس کی دائمی حالت نارمل نہیں تھی پھر میں نے ہی

اسے گھر ڈراپ کیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کچھ دیر آرام کرنے سے اس کی حالت سنبھل جائے گی مگر وہ گھر سے چلا گیا۔ اس کے نکتے ہی انکل اور مزل بھائی اس کی تلاش میں لگ گئے تھے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا وہ ابھی تک لاپتا ہے۔ سب دوستوں رشتے داروں کے گھر چیک کر لیا۔ پورے شہر کے اسپتال دیکھ لیے لیکن وہ کہیں نہیں ملا کل میں اور ساجد مزل بھائی اور انکل کے ساتھ مل کر سارا دن اسے مڑکوں اور پارکوں میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ شہر کا کوئی کوٹا ایسا نہیں چھوڑا جہاں ہم نے اسے نہ ڈھونڈا ہو۔ سمجھ نہیں آتا اسے زمین نگل گئی ہے یا آسمان۔ کہیں سے کوئی خبر تک نہیں ملتی۔ اب تو پولیس میں بھی رپورٹ کرا دی ہے اور صبح کے سب اخباروں میں اس کی کشدگی کا اشتہار بھی چھپ گیا ہے۔ دعا کریں کہیں سے کوئی اطلاع مل جائے۔ اس نئی افاد پر ہر کوئی چپ سا ہو گیا۔

”یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہر طرف سے بری خبریں مل رہی ہیں۔ سکون تو مجھے اب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ہے۔“ افتخار حسن گھبرا کر بولے۔ منیر حسن نے ایک نظر اپنے بھائی کو دیکھا جو ٹوٹ سے گئے تھے پھر آفاق سے تیز لہجے میں بولے۔

”تم یہ سب آج بتا رہے ہو۔“

”اور کیا کرتا جو سانچہ گزر چکا وہ کیا کم ہے جو میں آپ سب کو اور پریشان کرتا۔“

”اچھا اب یہ باتیں چھوڑو۔“ بڑی مہمانی پریشان سے لہجے میں بولیں پھر اپنے شوہر سے کہا۔

”افتخار ہمیں وجدان کے گھر چلنا چاہیے۔“

”تالی جان آپ وہاں نہ ہی جائیں تو بہتر ہے۔“

”کیوں؟“ وہ اسے دیکھ کر بولیں۔

”لیکن تم نے یہ سب ان سے کیوں چھپایا جب کہ اس کی ضرورت نہیں۔“ منیر حسن کی بات سن کر آفاق نے کہا۔

”تو کیا بتانا کہ میری موت کے صدمے نے وجدان کے دل پر اثر کیا ہے اور اس نے ہوش مند ہی میں نہیں بلکہ پاگل پن کی کیفیت میں گھر چھوڑا ہے تاکہ ان کے دلوں سے رہا سہا اطمینان بھی رخصت ہو جائے۔ جیسے میرے دل سے رخصت ہو گیا ہے اور اب تک تو دور در پہنکا وہ صبح پانچ ہو گیا ہو گا۔ غلط لوگوں کو دل میں جگہ دی۔ ان دونوں نے تو اپنے دل کے آگے کسی اور کے دل کی پروا ہی نہیں کی۔“ آفاق دلگرفتہ سا ہو گیا وہ چشم تصور سے وجدان کو قریب قریب دیوانوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد نمازی مسجد سے نکل رہے تھے جب وہ خستہ حال شخص ایک دم کہیں سے آدھمکا۔ اس کے سر کے بال اور بڑھی ہوئی داڑھی میں گرد جمع ہوئی تھی۔ کپڑوں کی حالت ابتر ہو رہی تھی ڈھیروں مٹی لیے زخمی پاؤں جو تکی کی قید سے آزاد تھے۔ وہ یقیناً کوئی دیوانہ ہی تھا۔ جو ایک ایک کو پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔

”تو نے انہیں دیکھا ہے۔ انہی وہ ادھر تھیں۔“

”نہیں نہیں۔ ادھر میں ادھر۔ ہاں ادھر ہی تھیں پھر بتائیں کہ ہر گھنٹہ انہیں چلتے دیکھا ہے۔“ اس نے اپنے مسجد کی میز دھویوں کی طرف اشارہ کیا پھر فوراً ہی انہیں منع کرتے وہ اندر برآمدے کی طرف اشارہ کرتے لگا مگر کسی نے اس پر دھیان نہیں دیا ہر شخص اس سے بچ کر نکلنے کی کوشش میں تھا وہ انجا میں کرنے لگا۔

”کوئی تو بتا دے وہ کہاں گئیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کوئی تو مجھے بھیک میں ان کا دیدار دے دے۔“ اپنی فریاد کے رائیگال جانے پر اس نے ایک دم ہی سفید کپڑوں کے کلف لگے شلواریں میں لمبوس سیاہ رنگ

کے موٹے سے آوی کو دیوچ لیا۔ اس پر جنون سوار ہونے لگا تھا۔ موٹے کو چھوڑتے وہ چیختے لگا۔

”تو بتانا مجھے وہ کہاں ہیں۔ جا میں جانتا ہوں تجھے پتا ہے بول کہ ہر ہیں وہ۔“ وہ پہلے تو اس افاد پر گھبرا گیا پھر خود کو چھڑا کر تھارت سے زوردار چھڑا اس کے گل پر جڑوایا۔

”ہٹ پاگل کہیں کا سارے کپڑوں کا ستیا اس کر دیا۔“ اور وہ پھینک دیا اور گرا۔ ”جیسی اسے نمازیوں کی بھیڑ کے باہر کسی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے ہٹنے سے اٹھ کر اس طرف بڑھا۔ اس نے اس پاگل کو اٹھ کر اپنی طرف بڑھتا ہوا اسے باختم سا ہو کر اس نے فوراً۔“ جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور تاک کر اس کی طرف پھینک دیا۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ بس ایک پل کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہوا پتھر پھینکتے ہوئے خون کی پروا چھوڑ کر وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ موٹے شخص نے جو بدستور اسے اپنی جانب آتے دیکھا تو ایک اور پتھر اٹھا کر اسے دے مارا۔ پھر ایک ساتھ کئی پتھر اس نے ہاتھ میں اٹھالے اور ایک کے بعد ایک مارنے لگا۔ باقی نمازیوں نے جو ایک پاگل کو اس موٹے آوی سے بھرتے دیکھا تو وہ بھی اس پر پل پڑے۔

”شرم نہیں آتی نمازیوں کو پریشان کرتا ہے۔ ہٹا کٹا مستیڈا ہو کر آواز گزری کرتا ہے۔ مسجد جیسی متبرک جگہ تیری بد معاشی کے لیے نہیں ہے۔“ ہر طرف سے اسے جملے پڑ رہے تھے اور اسی رفتار سے لائیں اور گھونٹے بھی۔ مگر وہ خوشبودوں میں دھلے اس سے پکڑ کر نگاہ جمائے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا تاہن کی پوری طاقت لگا کر خود کو ان لوگوں کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا پر اس کی ایک نہ چلی۔ اسے اتنے سارے لوگوں کی بے رحم شگے میں دیکھ کر ان جھیل سی آنکھوں میں طغیانی آگئی پھر جیسے اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اچانک ہی پلٹ کر بھاگنے لگی۔

”رک جا میں مت جا میں مجھے چھوڑ کر۔“ وہ چلایا پھر اپنے اوپر گرو موجود لوگوں کو دھکیلتے لگا۔ وہ جب تک

چپ کر کے چتا رہا لوگ اسے پیٹتے رہے اب جو وہ انہیں دھکے مار کر خود کو چھڑانے لگا تو سب اسے چھوڑ کر خوفزدہ سے پیچھے ہٹ گئے اور وہ اس کے پیچھے بھاگا جو نظر سے اڑ چلا۔ ہوتی جارہی تھی پھر بھاگتے بھاگتے اسے پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے تل زمین پر گر پڑا۔ اس کے انتقال سے خون نکل آیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس طرف دیکھا جدھر وہ گئی تھی۔ پھر گھبرا کر چاروں طرف نظر گھا کی۔ لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں برسنے لگیں اور وہ منہ لپیٹے اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور کرب سے فریاد کی صورت پکارا۔

”یا اللہ۔“ لوگ ہنس رہے تھے نیچے پاگل پاگل کی صدا میں لگاتے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ زمین پر پڑا پوری طاقت سے ایک ہاتھ کا منکا ہٹانے زمین کو پیٹ پیٹ کر اپنے ہاتھ زخمی کر رہا تھا۔ دھول اڑا کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ کرب سے چلاتا جا رہا تھا۔ قریب ہی ایک دکان کے باہر کھڑا شخص اس تماشے سے محفوظ ہوتا ہے سانسے کھڑے آوی سے بولا۔

”دیکھو مار کیا تماشا چل رہا ہے۔“

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ادھر دیکھو اصل تماشے کی خبر تو آج اخبار میں چھپی ہے۔ سنتے آئے تھے لڑکیاں گھروں سے بھاگتی ہیں پر اب تو لڑکے بھی گھر سے بھاگنے لگے۔“ اس نے منطلق دھیان نہ دیتے ہوئے اخبار میں چھپی خوش شکل اور خوش لباس لوجوان کی تصویر اسے دکھائی جس کے نیچے لکھا تھا۔

”نام وجدان مصطفیٰ ولد مصطفیٰ عظیم عمر چچیس سال رنکت سائونٹی قد پانچ فٹ گیارہ انچ بلیک شرٹ اور بلیک پینٹ میں لمبوس ہے اور پیروں میں بوٹ پیٹے ہوئے ہے۔ ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے اگر کسی صاحب کو وجدان مصطفیٰ کے بارے میں اطلاع ہو تو براہ مہربانی نیچے دیے گئے کیل فون نمبرز پر رابطہ کریں۔ صحیح اطلاع دینے والے کو ایک لاکھ روپے نقد انعام دیا جائے گا۔“ اس نے اپنے سامنے سے اخبار لے کر بلند آواز میں خبر پڑھی اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

پایا جان کی پہلے بھی کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی، بس بوائی اور گھنٹائی کے مینز میں ٹھہرائی کے لیے زمینوں پر چلے جاتے یا پھر اگر کوئی تنازعہ کھڑا ہو جاتا تو اس کے حل کے لیے انہیں جانا پڑتا۔ منافع اور اخراجات کا اندراج بھی ان کا سرور تھا۔ مگر جب وہ قصر فاروقی میں ہوتے تو واقعی ریشٹراؤ لا ٹف گزارا کرتے، فراغت کی فراوانی میں یا تو وہ ملک ناصر کے گھر پر ہوتے یا ملک ناصر قصر فاروقی میں ڈیرے ڈال کر بیٹھے رہتے اور دونوں دوست جوانی کے قصوں اور آری لا ٹف کی یادوں کو دہراتے، شطرنج کی بساط پر ایک دوسرے کو شہ اور مات دیتے رہتے۔ مگر بیچے کے جانے کے بعد سب کچھ بدل گیا تھا۔ زمینوں کے معاملات میں ان کی دلچسپی ختم ہوئی۔ نشی جو چاہے فصل بوتا جس دام پہ چاہتا فصل منڈی میں بیچ دیتا، کوئی بازاریس نہ کرتے کئی بار نور الہدی سے کہا بھی کہ اب وہ زمینوں کے معاملات و منڈل نہیں کرتے اس لیے نور الہدی ان کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں، مگر نور الہدی نے صاف جواب دیا۔

”مگر آپ زمینوں کے معاملات نہیں سنبھال سکتے تو بیچ دینے چھٹے اپنے بزنس سے فرصت نہیں۔“ اور زمینوں کو بیچنا پایا جان کو گوارا نہیں تھا، خیر کسی نہ کسی طرح معاملات چلتے ہی رہے مگر عملاً ”پایا جان نے ہاتھ اٹھا دیا تھا اور بس اپنے کمرے تک محدود ہو گئے تھے۔ ملک ناصر کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ خود ہی آجاتے، مگر اب شطرنج کی بساط نہیں پچھتی تھی، بس بیچے کا ذکر ہوتا رہتا اور بیچے کے ذکر میں خوشی کہاں تھی، اس کی تو پوری زندگی پایا جان کا پچھتاوا بن گئی تھی اور پچھتاوے کا احساس کسی بل ان کا پچھتاوا نہیں چھوڑا۔ اب ان کے پاس بیچے کو یاد کر کے آنسو بہانے کے سوا کوئی کام نہیں تھا، احساس جرم سے بے حال وہ بند کمرے میں بیچے کی تصویر کے آگے چلایا کرتے۔

”بیچے میری جان اپنے پایا کو معاف کر دو، میرے گناہ بخش دو، میں تیرے گناہ اپنے باپ پر۔“ وہ بیچے کی بوائی کو سینے سے لگائے روتے جاتے۔ نور الہدی کی

بے اعتنائی اس سے سوا تھی۔ انہوں نے پایا جان سے نہ تو کوئی جھگڑا کیا اور نہ ناراضی کا اظہار، بس ان سے لا تعلق ہو گئے۔ پایا جان کی بیچیں ان کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں، مگر وہ بھی انہیں دلاسا دینے نہیں آئے، انہیں اپنی سرور میں سے ان کے احساس جرم کو اور بھی بڑھاتے جاتے۔ انہوں نے پایا جان کو گھر میں رکھے سلمان کی طرح سمجھ لیا، کبھی ان کے کمرے میں جھانکنے کی زحمت بھی نہیں کی اور اگر کہیں پایا جان ہی ان کے پاس چلے آتے تو اس طرح نظر انداز کرتے کہ وہ کٹ کر رہ جاتے مگر شکایت کیسے کرتے۔ انہوں نے بھی تو کبھی بیچے کو خود سے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن ملک ناصر سے برداشت نہیں ہو سکا اور وہ نور الہدی کے پاس جا بیٹھے۔

”جس شخص نے تمہیں کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، اس کے ساتھ تم یہ سلوک کر رہے ہو، کاش کبھی کبھی اس طرح سے ایک کونے میں ڈال دیا ہے۔“ نور الہدی ان کے جلال کے جواب میں بے تاثر لہجے میں بولے۔

”اب کس سلوک کی بات کر رہے ہیں ملک انکل میری طرف سے پایا جان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ اس گھر میں ان کا جو رتبہ اور مقام کل تھا وہ ہی آج بھی ہے، گھر کے سارے ملازم ان کے حکم کے پابند ہیں اور میں نے خود بھی انہیں سختی سے بدایت سے رکھی ہے کہ پایا جان کے آرام و آسائش کا خیال رکھیں۔“

”تو کر تمہارا نعم البدل نہیں ہو سکتے نور الہدی۔ کیا تمہیں خبر بھی ہے اظہر کئی دن سے بیمار ہے۔ کیا ایک بار بھی تمہیں اتنی توجہ ہوئی کہ جا کر اس بیمار آدمی کی خدمت ہی دریافت کر لو، جس نے تمہیں اولاد کی جگہ سمجھا ہے۔“

”پایا جان بیمار ہیں۔“ اس خیال سے وہ اندر ہی اندر بے چین ہو گئے، لیکن جب بولے تو ان کی آواز ہر تاثر سے خالی تھی۔

”گھر میں تین تین ڈرا میور موجود ہیں۔ اگر وہ بیمار

ہیں تو مجھ سے کہنے کی ضرورت نہیں، وہ آریور کے ساتھ اسپتال جا سکتے ہیں اور اگر خود نہ بھی جانا چاہیں تو ڈاکٹر کو فون کر کے گھر پر بلا لیں۔“ ملک ناصر ان کی بے بسی پر حیران رہ گئے۔

”تمہیں کی بیماری کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں تمہارے پاس ہے۔ تم تو اپنی زندگی میں سمن ہو گئے لیکن اظہر کو تمہاری ضروری ہے، کبھی ڈاکٹر کی کال سے ہی سہی، اس کے پاس بیچے جایا کرو، تمہاری کو جھیلنا آسان نہیں۔“

”تمہاری۔“ وہ زہر خند ہو کر بولے، پھر اٹھے اور صوفے کی بیک پر جا کر وہ ڈال پڑے، اس کی پشت پر رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”تمہاری کو جھیلنا آسان نہیں ملک انکل اور بیچے نے جذباتی تنہائی کے ساتھ نو سال گزارے ہیں۔ بنا شکایت کیے اور پایا جان چند مہینوں میں ہی شکوہ کرنے لگے۔“ ملک ناصر کا بارہ گئے۔

”تم ایک باپ سے اس کی بیٹی کی موت کا انتقام لینا چاہتے ہو، کیا تمہیں اس کا حق ہے۔“

”مرنے والی اگر بیچے ہو اور مارنے والے پایا جان تو باوی بھائی کو حق ہے کہ بیچے کی موت کا انتقام لے سکیں۔“ ان کے لہجے میں کوئی گنجائش نہ پا کر ملک ناصر چپ کے چپ رہ گئے، بعد میں جب پایا جان کو پتا چلا تو کہا۔

”نور الہدی سے یہ گمان نہ ہونا ملک! اس نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، میں اسی سلوک کا مستحق ہوں۔ اس نے تو بہت صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اسے بیچے کے ساتھ کی ضرورت نہیں، وہ یوں بھی اس سے محبت کر لے گا۔ مگر میں نے زبردستی بیچے کو اس کے ساتھ منتھی کرنا چاہا۔ وہ بیچے کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا، کہاں تو میں نے اسے ہی بیچے کی تکلیف بتا دیا، ڈرا میور تو ملک میرے ہاتھوں اس کا کتنا بھاری نقصان ہوا ہے، پھر وہ اتنا بڑا طرف کہاں سے لائے کہ مجھے معاف کر سکے۔“ بیچے نے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، لیکن پچھتاووں سے دامن چھڑانا

بہت مشکل ہے۔



صوفے، پنجاب کے دور دراز علاقے میں سرحدی بیٹی کے بالکل قریب واقع پسماندہ گاؤں ”چنگ والی“ کی آبادی محض چند سو نفوس پر مشتمل تھی۔ مولوی عبدالخالق کا شمار اس چھوٹی سی آبادی کے معززین میں ہوتا تھا۔ مولوی عبدالخالق گاؤں کے سکون تھے اور جماعت کی امامت بھی ان کے فرائض میں شامل تھی۔ ان کے والد جنہیں گاؤں والے عقیدت سے بڑے امام صاحب کہتے تھے۔ مولوی عبدالخالق سے پہلے وہ ہی اذان دیتے اور نماز پڑھایا کرتے تھے۔ بڑے امام صاحب دین دار آدمی تھے، لیکن انہوں نے دنیا کا دامن بھی تھام رکھا تھا اور حسن و خوبی دین اور دنیا میں توازن قائم رکھتے ہوئے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی گزار دی۔ اپنے بیٹے کی تربیت بھی انہوں نے ان ہی خطوط پر کی۔ پیش امام کی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے وہ لاہور سے گریجویشن کر چکے تھے، پھر جب وہ اپنے والد کے پیچھے نماز پڑھانے لگے تو بڑے امام صاحب نے انہیں روزگار کو اپنانے کی ترغیب دی۔ مولوی عبدالخالق نے گھر کے ہی ایک کمرے میں دکان کھول لی۔ مہینے میں ایک بار دکان میں سلمان ڈالنے کے لیے وہ شہر کا چکر لگاتے۔ ان کی دکان میں اشیائے خورد و نوش کے علاوہ بنیادی ضروریات زندگی کا سامان بھی موجود ہوتا۔ یعنی ایک لحاظ سے اسے گاؤں کا بزنس اسٹور کہا جاسکتا تھا۔

بڑے امام صاحب کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا اور اب تو مولوی عبدالخالق بھی بزرگی کی عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب نے گاؤں کی ہی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ مگر اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم ہی رکھا۔ رفیقہ ہاتھ لپی لی باقیہ حیات تھیں اور ”نملانی جی“ کے لقب سے خاص و عام میں مشہور تھیں۔ سالوں سے مولوی عبدالخالق ایک ہی لگی بندھی روٹین کے عادی ہو گئے تھے۔ فجر کی اذان سے

ذرا پہلے جس وقت رات کا آخری پہرہ عمل رہا ہوتا وہ نیند سے جاگ جاتے پھر تہجد کی نماز پڑھ کر وہی کو جگاتے گاؤں کی کچی گلیوں سے گزر کر مسجد آجاتے پھر جب تک فجر کی اذان کا وقت ہو تا مولوی صاحب مسجد میں جھاڑو لگا کر نمازیوں کے لیے صحن میں دریاں بچھا چکے ہوتے نماز کے بعد وہ کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرتے پھر اپنی دکان پر اٹھ آتے جو پھر ظہر کی نماز کے لیے بند ہو جاتی۔ نماز کے بعد ایک گھنٹے کا درس ہوتا۔ جس میں بڑے احکام شریعت کے بجائے چھوٹی چھوٹی عام قسم باتوں کو شامل کیا جاتا وہ باتیں جن سے انسان کے کردار کا بنیادی ڈھانچہ تشکیل ہوتا ہے بڑے امام صاحب اکثر مولوی عبدالحق سے کہا کرتے تھے۔

”اصل چیز بنیاد ہی ہے تو بنیاد مضبوط کیے جا عمارت اپنے آپ سیدھی اور مضبوط اٹھے گی۔“ درس ختم کر کے پھر مولوی صاحب دکان پر آ بیٹھتے اور پھر عصر کی نماز پڑھا کر گھر لوٹتے تو صحن میں گاؤں کے بچے سپارے اور اسکول کی کتابیں لے کر بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہوتے مولوی صاحب دکان اور گھر کے صحن کا درمیانی دروازہ کھول دیتے اور دکان داری کے ساتھ ساتھ دین اور دنیا کی تعلیم دی جاتی۔ یہ سلسلہ مغرب تک چلتا پھر عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں ہی نمازیوں کی بیٹھک ہوتی جس میں ہر طرح کے دینی اور دنیاوی مسئلے زیر بحث لائے جاتے۔ یہ بیٹھک ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں برخاست ہو جاتی اور لوگ اٹھ کر اپنے گھر کو سونے چلے جاتے۔

اتنے برسوں میں آج پہلی بار مولوی صاحب کی روئین میں فرق آیا تھا۔ آج ظہر کے بعد درس کی محفل نہیں ہوئی اور مولوی عبدالحق نمازیوں سے محذرت کرتے اٹھ آئے اور اب چلچلاتی دھوپ میں وہ گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر تیزی سے چل رہے تھے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ صحن دن سے گاؤں والوں میں کسی ”سائیں“ کے تہہ در پکڑ رہے تھے جو نہ جانے کہاں سے آیا تھا اور اب گاؤں

کے باہر ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ گاؤں کے ساتھ لوح لوگ سائیں کے آنے سے پر جوش ہو گئے تھے اور اب انہیں سائیں کی کرامت کا انتظار تھا۔ مولوی عبدالحق نے جو کچے ایمانوں کو ڈولتے دیکھا تو محلے کی تحقیق کرنا ضروری سمجھا۔ وہ گاؤں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کچی مٹی کے مکان بست پیچھے چھوٹ گئے تھے بلا کی گری تھی مولوی صاحب کا حلق پیاس سے خشک ہو گیا تو ”رک کر سائیں بحال کرنے لگے“ پھر سامنے سے چہرے پر آیا پسینہ خشک کر کے آنکھوں پر ایک ہاتھ کا چھاسا بنا کر اسے سامنے دور تک دیکھا۔ خشک زمین پر ابھری گیسوں اس کی پیاس کی گواہ تھیں اور ایک سوکھا درخت جس کی خوب پھیلی پتھر شاخوں پر کوئی خشک پتا تک نہیں تھا۔ مردہ زمین کے سینے پر یوں گڑا تھا جیسے خود اپنے ہی حال پر لوح کناں ہو۔ دور تک پھیلا نیلا آسمان ایک دم صاف تھا جس پر سورج پیلے رنگ کے تھال کی مانند دیک رہا تھا۔ آج نگاہ پھیلے اس منظر کی درانی کو اور بھی گہرا کر رہا تھا۔ اکلوا آذی ریح جو اس سوکھے درخت کی ”جھاڑوں“ میں بیٹھا تھا اس کے سیاہ کپڑوں پر مسافتوں کی گرد تھی۔ سر کے بل لیے اور گرد آلود تھے بے ترتیب واڑھی جھاڑ کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ زمین پر پھینکی ٹانگ کی ران پر تھا جبکہ دوسرا ہاتھ کھڑکی کی ہونی ٹانگ کے گھنے پر۔ ہاتھ بچھے تھے سے ٹکا کر آنکھیں بند کیے وہ تکی زمین پر اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے صدیوں سے اسی جگہ میں ہو اور صدیاں اسی عالم میں گزارے گا۔ اس کے چہرے کے مہم نقوش سے غریب و اذیت کی عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی۔ مولوی عبدالحق نے بے ساختہ جھرجھری کی اور اس کی طرف چلنے لگے درخت کے پاس پہنچ کر مولوی صاحب نے کچھ دیر توقف کیا پھر پکارا۔

”کون ہو بھائی کہاں سے آئے ہو؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایسے بیٹھا رہا جیسے کوئی آواز سنی ہی نہ ہو مولوی صاحب انتظار کرتے رہے پھر کہا۔

”یہاں کے تو نہیں لگتے پھر وہ کیا خواہش ہے جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔“ وہ اس کے پر آگندہ لباس پر ایک نظر ڈال کر ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ یہاں کا نہیں ہے تو پوچھ لیا وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا۔

”یہاں ہی دوں تو کیا کر لے گا۔“

”جو بھی میرے بس میں ہوا۔“ مولوی صاحب اس کے سامنے زمین پر بیٹھے بولے ”اس نے آنکھیں کھول دیں مگر اسیں نہیں دیکھا اور آسمان پر نظریں جمائے کہنے لگا۔“

”ایک مدت خواہش کے پیچھے بھاگا ہوں لیکن اب خواہش سے بھاگتا پھر رہا ہوں“ مردہ ہیں کہ جان ہی نہیں چھوڑیں۔ پھر اس نے ایک دم مولوی صاحب کو دیکھا۔

”کوئی ایسی جگہ جانتا ہے جہاں میں خواہش سے جا چھوڑوں۔“ مولوی صاحب نے اسے شرم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”او جھلیا بندہ خواہش کا گھر ہے یہ باہر کھلی نہیں پھرتی آدمی کے اندر چھپ کے بیٹھ جاتی ہے اور تو اپنے اندر سے چھپنا چاہتا ہے۔“

”اندھ کو خود سے قریب نہ سمجھ۔“ وہ تنبیہ کے انداز میں بولتا انہیں اپنی سرخ آنکھوں سے گھورنے لگا۔

”یہ چھل دیتا ہے دیکھے گا تو قریب لگے گا۔ ہاتھ پر بھائے گا تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا پھر خالی ہتھیلی آسمان کی طرف دی اور گمبیر آواز میں بولا۔

”یہ ہاتھ بھر کا فاصلہ تو عمر بھر کی مسافت سے نہ

”تجھے کیسے معلوم؟“ مولوی صاحب کی بات سنی تھی کہ اس پر بھان طاری ہو گیا۔

”میں سرپٹ دوڑا ہوں اس سفر پر لیکن منزل کے

بھائے ہر قدم پر ٹھوکری اور میں ہر بار منہ کے بل زمین پر گر رہتا پھر فوراً ہی اٹھ کر دوڑنے لگا مگر ایک اونچے کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکا اور اب جب میں اس سفر سے عاجز آ گیا ہوں تو اس نے خواہش کو میرے پیچھے لگا دیا جسے جانا ہوں پیاس چلی آتی ہیں لیکن وہ ہاتھ بھر کا فاصلہ نہیں تھا۔“ اس کی آواز میں کسک تھی۔ پھر وہ اچانک ہی آسمان کی طرف دیکھ کر چلائے لگا۔

”مگر کرتا ہے میرے ساتھ قریب دیتا کیسا خدا ہے تو بندے کو دھوکہ دیتا ہے۔ ہنستا ہے تجھ پر یا گل ہے یا گل۔“ پھر وہ مٹی اور کٹر ٹھیلوں میں بھر بھر کر آسمان کی طرف پھینکنے لگا۔

”یہ لے نکل یہاں سے چلا جا نہیں ضرورت مجھے تیری مذاق اڑاتا ہے میرا۔“ مولوی صاحب لب بچھے اسے دیکھ رہے تھے انہوں نے اسے روکنے یا قابو کرنے کی کوشش نہیں کی پھر وہ ایک دم ان کی طرف پلٹ کر بولا۔

”تو نے یہ آواز سنی؟“ وہ آسمانوں پر بیٹھا مجھ پر ہنس رہا ہے خوب اونچی اونچی آواز میں۔ پھر اس نے ڈھونڈ کر ایک پتھر اٹھایا اور آسمان کی طرف اچھال دیا۔

”تو چلا کیوں نہیں جاتا یہاں سے جا چلا جا“ اکیلا چھوڑ دے مجھے۔“ پتھر اٹھا اٹھا کر پھینکتے اسے اچانک ہی جانے کیا نظر آیا تھا کہ ایک جانب نظریں جمائے سے ہوئے انداز میں وہ پیچھے کو ہنسنے لگا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرا بھی مگر رکا نہیں اور زمین پر خود کو گھسیٹتا درخت کے تنے سے جا لگا۔

”جائیں چلی جائیں کیوں بار بار آجاتی ہیں خدا کے لیے چلی جائیں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر ہلانا جانے کے لیے جانے کو کہہ رہا تھا مولوی صاحب نے مزہ نہ کھا بھی لیکن انہیں تو کوئی نظر نہیں آیا اور وہ بدستور کہتا جا رہا تھا۔

”تو رکتا رہا کریں گی مجھے کتنا ستائیں گی“ اب اور برداشت نہیں ہوتا۔“ حسرت بھرے لہجے میں کہتے اس نے سرانہو میں چھپایا اور بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے لگا۔

”چلی جائیں یہاں سے چلی جائیں۔“ مولوی صاحب گہری نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر اسے روٹا بلکنا چھوڑ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ اگلے دن درس کے بعد مولوی عبدالحق گھر آئے تو ملاجی سے کہہ کر کھانے کی ٹرے تیار کروائی پھر اسے کپڑے سے ڈھک کر گاؤں سے باہر نکل آئے۔ وہ تو تانگے والا روز کی طرح سواریاں اتار کر دوپہر کا کھانا کھانے گھر کو جا رہا تھا۔ مولوی عبدالحق کو دیکھا تو تانگا روک لیا۔

”مسلم مولوی صاحب۔“
 ”و علیکم السلام گھر جا رہے ہو علم دین۔“ وہ مودب انداز میں بولا۔

”جی مولوی صاحب آپ کا ارادہ کدھر کو ہے حکم ہو تو چھوڑ آؤں“ اس کی برخلوص پیش کش کے جواب میں مولوی عبدالحق مسکرائے اور کہا۔
 ”کیوں زحمت کرتے ہو بھائی میں تو بس جو مہمان گاؤں کے باہر آ کر ٹھہرا ہے اسے کھانا دینے جا رہا ہوں۔“

”سائیں کی بات کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا پھر بولا۔

”لیکن وہ تو چلا گیا۔“
 ”چلا گیا۔“ مولوی صاحب حیرت سے بولے۔
 ”کہاں چلا گیا۔“

”وہ تو پتا نہیں پر کل شام سے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔“ مولوی عبدالحق نے اس کی بات سنی پھر خود کھائی کرتے ہوئے بولے۔

”حیرت ہے مسافر کے سفر کو زنجیر کرنے کا وقت آ گیا ہے اور وہ ابھی تک بھاگتا پھر رہا ہے۔“
 ”کیا کہہ سکتے ہیں مولوی صاحب؟“ وہ خاک بھی نہیں سمجھا۔

مولوی صاحب اس سے لا تعلق اپنی سوچ میں ڈوبے رہے پھر نظر اٹھا کر اس کے اچھن بھرے چہرے کو دیکھا اور کہا۔

”وہ کہیں نہیں جاسکتا علم دین اس کا سفر تمام ہوا۔“

اب وہ جتنا بھی بھاگ لے اسے لوٹ کر نہیں آتا ہے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ واپسی کے راستے پر پلٹ گئے، لیکن بے چارہ وہ کتنی ہی درہنچ راستے میں گھرا ان کی بات سے مطلب اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اگلے دن پھر مولوی صاحب درس کے بعد گھر آئے تو کھانے کی ٹرے بنا کر ہاتھوں میں اٹھائے گاؤں سے باہر آگئے مگر آج بھی انہیں ٹرے اسی طرح گھر واپس لے جانی پڑی دوسرے دن بھی وہ ٹرے لیے گاؤں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ دور سے ہی دیکھ چکے تھے کہ درخت کے پاس کوئی نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ پر شکنیں ابھر آئیں۔ آج واپسی کے لیے قدم موڑتے ہوئے ان کے چہرے پر ترود تھا۔ وہ اپنا تانگا لیے گاؤں سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت سواریاں بھی اس کے ساتھ تھیں پھر بھی مولوی عبدالحق کو دیکھ کر اس نے تانگا روک دیا۔

”کب تک اس کا انتظار کرتے رہیں گے مولوی صاحب۔ اس جیسے کے پیروں کو واپسی کا رستہ نہیں ملتا۔“ وہ بھیدین سے بولے۔

”مجھے کیا لگتا ہے علم دین وہ یہاں صرف صورت دکھانے آیا تھا۔ اس کا یہاں آنا تو ازل سے طے ہے اب چاہے اس کے پیروں کو واپسی کا راستہ نہ ملے جس نے اس کی تقدیر لکھی ہے وہ خود اسے ساتھ تمام کر یہاں لے آئے گا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر پلٹے پلٹے اور دو ایک بار پھر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔

”کس سوچی بے گیا وہ چل پڑا شاموشاے واپس وی آتا ہے۔“ پیچھے بیٹھے شخص نے اسے شوکا دیا تو وہ ”بیچ“ کی آواز کاٹا تانگا بڑھانے لگا۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تو مولوی صاحب دکان بند کر کے بیوں کو پرستار چھوڑ کر مسجد آگئے۔ وضو کر کے اذان دی پھر جماعت نماز کی امامت کروائی اور دعا مانگ کر تسبیح کے دانے گراتے گھر کی طرف چل پڑے۔ چوہ پندرہ سال کا لڑکا بھاگتا ہوا۔

”مولوی صاحب، مولوی صاحب۔“ چلا تانان کے پیچھے آ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے سنا تو رک گئے اور

پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ قریب آیا تو پوچھنے لگے۔
 ”کیا بات ہے منور علی۔“ وہ اٹھل چھل سانسوں کے بیچ جلدی جلدی بولا۔

”وہ تو نائے والا آپ کے مہمان کے ساتھ حکیم جی کی دکان پر بیٹھا ہے اس نے کہا تھا آپ کو جبر کروں۔“ مولوی عبدالحق حیران سے کہنے لگے۔
 ”میرا مہمان کون ہو سکتا ہے اور علم دین کو کہاں مل گیا۔“

”وہ تو پتا نہیں مولوی صاحب۔“
 ”پچھا ٹھیک ہے میں جا کر دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے کہا اور حکیم جی مطلب کی طرف چل پڑے۔ ان کی پہلی نظر علم دین کے چہرے پر پڑی تھی اور دوسری لکڑی کے تانگے پر انہیں بندھے لیے سائیں پر جس کے چھانچوں پر حکیم جی مرہم لگا رہے تھے۔ مولوی صاحب تیزی سے آگے آئے۔
 ”یہ تمہیں کہاں مل گیا علم دین۔“

”لاری لڑے سواریوں کا انتظار کر رہا تھا کہ یہ مجھے ٹکٹ گھر کی دیوار کے ساتھ پڑا ہوا نظر آیا پاس جا کے دیکھا تو بے ہوش تھا اور بدن ایسے تپ رہا تھا کہ ہاتھ نہ لگایا جائے بس مولوی صاحب پھر میں نے اسے جیسے سے کر کے تانگے میں ڈالا اور گاؤں پہنچتے ہی سیدھا حکیم جی کے پاس لے آیا۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے علم دین سے بولے جو اس ماہ سے جیل پر ہی پھول کر گیا ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بہت کہنے کے باوجود بھی مولوی عبدالحق نے اسے حکیم جی کی نہیں ادا نہیں کرنے دی اور خود اپنی جیب سے پیسے نکال کر ٹکٹ پر بیٹھے شخص کو تھما دیے۔

”یہ دو تین ٹائم اسے کھلا رہنا۔“ چلتے ہوئے حکیم جی نے پڑیوں میں بند سفوف انہیں دے کر کہا۔ مولوی صاحب نے پڑیا لے کر انہیں سلام کیا پھر سائیں کو بے ہوشی کی حالت میں ہی اٹھا کر دو ٹوکے تانگے میں ڈالے اسے گھر لے آئے۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور اندھیرا

پھلنے لگا تھا۔ مولوی عبدالحق اندر سے چھوٹا ٹھیل اٹھا کر لے آئے اور اس کے سر پر رکھ کر مٹی کے تیل سے جلتے والا بیسپ روشن کر کے ٹھیل پر رکھ دیا۔ ملاجی بھی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے باہر آئے۔

”یہ کسے اٹھا لائے مولوی صاحب۔“ انہوں نے اس مفلوک الحال شخص کو دیکھ کر پوچھنے سے سوال کیا۔
 ”یہ ہمارا مہمان ہے۔“

”حلیے سے تو پاگل لگتا ہے۔“ وہ فوراً بولیں۔
 ”پر باتوں میں سیانا ہے ہوش میں آئے گا تو تو خود دیکھ لینا۔“

”میری بے کون؟“ وہ الجھ کر بولیں تو مولوی صاحب جھنجھلاہٹ کے باوجود چل سے بولے۔

”کو کرموں والی، کہا تا مہمان ہے اب زیادہ سوال مت کر اور جا کر ٹھنڈے پانی کی پیٹیاں رکھنے کا انتظام کر بے چارے کا جسم جنم بنا ہوا ہے۔“ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نمبر پچ چیک کرتے ہوئے وہ فکر مندی سے بولے۔ ملاجی جی نے پھر کوئی سوال نہیں کیا اور ایک کنوڑے میں پانی لے کر کسی پرانے کپڑے کو کاٹ کر اس کی پیٹیاں بنا تی مولوی صاحب کے پاس لے آئے۔ مولوی صاحب نے کنوڑا ان کے ہاتھ سے لے کر ٹھیل پر رکھا پھر بڑی محبت سے اس کے ہاتھ پر پیٹیاں رکھنے لگے۔ پوری رات مستقل مزاجی سے وہ سائیں کے ہاتھ پر پیٹیاں رکھتے رہے کچھ دیر کا بریک آیا بھی تو عشاء کی نماز کے لیے مگر آج کی بیشک انہوں نے درخواست کر دی وہ کبھی اس کے ہاتھ پر گیلی پیٹیاں رکھتے کبھی تولیہ بھگو کر اس کے پیروں کی طرف آ بیٹھتے۔ پاؤں کے چھالے پیر مسئلے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ گیلیا تولیہ اس کے پیروں کے گرد نرمی سے لپیٹ کر بلکے ہاتھ سے دھیرے دھیرے دباتے جاتے کہ شاید اس طرح اس کے تندر کی طرح جلتے جسم کو راحت مل جائے۔

نچر کی نماز کے بعد مولوی صاحب تسبیح پڑھتے ہوئے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔ علی میں مڑتے ہی وہ



freedom to live happily!

<http://www.kutubkhana.com>

دور رکھی بیڑھی کو انہوں نے چارپائی کے ساتھ کیا اور
 بیڑھی پر بیٹھ کر ڈول میں سے دودھ ہاتھ میں پکڑے
 گلاس میں ڈال کر مولوی عبدالحق کو دیکھتے لگیں جو
 سائیں کا شانہ ہلا کر اسے اٹھ کر بیٹھنے کو کہہ رہے تھے
 گمردہ یوں ہی سرخ سرخ کر رہا تھا تو مولوی عبدالحق
 نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو تھام کر دوسرا ہاتھ اس کی
 گردن کے نیچے دیتے ہوئے اسے اٹھا کر بٹھا لیا۔
 مولوی عبدالحق دھان پان سے آوی تھے پھر عمر بھی
 کافی ہو چکی جبکہ سائیں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ
 تمیں کے آس پاس ہو گا مگر خاک نوروی نے اس کے
 جسم سے ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ اسے اٹھا کر
 بٹھانے میں مولوی عبدالحق کو بہت زیادہ وقت نہیں
 ہوئی۔ وہ بیٹھ چکا تو مولوی عبدالحق نے ملائی جی کے
 ہاتھوں سے گلاس لے کر اس کے ہونٹوں سے لگایا مگر
 نیم بے ہوشی کے باوجود اس نے گلاس ہاتھ مار کر دور
 کر دیا جس سے دودھ چھلک کر مولوی صاحب کے
 ہاتھ اور کپڑوں پر گر پڑا تو وہ ڈبٹ کر بولے
 ”تو میں جھلا ہی اس۔ رازق سے جھٹرا سمجھ آتا ہے
 پر رازق سے کیا ناراضی ہے چل پی حاجب چلے۔“
 اس نے اپنی نیم غنٹوں آنکھوں سے انہیں دیکھا جن
 میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ ان آنکھوں کی
 وحشت ناکی دیکھ کر ملائی جی تو گھبرائی گئیں مگر مولوی
 عبدالحق ذرا متاثر نہ ہوئے اور کہے
 ”یے کیا گھورتا ہے۔“ وہ چپ چاپ انہیں گھورتا
 رہا حالانکہ آنکھوں پر مستقل کھار تھنے کے لیے اسے
 جدوجہد کرنی پڑتی تھی پھر بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد
 اس کی نگاہیں جھپک جاتیں۔
 ”یے دودھ پی پھر دوا بھی کھاتی ہے۔“ انہوں
 نے ایک بار پھر دودھ کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا
 دیا۔ اس بار اس نے مزاحمت نہیں کی مگر کمزوری اتنی
 زیادہ تھی کہ ایک ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے
 کے لیے اسے ہر بار دوسرا گھونٹ بھرنے سے پہلے
 توقف کرنا پڑتا۔ جب وہ پورا گلاس خالی کر چکا تو مولوی
 عبدالحق نے گلاس ملائی جی کو دے کر اور دودھ ڈالنے

دیکھ چکے تھے کہ لکڑی کا دروازہ بھرا ہوا تھا گمردہ جانتے
 تھے کہ دروازہ اندر سے مقفل نہیں ہو گا۔ دن کی
 روشنی میں اس دروازے پر کبھی قفل نہیں چڑھایا
 بھی بڑے امام صاحب کی نصیحت تھی۔
 ”ہے دروازوں کو بند کر کے حاجت مندوں کی
 خودداری کا مذاق نہ اڑاؤ کہ وہ دروازہ بجا کر گلی میں
 کھڑے تم سے اہانت کی درخواست کریں بلکہ
 چو کھٹوں کو کھلا رکھو تاکہ وہ سیدھے اندر چلے آئیں
 اور ان کی بے کسی کا حال کسی دوسرے پر آشکار نہ
 ہو۔“ مولوی عبدالحق نے دروازہ کھول کر اندر کچے
 صحن میں پاؤں رکھائی تھا کہ ان کے کانوں میں دوسرے
 کرانے کی آواز آئی۔ رات بھر وہ بے سدھ رہا تھا مگر
 اب نیم بے ہوشی کی حالت میں سر کو دائیں بائیں پھٹتا
 کراہ رہا تھا۔ اس کی حالت میں بہتری کا اشارہ تھا۔
 مولوی عبدالحق مسکراتے ہوئے اس کے پاس آگئے
 اور جھک کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک
 کرنے لگے۔ بخار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ملائی جی پاس آ کر
 کھڑی ہو گئیں۔
 ”تھوڑا بہت ہوش تو آئی گیا اب کچھ کر کے دوا
 بھی کھلا دیں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے ملائی جی سے کہنے
 لگے
 ”دوا خالی پیٹ تو نہیں کھلا سکتا“ پہلے اس کے
 کھانے کا بندوبست کر۔ پھر کچھ سوچا اور کہا۔
 ”پتا نہیں کب سے اس کے حلق میں کچھ نہیں گیا“
 کھانا کھا بھی پائے گا یا نہیں۔ ایک کام کہا جڑ تھوڑا سا
 دودھ گرم کر کے لے آ اور اس میں چینی بھی ڈال
 لیں۔“
 ”جی مولوی صاحب۔“ وہ صحن کے ایک جانب
 بنے باورچی خانے میں آگئیں جس کے گرد
 چار دیواری ناپید تھی۔ یہ ایک اور بن چکن تھا جس میں
 موجود مٹی کا چولہا لوہوں کی مدد سے سلگایا جاتا تھا۔ نیم
 گرم دودھ کو گلاس میں ڈالنے کے بجائے انہوں نے
 دوئے کے کونے سے ڈول کا پتلا کر کے اٹھالیا اور
 اسٹیل کا گلاس لیے صحن میں پائی آئیں۔ پاؤں مار کر

کا اشارہ کیا پھر گلاس اس کے منہ سے لگایا تو اس نے گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ سر گلاس پہلے گلاس سے کم وقت میں ختم ہو گیا تھا تیسرا گلاس بھر کر اسے پکڑاتے انہوں نے ایک پڑیا کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دی اور کہا۔

”یہ دوا ہے کھالے۔“ اس نے بلا جوں چرا کیے وہ پڑیا حلق میں جھاڑ کر چند گھونٹ بھرے پھر گلاس واپس کر کے چار پانی پر گر سا گیا۔ وہ پورا دن اس نے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں گزارا۔ رات ہوئی تو مولوی عبدالخالق اپنی چار پانی کو اٹھا کر اس کی چار پانی کے پاس لے آئے۔ ارادہ تھا کہ پچھلی رات کی طرح رات بھر جاگ کر اس کا خیال رکھیں گے۔ آدھی رات تک تو وہ جاگے مگر اس عمر میں اتنی مشقت کی جسم اجازت بھی تو نہیں دیتا بلکہ ابھی کل کی تھکن باقی تھی۔ وہ تو کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹے تھے پھر آنکھ لگ گئی۔ حسب عادت تہجد کے وقت آنکھ کھلی تو ہرزہ مارا اٹھ بیٹھے گردن موڑ کر سائیں کی چار پانی پر نظر ڈالی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے فوراً بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ چوہٹ کھلا تھا۔

”بڑی بچی ضد لگائی ہے۔“ وہ بڑبڑائے پھر اٹھ کر دروازہ بند کرتے صحن میں اس طرف آگئے جہاں بیٹنڈ پمپ لگا تھا اور ایک ہاتھ سے پمپ چلاتے بالٹی میں وضو کے لیے پانی جمع کرنے لگے۔

وہ پھر میں ظہر کی نماز کے بعد درس سے فارغ ہو کر وہ گھر لوٹے تو گرمی سے برا حال تھا۔ حالانکہ سر پر پستی ٹوپی کے اوپر انہوں نے صاف بھی پلیٹ رکھا تھا پھر بھی لگ رہا تھا جیسے دماغ کھول رہا ہو مگر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے آواز لگائی۔

”باجرہ ایک گلاس پانی پلا دے۔“ پانی لانے کا کہہ کر وہ رکنے نہیں اور صحن کے آخر میں بنے دو کمروں میں سے ایک میں کھس کر اندر چار پانی پر بیٹھ گئے۔ بجلی کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا وہ تکیے پر رکھا تھا صاف اٹھارہ ٹوپی اور صاف سا بیڈ میں رکھتے ہاتھ سے پمپ چلائے گئے چند لمحوں بعد ہی ملائی جی ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے کمرے

میں آئیں۔ انہوں نے ملائی جی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور منہ تک بھی لے گئے لیکن ہونٹوں سے نہ لگا سکے کمرے کی ٹھنڈی نیم تاریک فضا میں بیٹھے انہیں اس کا خیال آیا جو اس تپتی وہاں میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا خود کو جھلسا رہا ہوگا۔

”کیا بات ہے مولوی صاحب آپ پانی کیوں نہیں پیتے۔“ انہیں سوچ میں گم دیکھ کر انہوں نے ٹوکا تو مولوی عبدالخالق بڑبڑانے لگے۔

”اسے بھی تو پیاس لگی ہوگی اس کا بھی حلق سوکتا ہوگا۔“

”کون مولوی صاحب کس کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ نا سمجھی سے پوچھنے لگیں لیکن مولوی عبدالخالق جواب دے بغیر ہر نکل آئے۔ منگے سے پانی جگ میں اتر پڑا اور گلاس پکڑ کر دروازے سے نکل گئے۔ انہوں نے دور سے ہی اسے ٹھنڈا درخت کے سائے میں بیٹھا دیکھ لیا تھا اطمینان کا سانس لیتے انہوں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ سر جھکا کر بیٹھا انگلی سے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جگ اور گلاس اس کے سامنے رکھتے وہ زمین پر بیٹھے تو اس کی پیش کا احساس ہوا فوراً پیروں پر ہوتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا جو اس جھلتی زمین پر اتنے اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے ایئر کنڈیشنر روم میں معمولی نشست پر بیٹھا ہو۔ اس نے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ اس میں پلٹیں اٹھا کر ایک سرسری سی نظر ان پر ڈالی اور پھر سے اپنے مشغلے میں مشغول ہو گیا۔

”صبح سے وہ بھونگی سوچ سر پر چڑھ آیا ہے۔ اس گرمی سے تو زمین خشک ہو جائے تیسرا حلق بھی سوکھ رہا ہوگا چل دو گھونٹ پانی پی لے۔“ انہوں نے بہت پار سے اسے بلایا تھا مگر اس نے توجہ نہیں دی۔

”او جھلیا ظلم ہر حال میں برا ہے مگر اپنی ذات بدترین ہے کیونکہ اپنی ذات پر روار کھے جانے والا ظلم انسان کو بے حس بناتا ہے اور جو بے حس ہو جائے وہ انسان نہیں رہتا کوئی ہو جاتا ہے صرف آدمی ہونے سے جانور ہونا بہتر ہے۔ اپنے مرتبے کو پہچان صرف

آدمی ہونا قبول مت کر۔“ دل طے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے انہوں نے پانی گلاس میں ڈالا اور گلاس ہاتھ میں لے کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لے پکڑ اور خود پر قہر نہ توڑ۔“ اس نے ایک نظر ان کے بارش چہرے کو دیکھا پھر ان کے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو اور گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا مگر اس میں سے پانی پینے کے بجائے ہاتھ اونچا کر کے گلاس کو اتنے غور سے دیکھنے لگا جیسے وہ اسٹیل کا گلاس کاغذ کا ہو جس کے شفاف پینڈے سے پانی کا معائنہ کر رہا ہو کہ آیا پانی صاف بھی ہے یا نہیں پھر اس نے بہت عجیب سی حرکت کی۔ آہستگی سے گلاس اٹھتے ہوئے اس نے سارا پانی زمین پر گرادیا اس کے بعد گلاس نیچے رکھا اور اسی ہاتھ سے جگ اٹھا کر پانی گلاس میں اتار دیا۔ اس کے بعد گلاس کو اسی طرح اونچا کر کے پانی زمین پر گرادیا اور پہلی حرکت دہرانے لگا پھر تیسری بار اس نے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب حیرت زدہ رہ گئے۔

”تم کیا کر رہے ہو۔“

”آرزو کو خاک کر رہا ہوں۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر بولا پھر دوسرے ہاتھ میں گلاس اٹھا کر ان کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ جستجو کا برتن ہے اور انسان اس برتن کو آرزو سے بھرتا ہے۔“ اس نے بولتے ہوئے گلاس پانی سے لیا بھرا۔

”مگر آرزو کی قسمت میں تکمیل نہیں آرزو کی تقدیر ہے کہ خاک ہو جاتی ہے اور جستجو کا برتن خالی رہ جاتا ہے۔“ اس نے جگ رکھ کر گلاس سیدھے ہاتھ میں لیا پھر ہاتھ اونچا کرتے ہوئے دھیرے دھیرے پانی زمین پر گرادیا اور خالی گلاس کو دکھاتا ہوا بولا۔

”جستجوئی بار اس برتن کو بھرو گے یہ اتنی بار خالی ہو جائے گا۔ یہاں صدیوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے جستجو باقی رہ جاتی ہے اور آرزو خاک ہو جاتی ہے۔“ اس کے چہرے پر محفوظ سی مسکراہٹ تھی مگر پھر بولتے

بولتے اچانک ہی وہ افسردہ ہو گیا۔

”جستجو کا خالی برتن زیادہ وزن دار ہوتا ہے۔“ وہ گلاس کو دیکھتے ہوئے آسف بھری آواز میں بولا تھا پھر جیسے اس کا دل اس کھیل سے اچانک ہو گیا گلاس زمین پر لڑھکا لڑھکا آواز میں گرنے لگا۔

”کیوں آتا ہے تو یہاں مت آیا کر۔“ مولوی صاحب ذرا متاثر نہ ہوئے اور گرمی لگا ہونے سے اس کے بڑے ہوئے چہرے کو دیکھتے رہے پھر تمبیہ لہجے میں بولے۔

”یاد رکھیے آگ بس اسے نہیں جلاتی جس کے اندر آگ لگی ہو۔ تیرے اندر کون سی آگ ہے۔“ اس کی آنکھوں میں قہر کی جگہ کرب نے لے لی اور وہ اپنے سینے کو مسلتے ہوئے بولا۔

”یہاں عشق کی بھی سنگ رہی ہے۔“ اس کی آواز میں وہ آج بھی جیسے سچ سچ اس کا سینہ جل رہا ہو پھر بے چارگی سے بولا۔

”پوچھنے پر اس کا دھواں نظر نہیں آئے گا۔ باہر آگ لگے تو غلے بھڑکتے ہیں۔ دھواں اٹھتا ہے اور بریادی آنکھوں سے نظر آتی ہے پر اندر آگ لگ جائے تو چنگاری بھی نہیں سلتی اور سب کچھ خاکستر ہو جاتا ہے۔ کچھ باقی نہیں بچتا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہو پاتی کہ کیا کچھ تھا جو تباہ ہو گیا اور تو اس آگ پر پانی ڈالنے آیا ہے۔“ وہ طنز سے بول کر مذاق اڑاتے لہجے میں کہنے لگا۔

”مجھے جھلاکتا ہے۔ ناوان تو تو خود ہے اس آگ کو بجھانے آیا ہے جو جلتی ہی نہیں ہے۔ صرف جلاتی ہے۔“ تیز لہجے میں بولتا وہ اچانک کھوسا گیا پھر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

”وہ ہستی تھیں عشق وہ آگ ہے جو جلائے تو راکھ نہیں کرتا۔ فنا کرتا ہے۔ جا چلا جا یہاں سے اور دوبارہ اوہرنہ آتا یہاں فنا کا عمل جاری ہے۔“ پھر انہیں نظر انداز کرتا وہ جنوبی انداز میں انگلیوں کے ناخن سے زمین کھرتے لگا وہ پھر بھی بیٹھے اسے دیکھتے رہے کہ شاید وہ کچھ کہے مگر وہ چپ ہی رہا تو مولوی صاحب اللہ

اکبر کہتے گفتوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئے۔



نور الہدی کے لیے دن رات کا فرق مٹ گیا تھا انہوں نے خود کو بے تحاشا کام میں الجھایا ایسے میں کچھ دو گھنٹی کی فرصت میسر آجاتی تو خود بھی حیران ہونے لگتے۔ انہوں نے کب اس طرز پر زندگی گزارنی چاہی تھی اس تیز رفتاری سے ہی گھبرا کر وہ لندن سے پاکستان آئے تھے اور اب لگتا تھا وہ آنکھوں پر پٹی باندھے اندھا دھند دوڑتے چلے جا رہے ہیں کدھر ہیں اور کہاں جا رہے ہیں کچھ خبر نہیں۔ انہی گارمنٹس فیکٹری ڈھنگ سے اسٹبلشمنٹ بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ ٹیکسٹائل کے بزنس میں بھی آگئے اور اب وہ ایکسپورٹ کے لیے پرتول رہے تھے کورپورٹ سیکٹر میں لوگ کہتے لگے تھے نور الہدی فاروقی ایک ہی جست میں میدان پار کر لینا چاہتا ہے کون جان پانا کہ جو سودا انہیں چین لینے نہیں دیتا وہ تو کچھ اور ہی ہے۔ وہ تو خود کو ان یادوں سے بچانا چاہتے تھے جو ہر لمحہ ان کی گھات میں رہتی تھیں گھر سے باہر تو فرار کے کئی راستے تھے لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی یادیں انہیں نرسے میں لے کے بے بس کر دیتی تھیں گھر لوٹنے کا خیال انہیں خوفزدہ کر دیتا وہ خود کو بے نام مصروفیتوں میں الجھائے رکھتے مگر گھر تو لوٹنا ہی پڑتا ہے۔

انہوں نے انٹرنس کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا ہی تھا کہ نظر نہ چاہتے ہوئے بھی لاؤنج کے صوفے پر ٹھہر گئی اور اس کی یادوں نے ان کی آنکھوں پر یلچہ کے عکس کا پردہ ڈال دیا۔ اب انہیں دھوکے کی دھندلی دیوار کی ضرورت نہیں رہی تھی انہوں نے انگلیوں میں دبا سگریٹ مسل کر بچھلتے ہوئے ایک جانب اچھال دیا۔

”ایک تم جو نہیں ہو تو لگتا ہے۔ کچھ نہیں۔“ وہ عکس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ہر روز کی طرح یہ الفاظ دوہرائے پھر دروازے کے آگے بے اسباب پر بیٹھے

اور دونوں ہاتھوں پر سر گر لیا۔

”صائب“ بہت دیر گزر گئی تھی بہادر کی آواز انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”کھانا لگا دوں۔“ انہیں خاموش دیکھ کر بہادر نے پوچھا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ انہیں بھوک نہیں ہے پھر خیال آیا بھوک تو صبح بھی نہیں تھی برائے نام ناشتا کیا تھا کل رات کا کھانا بھی بھوک کے بغیر ہی کھایا تھا بلکہ یلچہ کے انتقال کے بعد سے ان کی بھوک پاس مر ہی گئی تھی اب وہ بھوک لگنے پر نہیں گھڑی دیکھ کر کھانا کھاتے تھے اور پھر بھوک ہی کیوں ان کا تو ہر احساس مر گیا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ محسوس کرنے لگتے کہ جیسے وہ بھی مر گئے ہیں مگر وہ پھر بھی جیسے جا رہے تھے کھانے کا وقت ہو تا تو کھانا کھا لیتے رات ہو جاتی تو آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ جاتے۔ نیند آئے نہ آئے کیا فرق پڑتا ہے۔۔ زندگی کو خود پر فرض کیسے کرتے ہیں یہ نور الہدی نے اب جانا تھا۔

”لگا دو۔“ کچھ دیر توقف کے بعد انہوں نے یوں سوچ کر جواب دیا تھا جیسے بہادر نے کوئی مشکل سوال پوچھ لیا ہو وہ اٹھ کر فریض ہونے اپنے کمرے میں چلے گئے فریض ہو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ ڈائننگ روم میں چلے آئے۔ بہادر بڑی خاموشی سے کھانا لگا رہا تھا۔

”کیا بات ہے بہادر صاحب۔ آج کل کھانا کم کھا رہے ہیں۔“ وہ پہلے کسی بے بسی بات سے بولے بہادر نے ہاتھ روک کر اپنے منہ سے انہیں دیکھ کر کہا۔

”نہیں تو۔“

”بچہ تمہاری آواز کیوں کم نکلتی ہے۔ میں تو سمجھا تھا تو ابائی کے اسراف سے پرہیز کر رہے ہو ورنہ تمہارے بولنے کی رفتار سے تو یلچہ جیسی کول ہائڈروجن کی بھی غصے میں آجاتی تھی۔“ یلچہ کا ذکر کرتے ہوئے بھی ان کا لہجہ سرسری سا تھا لیکن بہادر یلچہ کا نام سن کر ہی اداس ہو گیا۔

”اس لیے تو اتنا بولتا تھا صاحب شرارت کرتا تھا ان سے اور بی بی صاب بھی جانتی تھیں پھر بھی کبھی مذاق

کرنے سے نہیں روکا۔ بہت اچھی تھیں وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں پھر خیال آتا ہے ہم تو نوکریات ہیں پر کرنل صاب کی تو یہی تھیں وہ انہیں کتایا د کرتے ہوں گے ہر وقت تو بی بی صاب کی تصویر دیکھ کر روٹے رہتے ہیں ملک صاب اتنا سمجھاتے ہیں مبر کرنے کو کہتے ہیں پر مبر بھی تو ایک دم سے نہیں آجاتا ایک ہی تو اولاد تھی ان کی وہ بھی نہیں رہی ان کے دل پر جو گزرتی ہوئی وہ تو وہ ہی جائیں اٹلا کہتی ہے اولاد کا دکھ قبر تک ساتھ جاتا ہے۔ اللہ ان کے جمل پر رحم کرے۔“ اس نے جھرجھری لی اور کانوں کو اٹھا کر لگا لگا اپنے آگے رکھے کھانے کو گھورے نور الہدی کے اندر کی بے چینی کو بہادر نے انجانے میں ہی ہوا سے دی تھی۔

”جی صاحب۔“ وہ برتن رکھ کر کچن میں جا رہا تھا نور الہدی نے اس کا نام پکارا تو پلٹ آیا۔

”بابا جان نے کھانا کھایا تھا۔“

”نہیں صاب۔ وہ تو صبح سے دروازہ بند کر کے بیٹھے ہیں۔ دروازہ بجلانے پر بھی نہیں کھولا کھانا کیا کھائیں گے۔“ ان کی بے چینی پریشانی میں بدل گئی۔

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ اسے سرزنش کرتے نور الہدی فوراً اٹھ گئے لیکن بابا جان کے دروازے کے باہر کھڑے وہ دستک کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاپائے۔ پیچھے ہٹے ہوئے انہوں نے بہادر کو اشارہ کیا اس نے آگے آکر دروازہ بجلانے کے ساتھ ہی آواز لگائی۔

”دروازہ کھولے کرنل صاب۔“ مگر دروازہ کھلات ہی اندر سے کوئی آواز سنائی دی اس نے پھر دستک دی۔

”دروازہ کھولے۔“

”اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ نور الہدی کی پیشانی پر سلو میں ابھر آئیں۔

”بہادر جاؤ اور کمرے کی چابی لے کر آؤ۔ فوراً۔“ وہ سر ہلا کر چابی لانے چلا گیا۔ نور الہدی نے پریشانی میں ہی دروازے کے آگے دو تین چکر لگائے پھر مضطرب ہو کر دروازہ بجا ڈالا۔

”بابا جان دروازہ کھولیں۔“

یلچہ کی ڈائری کو پیٹنے سے لگائے راکنگ چیئر پر نیم دراز پایا جان کھٹکے کی ہی حالت میں آتش ان کے اوپر لگی یلچہ کی تصویر کو دیکھتے جا رہے تھے۔ بہادر کے دروازہ بجانے نور پھر دروازہ کھولنے کے لیے کہتی ہوئی اس کی آواز کو سن کر بھی ان کے جسم میں کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ کچھ مل کے وقفے سے دوبارہ دستک ہوئی ساتھ نور الہدی کی آواز بھی سنائی دی۔

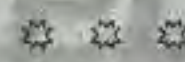
”نور الہدی۔“ ان کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ یلچہ کی ڈائری کو سنبھال کر وہ تیزی سے اٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ یلچہ کی موت کے بعد آج نور الہدی دو سہری یار ان کے دروازے تک آئے تھے۔ بابا جان ایسے ان کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے بیٹا پردیس سے لوٹا ہو۔

”کو بیٹا اندر آ جاؤ۔“ اندر آنے کو کہتے ہوئے وہ انہیں راستہ دینے کے لیے سامنے سے ہٹ گئے۔ انہیں اپنی طرف بے تابی سے دیکھا یا کر نور الہدی کا دل بھی کھٹکنے لگا تھا انہیں اس کے سوا اور کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ تو باپ کے سامنے سے محروم ہو گئے تھے مگر بابا جان نے ان کی زندگی میں اس محرومی کو کھٹکے نہیں دیا۔ ان کا جی چاہا کہ بابا جان سے لپٹ جائیں کہ کبھی وہ نور الہدی کو راستہ دینے کے لیے ان کے سامنے سے بٹے تھے اور یلچہ کی تصویر نور الہدی کی آنکھوں کے سامنے آگئی پل بھر میں ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ انہوں نے کمرے میں قدم نہیں رکھا۔

دروازے میں کھڑے کھڑے ہی انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر بابا جان کو دیکھا۔ انہیں موت سے چند لمبے پہلے یلچہ کی نم پلکوں کی لرزش یاد آگئی تھی۔ بابا جان کی متورم آنکھوں پر انہیں رحم کیسے آتا۔

”جی اس حالت کے لیے یہ خود ہی ذمہ دار ہیں۔“ بابا جان کے ٹھکے ہوئے بڑے مردہ چہرے پر ایک نظر ڈال کر انہوں نے سوچا۔

”یہ کیا بچوں جیسی حرکت تھی۔“ وہ بولے تو آواز میں وہ نرمی غائب تھی جو کبھی ان کے لہجے کی پہچان ہوا



مولوی عبدالحق اس خانماں برباد کے پاس سے اٹھ تو آئے مگر دوبارہ اس کے پاس جانے سے خود کو روک نہ پائے انہیں اس میں عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی اس کے لیے انہیں اپنے سینے میں باپ جیسا گداز محسوس ہوتا تھا حالانکہ اس کا انداز ہنوز وہی تھا۔ کبھی تو وہ مولوی عبدالحق کو اس طرح نظر انداز کرتا جیسے ان کی موجودگی سے بیخبر لاکھ ہو۔ جنون میں چلانے لگتا اور کبھی مغموم سا جانے کیا بیڑا تارتا۔ مولوی صاحب نے بھی اس کی کسی کیفیت میں دخل نہیں دیا وہ ایک سامع کی حیثیت سے اس کے پاس آتے تھے اور اس کی بے ربط باتوں کو بڑے دھیان سے سنتے جیسے وہ کوئی اہم بیان دے رہا ہو اور اگر اس کا ایک بھی پوائنٹ مس ہو گیا تو گڑبڑ ہو جانے کی پھر تھانی میں بیٹھ کر اس کی باتوں کو سوتے ہوئے الجھنے لگتے اس کے ذہن میں پڑی کہ کو کھولنے کے لیے کوئی سراہا تھ آتا دکھائی نہیں دیتا تھا مگر وہ صبر کے ساتھ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں اپنی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔

”تو پھر آگیا۔“ اس نے مولوی عبدالحق کو دکھا تو گھورا۔ لہجہ ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

”بڑا ڈھیٹ ہے۔“ مولوی عبدالحق اس کے لہجے کو محسوس کر کے مسکرائے۔

”کیا کریں دل لگ گیا ہے میرے ساتھ۔ جب تک وہ گھڑی تیرے پاس نہ بیٹھ جاؤ چین ہی نہیں بڑا۔“ صاف لگ رہا تھا وہ اس کی جھنجھالی شکل دیکھ کر مخلوظ ہو رہے ہیں۔ اس نے تپ کر رخ پھیر لیا تو مولوی صاحب بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔

”بلکہ مجھے تو لگتا ہے۔ تیرا بھی دل لگ گیا ہے۔ کہاں تو تو صحرانوردی کو نکلا تھا اور اب چار مہینے ہو گئے ہیں یہاں سے بلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔“

”تمیں دل لگا کر نہیں تھک کر رہا بیٹھا ہوں۔“ اس کے لہجے میں درد بولنے لگا تھا۔

کرتی تھی۔
 ”کیا تم جانتے ہو نور الہدیٰ کہ کسی مجرم کو سزا دینے سے پہلے اس کا منہ کالا کر کے چوراہے پر کیوں گھرایا جاتا ہے۔“ ان کی بات سن کر بابا جان عجیب سے لہجے میں بولے تھے۔ کچھ بل وہ نور الہدیٰ کی طرف سے کسی استفسار کے منتظر رہے پھر کہا۔

”کیونکہ اپنے ماتھے پر اپنے جرم کی سیاہی لے کر لوگوں کا سامنا کرنا سزا دینے سے بھی کٹھن ہے۔“

”آپ کے بچھتاوے کسی چیز کا عداوا نہیں کر سکتے۔“ ان کی بات پر وہ تفرسے ہوئے۔

”جانتا ہوں اور یہی احساس تو بچھتاوے کو اور بھی گہرا کرتا ہے کہ میں چاہے جان دے ڈالوں میری بیٹی کی جان واپس نہیں آئے گی۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولے پھر ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔“ نور الہدیٰ سرد لہجے میں بولے۔

”میری معافی یا سجدہ کی معافی سے مشروط ہے جائے جا کر اپنی بیٹی سے معافی مانگیں۔ اگر اس نے معاف کر دیا تو میں بھی معاف کر دوں گا۔“ سر جھکائے بابا جان بے بسی کی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔

”ایک بات اور۔“ نگلی اٹھا کر کہنے لگے۔

”براہ مہربانی آئندہ اس قسم کی حرکت کر کے مجھے پریشان مت کیجئے گا۔“ پھر ان کا رد عمل دیکھنے کے لیے وہ رکے نہیں ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ بابا جان کے کھنڈر ہوئے وجود کو ایک سیکنڈ بھی اور دیکھ مانتے اپنے کمرے میں آکر وہ چپل اتارے بغیر بیڈ پر گر گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو ان کی آنکھوں کے کونوں سے نکل کر کپٹیوں پر بہتے چادر میں جذب ہوتے گئے۔

محبوں کا حسن اسی صورت قائم رہتا ہے جب یہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک ہی سفر گامزن ہوں لیکن اگر محبتیں آپس میں نہو آنا ہو جائیں تو بڑی تباہی لاتی ہیں انہی معرکوں نے بلوچ کی زندگی تباہ کی تھی اور اب نور الہدیٰ کے درپے تھیں۔ محبت کا سر ہویا تھر۔ بچ پانا

”سکون کی تلاش میں ذرہ ذرہ چھان مارا مگر وہ تو جیسے کائنات میں ناپید ہو گیا ہے۔ پھر تلاش کا کیا فائدہ جب سکون ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔“

”جو چیز ڈھونڈنے سے نہ ملے مانگ لینی چاہیے۔“

ایک مہو جوان کے ہاتھ آیا تو مولوی عبدالحق نے بساط بچھانے میں دیر نہیں کی۔

”کس سے مانگوں۔“ اس نے پوچھا ساتھ ہی ان کے متوقع جواب کو سوچ کر اس کی تیریاں بھی چڑھ گئیں۔

”اللہ سے۔“ ان کے لہجے میں سکون تھا۔ اس کی آنکھیں آگ لگنے لگیں۔

”جو مانگا وہ دیا نہیں اب اور کیا مانگوں۔“ اس نے پھر کر کہا پھر کرب سے آگ میں بیچ کر سر پیچھے درخت کے تنے سے لگاوا۔

”میرے پاس تو اس پر بھی راضی تھا۔ کوئی شکایت نہیں کی بل کہ مردہ توں ہاتھ اٹھا کر سکون مانگا تھا وہ بھی اپنے لیے نہیں ان کے لیے پر اس نے کیا کید۔“ اس نے تڑپ کر آنکھیں کھولتے ہوئے گردن سینے تک نکالی اور سر کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا ایسے میں اس کے ناتراشیدہ بال عجیب سے انداز میں اس کے چہرے کو ڈھکے شانوں پر جھولنے لگے تھے۔

”اب بھی کچھ نہیں مانگوں گا۔“ وہ بیڑا پھر جھٹکنے سے سرائھا کر آسمان کو دکھاتا ہوا دھانے لگا۔

”تو سن رہا ہے نہیں آؤں گا تیرے در پر۔ تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ مجھے تجھ سے کچھ چاہیے بھی نہیں میرا کوئی نام نہیں تجھ سے۔“ مولوی عبدالحق کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

”او جھلیا حکیم سے تو دشمنی کرنی تو نے اب تیرے زخم کیسے بھرس گے۔“

مگر وہ ان کی طرف سے غافل ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

”اب چلتا ہوں اور دیکھ یہ کھانا رکھا ہے جی کرے تو کھا لینا پر خبردار جو تو نے اٹھا کر پیچھا کرنا رزق کی بے ادبی ہوتی ہے۔“ سائیڈ میں رکھی ٹرے کی طرف اشارہ

کر کے وہ جس طرح سے بولے تھے لگ رہا تھا سانس نے یہ کام کی بنا کر کیا ہے۔ ایک آخری نظر اس کے جھٹکے سر پر ڈال کر وہ اٹھ گئے پر وہ سر سے ہی قدم پر انہوں نے سے اٹھا کر بیٹھنے کی آواز سنئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے پلٹ کر دکھا وہ چہرے پر سختی لیے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا اور اس کے سامنے ٹرے کھانے سمیت الٹی پڑی تھی۔ انہوں نے بے بسی سے اسے دکھا پھر ٹرے سیدھی کر کے جتنا کھانا اٹھا سکتے تھے اٹھا کر ٹرے میں ڈالا اس کے بعد اوپر اوپر لڑکتے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھے اور ناراضی سے بولے۔

”یہی کام کرنا ہوتا ہے تو کل سے کھانا نہیں لاؤں گا۔ رہ بھوکا۔“ وہ خفا تھا اسے اٹھ کر چل بڑے لیکن اگلے دن وہ اپنے ساتھ کھانا لانا نہیں بھولے تھے۔



ملک کے ایک نامور اور بااثر بزنس مین اقبال یزدانی کی طرف سے بی بی کے لاؤنج میں زبردست ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شرکت کے لیے موصول ہونے والے دعوت ناموں کو شہر کے چوٹی کے بزنس مین اور پولیٹیشنس اپنے لیے اعزاز سمجھ رہے تھے اور کون نہیں جانتا کہ ایلٹیٹ کلاس کے ڈنر اور پارٹیز موقع کی مناسبت سے نہیں بلکہ موقع کی تلاش میں ذی جاتی ہیں۔

نور الہدیٰ کو موقع کی تو نہیں مگر مصروفیت کی تلاش اب اکثر رہا کرتی تھی اور آج تو وجہ بھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اہتمام سے تیار ہوئے۔ وقت پر ہی پہنچ گئے مگر وہی آئی بی بی کی آمد تو آخر سے ہوا کرتی ہے اقبال یزدانی نور الہدیٰ کے ٹیبل پر بیٹھے حسب عادت چھان بھریاں چھوڑ رہے تھے۔ نور الہدیٰ واقعی ان کی باتوں کو انجوائے کر رہے تھے کہ چہر آف کامرس کے صدر کی آمد کا شور اٹھا اور وہ انہیں دیکھ کر بے لہجے اٹھ گئے۔

”اے وہ نور الہدیٰ فاروقی سے نا۔ بھلا یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔“ نوید اختر کی نظر کیم کلر کے سوٹ میں

ملبوس نور الہدیٰ پر پڑی تو ساتھ بیٹھے اقبال بزدلی سے بولے انہوں نے کہا۔

”کمال کرتے ہیں نوید صاحب ہم نے بلایا ہے تو یہاں نظر آ رہا ہے۔“

”کمال تو آپ نے کیا ہے بزدلی صاحب یہ لڑکا جسے برنس فیلڈ میں آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے آپ اسے پرستلی انوائٹ کر رہے ہیں۔“ ان کے لہجے میں نور الہدیٰ کی تحقیر کے ساتھ ساتھ اقبال بزدلی کے لیے طنز بھی تھا جسے محسوس کر کے بھی انہوں نے برا نہیں مانا بلکہ ہنس کر بولے۔

”کیسی سوچیے نوید صاحب اگر ہم نے بلایا ہے تو اس لڑکے میں کچھ خاص بھی ہوگا۔“

”کیا خاص ہو سکتا ہے اس گل کے بچے میں۔“ وہ بدستور طنز کر رہے تھے۔

”خاصیت کی بات کی آپ نے تو کیا یہ خاصیت کم ہے کہ چہرہ آف کامرس کا صدر اسے اس کے ہم سے جانتا ہے۔“ وہ اپنے شگفتگی بھرے انداز میں ان کے طنز کا جواب دیتے ہوئے بولے تھے اور اس پر جسٹس پر ایک زور دار تہقہ گونجا تھا۔ ساتھ والے ٹیبل پر بیٹھی لڑکیاں جو با آسانی اس گفتگو سے مستفید ہو رہی تھیں وہ بھی ان کے جملے پر مسکرانے لگیں۔

”اقبال انکل تو نور الہدیٰ سے بڑے ایمپوسٹنگ رہے ہیں۔“ ایک نے مسکراہٹ روک کر ہجو کیا تو وہ سری بولی۔

”صرف اقبال انکل ہی کیوں اقبال انکل کی بیٹی بھی نور الہدیٰ فاروقی سے کافی متاثر ہے۔ کیوں مریم۔“ شرارت سے کہتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی لڑکی کو شوکا دیا جس کی نظریں مستقل نور الہدیٰ پر جمی تھیں۔ اپنی فرینڈز کی بات پر مسکراتے ہوئے اس نے کافی کا گھونٹ بھرا پھر کپ پیچے رکھ کر دوبارہ نور الہدیٰ کو دیکھنے لگی تو بلیو ایونٹنگ گاؤن میں ملبوس لڑکی مصنوعی فکر مندی سے بولی۔

”کنٹرول پور سیلف مریم تم کہاں اس زلدنگ کے چکر میں پڑ رہی ہو جو کسی کو دھو بھی نہیں دیتا۔ ویسے

بھی سنا ہے موصوف لینڈ لارڈ ہیں اور یہ زمیندار قسم کے لوگ ذرا ٹیڑھی کبیر ہوتے ہیں۔“

”میں بھی یہ سوچ رہی ہوں کہ یہ شخص مجھے اس طرح سے اپنی طرف اٹریکٹ کیوں کر رہا ہے شاید پاس جاؤں تو کچھ پتا چلے۔“ پر سوچ انداز میں کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو۔ اسی لڑکی نے اس کا ہانڈ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے ایک ادا سے شانوں سے ذرا نیچے لنگتے بے حد سیاہ بالوں کو جھٹک کر کہا۔

”نور الہدیٰ کے پاس۔“ پھر چپقل سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہانڈ چمڑا کر اسی ہاتھ سے اس کا گل تھمکتی ہائی ہیل سے ”کھٹ کھٹ“ کا شور دگانی نور الہدیٰ کے ٹیبل کے پاس آکر کھڑی ہو گئی پھر بڑے دل آویز انداز میں نور الہدیٰ کو مخاطب کر کے کہا۔

”گڈ ایونٹنگ مشرف فاروقی۔“ نور الہدیٰ اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے باتوں میں مصروف تھے وہ چونک گئے۔ وہ سیاہ آنکھوں میں شوخی لیے زیر لب مسکرائی اپنا دایاں ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔ نور الہدیٰ نے بیٹھے بیٹھے ہی اسے ”گڈ ایونٹنگ“ کہا اور اس کا گل سا ہاتھ پل بھر کو تمام کر چھوڑ دیا۔

”آئی ایم مریم بزدلی ڈائری آف اقبال بزدلی۔“ وہ خود ہی اپنا تعارف کروانے لگی تو نور الہدیٰ نے ہنس کر مسکراہٹ کے ساتھ۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ مجھے بھی خوشی ہوئی نور الہدیٰ نے ایک دم ہی ”مشرف فاروقی“ سے ”نور الہدیٰ“ پر اپنی پارے لگائی۔

”کیا تم مجھ پر بات کر سکتے ہیں۔“ ”میرا خیال ہے ہم اس وقت بھی بات ہی کر رہے ہیں۔“ ان کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”مجھے حاضر جواب لوگ پسند ہیں۔“ نور الہدیٰ نے اس کے dominating style کو محسوس تو کیا مگر وہ ان کے میزبان کی بیٹی تھی یعنی ایک لحاظ سے خود بھی میزبان تھی اور نور الہدیٰ اس وقت اس کے مسمان۔ انہیں منع کرنا اچھا نہیں لگا تو

اٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے باہر کھلی فضا میں چلے آئے۔

”ہاں تو اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔“ چلتے ہوئے وہ ان کے سامنے آکر کھڑی ہوئی اور اس طرح سے کہا جسے ان پر اپنی موجودگی کو بتا رہی ہو جو اس کے ساتھ چلتے ہوئے بھی اس سے بے نیاز لگ رہے تھے۔

نور الہدیٰ۔ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

”ہام تو آپ جانتی ہی ہیں اور کیا بتاؤں۔“

”ہام سے زیادہ کچھ نہیں جانتی اس لیے جو دل کرنا ہے بتا دیجیے۔“

”ہام سے زیادہ جان کر آپ کیا کریں گی۔“ وہ گریزوں ہوئے۔

”جان بھلانا بھلاؤں گی۔“ مریم کی بات پر نور الہدیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور اندازہ لگانے لگے کہ اس نے بے ساختگی میں یہ بات کہی ہے یا وہ بے باکی کی حد تک صاف گو ہے اور وہ ان کی سوچوں سے بے نیاز کتنی جا رہی تھی۔

”اپنی دے آپ اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی کم از کم میرے بارے میں تو کچھ پوچھ سکتے ہیں۔“

”ہتائیے۔“ اس کے اصرار پر نور الہدیٰ نے کہا اور وہ تپنے لگی۔

”تھوڑی سی ضدی ہوں تھوڑی سی موڈی اور ہاں برنس سے مجھے ذرا دلچسپی نہیں ہے مگر پاپا کے کہنے پر میں نے بھی ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا ہے۔“ وہ بولے جا رہی تھی اور نور الہدیٰ کو اس کی بولندگیس اچھی تو لگی تھی مگر وہ اس کا مقصد سمجھ کر اندر ہی اندر ہوشیار ہو گئے تھے۔ لندن کی آزاد فضاؤں میں رہتے ہوئے انہیں اس طرح کی تیزی طراری کا کئی بار تجربہ ہو چکا تھا اور وہ اس طرح کی بولندگیوں سے جان چھڑانے میں ماہر ہو چکے تھے وہ کوئی فرشتہ صفت انسان تو نہیں تھے ہاں مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ اس طرح کی فضولیات سے ہمیشہ بچتے ہی رہے تھے وچ صرف اتنی تھی کہ کوئی ان کے دل تک پہنچ نہیں پائی اور جو کچھی

اس نے محبت کو ان کے لیے اس طرح عبادت بنا ڈالا کہ نور الہدیٰ اسے اپنے کی خواہش بھی نہ کر سکے۔

”آپ سے بات کر کے اچھا لگا۔ لیکن اب اجازت دیجیے مجھے جانا ہوگا۔“ نور الہدیٰ نے اس سے جان چھڑانا چاہی اور ہر وہ سمجھ کر بھی حیران ہو کر بولی۔

”لہجہ کیوڑی۔ آپ کو یہاں ڈنر پر بلایا گیا ہے اور آپ ڈنر کے بغیر جانا چاہتے ہیں۔“

”مجبوری ہے مجھے ایک بے حد ضروری کام سے جانا ہے۔“ روائی سے جھوٹ بولتے ہوئے انہیں وہ لڑکی یاد آگئی جس کے لیے انہوں نے جھوٹ بولنا سیکھا تھا۔ اور ان کے چہرے پر یاسیت ابھر آئی جسے محسوس کر کے مریم نے روکنے پر اصرار تو نہیں کیا مگر اگلی ملاقات طے کرنے سے خود کو روک نہیں پائی۔

”دس دن بعد نیو ایئر پارٹی ہے تو ہم نیو ایئر پارٹی میں مل رہے ہیں ڈن۔“ کہہ کر اس نے وعدہ لینے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ نور الہدیٰ نے اسے دیکھا پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔

”ہائے۔“ پھر فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹے اور اندر جا کر کسی کو اپنے جلنے کی اطلاع دیئے بغیر وہ پارکنگ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ مریم حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اتنے آرام سے اس کی انسٹلٹ کر کے جا چکے ہیں پھر ایک دم ہی اسے نور الہدیٰ پر غصہ آیا اور پیرچ کر اندر چلی گئی۔



سرو اور تاریک رات اس ویرانے میں اتر چکی تھی۔ سیاہ رنگ آسمان پر نہ چاند چمک رہا تھا نہ تارے غنٹھارے تھے پھر چاند تاروں کو دیکھنے کے لیے وہاں تھا بھی کون خلقت سوچتی تھی اور جو جاگ رہا تھا وہ بند آنکھوں کے پیچھے جہان آباد کی دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا کہ جیب کے ایجن کی آواز اس سنانے میں غراہٹ کی طرح ابھری تھی پھر لہ لہ قریب آئی آواز تیز ہوئی کئی پھریوں لگا جیسے پل بھر کو جیب رکی ہو مگر اس

کا انجن اب بھی غرا رہا تھا۔ دروازہ کھول کر کوئی اترا پھر چند سیکنڈ بعد ہی دوڑنا ہوا وہاں جیب میں بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ جیب ہوا کے ساتھ اڑتی دور نکل گئی مگر سائیں کے استخراق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر اک باریک سی آواز سنائی دی اتنی باریک کہ اگر سنا لیا تو دینر نہ ہو تا تو شاید سنائی نہ دیتی۔ پل بھر کو ابھر کر وہ آواز معدوم ہو گئی مگر کچھ سیکنڈ بعد دوبارہ سنائی دینے لگی اور پھر جیب ہو گئی اس کے بعد دوبارہ ابھری اور مستقل آنے لگی۔

سائیں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور سر جھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، لیکن اس اندھیرے میں بھلا کیا نظر آتا آخر آواز کی سمت کا تعین کر کے وہ اٹھا اور ایک طرف کوچے لگا اب آواز صاف اور واضح سنائی دے رہی تھی وہ چلتا ہوا اس جگہ آپہنچا جہاں خورد رو جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے جھاڑیوں کے گرد چکر کاٹا مگر آواز کا ماخذ دکھائی نہیں دیا تو وہ جھاڑیوں سے آگے کی طرف چلے لگا کچھ قدم آگے چلے لگا کہ اب دواز چپ سے آ رہی ہے وہ واپس جھاڑیوں کے پاس آ گیا اور پڑاں پر بیٹھے ہاتھ سے ٹھل کر "آواز" کو تلاش کرنے لگا۔ زمین پر ہاتھ پھیر کر دیکھتے ہوئے اس نے یوں ہی جھاڑیوں کے اندر ہاتھ ڈالا تو ہاتھ میں کپڑا آ گیا۔ وہ حیران ہو کر کپڑے کو ٹٹولنے لگا، کبھی اس کا ہاتھ کسی نرم و موٹا م چیز سے ٹکرایا تھا۔ وہ ٹھنکا پھر دوسرا ہاتھ بھی اندر جھاڑیوں میں ڈال کر سختی سا شور مچاتی کپڑے میں لپٹی اس چیز کو احتیاط سے باہر نکال لیا۔ باہر نکال کر جو دیکھا تو اندھیرے میں نظر آتے اس کے خدو خال کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر جو گھبرا کر ٹٹولا تو اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

وہ ایک بچہ تھا، کسی کتے کی کانیں انسان کا بچہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اور تمام مخلوقات میں بس اسے ہی یہ شرف حاصل ہے کہ جگر کے ٹکڑے کو گوشت کے ٹکڑے کی طرح گندھ اور جھل کوڑوں کی خوراک بننے کے لیے دیر انوں میں پھینک آتا ہے۔ وہ

ہنا کا اسے گود میں لیے بیٹھا تھا۔ صبح الدماغ میں نے نو ماہ پیٹ میں رکھ کر جنم دینے کے بعد اسے مرنے کے لیے کانٹوں کے مقبرے میں لا پٹا تھا۔ مگر اس پاگل میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کو مل وجود کو کھردری زمین پر لٹا دے۔ اسے سینے سے چمٹائے وہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔ دماغ تو ایک مدت سے ماؤف ہو چکا تھا اور ہستی کھنڈر بن گئی تھی، لیکن چھاتی پر پلچل چاتے ننھے ننھے ہاتھوں اور پیروں کی حرکت نے اس کھنڈر کو بھی زبردست کر دیا۔ اس نے سر کو جھکا کر اندھیرے کی نقاب اوڑھے اس معصوم چہرے کو دیکھا جس کا رو تا اب اسے بے چین کر رہا تھا۔

"یہ اتنا کیوں رو رہا ہے۔" ایک عرصے سے بند پڑی دماغ کی مشین کے کل پر زوں پر سے گرد جھاڑ کر اس نے انہیں کام پر لگایا۔

"کہیں اسے ٹھنڈ تو نہیں لگ رہی، سردی بھی تو کتنی زیادہ ہے۔" طویل مدت سے بے حسی میں جیتے ہوئے اچانک ہی اس کے احساسات بے وار ہو گئے اور وہ ہوا میں پھیلی خنکی کو محسوس کرنے لگا، جس سے وہ کچھ دیر پہلے تک بے خبر تھا۔ اس نے اس بلکے سے تویے کو بچے کے گرد اور بھی کسا جس میں پلٹا ہوا تھا۔ پر اسے وہ ناکافی محسوس ہوا تو اپنی شرت اتار کر اچھی طرح اس کے گرد پھیلائے لگا، جس کی حالت اتنی سخت ہو چکی تھی کہ اتارنے کے لیے جن کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی، پھر اسے ہاتھوں میں سمیٹ کر سینے میں چھپاتے ہوئے اس نے اپنے گھٹنوں کو موڑ کر اس طرح خود کو گھسی بیٹھا کہ محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی گود میں بچہ ہے اس حالت میں اسے کوئی دیکھتا تو یہ بھی سمجھتا کہ سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے وہ خود میں سمٹ کر بیٹھا ہے۔ سردی بہت زیادہ تھی پر اس کا خیال تھا کہ اس کے جسم کی گرمی سے بچنے کو اتنی راحت تو مل جائے گی کہ رو تا بند کر دے گا مگر وہ رو تا ہی رہا۔

"ہو سکتا ہے اسے بھوک لگ رہی ہو۔" وہ دیکھ نہیں پاتا تھا، مگر چند منٹ یا شاید گھنٹہ بھر پہلے پیدا

ہونے والے بچے کے جسم پر چیچا ہٹ کو محسوس کر کے اندازہ لگا چکا تھا کہ پیدائش کے بعد اسے غسل نہیں دیا گیا تھا۔ "جس ماں نے ایک لوٹا پالی بنانے کی زحمت نہیں کی اس نے کہاں بچے کے حلق میں دودھ اتارا ہو گا۔" اس نے سوچتے ہوئے اپنے خیال کی تائید کی۔

"ہاں۔ اسے بھوک ہی لگی ہے۔" وہ پریشان ہو گیا۔

"لیکن میں اس کے لیے دودھ کہاں سے لاؤں۔" دماغ کی مشین تو اب چل ہی چکی تھی، اسے ایک راستہ بھی سوجھ گیا۔

مولوی عبدالخالق مولوی سی رسائی اور شے آرام سے سو رہے تھے کہ کسی نے زور سے ان کا گھر کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ پیٹھی بند سے جاگنے میں کچھ وقت لگ گیا تھا۔

"اتنی رات کو کون آیا ہے۔" ملانی جی بھی جاگ کھڑی تھیں مہتر راتھ کر بیٹھے ہوئے بولیں۔

"جا کر دیکھتا ہوں۔" چار پالی پر بیٹھے انہوں نے تپیل پیر میں اڑتے ہوئے کہا، پھر لائین اٹھا کر کمرے کا دروازہ کھولنے صحن میں نکل آئے۔

"ہاں بھالی آ رہا ہوں۔" انہوں نے اونچی آواز میں بول کر تو اتر سے دروازہ پینے والے کو اپنی آمد کی اطلاع کی، جس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا اور دروازہ اس وقت تک بچھا رہا جب تک کہ انہوں نے کھول نہیں دیا۔

"او تو ہیں۔" لائین کی روشنی میں آنے والے کا چہرہ دیکھ کر وہ حیرت سے بولے، پھر اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر کرتے بولے۔

"چل اندر آ جا۔" وہ دروازے کے کندھے میں زنجیر اٹکا کر پلٹے تو وہ ان کے پیچھے کھڑا تھا۔

"او جھلیا ادھر کیوں کھڑا ہے، کمرے میں آ جا، ہوی ٹھنڈ ہے۔" پھر اسے ساتھ لیے کمرے میں چلے آئے، جس کا اوپری دھڑ بھینہ تھا اور ایک بوتلی سی اس نے بازوؤں میں چھپا رکھی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے اپنے بازوؤں ڈھیلے کیے تو بچے کی جھلک دیکھ کر چار پالی

کے سر ہانے رکھا اور پٹہ اٹھا کر اوڑھتی ملانی جی کے ہاتھ رک گئے۔

"یہ کس کا بچہ اٹھا لیا ہے؟"

"انہوں کا۔" اس نے منت سے اطلاع دی۔

"پتہ کجھے کہاں سے مل گیا؟" مولوی صاحب کی حالت ملانی جی سے مختلف نہیں تھی۔

"جھاڑیوں میں سے۔"

"سبحان اللہ۔" مولوی صاحب ایسے لہجے میں بولے جیسے یقین نہ آیا ہو۔

"اسے بھوک لگی ہے۔" وہ ان کی کیفیتوں کی پروا کیے بغیر بچے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ جو بھوک سے اس قدر تڑھال ہو چکا تھا کہ اب رو بھی نہیں پاتا تھا۔

مولوی صاحب اب بھی پریشان تھے، مگر بچے کی بھوک کا احساس کر کے بولے۔

"ہاجرہ اٹھو دودھ لے کر آ۔"

"پر مولوی صاحب اس سے یہ تو پوچھ لیں کہ کس کا بچہ اٹھا لیا ہے۔"

"وہ بھی پتا چل جائے گا تو دودھ تولے آ۔" پروہ اٹھی نہیں ان کی نظر بچے پر جمی تھی جسے گود میں لیے سائیں چار پالی پر بیٹھ گیا تھا۔

"اس کا تو اٹھی غسل بھی نہیں ہوا۔" ملانی جی کی بات پر مولوی عبدالخالق کا دھیان بچے کی حالت پر گیا اور معاملے کی یہ تک پہنچ گئے پھر جب وہ بولے تو ان کے لہجے میں کچھ دیر پہلے والا بھون نہیں تھا۔

"پھر پہلے اس کے غسل کا انتظام کر، پھر اس کی بھوک کا بندوبست کرتے ہیں۔" اپنی بات کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئے اور باورچی خانے سے بھگونا اٹھا کر صحن میں لگے ہنڈ پمپ کے نیچے رکھا اور ہنڈ پمپ چلا کر دیکھا جالی سے بھرنے کے بعد اٹھا کر باورچی خانے میں چلے آئے، جہاں ملانی جی مٹی کے چولہے میں آگ لگا چکی تھیں۔ بھگونا چولہے پر رکھ کر وہ پھر صحن میں آگئے اور ہانٹی میں ہنڈ پمپ سے پانی بھرنے لگے۔ ہانٹی آدھی بھر گئی تو انہوں نے ہنڈ پمپ چلاتا بند کر دیا اور باورچی خانے میں آ کر بیٹھ گئے، پھر

چونے پر رکھا پانی گرم ہو چکا تو کپڑے سے پکڑ کر بھگونا اٹھایا وہ صحن میں آگے اور پیچھے کا گرم پانی پانی کے ٹھنڈے پانی سے کس کر کے نیم گرم پانی تیار کرنے لگے اور ملائی کی چولہا بجھا کر کمرے میں آئیں۔

”لا پیچے کو سلا دوں۔“ وہ بچے کی طرف ہاتھ بڑھا کے بولیں۔ سائیں نے انہیں دیکھا پھر بچہ انہیں دینے کے بجائے گود میں لیے باہر آگیا۔ ہنڈ پیپ کے پاس ہی کپڑے اور برتن دھونے کے لیے جگہ مخصوص تھی۔ وہ وہاں رکھی چوکی پر آ بیٹھا اور بچے کو ران پر لٹا کر رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ دھونے لگا۔ ملائی جی سمجھ گئی وہ بچہ انہیں نہیں دے گا، اس لیے انہوں نے دوبارہ اس سے بچہ نہیں مانگا اور چوکی اٹھا کر اس کے پاس آ بیٹھیں، جو اب بچے کے گرد لیٹے کپڑے بنا رہا تھا، پھر اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر بچے کو پیروں پر بٹھالیا۔ ملائی جی پانی میں سے پانی کے ٹک بھر بھر کر بچے پر اندھیلے لگیں اور وہ ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالنے دوسرے ہاتھ سے اس کے جسم کو نرمی سے صاف کرنے لگا، بچہ ٹھنڈ اور پانی سے پریشان ہو کر رونے لگا تھا، پر وہ دونوں پورے اطمینان سے اسے غسل دیتے رہے۔ جب وہ پاک ہو چکا تو مولوی صاحب نے ایک خشک تولیہ سائیں کے ہاتھوں میں پکڑ دیا جس میں بچے کو پیٹ کر وہ کمرے میں آگیا۔ ملائی جی اور مولوی صاحب کمرے میں آئے تو وہ بچے کو تولیے سمیت چارپائی پر لٹائے اس کے جسم کو خشک کر رہا تھا۔

”اب اس کے لیے کپڑے کہاں سے لاؤں۔“ ملائی جی بولیں تو مولوی عبدالحق نے کہا۔

”سو راج تو نکلے دے، اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔“

”پھر ایسا کرتی ہوں گرم چادر نکال لیٹی ہوں، ابھی اس میں پیٹ لیتے ہیں۔“ بولتی ہوئی وہ صندوق میں سے گرم چادر نکالنے لگیں، پھر جب بچے کو گرم چادر میں پیٹ چکے تو مولوی صاحب سائیں سے بولے۔

”لا پیچھے دے دے۔“ اس نے کچھ کراتے ہوئے مگر بچے کو سینے میں بچھینچ لیا۔ مولوی عبدالحق نے جسم

لیجے میں بولے

”اس کے کلن میں اذان دینی ہے یا پھر تو اذان دے دے۔“ اس نے ان کی بات سنی اور پھر سوچے بغیر بچہ انہیں دے دیا۔ ملائی جی دودھ گرم کرنے چلی گئیں۔ اور مولوی صاحب بچے کے کلن میں ذات برحق کی کبریائی بیان کرتے ہوئے اذان کے الفاظ اس کی سماعتوں میں اندھیلے لگے۔ اذان کی ادائیگی کے بعد انہوں نے بچہ اس کی گود میں ڈالا تو اس کی بے چینی کو محسوس کر کے مسکراتے لگے۔ ملائی جی دودھ گرم کر لائی تھیں، مگر انہوں نے بچے کو دودھ پلانے کی پیشکش نہیں کی، بلکہ چھوٹے نمبل پر دودھ کا پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسے تو بچے کو بچے سے دودھ پلانے میں مشکل ہو رہی تھی، بچے کو بھی بچے سے دودھ پینا مشکل لگ رہا تھا، وہ اور بھی رونے لگا، آخر کئی بار کی ناکام کوششوں کے بعد بچے کے حلق میں دودھ کے چند قطرے چلے ہی گئے۔ پتا نہیں پھر اس کا پیٹ بھرا کہ نہیں، مگر زیادہ دودھ گرا کر اور تھوڑا سا پی کر وہ کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ وہ سوئے ہوئے بچے کو گود میں لے کر بیٹھا رہا، پھر جب لگا کہ وہ گہری نیند میں چلا گیا ہے تو بہت آسستگی سے اسے بستر پر لٹا کر اٹھ گیا۔ شرمشہ پہلے ہی صحن چکا تھا، پھر کسی طرف دیکھے بغیر چلتا ہوا کمر سے چلا گیا۔ مولوی صاحب دروازہ بند کر کے اندر آئے تو ملائی جی بستر پر بچے کے پاس بیٹھیں دھیرے دھیرے اسے تھپک رہی تھیں۔ مولوی صاحب دوسری طرف سے چارپائی پر بچہ کر کے کھینچنے لگے جو بڑے معصوم انداز میں سوتا تھا۔

”میں تو پریشان ہو گئی ہوں، مولوی صاحب پتا نہیں کس کا بچہ ہے اور اسے کہاں مل گیا۔“

”پتا تو رہا تھا کہ جھاڑیوں سے ملا ہے۔“ وہ چپل اتار کر پاؤں اوپر اٹھا کر آرام سے بیٹھے اور رضائی اپنے اوپر پھیلاتے ہوئے لا پرواہی سے بولے۔ ملائی جی کو ان کا انداز ذرا نہ بھایا۔

”جھاڑیوں سے ملا ہے۔“ انہوں نے منہ بٹایا۔

”بھلا بچے جھاڑیوں میں اگا کرتے ہیں۔ ایسا ہوتا نا

مولوی صاحب تو دنیا میں کوئی بھی بے لولاد نہ رہتا، میں آپ جھاڑیوں سے دو چار بچے اٹھا لاتی۔ اس پاگل نے ایک بات کیا کہ وہی آپ تو ایمان لے آئے۔“

”تم اب بھی اسے پاگل کہہ رہی ہو۔“ ان کا اشارہ کچھ دیر پہلے کے اس کے رویے کی طرف تھا، ملائی جی بھی ایک پل کو خاموش ہو گئیں، پھر عاجزی سے بولیں۔

”میں تو وہی کہہ رہی ہوں جو نظر آتا ہے، پھر اس کی بات پر واقعی دل نہیں ٹھہرتا، کئی بھلا کیوں اپنا بچہ جھاڑیوں میں پھینکے گا، چلیں لڑکی ہوتی تب بھی مان لیتے کہ چودہ سو سال پہلے کی جہالت ابھی ختم نہیں ہوئی، مگر یہ تو لڑکا ہے۔“

”تو بہت معصوم ہے، ہاتھ اور میں کوئی پراقیاس کرنا نہیں چاہتا، میرا سمجھ لے جس عورت نے بچہ گود سے نکل کر پیچھا دیا، اس پر دعوا نہیں کرے گی، اگر سکتی ہی نہیں اور جو دعوا کرے گی، وہ اپنا بچہ خود سے جدا نہیں کرے گی۔ اب اور کیا کہوں، تو یہ بات ذہن سے نکل دے کہ اس کی ماں دکھ میں ہوگی اس نے کسی سکھ کی خاطر ہی اپنی اولاد خود سے دور کی ہوگی، اور بس اب اس بارے میں کوئی بات نہ کرنا کہ بات سچ ہوگی تو غیبت ہے جھوٹ ہوگی تو بہتان اور گناہ دونوں صورتوں میں ہے خود کو سمجھالے کہ اس کا رزق اس گھر میں لکھا تھا اور یہ اپنا حصہ لینے آیا ہے، اللہ کے کام حکمت سے خلی نہیں ہوتے، اسے یہاں بھیجا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی، اس کے ٹھیل وہی جانے۔“

تہجد کا وقت ہو چکا تھا، اپنی بات ختم کر کے مولوی عبدالحق وضو کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مسجد سے نکل کر مولوی عبدالحق تسبیح کے دانے گراتے گھر کی طرف جارہے تھے، ملائی جی کو جو دروازے میں کھڑے دیکھا تو ٹھٹک کر رک گئے، انہیں یاد نہیں آیا کہ پچیس سالہ اندوہی زندگی میں کبھی ملائی جی نے دروازے پر کھڑے ہو کر ان کا انتظار کیا ہو۔ حیران ہوتے وہ ان کے پاس چلے آئے اور ان کے اچھن بھرے چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

”کیا بات ہے۔“

”وہ آیا ہوا ہے۔“ ملائی جی پریشانی سے گویا ہوئیں۔

”کون؟“

”لوگتے ہوئے مولوی صاحب نے ان کے اوپر سے اندر گھر میں نظر ڈالی، پھر انہیں سائیڈ میں لے کر اندر چلے آئے۔“

خال صحن کو دیکھتے ہوئے بیٹھک میں آگئے، بچہ باگ چکا تھا اور سائیں اسے گود میں لیے چارپائی پر بیٹھا تھا، حالانکہ وہ ایک ٹک بچے کو دیکھ رہا تھا، لیکن اس کی آنکھیں دلچسپی سے خالی تھیں اور نہ ہی وہ بچے سے کھیل رہا تھا، مگر بچے کو اس کی موجودگی بہت اچھی لگ رہی تھی، وہ کبھی اپنے چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھ اس کے سینے پر مارتا اور کبھی اس کی واڑھی میں الجھا کر کھینچتا بہت گمن لگ رہا تھا۔ پتا نہیں سائیں نے مولوی عبدالحق کی موجودگی کو محسوس کیا یا نہیں، کیونکہ ان کے آنے کے بعد بھی وہ انتہاک سے بچے کو دیکھتا رہا تھا۔ اس پر سے نظر ہٹا کر مولوی عبدالحق پیچھے کھڑی ملائی جی سے بولے۔

”دکان کھولنے کا وقت ہو گیا ہے، میں دکان کھولتا ہوں، تم ناشتا کھاؤ، لیکن آج ناشتا تین لوگوں کا بنانا ہے۔“ وہ بول بول رہے تھے جسے روئین کی بات، ہوا اور پھر جا کر دکان کا دروازہ کھولنے لگے، ملائی جی دو کے بعد تیسرا پر اٹھا تیل رہی تھیں کہ انہوں نے سائیں کو کمرے سے نکل کر باہر جلتے دیکھا اور وہ جھنجھلاتے ہوئے پر اٹھا بیٹھنے لگیں۔

جنگل میں لگی آگ کی طرح گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ سائیں کسی کا بچہ اٹھا لیا ہے، جو اب مولوی صاحب کے گھر میں مل رہا ہے، اس کے ساتھ ہی چھ گھونٹیاں ہونے لگیں، مولوی صاحب کا بہت احترام تھا، مگر بات ہی ایسی تھی کہ اسی شام کی بیٹھک میں یہ ذکر چل نکلا۔

”ایک بات سنی ہے مولوی صاحب، پتا نہیں سچی ہے کہ جھونٹی پر سارے پنڈ میں شور مچا ہے کہ سائیں کسی کا بچہ اٹھا لیا ہے۔“

”جھوٹ سنا ہے۔“ جبار عرف جیرے کی بات پر

مولوی عبدالخالق نے کہا۔

”وہ کسی کا بچہ نہیں اٹھا لیا بلکہ بچے کے والی وارث خود بچے کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے۔“

”لیکن بچہ ہے کس کا۔“ ایک اور نے کہا۔

”دیکھو نیاز محمد ہمیں تو اس کی تمبانی کا فرض سونپا گیا ہے سو ہم کر رہے ہیں باقی کی باتیں تو اللہ جانے۔“ انہوں نے متانت سے جواب دے دیا مگر ملالی کی زنج ہونی جاری تھی۔

”عقل کی بات کر زینب جس نے رات کے اندھیرے میں بچہ ویرانے میں پھینک دیا کوئی کہاں سے اس کا پتا ڈھونڈے۔“ ان کی بات پر زینب بولی۔ ”یہ بھی ہے پر کچھ دن انتظار کر کے دیکھ لیں شاید کوئی اسے لینے آجائے۔“

”زینب تو واقعی کم عقل ہے۔“ ایک دوسری عورت بولی۔

”گر لینے ہی آتا تھا تو کوئی چھوڑ کے کیوں جاتا لیکن ملالی کی معاملہ تو مشکوک ہے کوئی کیوں اپنا بچہ پھینکے گا وہ بھی اتنے سونترے منڈے کو میرے گھر والے نے منڈے کے چکر میں تین بیابا کر لیے اب کتا ہے جو تھا کرے گا بھلا کوئی وارث کو بھی پھینک سکتا ہے۔“

”اب کیا کہوں سعیدہ بات تو میری عقل میں بھی نہیں آتی پر مولوی صاحب کہتے ہیں برا قیاس نہ کرو۔“ انہوں نے کہہ کر اس ٹاپک کو ختم کر دیا۔

صحن میں چار پائی بچھا کر بیٹھی عورتیں دھوپ سینکتے ہوئے اپنے اندازے لگاتی رہیں جبکہ وہ جس کی ذات معمہ بنی ہوئی تھی سامعین کی گود میں لینا مزے سے اگوشا جو رہا تھا۔ دھوپ اتر گئی تھی اور مولوی عبدالخالق کے گھر کا آگن بجوں سے بھر گیا تھا برابر برابر دو دریاں پھٹی تھیں ایک درمی پر بیٹھے بچے ہاتھوں میں سپارے لیے لٹک لٹک کر قرآن پڑھ رہے تھے اور دوسری درمی پر وہ بچے بیٹھے تھے جو قرآن کا سبق لے کر یاد کر چکے تھے اور اب اپنے اسکول کی کتابیں کاپیاں لے کر بیٹھے ہوم ورک کر رہے تھے سامعین نے آج پہلی بار شام میں مولوی صاحب کے گھر سے

کیا تھا، حلالانگہ کچھ دنوں سے وہ برابر ان کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ وہ آتا کچھ دیر بیٹے کے ساتھ گزارا پھر اٹھ کر چلا جاتا، مگر جتنی دیر بھی وہاں رہتا بچے کے سارے کام خود کرتا، بچہ بھی اس سے مانوس ہو گیا تھا۔ وہ اسے بچانے لگا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرا کے بول اپنے ہاتھ اٹھاتا جیسے اسے بلا رہا ہو پھر جتنی دیر اس کے ساتھ رہتا کھیلتا رہتا روتا تو بالکل بھی نہیں۔

سامعین دروازے پر آکر رک گیا تو بچے جینٹس سے اسے دیکھتے ہوئے آپس میں کھسپ کر کے لگے۔ بچے کو حساب کا سوال سمجھاتے ہوئے مولوی عبدالخالق نے دروازے کی طرف بچوں کی دلچسپی محسوس کر کے سر اٹھا کر دیکھا پھر سامعین پر نظر پڑتے ہی بیٹاشٹ سے بولے۔

”او جھلیا باہر کیوں کھڑا ہے اب تو اس چوکھٹ پر تیرے نام کے تعویذ گڑے ہیں سیدھا اندر چلا آ۔“ وہ چلتا ہوا اندر آیا اور مولوی عبدالخالق کے ساتھ درمی پر بیٹھ گیا۔ اسے چپ دیکھ کر مولوی عبدالخالق نے کہا۔ ”کاک سے ملنے آیا ہے۔“ اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا پھر کہا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”سبحان اللہ۔“ مولوی صاحب نے بے ساختہ کہا پھر آوازیں دینے لگے۔

”ہاجرہ او ہاجرہ کھانا لے کر آؤ۔“ لیکن ایک منٹ۔“ انہیں کچھ خیال آیا تو بول کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

”کھانا تو مجھے ضرور ملے گا پر پہلے ایک کام کرنا ہوگا۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ مولوی عبدالخالق اس کے استفسار کو سمجھ گئے تھے لیکن اسے کچھ بتانے کے بجائے وہ اشارے سے ایک بچے کو پاس بلانے لگے۔

”کو دھرا۔“ بچہ پاس آیا تو بولے۔ ”جا کر جبار سے کہہ کہ اپنا نام جھام اٹھا کر چلا آئے۔“

”جبار کون، جیرا نالی۔“ بچے نے معصومیت سے

بولتے ہوئے تصدیق چاہی تو مولوی صاحب ہاتھ پٹ کر بولے۔

”تم لوگ نام بگاڑنے سے باز نہ آنا۔ ہاں جی جا کر جیرے نالی سے کہو میں نے بلایا ہے۔“ اور بچہ ان کے کلمے پر غلطو فظ ہونا باہر بھاگ گیا۔ اسے بھیج کر مولوی عبدالخالق سامعین کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے بچوں کو بڑھانے لگے۔

”مسلم مولوی صاحب۔“ جبار نے دروازے پر سے ہی سلام جھازل۔ مولوی صاحب اس کے سلام کا جواب دیتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اپنا سامان ساتھ لائے ہو۔“ جی مولوی صاحب سب اٹھا لیا ہوں۔“ اس نے اپنے کندھے سے لگے کپڑے کے صندوق کو تھپکا۔

”پر آب کے بل بوتے جمعے کو ہی تراشے تھے اور خط بھی بنایا تھا پھر کیسے بلانا ہوا۔“ اس کی بات پر مسکرا کر مولوی صاحب نے سامعین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”تیری ضرورت مجھے نہیں اسے ہے۔“ پھر اس کے پاس آکر بولے۔

”چل اٹھ بہت پھر لیا اس طرح اب تجھے انسان کا بچہ بناتے ہیں۔“ اس کے بعد اندر سے میز اور کرسی منگوا کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ جبار پھرتی سے اپنا سامان نکال کر میز پر رکھتا جا رہا تھا۔ سامعین کے جی میں جانے کیا آتی کہ آئینہ اٹھا کر اس میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔

وہ چہرہ جس مدت سے دھویا نہیں گیا تھا بڑھے بالوں اور نازا شیدہ واڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ اسے جیسے خود بھی اپنی پر آگندہ حالی پر یقین نہیں آیا۔ واڑھی کے چھپاتے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنے اصل روپ کو یاد کرنا چاہا۔ پر حیرت کی بات تھی کہ اسے اپنی صورت یاد نہیں آتی اور آتی بھی کیسے آئینے میں نظر آتا چہرہ اس قدر اجنبی تھا کہ اس میں سے پرانے نقوش و صورت پانا مشکل ہوتا۔ جبار نے اس کے کندھوں پر تولیہ ڈال کر سر کے بال تراشنا شروع کیے۔ اس نے مدت سے سر نہیں دھویا تھا اور نہ بالوں میں

نیل لگایا تھا سو اب ان کی حالت جھاڑ جھنکار جیسی ہو رہی تھی جسے کانا آسان نہیں تھا ہر جبار اپنے کام کا کاری کر تھا، وقت تو ہوئی پر اس نے بالوں کو تراش فراش کی مدد تک صحیح حالت دے دی تھی پھر اس کی واڑھی کے بالوں کو معقول حد تک چھوٹا کر دیا۔ جبار اپنی طرف سے کام ختم کر کے سیدھا ہوا تو اس نے ہاتھ پیرا کر آئینہ اٹھا لیا۔ چہرہ اب بھی انجان لگ رہا تھا۔ بنا کچھ سوچے اس نے شیونگ کے لیے جھاگ بنا کر ہاتھ سے چہرے پر پھیلایا، پھر استرا لے کر شیونگ کرنے لگا۔

اب اس کے چہرے کو بلیڈ کی رگڑ کی عادت نہیں رہی تھی اس نے ایک ہاتھ مارا ہی تھا کہ چہرے پر کٹ پڑ گیا مگر اس نے شیونگ روک کر خون صاف کرنے کی زحمت نہیں کی اس کی حرکات و سکنات خوابیدہ سی تھیں جیسے وہ اپنی پرانی عادتوں کو یاد کر رہا ہو۔ وہ آرام سے شیونگ کرتا رہا، مگر اب اس کے انداز میں احتیاط تھی۔ واڑھی ہٹا کر اس نے تولیے سے جھاگ منہ پر سے صاف کرتے ہوئے آئینے میں دیکھا اور باطنی میں جھانکا۔ اب بھی اس کے چہرے میں کچھ اجنبی سا تھا۔ موٹھوں کو صاف کر کے اس نے پھر آئینہ دیکھا۔ اب کے اسے اپنے چہرے سے شناسائی کا احساس ہوا تھا۔

”اب کچھ بات بتی ہے۔“ اپنی ٹھوڑی کو مسلتے ہوئے اس نے سوچا۔ ”یہ کپڑے لے اور جا کر نما لے۔ ویسے میرا ناپ تجھے چھوٹا ہوگا مگر جو چھوٹے تولیے پہن رکھے ہیں ان سے بہر حال بہتر ہیں ابھی ان سے ہی کام چلانے کل تیرے دو جوڑوں کا پیرا خرید کر درزی کو سلنے کے لیے دے دوں گا۔“ مولوی صاحب ہاتھ میں اپنا ایک شلوار قمیص لیے اس سے کہہ رہے تھے اس نے ان کے ہاتھ سے کپڑے لیے پھر رسی سے تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلا گیا۔ وہ اتنی دیر تک نما لیا کہ مولوی صاحب مغرب کی نماز پڑھا کر آئے، مگر جب وہ کپڑے بالوں کو تولیے سے رگڑنا غسل خانے سے برآمد ہوا تو دونوں میاں بیوی خوشگوار حیرت میں گھرے اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بال بنو میاں لے رنگ کے لگا

http://www.pak.com

75 روپے والا نہیں

صرف 35 روپے میں

مہینے بھرا کا شیمپو

میدی کیم شیمپو

بالوں کو گھنا

میدی کیم شیمپو کرے بالوں کو گھنا۔ چمکدار اور سیاہ۔



اٹھ کر دیوار گیر الماری سے لنگھا پتھر کرواپس اپنی جگہ پر آ بیٹھیں۔ اس نے سخن میں بڑی بیڑھی اٹھا کر چارپائی کے پاس رکھی جس پر ملائی جی بیٹھی تھیں اور اس پر بیٹھ کر سران کے سامنے چھکا دیا۔ مولوی صاحب کی مسکراتی نظریں اس پر کئی لمحوں جو نگاہیں پتی کیے کسی بھی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا جبکہ ملائی جی اس کے بال رہتے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔

”دینے والے نے تقی باری صورت دی ہے بر تو ہے کہ خواجواہ بگاڑ دیکھی تھی تب نہ وہ حالت بنانا چھو نہیں بتا تجھ پر کیا بتی سے تیرے زخم لہو ہنڑ نہ جائیں اس لیے پوچھوں گی بھی نہیں، لیکن ایک بات کہوں گی کہ اگر آج بیٹے ہوئے کل کا ماتم منایا جائے تو اس کی نحوست کے سائے آنے والے کل پر بھی پڑ جاتے ہیں جو ہوا اگر اسے بھول نہیں سکتا تو بھی یاد کرنا چھوڑ دے۔ لے تیرے بال بھی بن گئے۔“ اس کے بال بن چکے تو انہوں نے کہا بھی اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی وہ اندر چارپائی پر سو رہا تھا اور جاگنے پر خود کو اکیلا پا کر رونے لگا تھا۔

”کاکا جاگ گیا ہے میں ذرا اسے دیکھ لوں۔“ خود کلامی کرتی وہ اٹھنے لگیں تو اس نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر روکتے ہوئے کہا۔

”آپ رہنے دیجیے میں دیکھتا ہوں۔“ علیہ کیا سنورا اس کا تو بات کرنے کا انداز بھی سنور گیا تھا شائستگی سے بول کر وہ کمرے میں آیا اور کچے کو شانے سے لگا کر چپ کرانے لگا لیکن بچہ تو اس کی گود میں آتے ہی ایسے چپ ہو گیا جیسے اس نے گود میں لے لیا ہو۔ اس کا بدن بڑھتا ہوا تو عبد اللہ نے جیسے اس کا تاثر دیکھنے کے لیے اپنا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے کیا۔

بچہ پریشان سا ہوا لیکن کس جانا پہچانا ہے پرچہ اجسی اپنی بڑی بڑی کھلی آنکھوں کو ہنستا ماہ اپنے نرم ہاتھوں سے اجسی چہرے کو چھونے لگا تو ایک مدت کے بعد عبد اللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی اظہارِ تشکر کے طور پر اس نے ان نرم ہاتھوں کو چوم لیا۔

”عبد اللہ اگر کھانا کھا لو۔“ کچھ دیر بعد ملائی جی نے

کرتے تھے ان کی سیاہ رنگت کئی بار صابن سے دھل کر نکھر آئی تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں کی مقناطیست تو وہی تھی لیکن اب ان میں وحشت دکھائی نہیں دے رہی تھی ہاں کمزور پائی ہوں کی توں تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے واضح ہو رہے تھے۔ رنگ شاید یوں بھی قدرے سا تولا رہا ہو گا مگر اب مجلس کر گہرا ہو گیا تھا۔ گالوں کا ڈھیلا ماس بتا رہا تھا کہ یہ چہرہ کبھی پر گوشت تھا۔ عنبالی رنگ کے ہونٹ جو سختی سے بچھے رہتے تھے اس وقت نرمی سے بند تھے جن سے چہرے کا اثر ہی بدل گیا تھا۔ وحشت اور دیوانگی کی جگہ سنجیدگی اور متانت نظر آ رہی تھی۔ اس کی دراز قامت تو نظر آتی تھی مگر شانوں کی چوڑائی اب زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بھی صحت مند جسم کا مالک رہا ہو گا لیکن اب اس کا وزن کافی کم ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کے کپڑے اس کے لیے قدر کافی چھوٹے تھے۔ شلووار ٹخنوں سے اوپر جا رہی تھی اور قمیص گھٹنوں سے اوپر اس پر مضحکہ یہ کہ کمزوری کی حد تک دبلا ہونے باوجود قمیص اس کے چوڑے چکلے سینے پر پھنسی ہوئی لگ رہی تھی مگر جس نے اسے دیوانگی کے عالم میں دیکھا ہو اس کے لیے اس کی بدلی ہوئی حالت واقعی خوشگوار تھی۔

”سائیں کی تو حالت ہی بدل گئی ہے مولوی صاحب دیکھیں ذرا کیسا سو ہنڑا روپ نکالا ہے۔“ ملائی جی کی بات پر اسے دیکھتے ہوئے وہ مسکراتے لہجے میں بولے۔

”یہ سائیں نہیں ہے ہاجرہ اللہ کا بندہ ہے۔ عبد اللہ ہے کیوں عبد اللہ میں نے ٹھیک کہا۔“ وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا، ران کے استفسار پر نظر چرا کر گیا تو لیدہ رسی پر پھیلائے لگا۔ مولوی صاحب کی مستی خیز مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

”نہ مان تیرے نہ مانے سے اس کی بزرگی اور تیری گی میں فرق نہیں آئے گا۔“ اور وہ انجان سا بنا لیوں کی مدد سے اپنے بال سلجھانے لگا ملائی جی نے بلھا تو بولیں۔

”کوہر آ میرے پاس میں بال بنا دیتی ہوں۔“ اور

246

”اسے بھی ساتھ لے آنا اس کے فیڈر کا وقت ہو گیا پر کھیل میں ٹھیک سے لپیٹ لینا کہیں سرور نہ لگ جائے۔“ وہ چلی گئیں تو عبد اللہ بھی اسے کھیل میں لپیٹ کر باہر باورچی خانے میں آ گیا۔ مولوی صاحب کھانا ختم کر کے اٹھ گئے۔

”اچھا ہجرہ میں مسجد جا رہا ہوں عشاء کا وقت ہو گیا ہے اور تو سن عبد اللہ کھانا کھا کر اوھر اوھر نہ نکل جانا بہت ہو گئی آوارہ گردی اب آرام سے گھر بیٹھ۔ اس کے لیے بھی بستر بچھا دینا۔“ وہ عبد اللہ سے کہہ کر آخر میں پھر ملانی جی سے بولے تھے جب مولوی صاحب مسجد سے لوٹے تو وہ سچے کو ساتھ لیے سو رہا تھا جبکہ بچہ سرگھاٹھا کمرے میں چاروں طرف دیکھتا اس کے بازو کے نیچے پر لینا جاگ رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر مولوی عبد الحاق نے ملانی جی کو دیکھا اور بولے۔

”رب سو ہنرے کی یہی بات تو سب سے سو ہنی ہے کہ بندہ جو ماتھا ہے اس سے دو گناوتا ہے اب دیکھ تو اس سے ایک پتر مانگا کرتی تھی اس نے دو دے دیئے ہیں اب سنبھل انہیں اور اپنے چاؤ پورے کر لیکن یاد رکھنا جس نے دیئے ہیں وہ لے بھی لے گا۔“

”بے شک مولوی صاحب پر ابھی تو میرا آنگن بھر گیا ہے مجھے اس پر خوش ہو لینے دیں۔“

”شکر کرنا مت بھولنا۔“ انہوں نے تینبہہ کی۔

”تمہیں بھولوں گی۔“ ملانی جی نے یقین دلایا۔

بہادر نے جھانک کر اندر اسٹڈی میں دیکھا۔ نور الہندی فائلوں میں سرورے بیٹھے تھے۔

”صاحب۔“ اس کی آواز پر انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا۔

”ہاں بولو۔“

”آپ سے ملنے کوئی بی بی آئی ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے بہادر کو دیکھا۔

”رات کے گیارہ بجے کون سی بی بی مجھ سے ملنے آئی۔“

”میں کیا جانوں۔“ وہ خواجھا شرمشا گیا تو نور الہندی جھنجھلا گئے۔

”تم نے نام پوچھا تھا۔“

”مریم تارہی تھیں۔“ ایک پل کو تو انہیں یاد ہی نہیں آیا کہ یہ نام کمال سنا ہے پھر جب یاد آیا تو اچھل پڑے۔

”اومانی گوڈ مریم بزدلی۔ یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے۔“ وہ تو خود کھائی کر رہے تھے۔

”جا کر اسے کہہ دو میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔“ وہ روڈ سے لہجے میں کہہ کر دوبارہ فائلوں میں الجھ گئے اور بہادر۔ ”جی صاحب۔“ کتا ڈرائنگ روم میں آ گیا اور نور الہندی کا پیغام حرف یا حرف مریم کے کالوں تک پہنچا دیا۔ اس کے تو کالوں میں لگی سر پر جا کر بچھی۔

”مجھے اپنے صاحب کے پاس لے چلو۔“ وہ بگڑے لہجے میں بولی تو بہادر منمتا۔

”صاحب آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔“

”شٹ اپ۔“ وہ حلق کے بل چلائی۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت نور الہندی کے پاس لے کر چلو ورنہ میں تمہارا حشر کروں گی۔“ بہادر بے چارہ تو اس کی اونچی آواز سن کر ہی ڈر گیا اپنا حشر کیا کروا لگے۔

”جی میم صاحب۔“ کہہ کر وہ اسے اپنے ساتھ لیے لاؤنج میں آیا پھر دور سے ہی بیس منٹ میں بی اسٹڈی کی طرف اشارہ کیا۔

”صاحب وہاں آئی۔“ نور الہندی سے ڈانٹ پکی تھی اس لیے جلدی سے کہہ کر صاب ہو گیا۔ وہ شعلہ بار انداز میں اسٹڈی میں داخل ہوئی تھی۔ نور الہندی اسے دیکھ کر حیران رہ گئے مگر جرحے سے ظاہر نہیں ہونے لگا اور کمر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اسے دیکھنے لگے جو چلتی ہوئی ان کے ٹیبل کے پاس آ کر رکی پھر تان اسٹاب بولتی چلی گئی۔

”تمہیں کس چیز کا غور ہے نور الہندی۔“ چند مہلے زمینوں کا جنہیں میں سوہا خرید کر پھینک سکتی

ہوں۔ تمہارے اس بزنس کا جس کا سیٹ اب کھڑا کیے تمہیں چار دن نہیں ہوئے یا تمہاری پر سناٹی کا جسے خاص بنانے والی بھی میری نظر ہے۔ تم ہو گیا اور تمہیں یہ سوچنے کی جرات بھی کیسے ہوئی کہ تم میری انسلٹ کر سکتے ہو۔ اس دن تو میں نے یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ تم شاید اپ سیٹ ہو مگر کن جو تم نے کیا اس کی تمہارے پاس کوئی وضاحت ہے کیا کا تمہیں مریم بزدلی تم پر مرمتی ہے۔ مجھے تو اس کا کیا تھا تم پر کہ اتنی تنگ انداز میں تم کلام لے کر بوجھتے رہ کر اپنے اور ڈپرہسڈ ہو گئے ہو۔ میں نے سوچا تھا تمہیں اپنے دوستوں سے کوارڈر لگا ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کر تم ریٹیکس میں مل کر گے تو تمہاری ڈل لائف میں کچھ ایسی آجائے گی اور تم۔“ تیز لہجے میں بولتے بولتے اچانک ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اپنی سیدھی کے احساس سے زیادہ نور الہندی کی بے رحمی کے لیے تھے۔

”forget it“ بس ایک پل کو اس کی آواز بھرائی تھی پھر تنفر سے کہہ کر وہ مزنی اور جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے واپس چلی گئی۔

”مجھے اسے رلاتا نہیں چاہیے تھا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر الطیبتان سے اس کی صلواتیں سنتے نور الہندی جھکے سے سیدھے ہوئے تھے پھر وہ اتنی تیزی سے نکل گئی کہ نور الہندی کو اسے روکنے کا موقع بھی نہیں ملا اور اب وہ بیٹھے افسوس کر رہے تھے۔ وہ فطری طور پر بہت کیرنگ انسان تھے مگر بلجھ کے بعد ان کی اس عادت میں خلل آ گیا تھا لیکن وہ مریم سے ایک سیکور بھی کرنا چاہتے تھے پھر بھی جھجک میں دو دن گزر گئے۔

مریم ان سے یہ کہہ تو آئی تھی کہ ان کے پاس ان کی خاطر گئی تھی مگر اسے خود بھی احساس تھا کہ یہ سچ نہیں ہے اور جو سچ تھا وہ اسے سوچ کر خوفزدہ تھی اسی لیے جب سے ان کے پاس سے آئی تھی منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ ملازمہ کئی بار اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے چکی تھی مگر مریم کے گلن میں جواں ٹھکڑا

نہیں رہ سکتی۔ آخری حربے کے طور پر اس کی ممی دو سرے چالی سے دروازہ کھول کر اندر آئیں اور ہینڈ پر بیٹھ کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے آوازیں دینے لگیں۔

”مگر کیا کون ہے۔“ وہ بدستور جرتے ہوئے بولی۔

”نام تو بتایا تھا اس نے بڑا الگ سا ہے کیا نام تھا۔“ ان کی بڑبڑاہٹ پر مریم کو مزید طیش آنے لگا مگر ضبط کیے بیٹھی رہی پھر انہیں بھی نام یاد آ گیا۔

”ہاں نور الہندی ہے اس کا نام۔“

”واٹ۔“ وہ اچھل ہی تو گئی۔

”مما آئی ایم سوہی۔“ وہ ان سے لپٹ کر بولی پھر ان کا کال چوم کر ہا ہر جھاک گئی۔

ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر اسے بریک لگ گئے تھے نور الہندی کی روڈ میں کو یاد کر کے اس کی ساری خوشی کا فور ہو گئی مگر ان سے ملنا بھی چاہ رہی تھی۔ سنجیدہ سا چہرہ بنائے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو نور الہندی اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

”تھینک گاڈ ورنہ تو لگ رہا تم ملنے کے لیے منع کرو گی۔“

”میں تمہاری طرح بد اخلاق نہیں ہوں۔“ اس کے منہ بنا کر کہنے پر نور الہندی بے ساختہ مسکرائے اور کہا۔

”ہاں وہ واقعی بد اخلاق تھی اور اسی لیے میں تمہیں سو رہی کہنے آیا ہوں۔“ اس کی صورت ایک دم سے رو باسی ہو گئی اور اس نے صفے سے منہ پھر لیا۔ نور الہندی اسے دیکھ کر بولے۔

”آئی ایم سوہی۔“ اس نے توجہ نہیں دی۔

”اچھا بابا یہ لو ہاتھ جوڑ کر سو رہی کہہ رہا ہوں۔“ اسے ماننا نہ دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ جوڑے تو بالکل اچانک ہی انہیں وہ پل یاد آ گئے جب خفا سی بلجھ ان کے ہزار ماننے پر بھی نہیں ملتی تھی اور انہوں نے ہار کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”مجھ روٹھ جاؤ گی تو میرے پاس کیا رہ جائے گا۔“

اپنا کما جملہ یاد کر کے ان کے اندر کا خلی پن سوا ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھ بے دم ہو کر گر گئے مریم نے ان کی طرف دیکھا پھر ان کے چہرے پر پھیلے بخرپن کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا تمہیں۔“ نور الہدی نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرائی۔

”کم آن نور الہدی میں مذاق کر رہی تھی۔“ وہ آہستہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے مگر باہر نکل جانے کے بجائے وہ وہیں رک گئے۔

انہیں معلوم تھا اب آگے ان پر کیا بیتے کی ان میں بگولوں کے طوفان انہیں گے اور وہ گلی کوچوں میں سر ہٹتے پھریں گے پھر جب بیچ کی یادوں کے شگے میں جکڑے قصر فاروقی لوہوں کے توہمت جواب دے جائے گی۔ مگر پھر بھی ان کے قدم ان کی مرضی کے بغیر اٹھیں بیچ کے کمرے میں لے جائیں گے۔ وہ کہہ جو نور الہدی کے زندہ وجود کا مقبوض تھا اور پھر... پھر خود پر اختیار کے رہے گا۔ ہر بل کے ساتھ یادوں کے اندھے کتوں میں اترتا، ابھرتا اور پھر اترتا۔ آسان نہیں ہوتا روح تک کو نڈھال کر دینے والا یہ عمل نور الہدی کی برداشت سے باہر تھا۔ مریم اب بھن بھرے انداز میں ان کی پشت کو دیکھ رہی تھی کہ وہ ایڑی کے بل گھوم کر بڑے ریٹیکس موڈ میں بولے۔

”آکس کریم کھانے چلو گی۔“

”کیوں نہیں؟“ وہ جھٹ سے بولی پھر کہا۔
”لیکن میں ذرا چیخ کر لوں۔“ نور الہدی بیچ کی یادوں کو بل بھر کی سہمت نہیں دینا چاہتے تھے فوراً بولے۔
”کیا ضرورت ہے ٹھیک تو لگ رہی ہو۔“
”میں نے صبح سے کپڑے نہیں بدلے اور تمہیں ٹھیک لگ رہے ہیں تم گاڑی میں چل کر بیٹھو میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“ روف سے ٹراؤزرنی شرٹ میں مریم ان کے بل بل بدلتے موڈ پر حیران رہ کر بولی تھی مگر وہ مصرر رہے۔
”کہنا ضرورت نہیں اور مجھے تو اس وقت تم بہت

خوبصورت لگ رہی ہو۔“
”اوکے۔“ وہ جھکرا ختم کرنے کو بولی۔
”لیکن شوژ پینے کی اجازت تو ملے گی نا۔“
انہوں نے ہنسی تمہارے آنے کا سن کر میں بیڈ روم سے نکلے پاؤں مٹائی چلی آئی۔“ اپنی جلد بازی کا اعتراف اس نے اتنی معصومیت سے کیا کہ نور الہدی مسکرائے بغیر نہ سکے۔

مریم کافی پانی قسم کی لڑکی تھی مگر اس کی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں نور الہدی اس کی گپنی میں بہت انجوائے کر رہے تھے۔ آکس کریم کھا کر وہ ساحل سمندر پر نکل آئے اور دور تک گلی رست پر پیروں کے نشان بناتے چلتے چلے گئے۔ شام کے سائے ڈھلے تو انہیں وقت گزرنے کا احساس ہوا اور وہ پلٹ آئے۔ نور الہدی اسے ڈراپ کرنے آئے تو گاڑی اس کے گھر کے باہر روک دی مگر وہ بیٹھی ہی رہی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ اسے بیٹھو دیکھ کر نور الہدی نے پوچھا تو وہ دھیرے سے بولی۔
”سوچ رہی ہوں کہ آج تم اگلی ملاقات کا وعدہ کرو گے یا نہیں۔“

”نہیں۔“ اس ایک لفظ پر اس کا چہرہ دھلن ہو گیا اور اس نے فوراً دروازہ کھول کر اتر جانا چاہا مگر نور الہدی نے دروازے کے لاک پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔

”پوری بات تو سننی جاوے۔“ وہ ڈیٹ کر بولے پھر اسے دیکھ کر مسکرائے جو خفا تھا اسی انہیں گھور رہی تھی اور کہا۔

”آج میں تم سے اگلی ملاقات کا وعدہ لینا چاہتا ہوں۔“ نور مریم ایک دم سے ہنس پڑی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔

باورچی خانے میں بیٹھ کر ناشتا کرتے ہوئے مولوی صاحب ملانی جی سے کہہ رہے تھے۔
”آج میں نے پیش امام کو کہہ دیا ہے کہ کل تڑکے

ہی لاہور کے لیے نکل جاؤں گا۔“
”مگر ابھی تو دوکان میں دوپٹے کا سامن موجود ہے پھر لاہور کیا کرنے جائیں گے۔“ وہ اچھبے سے بولیں تو مولوی عبدالحق مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

”بھلی عورت دوکان کے سامن کی میں نے بات ہی کب کی میں تو ننھے میاں کے لیے لاہور جا رہا ہوں خود ہی تو کہہ رہی تھی اس کے لیے بستر لینا ہے مگر کپڑے لینے ہیں اور بھی پتا نہیں کیا کیا خیر جو بھی منگوانا ہے بتا دینا میں لکھ کر لے جاؤں گا۔“ عبد اللہ خود فرماؤشی کی کیفیت سے تو باہر آ گیا تھا پھر بھی تنگ اس کا داغ غنودگی کے عالم میں تھا انہیں کوئی تحریک ہوتی تو داغ کا وہ حصہ جھٹک لے کر چل پڑتا مگر ان الگ الگ حصوں کا آپس میں کوئی ربط منقطع نہیں پایا تھا اسی لیے اس کے ذہن پر وہ نہی چھائی رہتی لیکن داغ بہر حال فعال ہو چکا تھا۔

اپنی بھی ان دونوں کی باتوں کو سن کر اس کے ذہن میں تحریک ہوئی تھی بچے کا سامن خریدنے کے لیے چلنے کی ضرورت تھی اور پیسہ کام کرنے سے آتا ہے عبد اللہ بچے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا بلکہ یوں کہتا چاہیے کہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور وہ اپنے آپ ہی عبد اللہ کی ذمہ داری بن گیا اب عبد اللہ سوچ رہا تھا کہ اسے بچے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کام کرنا چاہیے لیکن اس نے مولوی صاحب سے اس بات کا ذکر نہیں کیا بلکہ وہ تو کسی سے بھی کسی بات کا ذکر نہیں کرتا تھا ایک جلد چپ کی مہر اس کے ہونٹوں پر لگی تھی اور شاذ و نادر ہی اس کی زبان سے کوئی لفظ آواہوتا تھا حالانکہ وہ اپنی کے عالم میں تو وہ بہت بڑبڑاتا تھا مگر قرزا لگی نے اس کی گز نہ گھونٹ دی تھی۔

ناشتا کر کے اس نے ہینڈ پمپ پر جا کر ہاتھ دھوئے اور خشک۔ کیے بغیر باہر چلا گیا۔
”یہ دو دن تو آرام سے بیٹھا رہا آج پھر نکل گیا ہے۔“ ملانی جی اسے جانو دیکھ کر پریشان ہو میں مولوی صاحب سے بولیں تو وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے

بولے۔
”فکر کیوں کرتی ہے وہ تجھے اور مجھے تو چھوڑ کر جا سکتا ہے پر اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔“ بولتے ہوئے انہوں نے بچے کی طرف اشارہ کیا پھر ”اللہ اکبر“ کہتے گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

عبد اللہ سر جھکائے بیروں میں دیکھا ہاتھ پشت پر ہاتھ چلا چلا جا رہا تھا مگر اس کے داغ کی سولی ایک جگہ پر ہی اٹک گئی تھی اس نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ اب کام کرے گا لیکن سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کون سا کام کرے وہ سوچتے سوچتے تھک گیا تو ایک مکان کے آگے بنی ڈیوڑھی پر بیٹھ گیا۔ گلی میں کچھ نئے کنپڑے کھیل رہے تھے وہ انہیں دیکھنے لگا۔ وہ بظاہر انہیں دیکھ رہا تھا پر اس کا داغ ”کیا کیا جائے۔“ میں الجھا تھا۔ بچوں کو دیکھتے دیکھتے ہی اس کی نظر اس شخص کی طرف اٹھ گئی جو سامنے والی دوکان کے باہر زمین پر بیٹھا تھا اور جب وہ لوہے کی دوکتی سلاح کو سل پر رکھ کر ہولڈر سے پکڑے بھاری ہتھوڑے کے وار سے ضرب لگا تا تو چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ اسے وہ آتش بازی اتنی دلچسپ لگی کہ قریب سے دیکھنے کے لیے اٹھ کر لوہاری دوکان کی طرف چل پڑا لوہار نے ہاتھ روک کر عبد اللہ کو دیکھا جو اس کے مقابل بیٹھ رہا تھا۔

وہ بچپاس کے ٹیٹھے میں تھا مگر اوپر تک چڑھا رکھی آستینوں میں سے اس کے بازو کی طاقت کو مدنی محسوس ہو رہی تھی اور جب وہ بولا تو اس کی آواز بھی کڑکڑائی ہوئی تھی۔

”خیر ہو عبد اللہ آج تو فیروز گشت شروع کر دتی ہے۔“ اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا اور پھر وہ کہا جو اس کے داغ میں چل رہا تھا۔
”اب کام کروں گا۔“
”اوے کیرا کام۔“
”کوئی بھی۔“ اس نے کندھے اچکاویئے پھر بولا۔
”تمہیں جو کر رہے ہو وہ سمجھاؤ۔“

(بانی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔)



فضل مجھے واپس گھر چھوڑنے جا رہا تھا بظاہر ہر وہ اور
میں دونوں ہی خاموش تھے لیکن شاید ہم دونوں ہی اپنی
اپنی جگہ جو کلام بھی تھے۔
میں اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ ”عصمہ!
تمہاری راہیں کھولی ہو چکی ہیں اور واپسی کے نشان گرو
آؤ۔ بہتر ہے کہ اب تم اسے بھلا دو۔“
”کسے؟“ میرے دل میں جیسے کوئی کانٹا گر گیا۔
”وجہہ کو۔ اور کسے؟“ میرا تک تک کر آؤ گ
تیوری کھا گیا۔
”نا ممکن۔۔۔ میں اڑ گئی۔“
”نا ممکن! ہاں نا ممکن ہی تو ہے کہ اب تم اسے پاؤ
کوئی میرے اندر نہا۔
”نا ممکن نہیں ہے البتہ مشکل اور اذیت ناک
ضرور ہے؟“ میرا دل کسی کی شہیہ اڑا۔
”استغفار بڑھو اللہ سے ڈرو کیا تم اس قدر گستاخ
اور باغی ہو جاؤ گی کہ اللہ کے احکامات پر جن بوجھ کر اپنی
خود کو ترجیح دو گی؟“ میرے اندر کی عصمہ سم گئی۔
”میں وہی کروں گی جو اللہ نے بتایا ہے۔“ دلنشیں
ڈھیٹ کی ڈھیٹ رہی۔
”یعنی۔۔۔؟“ عصمہ کے چہرے پر زردیاں گہری ہو
رہی تھیں۔
”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو
دلنشیں دھاڑی اور اس نے اپنا چہرہ عصمہ سے
پھیر لیا۔
”دلنشیں لیا ابی۔ فضل کی دست دور سے آتی آواز
میری سماعتوں سے نکالی۔
”جی بھائی! میں نے بھی آہستگی سے جواب دیا۔
”گھر آ گیا۔ اس نے مختصراً بتایا۔
”صبر۔ اچھا۔“ میں نے چونک کر گاڑی کی کھڑکی
سے باہر دیکھا۔ ہم لوگ تو واقعی گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔
”آؤ نا بھائی! کھانا کھا کے جانا۔“ میں نے فضل کو
اندر آنے کی دعوت دی۔
”نہیں میرا جی اچھا نہیں ہے۔ اس لیے کھانا بھی
میں نہیں لے گا۔“ پھر کچھ سستی۔ ”وہ صاف انداز

سائلگرہ خیر



ناولٹ

گیارہویں قسط

شگفتہ بھٹی



میں بولا۔ وہ سنجیدہ زیادہ تھا یا او اس۔ میں اس کے کھوئے کھوئے لہجے سے اندازہ نہ لگا سکی مگر وہ مجھ سے کچھ کچھ ناراض بھی تھا۔ یہ اس کے چہرے پر پڑے ہوئے بل بتاتی رہے تھے۔

”دلنشین بی بی! اس نے اپنی نظریں میری طرف گھمائیں اس کی آنکھوں میں جلانے کس ضبط کا پانی تھا۔ میں تو مارے شرم کے ڈوب ہی گئی۔

”اگر پہلے سفر کی صعوبتوں سے پاؤں آبلے یا اور وجود تھکاوٹ سے چور ہو تو کبھی دوسرے سفر کا ارادہ فوراً نہیں باندھنا چاہیے۔ منزل تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔“ وہ بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں مارے گھبراہٹ کے شرابور ہوئی جا رہی تھی۔

”تمہارے سامنے جو دو سراسر راستے ہیں وہ پتھر پلا نہیں بلکہ کالج سے بھاڑا ہوا ہے اور تمہارے پاؤں بھی تنگ ہیں ذرا سوچ کر قدم رکھنا۔“ اس نے مجھے نصیحت کرنی چلائی۔

”جی۔۔۔ میں نے بمشکل جواب دیا۔

”اچھا چلتا ہوں۔ جب میری ضرورت ہو تو فون کر لیتا۔“ اس نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا کر گاڑی کی دینڈا سکرین پر جمائیں اور کچھ سے پاؤں ہٹا کر ایک دم سے گاڑی کی اسپینڈ بڑھادی گاڑی ایک خوفناک آواز کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

”یہ اس کا اظہار عم تھا۔“ میں چند لمحوں وہاں کھڑی خالی سڑک کو دیکھتی رہی پھر گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ گاڑی کا باران سن کر چاچا نے گیٹ کھول دیا تھا۔



رات کو وجیہ کا فون آیا تو وہ بے حد بے چین تھا۔ اسے یہ پوچھنے کی جلدی تھی کہ عالم دین نے کیا کہا۔ ”دلنشین! بتاؤ نا انہوں نے کیا کہا وہ کون سا اچھی خبر سنانا کسی خبر کے سننے کی سکت مجھ میں نہیں ہے۔“ اس کی آواز اس کے رتے رتے کی آہنی کھارہی تھی

جیسے نیند رات بھر اس کی پلکوں کو چھوئے بنا اس کے حلق میں گرتی رہی ہو۔

”کیا بات ہے دلنشین! تم چیپ کیوں ہو؟“ مجھے چیپ پا کر وہ اور بھی بے تاب ہو گیا تھا۔

”ہوں ہاں بتاتی ہوں۔“ میں نے خود کو سنبھالنے ہوئے کہا اور نہ تو اس کی آواز سنتے ہی میری آواز پتھر اگنی تھی اور میرے لہو کے سارے خلیے رت کے ذروں میں بدلنے لگے تھے۔

”یو لو نا۔ دلنشین؟“ وہ ماتحتی تھا۔

”وجیہہ! ایک راستہ تو ہے مگر۔“ میری زبان پر کالج کی کوئی پھانس جیسی چیز آن چھپی پورا جملہ میرے منہ سے اوا ہو ہی نہ رہا تھا۔

”مگر کیا؟ یہ تم آج اوھوری باتیں کیوں کر رہی ہو ٹھیک طرح سے بتاؤ نا؟“ وہ کچھ غصے میں آ رہا تھا یہ شاید اس کی ہر واداشت کی حد ختم ہونے کا نشان تھا۔

پھر میں نے ہمت کر کے اسے وہ راستہ بتا ہی دیا۔ جو مجھے اور وجیہہ کو دوبارہ ملا تو سکتا تھا۔ مگر تھا بڑا کرناک۔ ”نن، نن، نن۔“ اب وجیہہ کے لفظ پتھر نے لگے۔

”ہاں وجیہہ! صرف یہی اک راستہ ہے۔“ میں نے اسے دوبارہ کہا تاکہ اسے کوئی اہم نہ رہ جائے۔ ”یہ تو سزا ہے عذاب ہے مار بھنم سے بڑھ کر۔“ اس کے اندر بھڑک اٹھنے والی آگ کی پیش میرے مساموں کو بھی چھوئے گئی۔

”بے شک ایسا ہی ہے۔۔۔ بے شک!“ میں نے ہمدردی سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ مجھے اپنے وجود کا بند باندھنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”نن، نن، نن۔“ یہ کیسے ہر واداشت کروں گا کہ تم میرے سوا کسی اور کے۔“ وہ جی جی رو پڑا تھا۔

”وجیہہ! کاش تم یہ پہلے سوچتے۔“ آنسو میری پلکوں سے بھی ٹوٹنے لگے۔

”مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کیسے ہو گیا۔۔۔ کیسے میں نے اپنے دل پر چھری پھیر دی؟ مجھے ہرگز پتا نہیں چلا میں تو جب ہوش میں آیا تو میرا دل دو ٹکڑوں میں تڑپ

رہا تھا دلنشین! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، میرا یقین کرو، میرا یقین کرو۔“ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح سسک رہا تھا۔

”وجیہہ! وجیہہ! لیلیہ مت رو، کھو! ایسے تو مت کرو میں میں مرجاؤں گی مجھے یوں مت آزماؤ۔“

مجھ سے اس کا رونا برداشت نہ ہو رہا تھا۔ اس کے آنسو میرے دل کے شیشے پر ٹنگڑوں کی طرح برس رہے تھے۔

”دلنشین! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ مجھے تم سے اس قدر محبت ہو جائے گی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میرے شب و روز تمہارے بغیر بالکل اندھیرے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا اور میں سانس روک کے سن رہی تھی کہ مہاوا میرے سانس لینے کی آواز بھی اس کی آواز میں جاگن نہ ہو جائے۔

”وجیہہ! تم سوچو میری حالت کیا ہوگی؟“ میری کھلی کھلی آواز نکلی۔

”میں جانتا ہوں۔۔۔ مجھے سب پتا ہے۔“ ”تم اور میں ایک ہی وجود میں سانس لینے والے دو انسان ہیں I Love you۔“ وہ بہت جذباتی تھا۔

”پلیز کچھ کرو دلنشین! جلدی I can't wait اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے فوراً ہی آٹے۔

”اوکے تم، تم بھروسہ کرو مجھ پر میں کوشش کرتی ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ لیکن میں جانتی تھی یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے نہ ہی فوراً ہو جانے والا کام ہے۔

”ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

”لیکن کتنا؟“ وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ”یہ میں بھی نہیں جانتی۔ مگر پھر بھی کم از کم آٹھ دس ماہ یا اس سے بھی زیادہ۔“ میں نے اپنے مطابق حساب لگا کر اسے بتایا۔

”یعنی ایک برس؟“ وہ تو جیسے سانس ہی کھینچ گیا۔

”میں تو مرجاؤں گا دلنشین۔“ وہ پھر سے بے حوصلہ ہونے لگا۔

”اللہ نہ کرے۔“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا پھر ہم کتنی دیر باتیں کرتے رہے ہمیں وقت گزرنے کا کچھ احساس نہ ہوا یہاں تک کہ میرے پیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا نام ٹیس الارم دینے لگا صبح کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔

”وجیہہ! میں نے اسے مخاطب کیا۔

”ہوں۔۔۔ کو۔“ اس کی بھاری آواز میں رقعہ مجھے کاخمار تھا۔

”تجد کا وقت ہو گیا۔“ میں نے اسے اطلاع دینے والے انداز میں بتایا۔

”ٹھیک ہے تم نماز پڑھ لو۔۔۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ وہ ایک جمالی لیتا ہوا بولا۔

”وجیہہ! ایک بات کہوں۔“ میں نے کہا۔

”حکم کرو میری جان۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”تم بھی نماز پڑھا کرو۔۔۔ صبح بہت سکون ملتا ہے نماز پڑھنے سے۔“ اپنا کچھ کاج تجربہ بیان کیا۔

”اور نمازی کی دعا میں بھی رو نہیں ہوتیں۔“ میں نے اسے تری سے سمجھایا اور پھر میں نے اسے بتایا کہ میں نے کتنی شدت سے دعائیں مانگی تھیں کہ تمہارا موبائل نمبر مجھے مل جائے اور تم مجھ سے بات کرنے لگو۔

”اچھا تو وہ تمہاری نمازوں اور دعاؤں کا اثر تھا؟“ وہ ذرا سنجیدگی سے بولا۔

”کنا مطلب؟“ مجھے کچھ حیرانی ہوئی۔

”دلنشین! ایک بات تم سے شیئر کروں۔“ وہ مجھے کچھ بتانے کے لیے تمہید باندھنے لگا۔

”ضرور۔“ میں نے دلچسپی سے کہا۔

”دلنشین! جب میں تمہیں چھوڑ کر یہاں آیا تھا تو میں نے اپنے آپ سے سمجھو کر لیا تھا کہ تم بس میرے مقدر میں اتنے وقت کے لیے ہی تھیں۔“ وہ کہتے کہتے رکاوڑ میرا دل دھڑکنا بھول کر رک گیا۔

”اچھا پھر؟“

پھر وہ نہیں! میں نے انہیں بھلائے کے لیے ڈرنک اور کلب میں خود کو گم کر لیا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میں جلد ہی الونٹا سے شادی کر لوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا اور میں بزنس میں ٹنگ گئی تھی۔

"اے مجھ آ۔۔۔ پھر۔۔۔؟" میرے خشک ہونے میں تمہیں جلد ہی بھول بھی جاتا۔ لیکن پھر ایک رات تم اچانک میرے خواب میں آگئیں۔ میں نے دیکھا تم میرے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہو اور زار و قطار روٹی جا رہی ہو تم بار بار یہی کہہ رہی تھیں وجیہ! پلیز مجھ سے بات کرو۔ پلیز مجھ سے بات کرو۔" کتے کتے وہ پھر سانس لینے کو رکا اور میں تو جیسے آگ میں جھلنے لگی۔

"پھر مجھے لگا کسی نے مجھے جھنجھوڑ کے جگا دیا ہو میں ڈر گیا تھا دلنشیں! ہڑبڑا کر اٹھا تو میں نے دیکھا میرے موبائل پر فضل کا فون مسلسل آ رہا تھا فضل سے بات ہوئی تو اس نے مجھے تمہارا ٹھیک وہی پیغام دیا جو مجھے خواب میں کہہ رہی تھیں کہ پلیز وجیہ! مجھ سے بات کرو فضل نے یہ بھی بتایا کہ تم بہت روٹی ہو میرا نمبر لینے کے لیے تمہیں کہنی ہو بس دلنشیں! تب سے میرے دل میں تمہاری یاد کا ایسا خنجر گڑا کہ مجھے اب ایک پل بھی قرار نہیں۔"

اس نے اپنی بات پوری کی تو مجھے اپنی رکی ہوئی دھڑکنیں بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"وہ بے شک میری دعا میں ہی تھیں وجیہ! جنہیں میرے اللہ نے قبول کر لیا۔" میرے دل میں چھپا ہوا مسجد کا وہ پرانا پھر سے بننے لگا۔

"اللہ بے شک بڑا مہربان ہے۔۔۔ وہ اپنے بندوں کی التجائیں ضرور قبول کرتا ہے۔" میرے دل کا پانی آنکھوں کے کناروں پر آ گیا۔

"وجیہ! تم بھی اسی سے مانگو بے شک وہی دینے والا ہے کسی اور کے پاس یہ قدرت کہاں؟" میری گواہ جھیننے لگی۔

"نہ۔۔۔ م۔۔۔ انہ۔۔۔ اچھا میں بھی رہا کروں گی۔"

اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی سی نکلی۔

"دلنشیں! میرا دل بہت بے قرار ہے۔۔۔ میرے سینے پر اک پھاڑ کھڑا ہے اور۔۔۔ اور اس پھاڑ پر سے ہر وقت کسی کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔"

"کس کی وجیہ؟" میرا دل اداسی میں گھر گیا۔

"کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم رو رہی ہو۔۔۔ اور کبھی؟" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور کبھی کیا؟ وجیہ۔۔۔" مارے تجسس اور خوف کے میرا دم نکلنے لگا۔

"کبھی لگتا ہے کہ صبحی رو رہی ہے۔۔۔ اس کے رونے کی آواز اتنی کرناک ہوتی ہے کہ میرے رونے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں لرز کے اٹھتا ہوں اور بستر چھوڑ دیتا ہوں لیکن کرو دلنشیں! پھر مجھے نیند نہیں آتی اور کوئی میرا دل اپنے پیروں تلے چلانا چاہتا ہے۔ پھر نہ شراب کام آتی ہے اور نہ ہی نیند کی گولیاں میں بہت پریشان ہوں بہت پریشان۔" وہ پھر سسکا اٹھا۔

"وجیہ! مت پیا کرو پلیز۔" میں نے اسے زیادہ پینے سے روکنا چاہا۔

"تو پھر کیا کروں؟" وہ گویا بے حد بے بس تھا۔

"نماز پڑھ کے دیکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔

مشورہ جو میں اکثر اسے پہلے بھی دیا کرتی تھی۔

"مجھ جیسے کی نماز بھلا کہاں؟"

"ایسا مت سوچا کرو بس اپنے لیے توبہ کرو مہمان مانگو اللہ سے بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔"

مجھے پتا تھا صوفی کا ناتق قتل اس کے فمیر کا بوجھ بنتا جا رہا ہے۔

"اچھا تم جاؤ نہ زار و قطار میرے لیے بھی دعا کرنا۔"

اس نے مجھے نماز پڑھنے کا کہہ کر فون بند کر دیا اور میں سوئے گئی۔

"اللہ واقعی قادر مطلق ہے اس کے لیے ہلا کیا ممکن ہے۔"

اس نے "کن" کہا ہو گا اور وجیہ کے دل میں میرا خیال اور آنکھوں میں خواب خود پا خود بس گئے ہوں گے ورنہ تو وہ بتا ہی رہا تھا کہ وہ مجھے بھلانے کا ارادہ کر چکا تھا بلکہ وہ تو الونٹا سے شادی۔" مجھے ایک جھرجھری سی

آگئی اور میں تیزی سے ہاتھ روم کی طرف لپکی تاکہ جلدی جلدی وضو کروں نماز ہی دعا کا راستہ اور وسیلہ ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرض کی ہے تاکہ اس کا بندہ اس سے اپنی حالتیں مانگتا رہے اب میرے دل میں یہ احساس اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وجیہ کی رجسٹرڈ پوسٹ میں نے وصول کر لی تھی اور میرے والدین کے چروں پر چند روز قبل ملنے والی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی۔۔۔ میں نے اسے طلاق دے دی۔

یہ سانحہ میری ماما کے لیے ناقابل برداشت تھا چنانچہ وہ دوبارہ سے ہسپتال میں داخل ہو گئیں اور میرے بابا! وہ تو چلتی پھرتی اب ویسا بن کر رہ گئے نہ وہ بولتے تھے نہ کچھ سمجھتے بہت کم کھاتے اور میرے سامنے آنے سے کتراتے رہے میرا بھی زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزار جاتا۔ ہسپتال میں تو راتیں ممانی تھیں میرے لیے وقت بڑا خالم ہو گیا جس کا ایک ایک لمحہ صدی برابر تھا جو کھتا ہی نہ تھا اب ہر روز میری اور وجیہ کی بات نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ہفتے میں ایک آدھ بار وہ بھی بالکل عام سی نہ ہی وجیہ شدت جذبات سے اپنا حال دل کہتا تھا اور نہ مجھے اپنے لبوں میں کوئی پھل محسوس ہوتی تھی۔ یوں کہہ لیں کہ ہم دونوں بے حد اداس تھے اور اس سے بھی بڑھ کر پریشان۔

"دلنشیں!" آج بھی چھ روز کے بعد وجیہ کا فون آیا تھا اور وہ آواز ہی سے بیمار لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے وجیہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے اس کی خیریت معلوم کرنی چاہی۔

"فکو ہو گیا ہے شاید۔" وہ کہنے لگا۔

"وہالی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں بس دل ہی نہیں چاہتا کہ اٹھوں۔" وہ بدستور اداس تھا۔

"کوئی تمہارے پاس ہے یا تمہا ہو؟" مجھے ذرا فکر ہوئی۔

"نہ کوئی میرے پاس ہے اور نہ ہی میں تمہا ہوں۔" وہ کھویا کھویا سا تھا۔

"اچھا۔" میں نے ایک سرو تو کھینچی یعنی وہ میرے والی کیفیت میں ہی مبتلا تھا۔ میں بھی تو اسی طرح سے محسوس کرتی تھی۔ بالکل اکلی گھٹنوں ایک ہی جگہ پر گم سم سی بیٹھی رہتی مگر مجھے لگتا کوئی میرے اندر سرگوشیاں کر رہا ہے۔

"ایک بات کہوں وجیہ۔" میں نے اپنے دل میں آئے خیال کے مطابق کہا۔

"ہاں کہو۔" اس نے جواب دیا۔

"تم فضل کو اپنے پاس بلا لو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اچھا میں اسے کہتا ہوں۔" وہ فوراً مان گیا۔

"اپنا خیال کرو ڈاکٹر کو دکھا کر دو الو۔" میں نے اسے ہدایات دیں جس پر اس نے پھر فوراً ہی ہائی بھر لی۔ اب تو کئی روز سے ہمارے درمیان ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی دو تین دن کے بعد اس نے مجھے فون کیا تو بتانے لگا۔

"دلنشیں! فضل میرے پاس آ گیا ہے۔ اور اب میری طبیعت بھی کافی ٹھیک ہے تم پریشان نہ ہونا۔" وہ مجھے تسلی دے رہا تھا۔

"چلو! یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔" میں نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اچھا کہاں کیا دلنشیں! وہ بات کو دو سری جانب لے جاتے ہوئے دکھ سے بولا۔

"دلنشیں!" اس نے مجھے چپ پایا تو پھر مخاطب کیا۔

"تم مجھ سے ناراض ہونا۔" میں نے تمہیں اتنا بڑا صدمہ دیا۔

"وہ اپنے جرم کا اقرار ایک بار پھر کر رہا تھا۔

"پتا نہیں لیکن میرے والدین بہت سخت صدمے کا شکار ہیں آج کل۔" میں نے اپنے اندر تو سوائے اک خاموش اور گری اداسی کے کچھ اور نہ پایا تھا البتہ میرے والدین۔۔۔ ان کی حالتیں مجھے مار دے رہی تھیں۔

"ہاں میں جانتا ہوں ان کے دلوں پر کیا بہت رتی ہو گی۔" وہ سخت شرمندہ تھا۔

”جن بیٹیوں کو یوں ایک دم سے بلاوجہ ہی فیصلے مل جائیں ان کے ماں باپ کس طرح سے زندہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں وہ جیسے۔“ بہت دنوں کے بعد میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

”میں میں اپنے کیے پر سخت تادم ہوں۔ کاش وقت پیچھے کو لوٹ جائے کاش۔“ وہ بے چین اور بے قرار تھا۔

”وقت کبھی اپنے قدموں پر نہیں پلٹتا۔ یہ تو صرف آگے بڑھنے کے حکم کا تابع ہے۔“ میرے اندر اک کنواں کھد رہا تھا۔ گرا اور گرا جس میں میری ذات و عظمتی جا رہی تھی۔

”وجیسہ! کاش تم ایسا نہ کرتے۔“ میرے گرد اس کنویں کی دیواریں تنگ ہونے لگیں اور میں نے مارے گھبراہٹ کے فون بند کر دیا ساتھ ہی اپنی آنکھیں بھی کاش لفظ اپنے اذیت ناک معنوں کے ساتھ میری روح کو گھائل کر رہا تھا۔ اس کے کاف سے شین کے درمیان کالف و ودھاری تلوار بن کر میری شہ رگ کو چھو رہا تھا۔

”یا اللہ میری توبہ۔“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور میں بے سدھ ہو کر ستر گر گئی۔



ماما ہسپتال سے گھر واپس آ گئی تھیں اور میں ان کا سامنا کرنے کی سکت سے محروم تھی میرے جوڑ میرے ریشے میرے اعصاب شل اور بے جان تھے اور میں صبح ہی سے اپنے بن ہاتھ پھیروں کو سہلاتی ہوئی اٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”عصمہ بیٹیا۔“ نورال مائی کی آواز ایک گرم سیال کی طرح سے میری سماعتوں سے میرے دماغ پر گری۔ ”جی مائی۔“ مجھے لگا میں کم از کم بول تو سکتی ہوں۔ ”بیٹیا! آپ کو بیگم بلا رہی ہیں۔“ وہ میرے بے حد قریب کھڑی تھیں۔

”ماما۔۔۔“ میرے ہونٹوں کا پتھر بھی پگھلا۔

”جی وہ بلا رہی ہیں آجائو۔“ مائی نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما تو مجھے ان کا لمس بھی کرنا جیسا لگا۔ میرے اعصاب جھنجھٹا گئے اور میں فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یعنی میرا وجود سلامت تھا بس میرے احساسات ہی جمود کا شکار تھے اور میٹری نفسیات کی سستی نے مجھے بت بنا رکھا تھا۔ میں نورال مائی کے ساتھ چلتی ہوئی ماما کے کمرے میں آئی۔

”اوجھر آؤ عصمہ! میرے قریب۔“ مجھے اپنے سے دور کھڑا کر ماما نے نرمی سے کہا۔

”جی۔“ میں خود بخود ان کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ ”مجھے پتا ہے تم کس قیامت سے گزر رہی ہو۔ تمہاری اذیتوں کی گزرگاہ میرے لبوں سے ہی متصل ہے۔“ انہوں نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تھے یہ ان کی آواز کی کمی بتا رہی تھی۔

”جی۔ ماما۔“ میں نے ایک لمبی سانس کھینچی جو جانے کب سے میرے سینے پر جمی پڑی تھی۔

”کیا کنویں میری بیٹی! یہ تیرا نصیب مشیت ایزدی سے ہی ہو گا ورنہ بظاہر تو کوئی مسائل نہ تھے۔“ وہ میرے ساتھ ہونے والے ظلم کی بات کر رہی تھیں۔ میں سر جھکائے بیٹھی صرف جی جی کر رہی تھی انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”تم پریشان نہ ہونا۔ اب پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہو گا۔“ وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھیں اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے سہلا رہی تھیں اور مجھے

میرے دل پر بڑے آواز اور راحت مل رہی تھی ”دیکھو! میں تم پر برداشت نہیں کر سکی اور بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئی۔ مگر کیا ہوا زندگی تو نہیں باری نا۔۔۔ ہماری زندگی کی ڈور تو حکم اللہ سے بندھی ہے۔ یہ دکھ درد صدمے اس کا زائقہ کٹوا ضرور کرتے ہیں۔ اسے ختم نہیں کر سکتے۔“ وہ مجھے زندگی کی اصل حقیقت سمجھا رہی تھیں۔

”تمہارا صدمہ اس وقت بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی آسمان کو چھوتا ہوا پہاڑ اور وہ پہاڑ تمہارے دل پر

ان کھڑا ہے لیکن۔“ ان کی سانسیں اب زیادہ بات کرنے سے پھولنے لگتی تھیں وہ ذرا رکیں سانس لی اور پھر بولیں۔

”وقت بہت بڑا حکیم ہے بہت دانا اور شافی ہے تم دیکھو گی کہ دھیرے دھیرے پہاڑ مٹی ہونے لگے گا اور بہت جلد وہ مٹی تمہارے تسمیر میں گھل جائے گی اور تمہیں یاد بھی نہ رہے گا کہ تم نے کیسا بوجھ برداشت کیا تھا۔“

ان کے ہاتھ میرے ہاتھ سے ہٹ کر میرے چہرے کے گرد آگئے اور میرا چہرہ ایک رسم اور شان الہی میں آ گیا۔

”ماما! میں نے وہ دنوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔“

”میری بیٹی! میری جان! ماما نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔“

بھر پور دیر ہم دونوں ماں بیٹی روتی رہیں۔ ہمیں کچھ پکارنا چاہا۔ بس محسوسات تھے جو بتا رہے تھے کہ اندر کی جلن پر کسی نے ٹھنڈی ٹھنڈی شبنم برسا دی ہو۔ میرا آبلہ پا دل اور بے قرار روح کافی حد تک آرام محسوس کر رہے تھے اور میرے اندر شرمندگی کا احساس کم ہونے لگا ورنہ تو میں سوچ رہی تھی کہ اپنے نصیب کے اس داغ کے لیے میں ہی مورد الزام ٹھہرائی جاؤں گی لیکن میری ماما نے مجھے کوئی طعنہ دینے کی بجائے میرا درد بیان کیا۔ وہ میرا آؤھا درد کھینچ کے اپنے اندر اتار چکی تھیں۔ حالانکہ ان کے اپنے اندر پہلے ہی سے درد کا اک سمندر موجود تھا۔ ماں کا مفہوم پوری تفسیر کے ساتھ مجھے سمجھ آ رہا تھا۔



”دلنشیں! کیسی ہو؟“ اس رات وجیسہ کا فون آیا تو میں عشاء کی نماز سے فارغ تھی ہوئی تھی۔

”الحمد للہ تم کیسے ہو۔“ میں نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”میں بھی اب ٹھیک ہوں۔“ اس کا لہجہ بھی صاف

تھا، کسی بھی ڈپریشن سے پاک۔ ”کیا کر رہی تھیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”میں ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی ہوں۔“ میں نے پہلے بتایا اور پھر اس سے پوچھا۔ ”وجیسہ! کیا تم نے نماز پڑھی؟“ مجھے امید تھی وہ کہے گا۔

کل سے ضرور پڑھوں گا مگر اس نے تو مجھے حیران ہی کر دیا! یہ کہہ کر۔

”میں نے فضل کے ساتھ جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔“ اس کی آواز میں خوشی کا عنصر نمایاں تھا۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ مجھے بھی حج خوشی ہوئی یہ سن کر۔

”دلنشیں! میں اگلے ہفتے آ رہا ہوں۔“ اس نے مجھے یہ اطلاع دے کر بے چین کر دیا۔

”تم آ رہے ہو۔“ شوق دیدار نے میرے دل میں اک چٹکی بھری۔

”ہاں۔ وہ زویا کی شادی ہے نا۔“ اس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

”زویا کی شادی کس سے؟“ مجھے اتنی جلدی ایسی بھڑکی امید نہ تھی اس لیے عجیب سا لگا۔

”وہ۔۔۔ وہ چھوٹو تم۔ کوئی اور بات کرو۔“ وجیسہ مجھے بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

”مگر میرا اندازہ غلط نہیں تو مراد ہی سے ہو رہی ہے نازویا کی شادی۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز آئی گیا۔

”ہاں۔ ظاہر ہے وہ اس کا منگیترا تھا۔ اسی سے ہوئی تھی۔“ وجیسہ کو بھی شاید میرا یہ کہنا اچھا نہ لگا تھا۔

”اور صنوی کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا؟“ مجھ سے اپنا غصہ دہانا مشکل ہو گیا، مجھے غصے سے بھی زیادہ صنوی کے ناخوش فعل کا غم تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ان لوگوں کی حد درجہ بڑھی ہوئی بے حسی کا افسوس۔

”دلنشیں! چھوٹو۔۔۔ تم اپنی بات کرو۔“ وہ اس موضوع پر بات شروع کر کے بچھتا رہا تھا۔

"میری بات! میں اپنی کیا بات کروں جو جیسے میرے لیوں پر شکوہ بولنے لگا۔
"جس بات نے میری ہر بات کو بے وقعت اور بے معنی کر دیا میرے لفظ گوئے کو بیسے تمہاری سماعتیں اسے تو سننے کو تیار نہیں اور۔" میرا انداز دکھ سے بھر گیا۔

"I M Sorry" وہ شرمندگی سے بولا۔
"صرف Sorry" کسی کی بھی کھیلتی زندگی کے دامن طلاق کا نمٹ داغ لگا کر کسی معصوم کو ناحق قتل کر دینے کے بعد صرف sorry "مجھے اس وقت وجہہ اچھا نہ لگا۔
"صوفی نے مراد سے نکاح کر لیا تو تم لوگوں نے اسے غیرت کا اتنا سنگین مسئلہ بنا دیا کہ بے چاری کی جان ہی لے لی اور اب جو تم کر رہے ہو وہ کیا ہے؟" مجھے ان کی بے غیرتی پر گھن آرہی تھی مجھے لگ رہا تھا صوفی میرے اندر سے رونے لگی ہو۔

"دلشیں اپلیز۔" وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔
"لگتا ہے تمہارے سینے پر اٹنے والے پہاڑ کی چوٹی سے صوفی کے رونے کی آوازیں آتا بند ہو گئیں گی تم نے اسے وہاں سے بھی پھکا دے کر دوسری پار مار دیا ہے؟" میں بولتی جا رہی تھی اور وہ چپ ہو گیا تھا۔ ایسا چپ کہ اس نے فون ہی بند کر دیا۔
"صوفی! میں نے اپنے دل کے پہاڑ پر صوفی کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔
"صوفی! میں سسک رہی تھی۔

"بھرجانی۔" اس کی ڈری سسکی سی آواز واقعی میرے دل کے گوشے سے آئی۔
"صوفی! میں نے اپنے ہی وجود کے گرد اپنے بازو جمائل کر لیے اور مجھے لگا صوفی کا لڑنا کا پتا وجود ان میں سا گیا ہو۔

"میرا ہور ایساں نہ جائے گا تم دیکھ لینا بھرجانی۔
وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔
"میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیا ہے۔ تم دیکھنا اس کا فیصلہ جلد ہی آئے گا۔"

"بے شک وہ انصاف کو پسند کرنے والا اور اسے قائم کرنے والا ہے۔" میں نے اس کے احساس کو اپنے ساتھ بھینچ کر اپنے اندر سمولیا اور وہ کبھی نہ بھولنے والی یادیں کر میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔

"صوفی کا ناحق بنایا گیا" لہو مٹی میں جذب ضرور ہو گیا تھا مگر جینے والا نہ تھا۔ معصوم کے خون کے چھینٹے تو عرش کو چھوتے ہیں پھر پھلا اسے انصاف کیونکر نہ ملے۔" مجھے یقین تھا صوفی کے قاتل سکون نہ پائیں گے اس کا قاتل ایک فرد واحد نے نہ کیا تھا بلکہ یہ تو اجتماعی قتل تھا۔ اس کا محرک وہ روایات اور رسوم تھیں جو ایسے خود غرض اور بے حس لوگوں نے غیرت کے نام سے منسوب کر دی تھیں اور ایسے لوگ خصوصاً زمیندار طبقہ یا پھر ہمارے گاؤں دیہات کے جاہل عام سی بات پر بھی اپنی بسند بٹھی بیوی کسی کو بھی بد چلتی کے الزام میں موقع پر ہی قتل کر دیتے ہیں اور اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کرتے ہیں۔ غیرت قتل کے نام پر اپنی کوئی دشمنی یا مفاد نکلانے کی خاطر بے تصور عورتوں کو اس کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور ایسے قتل خطا کی حد میں درج کرا کے چند سال کی قید کاٹ کر واپس آجاتے ہیں۔ حالانکہ یہ قتل بھی قتل ہی ہے اور اس کی سزا بھی سزائے موت ہی ہے۔ مگر قانون انصاف ہے کہاں؟" میں اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔

"سے نا انصاف" کیوں نہیں ہے بھلا اللہ سے زیادہ منصف کون ہے اور اس کی گرفت سے بھلا خطاوار کبھی بچا ہے۔ میرے دل نے گواہی دی۔
"صوفی کے قاتل بھی جلد ہی سزا پائیں گے۔"
"صوفی کے قاتل۔ یعنی وجیسہ!" کسی نے میرے دل پر گھونٹ دے مارا۔

"وجیسہ۔ وجیسہ۔ وجیسہ۔" مجھ پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔
"یا اللہ رحم کرنا۔" میں نے صوفی کے قتل کا

حساب مانگتے مانگتے وجیسہ کے لیے رحم اور درگزر بھی مانگ لیا۔ یعنی میری دعا اور میرے جذبے دونوں ہی ملاوٹ زدہ تھے۔ دونوں میں کھوٹ تھا۔ صوفی کے لیے انصاف کا مطلب تھا وجیسہ کی موت۔ اور وجیسہ پر رحم کا مطلب تھا صوفی کے ساتھ ظلم میں اپنے آپ سے ابھرتی نظریں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور اس رات مجھے لگا میرے بسزیر کوئی اذان فجر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا ہو گا۔
"صوفی یا وجیسہ!" یہ سوال میرے دل کے پہاڑ پر سیدھا کھڑا ہو گیا جیسے کوئی آسمان کی طرف منہ کر کے اپنا حال دل کتا ہو۔

"عصمہ! اجنبی! مانا نے مجھے پیار سے پکارا اب وہ کافی بستر تھیں اور آج خود چل کر برآمدے میں پہنچی کر سیدوں تک آئی تھیں۔

"جی ماما! میں جو وہاں پہلے سے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی ابھی اور انہیں ہاتھ تھام کے کرسی پر بٹھا دیا۔
"تم سے ایک بات کرنی تھی اگر تم پرانہ منادو تو۔" وہ میری طرف بڑی ہی التجائیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں ان کی درد بھری تسکلی تسکلی سی نگاہیں مجھے پریشان کر گئیں۔

"کہیں ماما! کیا بات ہے؟" میں ان کے گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھ کے نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔

"تمہاری عدت ختم ہو گئی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے بپشاء اللہ خود کو صبر اور ہمت سے کافی حد تک سنبھال لیا ہے۔" وہ کچھ تمہید سی باندھ رہی تھیں۔ میری چٹختی حس مچنے لگی کہ ضرور کوئی بہت بڑی بات ہے جو مانا کہنے والی ہیں۔
"جی ماما! تمہیں نے نظریں جھکا لیں۔
"بی بی! میری صحت تمہارے سامنے ہے لگتا ہے وقت اب مجھے زیادہ مہلت نہیں رہنے کی نہیں دے گا۔" وہ بے حد مغموم تھیں۔

"اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔" میں نے

تڑپ کر انہیں دیکھا۔
"ہم سب اللہ ہی کے حکم کے تابع ہیں ہماری ہر سانس اپنے مقدرہ وقت کی پابند ہے اور وقت وہ تو اک نہ ایک روز آتا ہی ہوتا ہوتا ہے ہر کسی کا۔"
"ماما! پلیز ایسی باتیں تو نہ کریں۔" مجھے ان کی زندگی بے حد عزیز تھی اور۔ چاہتی تھی کہ وہ عمر دراز پائیں۔

"عصمہ! نصیر احمد نے تمہارے لیے پھر سے پیغام بھیجا ہے۔" مانا نے اصل بات کو نہایت سادگی سے کہہ دیا اور میں اسے سن کر پھر بھی جھٹکا کھائے بغیر نہ رہ سکی۔

"نصیر احمد نے؟" مجھے تو جیسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔
"ہاں عصمہ! اس نے ابھی تک شادی نہیں کی اور اسے جب یہ خبر ملی کہ تمہارے ساتھ اتنا بڑا سانحہ ہو گیا ہے تو اس نے۔" مانا سانس لینے کو رکھیں پھر کہنے لگیں۔

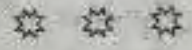
"اس کی نیت میں تمہارے لیے خلوص ہے بھلائی ہے اسے دوبارہ غلط نہ سمجھنا۔" وہ مجھے سمجھا رہی تھیں اور میں چپ کی چپ اس پیغام کے یوں اتنی جلدی آجانے پر دنگ تھی یہ کیسے ہو گیا تھا اور کیوں میں شیت ایزی کی حکمت اور اس کی رحمت کے درمیان کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تو پھر میں خاتون آپا کو کیا جواب دوں تم مجھے سوچ کر جواب دے دینا۔" مانا نے مجھے چپا کر کہا۔
"جی ماما! میں نے مختصراً کہا۔

"چائے بنا کر لاؤں آپ کے لیے۔" میں نے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ کیا۔
"ہاں بنا لو۔" وہ مسکرا کے بولیں۔ میں نے ان کے چہرے کو پر سکون دیکھا تھا وہ بھی مہینوں کے بعد آج وہ واقعی بیمار نہ لگ رہی تھیں مجھے ان پر بہت سارا پیارا آ گیا۔

"میری ماما! میں نے بے ساختہ ہی جھک کر ان کا بوسہ لیا اور چائے بنانے چل دی۔
"اللہ تمہیں آباد کرے اور پھر کبھی کوئی آزمائش

تمہارے گھر کی دیواروں سے نہ جھانکے۔ ان کی دعا نے میری پشت پر ہلکی دی یقیناً وہ میری مسکراہٹ کو میری رضامندی سمجھ رہی تھیں۔ اور وہ غلط نہ تھیں یہ میرا دل کہہ رہا تھا۔ حالانکہ میرے احساسات اس وقت کسی اور خوشی سے ہمکنار تھے۔



آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آج صبح ہی سے ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ رکتی تھمتی اور پھر برستی بوندیں، ہلکی ہلکی چلتی ہو اور تازگی سے بھر پور ٹھنڈک میرا پسندیدہ موسم تھا۔ میں چھت پر چل قیدی کر رہی تھی اور موسم سے خوب لطف اٹھا رہی تھی۔ جب میرے موبائل کی واٹس ایپ کے ساتھ اسکرین پر وجیہہ کا نام چمکنے لگا۔

”وجیہہ!“ میں نے ایک طرف کو بیٹھ کر فون آن کیا۔

”اسلام علیکم۔“ اس کی تازہ دم آواز بالکل ایسے محسوس ہوتی جیسے وہ پاس کھڑا خود سلام کر رہا ہو۔

”وعلیکم السلام کیسے ہو وجیہہ!“ میں نے پوچھا۔

”حمد للہ۔“ اس کا انداز میرے والا تھا مجھے خوشی ہوتی۔

”کہاں ہوں کیا اپنے گلوں میں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں میں تو اس وقت کویت میں ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”تم تو دعویٰ میں تھے پہلے پھر پاکستان آگئے تھے اور اب۔“

”ہاں اب میں کویت میں ہوں اور اگلے ہفتے سعودیہ جا رہا ہوں۔“ اس نے ایک اور خبر دی۔

”سعودیہ۔“ میرا دل اڑ کر مکہ کی حدود میں داخل ہو گیا۔

”ہاں دلنشیں! میں عموماً کرنے جا رہا ہوں۔“ اس کی آواز شدت جذبات سے رندھ گئی۔

”عمو!“ میرے اڑن بھی چلنے لگے۔ مجھے یاد آگیا

شادی کے بعد جب وجیہہ نے مجھے اپنی مومن پرہیزگاری پوچھا تو میں نے اسے کہا تھا۔

”عمو کرنے چلتے ہیں وجیہہ۔“

”میں اپنی مومن کا پروگرام بنا رہا ہوں توبہ استغفار کا نہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”کیسے بے اولیٰ سے نہیں کہتے۔“ میں نے برا مناتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

”سوری میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ لیکن یارا تم بھی تو روٹانس کے دنوں میں تنوی اور پرہیزگاری باتیں کر رہی ہو۔“

وہ شرارت سے میرے بال بکھیرتا ہوا بولا تھا۔ پھر سنجیدہ ہو کر مجھے سمجھانے لگا تھا۔

”چلیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عمرے پر بھی چلیں گے بلکہ حج پر چلیں گے تم فکر کیوں کرتی ہو۔“

اور اب وہ جا رہا تھا! ”کیا! میرے بغیر میرے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔“

”تم نے ہی مجھے بتایا تھا نا کہ وہاں پر جا کر مانگنے والے کو سب ملتا ہے اس کی کوئی دعا تو نہیں ہوتی۔“ وہ مجھے پوچھنے کے انداز میں بتا رہا تھا۔

”ہاں سب شک اللہ اپنے گھر سے کسی کو خالی نہیں لوٹتا۔“ میں نے اپنے گلوں پر پھل آنے والے اشکوں کو ہتھیلی پر اتارتے ہوئے کہا۔

”تم نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ خانہ کعبہ پر پہلی نگاہ پڑتے ہی جو دعا لیں سے نکلے وہ تو ہرگز رو نہیں ہوتی۔“ وہ مجھے یاد کر رہا تھا۔

”ہاں میرے اللہ اور اس کے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی فرمودات ہیں۔“ میرا دل قطرہ قطرہ ہو کر پلوں پر سے ٹوٹ رہا تھا۔

”تو جانا دلنشیں! میں کیا مانگوں۔ مجھے دعا مانگنے کا سلسلہ نہیں ہے مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ تم بتاؤ میں کیا مانگوں؟“ وہ بھی شاید بمشکل اپنے آئسو سمجھالے ہوئے تھے اس کی آواز کابھاری پن بڑھ رہا تھا۔

”جو تمہارے دل میں ہو۔“ میں نے اپنے دل کی بات دل میں ہی روک کر کہا۔

”میرے دل میں تو صرف تم ہو دلنشیں! ہمیں تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل کر کے ہی نہیں پار رہا۔“

مر رہا ہوں۔ قطرہ قطرہ۔ میں میں! تمہیں پانا چاہتا ہوں۔“ آج پھر وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

”وجیہہ! میں تمہیں اللہ سے مانگتے جا رہا ہوں۔“ دلنشیں! میں تمہیں اللہ سے مانگتے جا رہا ہوں۔“

میں تو بس اس کے سامنے سوال ڈالنے جا رہا ہوں۔ اس سے التجا کرنے اس سے مدد مانگتے جا رہا ہوں۔ جیسا کہ کیا غلط کر رہا ہوں؟“ وہ مجھ سے سوال کر کے مجھے اٹھان میں ڈال رہا تھا۔ ایسے سوال جن کا جواب آسمان نہ تھا۔

”وجیہہ! تم کہے پر پہلی نگاہ پڑنے پر اللہ سے اس کی محبت مانگنا کہ تمہیں اپنی محبت سے نواز دے سوچو ذرا جسے وہ چاہے اس کا توبہ پار ہی پار ہے۔“ میں اسے سمجھانے لگی۔

”اللہ کی محبت۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”جو کتنا کار اور خطا کار سے وہ محبت کرے گا۔“ اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

”پاگل! جو اس کے در پر چلا جاتا ہے اس کی بخشش پالیتا ہے اور اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو کر لوٹتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے نومولود بچہ۔“ میں اسے اسی طرح سمجھانے لگی جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو سمجھاتا ہے۔

”اچھا۔“ اس کے پاس جیسے لفظ ختم ہونے لگے۔

”وہ مجھے اور تمہیں ملادے گا نا؟“ اس کے اندر بے پناہ یاس تھی۔

”تم اپنا ایمان مضبوط اور اس پر بھروسہ کامل رکھو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”میرے لیے بھی دعائیں کرنا وجیہہ! ہمیں نے لالچ سے کہا۔“

”ساری دعائیں تمہارے لیے ہی تو کروں گا۔ بس ان کا اثر اپنے لیے مانگوں گا۔“ وہ روتے روتے ہنس دیا تھا۔

”پتا ہے میں نے باقاعدگی سے نماز جاری رکھی ہوئی ہے اور روز سورۃ قیامین بھی پڑھتا ہوں۔“ وہ ایک بچے

کی طرح خوش ہو کر ہنسا رہا تھا۔

”پورے قرآن پاک کو بھی اس کی ترتیب سے پڑھنا چاہیے۔“ میرا مطلب ہے پہلے پارے سے شروع کر کے پچھلے روزانہ چند آیات پڑھو۔“

”اچھا اب ایسے شروع کروں گا۔ بلکہ وہیں پر قرآن ختم کر کے آؤں گا۔“ وہ مان گیا۔

”وجیہہ!“

”ہوں!“

”وجیہہ! اما کا خیال ہے کہ وہ اگلے جیسے میرا نکاح کرویں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ میرا خیال تھا وہ موڈ خراب کر لے گا۔

”اچھا۔“ وہ ناراض ہونے کی بجائے او اس ہو گیا۔ اور پھر اس نے مجھے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔



کل میرا نصیر احمد سے نکاح تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا میرے بابا اور اما کے چہروں پر گمراہ اطمینان تھا اور وہ خوش تھے۔ اس کے باوجود مجھے ذرا سا محسوس نہیں ہوا تھا کہ یہ تو ان کی دیرینہ خواہش تھی جو اب جا کر پوری ہو رہی تھی۔

ایسا نہیں تھا۔ وہ میری وجیہہ کے ساتھ شادی کو بھی قبول کر کے خوش تھے۔ اور جب وجیہہ نے مجھے چھوڑا تب بھی وہ اسی قیامت سے گزرے تھے جو اس دنیا کے والدین پر ایسے سانحات کے بعد ہوتی ہے۔ اور انہوں نے وجیہہ کے اس عمل کی سخت مذمت کرنے کے باوجود نہ تو مجھے طے نہ کیے تھے نہ بات بے بات وجیہہ کو برا بھلا کہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں حقیقت پسند انسان تھے اور عملی طور پر قرآن و سنت پر چلنے والے مسلمان تھے۔ تب ہی تو انہوں نے میرے عقد ثانی کا فیصلہ فوراً ہی کر لیا تھا۔ میری حالت عجیب سی تھی میں خوش تھی نہ غم زدہ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی خاتون آپا نصیر احمد کے ساتھ اگر نکاح کا جوڑا اور کچھ ضروری لوازمات دے کر گئی تھیں۔

میں نے دیکھا جب وہ مجھے اپنے ساتھ لگا کر میرا ہاتھ چوم رہی تھیں تو ان کے چہرے پر ایک بھی ایسا میل نہ تھا جو میرے لیے ناپسندیدہ ہو یا آخر شائدانہ ہو تاکہ ان کے ساتھ دل کا خلوص ان کے عمل سے ظاہر ہو رہا تھا۔ انہیں میں طلاق یافتہ ہو کر بھی اتنی پیاری تھی جتنی اس وقت تھی جب وہ مجھے پہلے مانگنے آئی تھیں۔

”اللہ تیرے نصیبوں میں میرے نصیر کی محبت اور میرے نصیر کے نصیبوں میں تیری محبت لکھ دے۔“

مجھے ریا کرنے کے بعد انہوں نے دعاوی مجھے ان کی یہ دعا پڑھ عجیب سی لگی تھی۔ اور شاید ابھی بھی نہ لگی تھی۔

”میری محبت اور نصیر کی محبت۔“ مجھے کچھ الجھن سی ہوئی۔ اس وقت میرے دل نے چٹکی کھائی۔

”نصیر احمد سے شادی آج بھی تمہاری مجبوری ہے نا؟“

”شٹ اپ۔۔۔ میں نے اسے جھڑکا اور خاتون آپا کو مسکرا کر اللہ حافظ کہنے لگی۔“

”جیتتی رہو۔ آباد رہو۔“ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

اور میں اپنے دل کے چور سے نظریں چراتی ہوئی پھر سے وضو کر کے جائے نماز پر آئی۔ میرے اندر جب بھی ندامت کے کانٹے جھبھتے میں بھاگ کر اللہ سے رجوع کر لیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ میرے دل کی حالت جانتا ہے تو پھر بہتر ہے میں خود ہی اپنی خامیوں کے اعتراف کرتی رہوں۔ اس طرح کم از کم میں اس سے بار بار معافی تو مانگتی تھی۔ اور وہ مجھے معاف کر دیتا تھا۔ میری دعاؤں کی قبولیت اس کی گواہ تھی۔ میں اس سے جو بھی مانگ رہی تھی وہ مجھے بغیر انتظار کی اذیت میں ڈالے دیتے جا رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب تو یہی تھا کہ مجھ سے وہ خفا نہیں ہے اور پھر مجھ سے خفا ہوتا میں نے ایسے تو کوئی کام نہیں کیے تھے۔ میں تو اسی سے دست سوال پھیلائے ہوئے تھی۔

میں نواقل ادا کر کے دعا مانگ رہی تھی تو بے شمار سوچیں بے شمار سوالات میرے دل و دماغ کو الجھا رہے تھے۔

”مجھے اعتراف تھا کہ میں بے حد گناہ گار بے حد کمتر ہوں۔“

اگر اس دنیا سے نکل دی جاؤں تو ”خس کم جہاں پاک“ والا مقولہ درست ہو جائے پھر بھی میرا رب مجھے چاہتا تھا۔

اور اس قدر چاہتا تھا کہ مجھے نوازنا جا رہا تھا۔ اس طرح جیسے کہ وہ صرف میرا ہی اللہ ہو۔”

میرے دل کی بے چینی کو کافی حد تک سکون مل گیا۔ اور میرے دل کا چور بھی جیسے کہیں منہ چھپا کر چھپ گیا۔ میں نے اٹیجہ کر وہ ساری چیزیں سنبھالیں جو خاتون آپا دے کر گئی تھیں۔ سرخ کاندانی غرارہ، سونے کی چھ چوڑیاں، ایک مناسب سے وزن کا یا قوت جڑا سیٹ۔ جو یقیناً ”خاتون آپا کا ہو گا۔ اس کا ڈیزائن بتا رہا تھا۔ بڑا خوب صورت سیٹ تھا۔ میں نے یونسی اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا اور۔

ڈرنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میرا نصیر وہاں ڈول رہا تھا مجھے اپنے دو چہرے دکھائی دیئے اور میں ڈر کے پیچھے ہو گئی۔

”عصمہ“

”عصمہ“ جیسے کوئی مجھے آواز میں دے رہا تھا۔

”عصمہ“ میری آواز میں ہر بڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”کون۔۔۔ کون۔۔۔“ میں نے اندھیرے میں ادھر اور دیکھتے ہوئے کھٹی کھٹی تھی میں آواز میں پوچھا۔

”میں دلنشین! انھو میری بات سنو۔“

سامنے ڈرنگ ٹیبل کے آئینے سے ایک چہرہ بول رہا تھا یہ وہی چہرہ تھا جو شام کو میں نے دیکھا تھا۔ میں ٹھیک اسی طرح ڈر گئی جیسے شام کو ڈر گئی تھی۔

”دیکھو! اس وقت کمرے میں میرے اور تمہارے

سوا کوئی بھی نہیں مجھے ایک بات بتاؤ۔“ وہ چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

”کیا۔۔۔؟“ میں نے سوچے ہوئے حلق کو اپنے تھوک سے تر کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم نصیر احمد سے شادی کیوں کر رہی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”میں۔۔۔ میں!“ مجھے جواب سمجھ نہ آ رہا تھا۔

”کیا صرف اپنے والدین کے کہنے پر؟“ وہ میری حالت کو نظر انداز کر کے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں ظاہر ہے۔“ میں نے اسی جواب کو مناسب جان کر ہائی بھری۔

”اچھا کیا تم نے رخصت ہو جلا دیا ہے؟“ اس کا اگلا سوال بے حد دلچسپ تھا جس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

”بچ بچ رہتا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ نہیں۔“ وہ چہرہ طنز سے مسکرایا۔

”دیکھو عصمہ! اگر تم نصیر احمد کو اپنے باپ دل پر ایک مہرے کی طرح رکھنے جا رہی ہو تو سوچ لو کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔“

”تم۔۔۔ تم کو اس نہ کرو تمہیں کیا خبر میرے دل کا حال؟ تم کیسے جان سکتے ہو؟“ اس چہرے کی بڑھتی ہوئی جرات پر مجھے غصہ آیا میں اسے جھڑکنے لگی۔

”تمہارا حال دل میں نہیں تو اللہ تو جانتا ہے نا؟ وہ اللہ جس کی محبت کا دم تم آج کل خود پر فخر کر کر کے بھرتی نظر آتی ہو۔“ اس نے مجھے طعنہ دیا۔

”یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ تم سے مطلب؟“

میں نے پھر بھی اپنے پروں پر پائی نہ پڑنے دیا۔

”اللہ اور بندے کا معاملہ کیا ہوتا ہے اس کے معنی ڈھونڈو عصمہ! تم اللہ کی قربت کی دعوں دار ہو تو اس کی صفات پر بھی غور کرو بس یہی بات تھی جسے سمجھانے کے لیے میں نے تمہیں اس وقت جگایا تھا۔“

دلنشین کا چہرہ آئینے میں ہی غائب ہو گیا اور میں اپنے سینے سے شرابور جسم کو کاٹتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ حالانکہ آج سخت سردی تھی۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟“ میں سوچنے لگی۔ کچھ برکت برسرِ اصرار۔ مت الوکھے واقعات۔

یہ دلنشین کا چہرہ۔

یہ سب کیا تھا۔ حالانکہ میں ہی تو دلنشین تھی اور میں ہی عصمہ۔۔۔ میں تو ایک ہی ہوں یہ تو میرے دو نام تھے اور میرے ہی کیا اکثر لوگوں کے دو نام ہوتے ہیں پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ جب بھی میرے اندر سے آواز اٹھتی تو عصمہ کے نام سے اٹھتی۔ اور باہر کے ہونے لگے مجھے دلنشین کے نام سے پکارتے تھے۔ کیا میرے ساتھ کوئی جن تھا۔

جن کا خیال آتے ہی میری گھٹکی بندھ گئی۔

”نہیں نہیں یہ تو میرے واسطے ہیں۔۔۔ میں نے نفسیاتی طور پر اپنے ما فی الضمیر کو اپنے اوپر طاری کر لیا ہے لہذا وہ شکل اختیار کر کے مجھ سے باتیں کرنے لگا ہے ورنہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اور پھر جن کہاں سے لگ گیا میرے پیچھے۔“ میں نے خود کو یاد کرانا چاہا۔

جو صلہ دینا چاہا۔

مجھ میں نے محسوس کیا میرے وجود کا چو کھٹا لکڑی کا ہو گیا ہے اور میرے رگ رگ میں پانی بننے لگا ہے میرے خیال پر اس لمحے ایک دھند میں لٹی ہوئی مسجد آہستہ آہستہ واضح ہونے لگی۔ جس کے صحن پر سے ایک شخص کبل کی بکل درست کرتا ہوا اٹھا اور میرے وجود کی دیواروں سے باہر نکل گیا۔ جب وہ اپنی بکل درست کر رہا تھا تو میری نظر اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی اور میری ساری جان جھنجھ کر میری شد رگ میں آن پھنسی تھی۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

میں دو سری بار دلہن بن چکی تھی۔ سرخ کاندانی غرارے اور یا قوت کے اس نیکلس سیٹ سے سخی عصمہ۔ پھر سے سرخ گلابوں کی بیج پر تھی اس وقت میری حالت ناقابل بیان تھی۔ میرے احساسات میری کیفیات اور یہ سارا ماحول میں ایک قیامت سے

دو چار تھی۔۔۔ میری حالت وہی عورت جان سکتی تھی جو میری طرح سے اپنا محبوب پیچھے چھوڑ کر آئی ہو اور یہ گوارہ نہ کر سکتی ہو کہ اسے سوائے اس کے محبوب کے کوئی اور چھوئے مگر وقت اسے اس آزمائش میں ڈال بھی دے۔

تازہ گلابوں کی منک مجھے کاٹے دے رہی تھی اور کاندانی غرارے کی ہر تار تپے ہوئے لوہے کی تارنگ رہی تھی۔ سگی چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں اسی لمحے کسی کے گلا کھٹکھارنے کی آواز نے میرے اندر کے لاوے کو ہوا دے دی۔

”اسلام علیکم۔“ وہ آکر میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔ میں تو چاہتی تھی کہ اسے کوئی جواب نہ دوں۔ مگر میرے لبوں سے بے اختیار ہی نکل گیا۔

”و علیکم السلام۔“ میرا حال چال دریافت کرنے کے بعد وہ بولا۔

”آپ آرام اور سہولت کے ساتھ بیٹھ سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہم روایتی سے میاں بیوی بننے کی بجائے اچھے دوست بننے کی کوشش کریں۔“ وہ بہت سلیقے سے بات کرتا تھا اس کی آواز ہو سو جیسے کی آواز جیسی تھی یہ مجھے آج محسوس ہونے والی پہلی بات تھی جو بری نہ لگ رہی تھی۔

”عصمہ! میں دندوں اور دعوؤں پر انحصار کر کے خود کو اچھا ثابت کرنے والا مرد نہیں ہوں۔“

وہ کہہ رہا تھا۔ بڑے ٹھہراؤ اور نپے تلے انداز میں۔

”میں تو بس ایک عام سامرد ہوں۔ میرا ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں اور میں اپنے جذبات کے اظہار بریقین رکھتا ہوں۔“ اس نے اپنی شخصیت کو مختصراً واضح کرنے کی کوشش کی۔

”میں چاہوں گا کہ تم بھی۔ اچھا میں تم کو سکتا ہوں یہ۔“ آپ کے ساتھ لگا ہوا کلف غریب لگا۔ اس نے مجھ سے تم کہنے کی اجازت طلب کی۔

”جی جیسے آپ کو مناسب لگے۔“ میں نے خود کو

اس سے متاثر ہوا یا۔

”تم بھی مجھے آپ نہ کہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“ وہ تھوڑا سا بے تکلف ہوا اور کھسک کر اور ہو گیا اس نے تکیے کو بیڈ کی پشت پر کھڑا کر کے ٹیک لگا لیا تھی۔

”میں نے کہا تم بڑی ہو کر بیٹھ سکتی ہو۔ تاکہ ہم سکون سے باتیں کر سکیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا دوپٹہ ذرا سر پر پیچھے کر دیا۔ کچھ لمحے اس کی نظروں کی پیش میرے چہرے پر رہی۔ پھر وہ گویا ہوا۔

”تم بہت حسین ہو بہت۔“ اس کے لبوں پر میری تعریف تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”اچھا! یہ ایک چھوٹا سا تحفہ۔“ اپنی دوستی کی ابتدا کرتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ ایک نازک سی چین میں اللہ کا لاکٹ دک رہا تھا کوئی اور وقت ہوتا جیسے میں پہلے تھی تو نصیر احمد کو پینڈو اور کجوس اور جانے کیا کیا کہتی مگر اب۔۔۔ اب تو مجھے اس لاکٹ میں دکنے والے لفظ پر اپنا آپ پورا اچھا اور ہوتا محسوس ہوا۔

”اگر برانہ مناد تو۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں یہ لاکٹ خود مجھے پہننانے کی خواہش تھی۔ میں نے وہ لاکٹ ڈبیا میں سے اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ جس پر وہ مسکرایا۔ میں نے دیکھا وہ ایک عام سی شکل و صورت کا مرد اپنے چہرے پر خاصی کشش رکھتا تھا ایک نا دانستہ سی مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی اور میرے اندر جلنے والے آواز جیسے غم کرنے لگی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



== جنت کے وارث ==

ایمان والوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں جو لغویات سے منہ موڑتے ہیں جو رزقہ ادا کرنے والے ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں جو اپنی امانتوں اور رازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں جو اپنی نمازوں کی تکسالی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے۔

(المؤمنین)

میرا عبد الغنی بٹ اور نجف لودھڑے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے پینے کے انداز

عادتِ طیبہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر کھانا تناول نہ فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

”میں بندہ ہوں اور بندوں کی مانند بیٹھتا ہوں اور ایسے ہی کھاتا ہوں جیسے بندے کھاتے ہیں۔“

(حضور کی نشست اس قسم کی تھی کہ گویا گھٹنوں کے بل ابھی کھڑے ہو جائیں گے۔ یعنی انڈوں بیٹھ کر۔ (زلزال الحداد)

ٹیک لگانے سے مراد جم کر بیٹھنا اور کھانے کے وقت جو کڑی مار کر سرین پر بیٹھنا اس بیٹھنے کے مانند ہے جو کسی چیز کو اپنے نیچے رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھے۔

(قاضی عیاض)

صاحبِ مواہب کہتے ہیں کھانے کے لیے اس طرح بیٹھنا مستحب ہے کہ دونوں رانوں کو کھڑا کرے اور دونوں قدموں کی پشت پر نشست کرے یا اس

طرح کر اپنے پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے اپنی ٹیم نے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تواضع و ادب کی خاطر بائیں قدم کے اندر کی جانب کو اپنے قدم کی پشت پر رکھتے تھے۔ (مدارج النبوة)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع میں سے

ایک یہ بھی ہے کہ آپ کھانے میں کبھی عیب نہ بتاتے تھے۔ اگر چاہا تو کھالیا ورنہ چھوڑ دیا اور یہ بھی نہ فرمایا کہ یہ کھانا برا ہے۔ ترش ہے۔ نمک زیادہ ہے یا کم ہے۔ شور باگڑھا ہے یا پتلا ہے۔ (مدارج النبوة)

صدق عبد اللہ۔ یواسے ای

کرن کرن روشنی

سیدنا شیخ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

☆ جب کوئی بندہ گناہ کرتے وقت اپنے دروازوں کو بند کر کے پردے ڈال کر مخلوق سے چھپ جاتا ہے اور خلوت میں خالق کی نافرمانی کرتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

”اے ابن آدم علیہ السلام! تو اپنی طرف دیکھنے والوں میں مجھ کو ہی سب سے کمتر سمجھتا ہے اور مجھ سے مخلوق کے برابر بھی شرم نہیں کرتا۔“

☆ کسی کی دشمنی یا کینہ پروری کے خیال میں ایک رات بھی مت گزار۔

☆ مومن اپنے لیل و عیال کو اللہ رب العزت پر چھوڑتا ہے۔ جبکہ منافق اور ہمہ دینار پر۔

☆ اے عمل کرنے والے اخلاص پیدا کر اور نہ مشقتِ فضائل سے۔

☆ مومن جس قدر بوڑھا ہوتا ہے اس کا ایمان طاقتور ہوتا ہے۔

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے بڑے دوست ہیں۔

☆ موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی دوا ہے۔

☆ اوروں پر ہر دم نیک گمان رکھ اور اپنے نفس پر بدظن رہ۔

☆ شروع کرنا تیرا کام ہے اور ختم کرنا اللہ کا کام ہے۔

انبیاء و ائمہ کرام

توبہ

حضرت عیسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایک شخص بہت گناہ گار تھا۔ لوگوں نے مشورہ کر کے اسے بہتی سے نکال دیا۔ وہ شخص بھوکا پیاسا بیماری کی حالت میں ایک جنگل میں چلا گیا۔ وہاں اس نے حق تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے کہا۔ ”اگر مجھے معاف کرنے سے تیری رحمت کے خزانوں میں کمی ہوتی ہے تو بے شک مجھے معاف نہ کر۔ اگر میری بخشش سے تیرے خزانوں میں کمی واقع نہ ہوتی تو مجھے معاف فرما دے۔“ اللہ تعالیٰ اس کی اس بات سے ناصرف راضی ہوا بلکہ اس کی موت کے بعد حضرت عیسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم ملا کہ فلاں جگہ میرا ولی بڑا ہے اس کا جنازہ پڑھاؤ۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کو لے کر وہاں پہنچے تو لوگوں نے اس شخص کو دیکھ کر جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔

مگر آپ رضی اللہ عنہ کو چونکہ حق تعالیٰ سے حکم ملا تھا سو آپ نے جنازہ پڑھایا اور جنازے کے بعد اسے دفنایا گیا۔ حضرت عیسیٰ نے عرض کیا۔ ”میرے گناہ گار بندے کے لیے ایسا حکم کیوں کر؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”وہ بندہ تو بہت کم ظرف نکلا۔ اس نے سچے دل سے توبہ کی تھی اور میں نے اسے بخش دیا۔ اگر وہ پوری

انسانیت کے لیے دعا کرتا تو قبول کی جاتی تھی۔“ حرمت رواد اکرم ذلول

کام کی بات

○ میں نے اللہ سے طاقت مانگی اور اس نے مجھے مضبوط کرنے کے لیے مشکلات دیں۔

○ میں نے اللہ سے دانش مانگی اور اس نے مجھے حل کرنے کے لیے مسائل دیے۔

○ میں نے اللہ سے خوشحالی مانگی۔ اور اس نے مجھے کام کرنے کے لیے دل غوا۔

○ میں نے اللہ سے حوصلہ مانگا اور اس نے مجھے خطرات دیے کہ میں ان پر قابو پاؤں۔

○ میں نے اللہ سے محبت مانگی اور اس نے مجھے مصیبت زدہ لوگ دیے کہ میں ان کی مدد کروں۔

○ میں نے اللہ سے عنایات مانگی اور اس نے مجھے مواقع دیے کہ میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔

نشاوریں بولنا۔ جسز اسگھ

ردھ

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے اسے دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے۔ پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور باخوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ سو کہ توبہ و انابت کی میڑھی ہے اس پر صابر و شاکر رہی جڑھ لگے ہیں۔

(بانی قدسیہ کی کتاب دوستی سے انتخاب) فوزیہ ثمرت، کجرات

لاجواب

ایک روز مشہور شاعر داغ دہلوی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملاقات کے لیے آئے اور انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر لوٹ گئے اسی وقت داغ نے سلام پھیرا ملازم نے انہیں بتایا۔

”ایک صاحب آپ سے ملنے آئے تھے اور چلے

گئے۔“ مرزا داغ نے ملازم سے کہا۔ ”دوڑ کر جاؤ اور انہیں بلا کر لے آؤ وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔“ ملازم بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا لایا۔

وہ صاحب کہنے لگے۔ ”آپ نماز پڑھ رہے تھے اس لیے میں چلا گیا۔“

داغ صاحب فوراً بولے۔ ”حضرت میں نماز ہی تو پڑھ رہا تھا لا حول و لا قوت نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگ گئے۔“

سیرا عبدالحی دست اور جف لو دھرے

بڑے لوگ بڑی بڑی باتیں

○ حفیظ جانند ہری نے جب مزاح نگار ضمیر جعفری کی کتاب ”مافی الضمیر“ دیکھی تو بولے۔

”کتاب کا نام مشکل ہے یہ آسان ہوتا تو اچھا تھا۔“ ضمیر صاحب نے پوچھا! مثلاً ”جانند ہری صاحب کہنے لگے ”مثلاً“۔ ضمیر مراد۔ ضمیر صاحب گویا ہوتے۔

”میں نے سوچا تھا مگر پھر اسے آپ کی کتاب کے لیے محفوظ کر لیا۔“

○ انجم ربانی کی کتاب کا نام ”کوئے ملامت“ تھا۔ سجاو باقر رضوی نے اسے دیکھ کر ناشر سے کہا ”نام کچھ موزوں نہیں۔“ ناشر نے وضاحت مانگی تو باقر صاحب بولے ”کوئے ملامت ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔“

حرمت رواد اکرم ذلول

کامل نظم

نظم ابھی ہوئی ہے سینے میں شعرا نے ہوئے ہیں ہونٹوں پر لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں اڑتے پھرتے ہیں تیلیوں کی طرح کب سے پٹھا ہوا ہوں میں جام ساہ کاغذ پہ لکھ کے نام ترا بس ترا نام ہی مکمل ہے

اس سے پہلے بھی نظم کیا ہوگی (گلزار) ارم آفتاب۔۔۔ کراچی

سہرے حروف

☆ اگر آپ سچے ہیں تو آپ کو ہر شخصیت اچھی لگے گی اور اگر آپ خود اندرونی کمزوریوں اور شخصی کمتری میں مبتلا ہیں تو آپ کو ہر شخص برا لگے گا۔

☆ محبت کا جذبہ بڑا سرکش سمند و تیز موجوں کی مانند ہوتا ہے جو اپنی ذات کے آسمان کو پالے وہ کبھی اس جذبے کو غلط ترجیحات میں تول کر خود کو پستیوں کا مین نہیں کرتا۔

☆ نہ سے بات شروع ہو تو پھر دامن ہی نہیں دل بھی تنگ ہو جاتا ہے پھر دل میں جگہ ملتی ہے نہ دامن میں۔

☆ جان پہچان دکھ دیتی ہے ”جسے“ جتنا اپنا سمجھو وہ اتنا گہرا دکھ دیتا ہے۔

☆ جدائی کے راستوں پر درو بسیرا کر لیتا ہے۔ مگر محبت انہیں سجاتی ہے خواہ آپ کی ہو خواہ کسی اور کی۔

☆ انسان بھی عجیب شے ہے بعض اوقات اس کی نظر میں وہ چیز بالکل بے وقعت ہو جاتی ہے۔ جس کے لیے وہ ساری زندگی جدوجہد کرتا ہے۔

نوشین اقبال لوشی گاؤں بدر مرجان

لفظوں کی خوشبو

☆ اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی پر توقع مت رکھو کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔ (اشفاق احمد)

☆ تنگ نظروہ ہے جسے دو برائیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑتا ہے۔ تو وہ دونوں کو اختیار کر لیتا ہے۔ (شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ)

☆ زندگی ایک ایسی خوب صورت تھلی ہے جو اپنے خوب صورت رنگین پر دکھا کر ہر انسان کو درغلائی ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھولوں سے لدی کیاری میں گم ہو جاتی ہے۔ (خلیل جبران)

☆

☆

بشری حود

بھرا رہے تری خوشبو سے تیرا سخن چمن
بس ایک موسمِ عنبرِ نشانِ گزرتا رہے

ساعتیں ترے بچھے سے پھول پختی رہیں
دلوں کے ساز پہ تو نغمہ خواں گزرتا رہے

خدا کرے تیری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
دیارِ وقت سے تو شاہِ دماں گزرتا رہے

میں خود کو دیکھ نہ پاؤں تو کچھ مائل نہیں
کہیں بھی ہو تو رستارہ نشانِ گزرتا رہے

مراستارہ کہیں ٹوٹ کر بکھر جائے
فلک سے تیرا خط کو کبکشاں گزرتا رہے

میں تجھ کو دیکھ سکوں آخری بشارت تک
نظر کے ملتے بس اک سماں گزرتا رہے

میں تیرا ساتھ نہ دے پاؤں پھر بھی تیرا سفر
گلابِ دجواب کے ہی درمیان گزرتا رہے

نہا، فضا، کی ڈائری میں تحریر
انور شوق کی غزل

تو ناظمِ وقت تو کیا دیکھتا ہوں میں
اب تک اسی مقام پہ تنہا کھڑا ہوں میں

یہ کشمکش الگ ہے کہ کس کشمکش میں ہوں
آتا نہیں مجھ میں بہت سوچتا ہوں میں

نمرہ، افسر، کی ڈائری میں تحریر
سائمنڈی کی غزل

ہے دجا یاد مگر حرفِ دعا یا اور نہیں
میرے نغمات کو اندازِ یاد نہیں

میں نے پلوں سے دیارِ بدست کی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

ہم نے جن کے لیے راہوں میں پچایا تھا ہوا
ہم کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں سہر شام کسی کی آنکھیں
کیسے مٹرائی چراغوں کی منیاد یاد نہیں

صرف دُعا لائے تلووں کی جھک دیکھی ہے
کب ہوا، کون ہوا کس سے خفا یاد نہیں

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جلنے کس جرم کی پانی ہے سزا یاد نہیں

اُدّا کس سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساعر کو خدا یاد نہیں

صدقہ عبداللہ، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

تمہاری سالگرہ پر
یہ چاندِ ابدیہ ابرِ رواں گزرتا رہے
جمالِ شامِ تہہ آسمان گزرتا رہے

کیوں ہم ہیں تھما تھما سے
کیا قصہ مشہور ہوا
داستان کچھ بھی نہیں
بات تو ذرا سی ہے
نازک سا اک شیشہ تھا
اک ٹھیس لگی اور
چور ہوا

فوزیہ شمرٹ، ہجرات

فرشتہ اور شیطان

ایک مصور کو ایک مرتبہ فرشتے کی تصویر بنانے کا خیال آیا اس نے پوری دنیا کو دیکھ ماری مگر اسے کوئی فرشتہ جیسا نہ ملا۔ آخر سخت کوشش کے بعد اسے ایک آٹھ سال کا نونسا ملا شکل و صورت میں کسی بھی فرشتے سے کم نہ تھا۔ مصور نے آخر اس کی تصویر بنا ڈالی۔ جب اس تصویر کی نمائش کی گئی تو خوب واہ واہ ہوئی۔ تیس سال بعد جب مصور بوڑھا ہوا تو اس نے سوچا کیوں نہ مرنے سے پہلے کوئی بڑا کام کر لیا جائے۔

چنانچہ اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ آخر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ شیطان کی تصویر بنائی جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے شیطان کی تلاش شروع کر لی۔

اس کام کے لیے اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔ کیونکہ دنیا میں شیطان بہت ہیں ایک ڈھونڈ تو ہزار ملتے ہیں پھر بھی اس نے نیل میں ایک ایسے قیدی کو ڈھونڈ نکالا جو نہایت خوفناک لگ رہا تھا۔ اس کی شکل سے وحشت تک رہی تھی۔

اس کی لال لال آنکھیں اس کو اور زیادہ ہشت ناک بنا رہی تھیں۔ مصور نے اسے تصویر بنانے کے لیے چن لیا اور جیل کے کام سے اجازت لے کر اس کی تصویر بنانی شروع کر دی۔

شروع میں مصور کو دیکھتے ہی رونے لگا اس نے دونوں ہاتھوں کے چہرے چھپا لیا مصور کے پوچھنے پر اس نے جواب دیا۔ "کہ آج سے تیس سال پہلے آپ نے فرشتے کی تصویر بنانے کے لیے مجھے ہی پسند کیا تھا۔"

حرمتِ روا اکرم سے ذوالوال

☆ دنیا میں کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرتی جبکہ اس قوم کی خواتین آگے نہ بڑھیں (قائد اعظم)

☆ نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کو کسی بھی نام سے پکاریں اس کے لفظ اور رنگین میں کوئی فرق نہیں آتا (شہکسیپر)

☆ سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔ (واصف علی واصف)

سردار وزیر، ناصرہ، تول، خوشاب
شاید آپ کے لیے

○ کوشش کیجیے جن کے ساتھ عمر گزارنے کا سودا طے کرنا ہو۔ ان سے دل ملیں نہ ملیں، ذہن ضرور ملتے ہوں۔

○ کچھ چیزوں کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ جاتی ہے اور کچھ چیزیں وقت گزرنے کے ساتھ اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں۔

○ جو شخص آپ کی بے جا تعریف کرتا ہے۔ وہ بے جا تعریف بھی کر سکتا ہے۔

○ وقت صرف ان سے وفا کرتا ہے جو اس کی قدر کرتے ہیں۔

○ دور بھاگیے ایسے لوگوں سے جو کھیل کھیل میں زندگیوں سے کھیل جانے کے علوی ہوں۔

○ اپنی غلطی تسلیم کرنا مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے لیکن ناممکن کاموں میں سے نہیں۔

○ چھوٹا اور تاریک کھر قبول کر لو۔ لیکن چھوٹے اور تاریک ذہن کا ساتھ قبول مت کرو۔

فوزیہ شمرٹ، ہجرات



اس دل پہ ایسی کیا بتی
کیوں
زندگی سے دور ہوا

میں اہل تو نہیں ہوں کہ دیکھے کوئی مگر
دنیا! مجھے بھی دیکھ، ترا آئینہ ہوں میں

اکثر غبارِ فکرِ جب اتراد ماخ سے
میں رنگ رہ گیا کہ یہ کیا لکھ گیا ہوں میں

عجیب سے نہیں اُسے مرے فردا سے ہے امید
منزل ہے کوئی اور نقطہ راستوں میں

غافل اب اور کیا ہوں کسی سے کہ عمر بھر
آوارگی کی گود میں سوتا رہا ہوں میں

کیا یہ جگہ ہے جس کی تمنا میں آج تک
دن رات شہر شہر بھٹکتا پھل ہوں میں

مشعل بدست گھومتے گزری ہے ایک عمر
اب کس کے انتظار میں ٹھہرا ہوا ہوں میں

نہ بہت جہیں صیادہ کی ڈاڑھی میں تحریر
اُسنے کہا تھا سن
عہد نبھانے کی خاطر امت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
بھجوری یا بھجوری کی تھکن سے ٹوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
سمنند رستمند ریاستی پیاس، بھجاؤ
جن آنکھوں میں اُترو
جس دل میں ڈوبو
میری تنہائی تمہیں آواز نہ دے گی
مگر جب
پیری خواہش اور بہت کی لے
آسی اونچی اور آتی تیر ہو ملنے
کہ دل رو دے
تو...

نوٹ آنا

خدا کچھ سلیم ماکی ڈاڑھی میں تحریر
پرویز ساحری غزل
عجب قریب ہے لیکن یہ اک قریب عشق
کڑے کیا سفر آسمان بہ زینہ عشق

ہزار شکر کہ عزت جانی سے رہا محفوظ
کنارے آن لگا آپ ہی سینہ عشق

یہ اور بات کہ خود کو گنوا دیا میں نے
مگر یہ کم ہے کہ ہاتھ آ گیا خزانہ عشق

سری مثال سب اہل نظر کے سامنے ہے
کہ زخم زخم رہا ہے اُنل سے سینہ عشق

اسی لیے تو ہمیں رہ بڑا ہوں میں ساحر
پسند آیا ہے مجھ کو بھی یہ مدینہ عشق

حرمِ ردا اکرم ماکی ڈاڑھی میں تحریر
پیر نصیر الدین نصیری غزل
رنگ پر آئے جنوں خلق میں آئینہ بنوں
تم جو دروانہ کہو مجھ کو تو دروانہ بنوں

بے خودی ہر قریب ہو کہ فرزادہ بنوں
کوئی صورت ہو مگر ان سے نہ بے گانہ بنوں

غم کی روداد بنوں درد کا افسانہ بنوں
تم جو بناؤ محبت میں تو میں کیا نہ بنوں

بادہ حسن وہ چھلکانیں تو کشتن میں ذرا
ہر گل تری تمنا ہے کہ پیما نہ بنوں

عجیب کو مدت سے یہ ارماں ہے کہ ایشیہ قلب
دولت حسن خدا داد کا اندرانہ بنوں

سوزنے شمع کی مانند جلا رکھا ہے
پہر بھی مل جائیں تو میں شمع سے پروانہ بنوں

وہ تو سورنگ جنوں بخش گئے مجھ کو نصیر
اب یہ مجھ پر ہے کہ دروانہ بنوں دروانہ بنوں

زینب احسن زینبی ماکی ڈاڑھی میں تحریر
اصول شہزادی غزل
یاد آتے ہو شام ڈھلتے ہی
دل گیا دل چراغ جلتے ہی

غم کے دروازے کھل گئے مجھ پر
ہلی ہلی ہوا کے پتلے ہی!

خود کو تبدیل کر لیا تم نے
اک نیا ہم سفر بدلتے ہی

گر کے بھی ہم سنیل گئے یارو
اور تم گر پڑے سنیلے ہی

پھیل جاتی ہے چاندنی ہر سو
چاند کے بام پر نکلتے ہی

لاکھ غم اور آگے شہزادو
ایک لقم میرے سر سے پلتے ہی

سیدہ نسبت زہرا ماکی ڈاڑھی میں تحریر
نوشی گیسلائی کی غزل

گر زینب سے، سحر سے کلام رکھتے تھے
کبھی وہ دن تھے کہ زلفوں میں شام رکھتے تھے

تمہارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کدھر سو کرو
دگر نہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے

ہمیں بھی گھیر لیا گھر کے زخم نے تو کھلا
کچھ اور لوگ بھی اس میں قیام رکھتے تھے

یہ اور بات ہمیں دوستی نہ اس آئی
ہوا تھی ساتھ تو خوشبو مقام رکھتے تھے

بجائے کون سی رت میں بچھ گئے وہ لوگ
جو اپنے دل میں بہت احترام رکھتے تھے

وہ آتو جاتا کبھی، ہم تو اس کے رتوں پر
دیے جلانے ہوئے صبح و شام رکھتے تھے

نوشین اقبال ماکی ڈاڑھی میں تحریر
میر واحد اعجاز و حسانی

خواب

ای ایک خواب میں آج تک
میں بندھا ہوں اس کے جال میں
کوئی شہر یار و فاؤل کا
کبھی آئے عشق کے تخت پر
مجھے مجھ سے جہیں کے لے چلے
کہیں دود شہر جمال میں
میرے سرد جسم کو دھانے سے
وہ سنگتی بالیوں کی مثال میں
جہاں میں ہوں اس کے خواب میں
جہاں وہ ہو میرے سوال میں
نہ ہو ایک مانس کا بھی فاصلہ



مگر، افسر! جیب خزاں آئے تو لوٹ آئے گا وہ بھی محسن
وہ بہاروں میں ذرا کم ہی ملا کرتا ہے
جاسم مدیم نوید کراچی
ایکلا وارث ہوں میں اس کی تمام فزول محسن
وہ جو شخص سارے شہر میں پیار بانٹتا ہے
بڑا، فضلہ فیصل آباد
شکستہ دل ہوں مگر مسکرا کے ملتا ہوں
اگر یہ فن ہے تو آ رہا ہے اک خدا کے بعد
آسیہ جاوید علی پور چھتہ
اپنے کھو جانے کا اس راہ میں امکان نہ تھا
تھا، مگر اتنا بھی اس کا مجھے ارمان نہ تھا
کچھ نصیح بھی تھا، ورنہ مرے تم پر وہ شخص
جتنا آتا تھا نظر اتنا پریشان نہ تھا
خدیجہ سلیم کراچی
ہوں اس الجھن میں، عجب شخص تھا وہ بھی کہ مجھے
پلکے سرور تھا اور کھوکے پیشیاں نہ تھا
بارہا اس کو مناتے ہوئے سوچا ہے بہت
اپنے پسند پر کیا مجھ کو بہت مان نہ تھا
صابرہ یار محمد اسلام آباد
کیا کہیں کس نے لوٹا ہے پر وہ اخلاص میں
جتنے قتال جتنے ہر انداز مسیحائی تھے
فرزانہ علی کراچی
تھا جنہیں زعم وہ دیا بھی بھی میں دو بے
میں کہ صخرہ نظر آتا تھا سمندر تکلا
میں کہ صحرائے محنت کا مسافر تھا قراد
ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا
نازیہ لاہور
کتنی لمبی خاموشی سے گزرا ہوں
ان سے کتنا کچھ کہنے کی کوشش کی
ایک ہی خواب نے ماری تیرے جگاہ ہے
میں نے ہر گروٹ سوسے کی کوشش کی

صائمہ مہتاب دہلی
ہم تھامتے ہی رہ گئے ذبح و وقت کو
آیا، رکلا، ہنسا، مڑا اور ایک بل گیا
مد جنوں کو دیکھنا عادت ہے عشق کی
روشن رہا چراغ اور پروانہ مل گیا
مریم یوسف کراچی
اس کو جا یا بھی تو اظہار نہ کرنا آیا
کٹ گئی غم ہمیں پسند نہ کرنا آیا
اس نے مانگا بھی اگر کچھ تو جلیان مانگی
اور ہم تھے ہمیں انکار نہ کرنا آیا
نشا نویدین
خود کو ہر بار نشانے پہ ترے دکھا ہے
میری خواہش ہے ترا وارثہ خالی جانے
حرمت دعا کرم ڈھولال
کٹھ پتلی فطرتوں نے ہم کو بنا دیا ہے
دن نے ملادیا ہے، تو شب نے جگانیا ہے
دیوانہ ہم کو کہہ کر بیٹے ہیں لوگ ہم پر
سارے شہر کو ہم نے ہنس مکھ بنا دیا ہے
لائب، ایمن آباد کشمیر
موسم تے بال و پر تو سوار ہے بہت مگر
اترے کہاں کہ ہم تو اسی سرگند تھے
محسن دیا کے نام پر ساتھی تھے بے شمار
جن میں تھا کچھ غلوں وہ دن بھی چند تھے
نادیہ رئیس کراچی
بلجھت اپنی جب گھیرا قی ہے سنان دلوں میں
ہم لہجے میں تیری باتوں کی چادر تان لیتے ہیں
مددہ مذہب خوشاب
راستہ روکے کھڑی ہے یہی الجھن کب سے
کوئی بوجھے تو کہیں کیا کہہ دھر جاتے ہیں
زرم الفاظ، جھلی باتیں، مہذب لہجے
پہلی بارش ہی میں سب رنگ اتر جاتے ہیں

خود العین اقبال کراچی
جو نظر آتی ہیں تمہیں غشک اور دیوان سی
اک سمندر تھا، بہا ان آنکھوں کے کناروں
یوں رسی کھلا سماعت میں کہ محسوس یہ ہوا
جیسے الفاظ جن لائے کوئی قرآن کے باروں
کرن، تینش کراچی
پھر بھی لوگوں کی باتوں میں نہیں آئے گا وہ
دیکھ لینا مجھ سے مل کر تھا، ہوا کے
صلح تو کرے گا آگے مجھ سے نہیں اس کے بعد
جب ملے گا بس یہی احسان بتائے گا وہ
سونیا سانی قاضی محلہ بالا
کمال رسم دفانے یہ دن دکھائے تھے
مجھے بھلا دیا جس نے وہ یاد کئے تھے
سیدہ الزہرا محی کراچی
دھل کو کیسے محبت سمجھیں
ججر کا خوف دل پہ طاری ہے
آج تو دل کی بات کہنے دو
آج کی شام تو ہماری ہے
غوزیہ قریشی گجرات
وہ ایک یاد کہ ہر لمحہ ذہن میں جاگی
وہ ایک ذکر کہ لہجہ بھی ہم بدل نہ سکے
وہ ایک نام کہ جن نام کو نہ بھولے کبھی
وہ ایک راہ کہ جس راہ سے نکل نہ سکے
عظمیٰ غلام نبی کراچی
تم پاس نہیں ہو تو عجیب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ دکھ کے کہیں بقول کہی ہوں
حراثہ شجاع آباد
وہ جن کو ہم تیری قربت میں بھول گئے تھے
وہ لوگ تیری جدائی کے بعد یاد آئے
ہم اتنے بھی گئے گزیرے جس تھے فراز
کہ تجھ کو ساری خدائی کے بعد یاد آئے
سمیرا عبد الغنی بٹ درجنف لودھرا
دیکھنا نہ تھا جب آپ کو دل کو سکون تھا
جب سے ملی نگاہ مصیبت میں پڑ گئی

زینب احمدی زینب آباد
سے تو خود میں کشش پیدا کرو
ہر شخص کو حسرت ہے دیکھا نہیں کرتے
ہر شخص نہیں ہوتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لیے پرکھا نہیں کرتے
زینب ریاض کراچی
جیسے کسی کی یاد نے سینے پہ ہاتھ رکھ دیا
جیسے کوئی دیا جلا آخر شب کے دشت میں
نوشین اقبال نوشی گھاٹوں بدرمجان
پیٹر کو دیکھ لگ جاتے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امداد ہم نے بچتے دکھا کم
بہت غم پر بھی تو ہنس بڑتا ہے آدمی
بہت خوشی میں بھی تو کھینچ ہو جاتی ہیں غم
نعل تاج کراچی
عجیب چہرے سے پارو یہ منتر لوں کی ہوں
کہ لائبرن جی مسافر کو رہنما سا لگے
الماس لاہور
زندگی کب کی ہو گئی خاموش
دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے
نایاب اسلم لاہور
سنبھلی یقین کی صورت کبھی گماں کی طرح
مزاج اس کا بدلتی ہواؤں جیل ہے
شاپن شوقین میرپور خاص
اپنے نصیب کا تو مل ہی جائے گا یارب
وہ چیز عطا کر جو تقدیر میں نہیں
حیر و مہتاب سعوی غرب
میں دمیت کونہ گزے تخیل سے چاک تک
آیا ہوں آسمان سے ہو کر میں خاک تک
ماڈل صائمہ
میک آپ روز بیوی یاد لر
ژانر نسبی موسیٰ رضا

سرورق کی شخصیت
ماڈل صائمہ
میک آپ روز بیوی یاد لر
ژانر نسبی موسیٰ رضا



ایک سے بڑھ کر ایک

”میرے پاس کی بیوی کو تم نے پارٹی میں دیکھا تھا نا۔ کس قدر خوب صورت ہیں۔“ شوہر نے بیوی کو پڑانے کی غرض سے کہا۔
”کچھ روز سے میرے خوابوں میں آرہی ہیں۔“
”اکلی ہی دکھائی دیتی ہوں گی؟“ بیوی نے پریشان ہونے کی بجائے التماساً سوال کر دیا۔
”ہاں! لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ شوہر نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیونکہ آپ کے پاس میرے خوابوں میں آرہے ہیں۔“ بیوی نے اٹھلا کر جواب دیا۔
شایدہ ظفر۔ گلشن حدید کراچی

بے خیالی میں

ایک صاحب کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ٹریفک سارجنٹ نے ان کا چالان کیا تھا۔ مجسٹریٹ ان سے مخاطب ہوئے۔

ریحانہ علی احمد

سائیکہ صہب

”مجھے بتایا گیا ہے کہ ٹریفک قوانین کی خلاف درزی کرنے کے علاوہ آپ نے ٹریفک سارجنٹ سے نازبا گفتگو بھی کی؟“
”میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔“ وہ صاحب معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔
”دراصل ٹریفک سارجنٹ مجھے بالکل اس انداز میں ڈانٹ رہے تھے جس طرح میری بیوی ڈانٹتی ہے اس لیے بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا۔“ تم ٹھیک کہہ رہی ہو جان سن! اس کے علاوہ تو میں نے کچھ نہیں کہا۔“

ساجدہ۔ میرپور خاص

فرض شناس

ڈاکٹر صاحب پاگل خانے کے اسپتال کا معائنہ کرتے ہوئے ایک وارڈ میں پہنچے تو وہ بالکل خالی تھا۔
”کیا اس وارڈ میں کوئی مریض داخل نہیں ہے؟“
ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔
”مریض تو موجود ہیں سر۔“ ان کے ساتھ چلنے والے ڈیوٹی آفیسر نے بتایا۔

”تو پھر مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے؟“ ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔
”وہ اصل اس وارڈ میں اتفاق سے صرف وہ پاگل مریض داخل ہیں جو پیسے کے اعتبار سے موثر ٹیکہ لگاتے ہیں۔ وہ سب اس وقت اپنے اپنے بیڈ کے نیچے گھسے ہوئے ہیں اور اپنے خیال میں گاڑی کی مرمت کر رہے ہیں۔“ ڈیوٹی آفیسر نے بتایا۔

حصولِ دماغ
بجھ۔ کراچی

برسوں سے ترقی نہ ملنے کے سبب ایک اوسط

درجے کا ایگزیکٹو فرسٹریشن کاشکار ہو کر اس امید پر دماغ کی ٹرانسپلانٹیشن کرنے والے اوارے جا چکا کہ دماغ کی تبدیلی کے بعد اس کا آئی کیو لیول بڑھ جائے گا۔ مختلف جسمانی اور نفسیاتی ٹیسٹوں کے بعد اوارے کے ڈائریکٹر نے اسے بتایا کہ وہ اس عمل سے گزر سکتا ہے۔

”واقعی! تمہیں نے سنا ہے کہ یہ آپریشن خاصا مہنگا ہے؟“ ایگزیکٹو نے کہا۔
”جی سر! آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ ڈائریکٹر کا جواب تھا۔

”ایک اکاونٹنٹ کا ایک اونس دماغ آپ کو ایک لاکھ روپے میں پڑے گا، ہر صحت کا ایک اونس دماغ دو لاکھ میں، کارپوریٹ اوارے کے صدر کا پانچ لاکھ میں اور سیاست دان کے ایک اونس دماغ کے لیے آپ کو پچاس لاکھ روپے دینے ہوں گے۔“

”پچاس لاکھ روپے! سیاست دان کے ایک اونس دماغ کے لیے سیاست دان کا دماغ اتنا مہنگا کیوں؟“ ایگزیکٹو کا رد عمل حیرت انگیز تھا۔

ڈائریکٹر نے گہری سانس لی اور کہا۔
”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ایک اونس دماغ کے حصول کے لیے ہمیں کتنے سیاست دانوں کو قتل کرنا پڑے گا۔“

شہلا۔ کراچی

دل جلا

ٹرین نہایت سست رفتاری سے چل رہی تھی اس دوران گاڑی ایک کپار ٹمٹ میں آیا اور بولا۔
”جو مسافر نصیب نگر جا رہے ہیں انہیں نہایت افسوس سے اطلاع دی جا رہی ہے کہ وہاں کاریلوے اسٹیشن تباہ ہو گیا وہاں آگ لگ گئی تھی۔“

ایک لمحے کے لیے خاموشی رہی پھر ایک مسافر دوسروں کو تسلی دینے کے انداز میں بولا۔
”یریشانی کی کوئی بات نہیں ہے جب تک ہم

نصیب نگر پہنچیں گے اسٹیشن دوبارہ تعمیر ہو چکا ہو گا۔“

ذکیہ خان۔ کورنگی

داؤ پیچ

چار ہسپانوی ایک دہائی رستوران میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو پہلوان تھا، ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ لوگ فارغ ہوئے تو انہوں نے گھر کی راہ لی۔

کھیتوں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا ایک سائڈ سے ہو گیا۔ بلا نوش نے آگے بڑھ کر سائڈ کے دونوں سینک پکڑ لیے اور اپنے داؤ پیچ آزمانے لگا۔ پانچ دس منٹ میں سائڈ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلوان اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

”تم لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے کہ میں کچھ زیادہ ہی پی گیا اور نہ اس سائیکل سوار بد معاش کو نیچے کھینٹ کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا۔“

سفینہ طارق۔ فیصل آباد

زعفرانی جو کے

اک میرے نام کا بھی عطا نکالا اس نے خوب بچالے اور خوب ہی کمالی کی میرے عاشق کا تو پر فہوم کا بزنس ہے جناب اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی گیا پریس بربر سول ہوئے لوٹا ہی نہیں پہلے دیکار تھا اور مار تھی منگائی کی بھیج دیتا ہے میرا نام سے ہر ماہ ڈرافٹ اک کی بات ہے اچھی میرے ہر حال کی سونیا ربالی قاضیاں محلہ بالا

شہر ہے یا جہنم

کراچی شہر انہیں کسی طور اور کسی طرف سے اچھا نہیں لگا جہنم کراچی ہے۔
”اماں! یہ شہر ہے یا جہنم۔“ مرزا کسی دانا کے قول

دگرخوان

تحلیلہ جیلد ثانی

آٹھ عدد	بیکٹ
چار کھانے کے چمچے	پائین ایبل سیرپ
آدھا کپ	پینڈی
ایک چوتھائی کپ	ونیلہ کسٹروڈ
آدھا کپ	یادام (ہوائیاں کٹی ہوئی)
چوتھائی کپ	پستے (ہوائیاں کٹی ہوئی)
200 گرام	انور
ایک چائے کا چمچ	چاکلیٹ پاؤڈر
تین کپ	دودھ

ترکیب :

بیکٹوں کو باریک ٹکڑوں میں توڑ کر ایک پیالے میں ڈالیں۔ اب ان بیکٹوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ چھوٹے پیالوں میں رکھیں پھر ان بیکٹوں کے اوپر پائین ایبل سیرپ ڈال کر چھوڑ دیں (یہاں تک



گلاب جامن

اجزا :	کھویا
تیل (فرانگ کے لیے)	تیل (فرانگ کے لیے)
شک دودھ	شک دودھ
چینی (پس ہوئی)	چینی (پس ہوئی)
میدہ	میدہ
کھی	کھی
انڈا	انڈا
الایچی	الایچی
شیر وٹانے کے لیے	شیر وٹانے کے لیے
چینی	چینی
الایچی (پس ہوئی)	الایچی (پس ہوئی)
ایک کپ	ایک کپ
چار عدد	چار عدد

ترکیب :

گلاب جامن میں ایک باؤل میں کھویا، شک دودھ، چینی، میدہ، انڈا، الایچی ڈال کر مکس کریں اور ہلکا سا دودھ کا چھینٹا دے کر گوندھ لیں۔ اس آمیزے کو پانچ منٹ تک گوندھنا ہے اور حسب پسند باؤل بنا کر آدھے گھنٹے کے لیے فرین میں رکھ دیں۔

دیکھی میں دو سے تین گلاس پانی ڈالیں اور اس میں ایک کپ چینی اور الایچی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ دس سے پندرہ منٹ کے بعد چولھے کی آجھ بھکی کر دیں۔ اب بنی ہوئی باؤل کو بھکی آجھ پر ڈیپ فرانی کریں اور حسب پسند براؤن ہونے پر نکال کر پکنے ہوئے شیرے میں ڈالتی جائیں اور بھکی آجھ پر پکنے دیں مزے دار گلاب جامن تیار ہیں۔ ٹھنڈا یا گرم سرو کریں۔

یادام ترا نقل

اجزا :

دیکھ لیا اور روک کر اسے ڈانٹا۔
”تمہیں معلوم نہیں آگے محاذ پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سپاہی چپ رہا تو آفیسر نے پھر گرج کر کہا۔
”جواب تو دو، تمہیں پتا نہیں میں کون ہوں، میں تمہارا جنرل ہوں۔“ یہ سن کر سپاہی چیخ پڑا۔
”خدا کی پناہ میں اتنا پیچھے آپہنچا۔“

امیر اسلم۔ پشاور

بطور احتیاط

ایک بار مرزا غالب کے ہاں ایک مہمان آئے ملاقات کے بعد وہ واپس جانے لگے تو مرزا غالب موسم بتی لے کر دروازے تک انہیں چھوڑنے لگے۔ مہمان اس حسن و سلوک سے بہت متاثر ہوا اور اس نے کہا۔

”اس زحمت کے لیے بہت بہت شکریہ۔“ مرزا غالب مسکرائے اور بولے۔
”جناب میں اس لیے آیا ہوں کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں۔“

فرزانہ احمد۔ کراچی

کارستانی

ایک فرانسیسی کو ڈاکٹر نے بتایا۔
”تمہارے جسم میں پانی زیادہ ہے۔“
وہ بہت حیران ہوا اور بولا۔
”پانی زیادہ ہے میں نے تو زندگی میں کبھی پانی پیا ہی نہیں۔“ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔
”اوہ، یہ اس برف کی کارستانی معلوم ہوتی ہے جو میں بھی کبھی بھار شراب میں ملا کر پیا کرتا تھا۔“

رباب آفاق۔ کراچی

☆ ☆

میں تصرف سے جا کر کے فرماتے ہیں کہ ”قبلہ اس دارالرحمن سے کوچ فرمانے کے بعد اگر خدا نخواستہ وہیں پہنچ گئے جس سے کراچی کو تشبیہ دیا کرتے تھے تو چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد یہی ارشاد ہو گا کہ ہم نے تو سوچا تھا کراچی چھوٹا جہنم ہے۔ جہنم تو بڑا سا کراچی نکلا۔“

ایک دفعہ ان کے ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا۔

”تمہیں معاشرے میں خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں تو بیٹھے بیٹھے ان پر کڑھنے کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرو۔“ ارشاد فرمایا۔
”سنو! میں نے ایک زمانے میں بی ڈبلوڈی کے کام بھی کیے ہیں مگر وہ نرخی ایئر کنڈیشننگ کا ٹھیکہ نہیں لے سکتا۔“

(مشفق احمد یوسفی از آب گم)
کن عدنان۔ کراچی

موضوع

ایک مشہور ہدایت کار ایک خوب صورت ایکسٹرا لڑکی کو بانو میں سمیٹے اس کے کانوں میں ٹیٹھے ٹیٹھے بول کر رہا تھا۔

”تم میری روح ہو، میری زندگی ہو، تم سے مجھے اتنی محبت ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔“ ایکسٹرا لڑکی نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

”پھر کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ ہدایت کار نے کہا۔

”تم عورتوں میں یہی ایک بڑی خرابی ہے، جھٹ موضوع بدل دیتی ہو۔“

رانی سلاہور

ایسا بھی ہوتا ہے

ایک سپاہی اتنا ڈر بوک تھا کہ جنگ چھڑتے ہی محاذ سے بھاگا تو پیچھے ہی بھاگتا چلا گیا، ایک آفیسر نے اسے



کسی بھی خاتون کی عمر کا اندازہ عموماً اس کی گردن سے لگایا جاسکتا ہے اکثر بیشتر گردن کی دیکھ بھال کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے حالانکہ اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کی بھی بہت جلد خشک ہو جانے کے باعث اس پر جھریاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ گردن پر ضرورت سے زیادہ پرفیوم کا استعمال ہونا ہے اسے زیورات کا بوجھ برداشت کرنا ہوتا ہے یا پھر دن بھر کا گردوغبار جتنا رہتا ہے پھر ایک دن شستلی کا شکار ہو کر چہرے سے زیادہ عمری لگنے لگتی ہے۔

اس کے اس نازک حصہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے لیے ہم نے چند ایسے سوالات ترتیب دیے ہیں جو عموماً پوچھے جاتے ہیں۔ ان میں ایسے سوالات بھی شامل ہیں جو شاید آپ کے ذہن میں نہ آتے ہوں۔

کیا گردن کی جلد چہرے کی جلد سے مختلف ہوتی ہے؟

پیدائش کے وقت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان میں تبدیلی آجاتی ہے۔ آپ کی گردن کی حفاظت اچھی طرح نہیں ہوتی اس لیے اس میں دو خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

- 1 اس کی کوہر قرار رکھنے والی تہ بہت کمزور ہوتی ہے اور اسے روکے رکھنے میں کامیاب نہیں رہتی۔
- 2 ایسی ڈرمس نامی جلد کی دونوں پر تہیں بہت باریک ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ جلد کی نمی کو بخارات کے بننے سے نہیں روک پاتیں۔ اس لیے نمی کا خشک ہو جانا ایک سنگین مسئلہ ہے۔

کیا گردن بھی جلدی امراض کا شکار ہو سکتی ہے؟

جی ہاں وہ جلدی امراض سے محفوظ نہیں۔ اگر آپ کی گردن پر خارش کا اثر ہے تو تمام زیورات اتار دیں اور کسی ماہر جلد سے رجوع کریں۔ اس بات کی جانچ بھی کریں کہ قمیص کی گردن پر استعمال ہونے والی

اور باریک کئے ہوئے بادام پستہ اور اخروٹ ڈال کر چمچہ چلائیں۔ اس آمیزے کو ہلکی آنچ پر مزید دس منٹ پکائیں اور چمچہ برابر چلاتے رہیں۔ ڈش میں نکال کر اوپر سے پستہ بادام، اخروٹ سے گارنش کریں۔ مزے دار اینڈول کا شاہی حلوہ تیار ہے۔

فروٹ کسٹروپ میشر ٹارٹ

اجزا :	میدہ
	کھن
	نمک
	اینڈا
	ٹھنڈا پانی
	دودھ
	چینی
	وینلا کسٹروپاؤڈر
	انگور عسب بادام چیری
	ایک کپ

میدہ چھان کر تسلی میں ڈالیں۔ اس میں کھن، نمک اور اینڈا ڈال کر ہاتھ سے اچھی طرح مکس کریں۔ میڈہ جب بریڈ کر مہر کی طرح ہو جائے تو اس میں پانی ڈال کر گوندھ میں ٹارٹ ٹری میں پھیلانے سے چکنا کریں۔ میڈے کی گول روٹی عمل کر گول کٹری سے نکلیں سی کٹ لیں اور ٹارٹ ٹری میں رکھ کر سیٹ کریں۔ ٹارٹ ٹری کو پہلے سے گرم اوبان میں 200°C پر رکھ کر پین میں مکس کر لیں۔

سوس پین میں دودھ اور چینی کو پکائیں۔ ٹھوڑے ٹھنڈے دودھ میں وینلا کسٹروپاؤڈر کھول کر پیتے ہوئے دودھ میں ڈال دیں مسلسل چمچہ چلائیں۔ گاڑھا ہونے پر اتار لیں ٹھنڈا ہونے پر اس میں انگور، عسب، کیلا، بادام اور چیری شامل کر دیں۔ تیار کی ہوئی ٹارٹ میں بھریں پکھلی ہوئی چاکلیٹ سے گارنش کریں۔

کہ بسکٹ ٹھوڑے نرم ہو جائیں) اب کسٹروپاؤڈر سے پکا کر تیار کر لیں۔

کسٹروپاؤڈر کرنے کے لیے ڈھائی کپ دودھ اور چینی کو دیگی میں ڈال کر گرم کریں۔ اس کے بعد اس میں کسٹروپاؤڈر کو اٹھا کپ ٹھنڈے دودھ میں مکس کر کے آمیزے کو گرم دودھ میں ڈال کر چمچہ چلاتی جائیں۔ جب کسٹروپاؤڈر گاڑھا ہو جائے تو چھلے سے اتار لیں۔ نیم ٹھنڈا ہونے پر اس کسٹروپاؤڈر میں انگور اور چاکلیٹ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اس آمیزے کو بسکٹ والے چھوٹے پالوں میں ڈال دیں۔ اوپر سے کٹے ہوئے بادام اور پستے چھڑک کر فریج میں رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر سرو کریں۔ مزے دار بادام ٹراٹفل تیار ہے۔

اینڈول کا شاہی حلوہ

اجزا :	اینڈے
	کھویا
	برنی
	چینی
	بادام
	پستہ
	اخروٹ
	سبز الائچی
	دودھ
	کھی
	ترکیب :
	دس عدد
	ایک کپ
	ایک کپ
	حسب ضرورت
	50 گرام
	50 گرام
	50 گرام
	چار سے پانچ عدد
	چار کھانے کے چمچے
	60 گرام

کڑائی میں کھی گرم کریں۔ الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ اینڈے ڈال کر پیمینٹ لیں۔ اینڈول میں چینی اور دودھ بھی ڈال کر مکس کر لیں۔ برنی کے چھوٹے چھوٹے پیس کر لیں۔ بادام، پستہ اور اخروٹ کو باریک کٹ لیں۔

کڑائی میں اینڈول کا آمیزہ ڈال کر چمچہ چلائیں۔ نیسے ہی اینڈے ٹھوس شکل اختیار کریں اس میں کھویا برنی

اشیاء جیسے فرکالز، کیمیاوی لیبل یا نائیلون کے دھاگے آپ کی جلد پر جلن پیدا کرنے تو پیدا نہیں کر رہے ہیں۔
گردن امراض کے لیے اتنی حساس کیوں ہے؟

اس لیے کہ آپ اس کے ساتھ بے توجہی برت رہی ہیں۔ بہت سی خواتین یہ بھول جاتی ہیں کہ اسے بھی کلیننگ مونسجور اترنگ اور چہرے کی طرح دوسری حفاظتوں کی ضرورت ہے۔ چہرے کے مقابلہ میں اس کے اندر مختلف اقسام کی حرکتیں بھی ہیں۔ اس لیے آپ کو جھریاں دور کرنے والی ورزشیں اور صحیح قسم کی کاسٹیکس استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔
گردن پر اچانک گول گول دائرے کیوں پڑنے لگتے ہیں؟

گردن کے اس حصہ کی جلد بہت باریک ہونے کے باعث بیرونی محرکات کے لیے بہت حساس ہے جیسے دھوپ، درجہ حرارت میں تبدیلی وغیرہ۔ وقت گزرنے کے ساتھ کولینین کے ریشے اپنا لوج کھودتے ہیں اور کچک دار ریشے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ پہلے جھریاں نمودار ہوتی ہیں اور گردن کی حرکت کے ساتھ وہ مزید گہری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جلد سے نمی کا اخراج بڑھ جاتا ہے اور خشکی اثر انداز ہونے لگتی ہے۔

اس حصہ کی حفاظت کیسے ہو؟

چہرے کے دوسرے حصوں کی مانند گردن کی جلد کے ساتھ بھی وہی عمل دوہرائیں جیسے مونسجور اترنگ کریم، نائیت کریم، جھریوں کو دور کرنے والی کریم، فرنگ کریم اور آئیل پیک کا استعمال۔ ان اشیاء کو استعمال کرنے سے قبل گردن کی جلد کو کلیننگ ماسک اور الکوحل سے پاک ٹونر کی مدد سے اچھی طرح صاف کر لیں۔

کیا کسی خاص کریم کے استعمال کی ضرورت ہے؟

گردن کے لیے خصوصی کریمیں دستیاب ہیں جو زیادہ موثر ہوتی ہیں کیونکہ اس کے اندر زیادہ فعال اجزا شامل ہوتے ہیں۔ وہ ناصرف مونسجور اترنگ کرتے ہیں بلکہ مساموں کو آکسیجن بھی فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ جھریوں کے خلاف اپنا دفاع مضبوط کر سکیں۔ گردن کی جلد پر چہرے کے مقابلہ میں دیر میں بڑھاپا نمودار ہوتا ہے لیکن ایک مرتبہ وہ نمودار ہو جائے تو پھر وہ بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

کیا میک اپ کے ذریعے گردن کی خامیوں کو پوشیدہ رکھا جاسکتا ہے؟

اس کے اثرات کو کم نمایاں کرنے کے لیے گردن پر معمول سے ایک شیڈ کا زیادہ فاؤنڈیشن استعمال کریں۔

کیا گردن کے لیے لیپو سکشن کرایا جاسکتا ہے؟

گردن اور ٹھوڑی کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے ان دونوں مائیکرو لیپو سکشن ٹیکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ اس ٹیکنیک میں سرجن ٹھوڑی کے نیچے ایک ہلکا سا کٹ لگاتا ہے اور پھر ایک آلہ اندر داخل کر کے اضافی چربی کو کھینچ کر باہر نکال دیتا ہے۔

بہت لمبی گردن کو کس طرح کم کر کے دکھایا جاسکتا ہے؟

گردن پر ہلکی شیڈ کی فاؤنڈیشن استعمال کریں اور بہت بڑی بڑی آئیل پیک کریں۔

گردن کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کیا کوئی ورزش کی جاسکتی ہے؟ معجزات کی توقع نہ کریں لیکن آدھے بیونیلیون اور گھریلو دیکھ بھال کے ذریعہ۔ مندرجہ ذیل ورزشوں سے گردن سٹول اور مضبوط ہو سکتی ہے۔

○ گردن کو ہمیشہ صحیح زاویہ پر رکھیں۔ دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھ کر کھنڈاں اور اٹنی حالت میں کر لیں۔ اب اپنی گردن کو پیچھے کی طرف دھکیلیں۔ چند سیکنڈ

کے بعد پرسکون حالت اختیار کر لیں اور پھر یہی عمل دوہرائیں۔ ایک ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سر کو آگے کی طرف دھکا دیں۔ چند سیکنڈ کے بعد نارمل حالت اختیار کر کے اس عمل کو پھر دوہرائیں۔

○ سیدھی کھڑی ہو کر سر اور کمر بالکل سیدھی کر لیں۔ لب سر کو واہنی طرف اور پھر بائیں طرف جھکا لیں اور کندھے کو پھونکنے کی کوشش کریں۔ دونوں طرف اس عمل کو پانچ بار کریں۔

اس ورزش سے ذہنی دباؤ اور تھکن میں کمی کی توقع ہوتی ہے۔

گردن کی دیکھ بھال

○ گردن کا حصہ اور اٹنی حصہ بہت جلد سیاہی مائل اور مینا کثیف نظر آنے لگتا ہے۔ اس لیے نہاتے وقت گردن کے ان حصوں کو ٹول سے اچھی طرح رگڑ کر صاف کریں۔ تاہم زیادہ زور سے نہ رگڑیں اور نہ اس پر لیکرس ڈالیں۔

○ بالوں کے نیچے گردن کی پشت پر لہلہکم پاؤڈر چھڑکیں تاکہ وہ پسینہ خشک کرنے کے ساتھ ہی جسم سے نکلنے والی بو کو بھی رفع کرے۔ بلائنگ سر جری کے ذریعہ گردن پر لٹکتی ہوئی ذہیلی کھال کو کٹ کر اسے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح آپ کی عمر کی برس کم نظر آنے لگے گی۔ لیکن پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ اس لیے کم عمری سے ہی گردن کی دیکھ بھال کرنا شروع کر دیں تاکہ اس پر جھریاں پڑنے نہ پائیں۔

○ اضافی چربی اور ڈھیلے پٹھوں کے باعث ٹھوڑی دہری نظر آنے لگتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے سوتے وقت سر ہانڈ زیادہ اونچا نہ رکھیں۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ ٹکیہ کا استعمال ہی نہ کریں۔

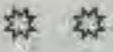
○ لٹکتی ہوئی ٹھوڑی کو صحیح شکل میں لانے کے لیے یہ ٹوننگ ورزش کر لیں۔ سر کو سیدھا رکھیں، کندھوں کو پیچھے کی طرف دھکیل کر سکون سے کھڑی ہو جائیں۔ ٹھوڑی کی سطح نمودار ہونی چاہیے۔ شہادت کی انگلی کو دائیں طرف کے درمیان انٹی شکل میں دبائیں اور پھر

زبان سے اوپر کے بالوں کو دھکا دیں۔ آپ کو ٹھوڑی کے نیچے کھینچنے والے محسوس ہوں گے۔ روزانہ دو مشٹ تک یہی ورزش کرتی رہیں۔ گردن کے پٹھوں کو بھی سخت کرنے کی ورزشیں ہیں۔

○ اپنے منہ کو نصف تھلا رکھیں۔ ہتھیلی کو جڑے کے نیچے لگائیں۔ انگلیوں کو دائرہ کی شکل میں اس طرح رکھیں کہ وہ آپ کے گالوں سے آہستہ سے چپکی رہیں۔ پھر ہاتھوں کی مزاحمت کے خلاف منہ کھولنے کی کوشش کریں۔

○ ایک ہتھیلی سر پر رکھیں اور دوسری ٹھوڑی کے نیچے۔ اب دونوں ہاتھوں میں دبائے ہوئے سر کو آگے کی طرف بڑھانے کی کوشش کریں۔ اس عمل کے دوران کندھے سیدھے رکھیں اور آپ خود پرسکون رہیں۔ کھنڈوں میں بہت جلد سیاہی مائل خشک اور جھریوں دار بن جانے کی صفت پائی جاتی ہے۔ ان کی صفائی کے لیے نہاتے وقت ہفتہ میں ایک بار جھانوسے سے گھسنا بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ رات کے وقت ان پر کولڈ کریم مل لینے سے کھنڈیاں چکنی ہو جاتی ہیں۔

○ گورا کرنے والی کریم کے استعمال سے آپ کھنڈوں کے سیاہی مائل رنگ کو کٹ کر صاف بنا سکتی ہیں۔ ایک دو سراسا اور آسمان نسخہ یہ ہے کہ نصف لیٹوں کے دو ٹکڑے لے لیں اور اپنی کھنڈوں کے ساتھ پندرہ مشٹ تک دبا کر رکھیں۔ لیٹوں کا سٹراٹک جوس کھنڈوں کے سیاہ رنگ کو کٹ کر انہیں گورا بنانا دے گا اور اس عمل سے انہیں تازگی بخشنے گا۔ خوب صورتی کاراز پورے جسم کی دیکھ بھال میں مضمر ہے۔ ہم اپنا قد جلد ہی رگت اور خدو خال تو تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کی مناسب دیکھ بھال سے اور حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کر کے انہیں تازگی اور صحت ضرور عطا کر سکتے ہیں۔





ذوالقرنین

عمر اور حلال

نبیلہ امان۔ پشاور

س : ذرا یہ تو بتائیے کہ کیا آپ معلومات عامہ کی کتاب ہیں جو سب آپ سے سوالات پوچھتے ہیں؟
ج : ”یہ تو سوال کرنے والوں سے پوچھنی ہی۔“

نورین عزیز۔ شکارپور

س : لفظ عورت کے اجزائے ترکیبی سے عظیم سے وقار سے رتبہ اور ت سے بلند ذرا مروکی خصوصیات بتائیں؟
ج : ”م سے حسن سے راست باز اور سے دیانت دار کیا سمجھ میں۔“

فرزانہ گل۔ لطیف آباد

س : ”بھیا! اگر آپ نے اب میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں خود کشی کر لوں گی؟“

ج : ”میرا احسان مانو کہ خود کشی سے بچا لیا۔“
فریدہ۔ کراچی

س : میرے خیال میں رونے والا مرد بزدل ہوتا ہے آپ کا کیا خیال ہے؟
ج : میرے خیال میں وہ؟

س : اگر کوئی مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بولے تو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟
ج : آپ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا بولنے میں۔

نفیس مظفر۔ کراچی

س : بھیا! محبت کا آغاز کب ہوا؟
ج : حضرت آدم سے یہ غلطی ہوئی تھی۔

قمر سلطان۔ کراچی

س : نین بھیا! دل کو کھلونے سے کیوں تشبیہ دی جاتی ہے؟
ج : لوگوں نے کھیلنا جو شروع کر دیا ہے۔

ثمینہ گل۔ ممبئی بلوچستان

س : نین جی آج کل تمہیں کیا ہو گیا ہے جب بھی گھر آتے ہو تو منہ کیوں پھولا رہتا ہے؟
ج : کھانا ڈھنگ کا نہیں ملے گا تو!

ربحانہ بیگم۔ کراچی

س : ”کس نام سے پکارا دل کیا نام ہے تمہارا؟“
ج : ”میں نے تو میں ہوں میرا نام بیگم۔“

ممتاز کنول۔ کراچی

س : تضائل تیرا حد سے گزر گیا تو کیا ہوگا اگر ہم بے نیازی پہ اتر آئے تو کیا ہوگا؟
ج :

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تیری عادت ہی سہی

ہلی۔ سمہ سٹ

س : بھیا! سنا ہے جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو یہ اپنی جلدی پرواز کیسے کرتا ہے؟
ج : پردوں سے۔

صبا جمیل احمد۔ کراچی

س : ذرا یہ تو بتائیے کہ بیوی کے خڑے اور قربانی کے بکرے میں کیا فرق ہے؟
ج : قربانی کا بکرا تو پھر بھی قربان ہو جاتا ہے۔

س : نین بھائی! آپ کی نظر میں اچھی اور بری چیز کیا ہے؟
ج : اچھی چیز اچھائی بری چیز برائی۔

مسرت جسین فائدہ ڈر۔ حلال پور پیر والا

س : آج کل کے لڑکے انفل کھلانے سے کیوں گھبراتے ہیں پیرا تھی بری ہو نہیں رکھنے کا کیا فائدہ؟
ج : مجھے معلوم ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔

شگفتہ نور۔ سمہ سٹ

س : کوئی چیز بھیج کر کب تک انتظار کرنا پڑتا ہے؟
ج : جب تک شائع نہ ہو جائے۔

س : اگر آپ کی جگہ میں ہوتی تو بہنوں سے پورا پورا انصاف کرتی؟
ج : سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری جگہ تم ہوتی ہی کیوں؟

فرخندہ تبسم۔ گوجرانوالہ

س : لفظ شوہر کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟
ج : بیوی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔

س : بھیا! جب ایک میان میں دو تلواریں ایک شوہر دو بیویاں رکھ لیتے ہیں تو ایک کالج میں دو عین کیوں نہیں ہوتے؟
ج : ایک میان میں دو تلواریں ایک شوہر کی دو بیویوں کا حشر شاید تم نے نہیں دیکھا۔

لبنی عنایت۔ پشاور

س : کیسے پچانا؟
ج : تم کو نہ پچانوں یہ کیسے ممکن ہے۔

کوثر جسین سحر۔ کراچی

س : پکڑے کے تم ذوالقرنین نہیں ایمیل فیصل ہو، جیسی ہر جگہ تمہاری تصویر کے نیچے محمود باقر فیصل لکھا ہوا ہے چاہے اپنی اس تصویر کے ساتھ ملا لو جو کسے پہ دہلا کسے پہنچے ہو؟

ج : یعنی آنکھیں ٹیٹ کر آؤ۔

سیمہ جمیل احمد۔ کراچی

س : کیا تم حقیقت میں اتنے پنڈ سم اسارٹ اینڈ بیوی فل ہو جتنے کہ تصویر میں نظر آتے ہو؟
ج : اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

س : اریے نین پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنے آپ کو کیا طرم خان سمجھتے ہو؟
ج : طرم خان کہہ کر میری انسلٹ مت کرو۔

تمینہ کنول، روحیلہ کنول۔ نوشہرو

س : یہ زندگی کیا چیز ہے؟
ج : یہ تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔

افشال تبسم القشی۔ کراچی

س : بھیا! زندگی اور موت میں کتنا فاصلہ ہے؟
ج : کچھ بھی نہیں۔

توحید صدیقی۔ کراچی

س : بادشاہوں کے محل معمار بناتے ہیں یہ بتائیے سپنوں کے محل کون بناتا ہے؟
ج : سپنوں کے محل معمار نہیں بناتے جیسی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔

فرحت واحد علی۔ لطیف آباد

س : شرم و حیا عورت کا گنا تصور کیا جاتا ہے۔ تو مرد کا گنا کیا ہوتا ہے؟
ج : صرف تصویر ہی کیا جاتا ہے۔

صفیہ خانم۔ ملکووال

س : شام کو چلنے والی مست خرام ہوا کا جھونکا تمہیں کسی کا کوئی پیغام نہیں دیتا؟
ج : کیا تم نے کوئی پیغام بھیجا تھا۔

سائلگرہ ضیاء



مدیرہ عالی حضرت

تائیدہ منصورہ مردان

میں کافی عرصے سے کرن کی قاری ہوں۔ کرن کی تحریروں کا معیار بلاشبہ ایک بہترین جریدے کا معیار ہے۔ جو اصلاح معاشرہ میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کر رہا ہے۔ کرن کی تحریروں پر تبصرے نما خطوط بھی میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں میں ایک رشتہ زنجیر ہوں جس نے اپنی عمر کے میں بیسیس برس اردو ادب کو بڑھاتے ہوئے اور بچوں کو اچھے ادب کے زندگیوں پر اچھے اثرات کے بارے میں سمجھاتے ہوئے گزارے ہیں اچھی اور برس قبل میں رشتہ زنجیر ہوں۔

مدیرہ صاحبہ! آج میں ایک تحریر تبصرہ کرنے کے لیے خط لکھ رہی ہوں اس تحریر پر اگر میں تبصرہ نہ کرتی تو میرے دل پر بڑا بوجھ رہ جاتا۔ ”گوشہ عافیت“ آپ کے جریدے پر اس وقت ایک دلنہا کی پیشانی کے جھومر کی طرح چمک رہا ہے۔ میں اپنے خط میں اس کی قارئین بچیوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ دراصل ایک ناول کے کیا لوازمات ہوتے ہیں جو اسے حسین اور منفرد بناتے ہیں یعنی ایک اچھا اور معیاری ناول کتنا بڑا نام ہو سکتا ہے۔ ”گوشہ عافیت“ ایک ایسا ہی عمل اور معیاری ناول ہے جس کا انداز تحریر جاندار، مکالمے سادہ مگر گہرے معانی سے گندھے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی عام ناول نہیں ہے جس میں محض ایک لڑکے اور لڑکی کا عشق ہو یا کھریلو جھگڑوں کی داستان اس ناول میں ایک زندگی کے سارے رنگ ہیں اور اس کے کردار حقیقی دنیا کے زندہ کردار ہیں۔ وجہ یہ اور عصمد دراصل پورے انسان ہیں تنگی اور بدمی کے برابر خیر سے گندھے ہوئے۔ اس لیے قارئین سے میری گزارش ہے کہ وہ اس کی گہرائی اور اس میں پوشیدہ سبق کو سمجھیں اور اپنی زندگیوں کے لیے اس سے زاورہ لیں۔ عصمد جیسی لڑکیاں جب عشق مجازی میں مبتلا ہوتی ہیں تو اپنے گھر اور والدین بھی تباہ دیتی ہیں مگر زندگی کا آئینہ جب انہیں اصل صورت دکھاتا ہے تو وہ مجاز سے حقیقی کی طرف کا سفر طے کرتی ہیں۔ کس طرح سے ”تصوف“ کی منزلوں کو سمجھنے لگتی ہیں۔ یہی اس ناول کا درس ہے وجہ یہ جیسا شرابی اور زانی جب سچ سچ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جائے تو پھر وہ جسم کی طلب سے نکل کر روح کی پہچان کیے کرتا ہے۔ اس سفر کی لطافت کو اگر محسوس کریں تو ”گوشہ عافیت“ پڑھنے کا سرور ملے گا۔ شگفتہ بھی کو میں نے بار بار پڑھا ہے ان کی ہر تحریر میرے پاس محفوظ ہے۔ میں کرن کو مبارک دیتی ہوں جس کے لکھنے والوں میں ایسے لکھنے موجود ہیں اور شگفتہ بھی کو بھی مبارک ہو جسے اللہ نے ایک منفرد سوچ عطا کی ہے جو یقیناً ”دوسروں سے بہت بہت کرے۔“

میرا یہ خط لکھنے کا مقصد ”کرن“ کی قارئین بچیوں کو خصوصاً ”یہ احساس دلانا ہے کہ وہ اس تحریر کو اپنے دل میں سمو کر پڑھیں تاکہ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے عشق حقیقی کو پہچانیں مجھے ”نوابزادی سولنگی“ کے خطوط بہت اچھے لگتے ہیں وہ ایک اچھی قاری ہی نہیں تجزیہ نگار بھی

ہے اس نے ”گوشہ عافیت“ کو محسوس نہیں کیا مجھے حیرت ہے ہر حال میں صاحبہ! آپ سے بھی اتنا س ہے کہ ایسی جاندار تحریروں سے کرن کے گوشے منور کئی رہے گا باقی ہر راسخراہی جگہ بہت اچھا لکھتی ہے اور یقیناً ”معاشرے کی اصلاح میں اپنا حصہ ڈال رہی ہے سب کو مبارکباد کرن کے لیے بہت دعا میں۔“

حزمت و اکرم۔ ذوالول

کرن اس دفعہ نو فروری کو ملا سال اچھی قسم کی حسی حمد و نعت کا مطالعہ کیا اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد و ثناء سے منور کیا۔ اس کے بعد ”عشق اس“ پڑھا۔ بہت زیورست لکھا ہے۔ ”اس قسط کو خصوصاً“ لکھنے کے مرنے اور جنازے کے سننے کے مالا مال۔

لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شادی کروادی جاتی۔ اس سے کہانی میں کچھ اور رنگ بڑھ جاتے۔ نور البدی کا بیو کے لیے پیار اور شدید محبت نے بہت متاثر کیا تھا۔ اک اور بات کہ پلیر اب شایان اور مانیہ کی شادی ضرور کروا دیجیے گا سعید ہی اس ماہ ایڈ کریں اس ناول کا بیو اور ایڈ بھی اچھا ہونا چاہیے۔

نیپیلہ عزیز کا ”در دل“ پڑھا۔ وہ بھی اچھا جا رہا ہے اس قسط میں پہلے والی قسط سے زیادہ جان سنی آپ جیسے جیسے ناول آگے بڑھے گا تو ہی اندازہ ہو گا کہ نیپیلہ کی ترقی کا میانی سے اس ناول کو لکھ سکیں۔ ایک بات اور پوچھنی تھی کہ نیپیلہ کا کوئی عمل ناول کب تک شائع ہو رہا ہے۔ کچھ نیا اور کچھ کے وار تو ہونا چاہیے۔

کرن ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی کافی حوصلہ افزائی کرتا ہے مگر لکھنے والوں کا بھی کام ہے کہ وہ بھی کہانی کے ساتھ مکمل انصاف کریں۔

آصف عزیز قاضی کا مکمل ناول ”خوشبو کی بشارتیں“ ایک دم بوم بوم لگا۔ ہزاروں دفعہ نہیں بلکہ لاکھوں دفعہ اس موضوع پہ لکھا جا چکا ہے کہ ہیرو کئی وجوہات کی بنا پر اپنے گھر والوں سے دور ہو جاتا ہے اور غصہ بھی دکھاتا ہے۔ پھر اک کرن صاحبہ اسے سیدھے راستے پہ لاتی ہیں تو ان کا کڑا کے وار ٹائپ کا فیر اور انجام شادی۔

کیا یار! ہم لوگ کچھ نیا پڑھنا چاہتے ہیں۔ آج کل کے مسائل یہ بات کریں ایسا لکھیں جس سے ہم لوگوں کو کچھ

سکھنے کو ملے تاکہ ہم لوگ صرف ایک ناول کے لیے اپنا وقت برباد کریں۔ اگر آپ لوگوں کو میرا مطلب ہے راسخراہ کو برا لگتا ہے تو سب کی مرضی مگر مجھے آصفہ کا ناول رتی برابر بھی اچھا نہیں لگتا۔

رشتہ خاندان کا انسان پڑھا۔ آج کل کے حالات و واقعات اور سب سے بہتر کو ہم روزانہ سنتے اور دیکھتے ہیں مگر ہمارے ذہن میں اچھے والے سوالات کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

ہزاروں ڈاکٹر مہرمان روزانہ ناکرہ گناہوں کی سزا جھیلنے رہتے ہیں اور لاکھوں حمید بابا سزوں پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر جاتے ہیں مگر ان کا پرمان حال کون ہے؟ ایوانوں میں بیٹھے ہمارے ناخدا ہمارے ان گناہوں کی سزا ہیں جو روز ہم کرتے ہیں، کسی معصوم انسان کو اپنی مصنوعی فرض شناسی کے ہاتھوں مار دینا گناہ ہی تو ہے مگر ہم سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔؟

”موش افکار“ کا ناول پڑھنا ابھی باقی ہے اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ نازیہ کنول کا ناول پڑھا اچھا لکھا تھا انہوں نے مگر اشارت میں عبیرہ کے ڈاؤن لاک کچھ اچھے نہیں لگے۔

اک بات کہ اگر عبیرہ نے سوید کو موی سے شادی پر مجبور کیا تو بعد میں اس سے اتنی جیلس کیوں تھی۔ وہ تو سوید کی ہمد یہ اس سے کورٹ میرج کر لی اور نہ وہ اگر اس سے شادی نہ کرتی تو بھی سوید کو دل آویز سے بات چیرت سے اسی طرح روکتی توکتی۔ جو کچھ بھی ہو مگر ناول اچھا تھا۔ فوزیہ احسان رانا کا افسانہ بھی اچھا تھا اور حقیقت پر مبنی بھی۔

”بول کہ لب آزاد ہیں تیرے“ میں اس دفعہ سب نے اچھا لگا مگر شاید بولنے کی آزادی بھی حد میں ہی ہے؟ ہے نا

”نور عین عاصم بشیر“ اور ”جو او احمد کا انٹرویو پڑھ کر مزا آیا مگر“ دو کا ہاڑا“ میں نعیم خان نے حد سے کچھ زیادہ بولکیاں ماری تھیں۔ بلکہ مجھے تو لگا کہ شاید نعیم خان صاحب انٹرویو دینے کے لیے سیریس ہی نہیں تھے خواجہ وقت بریاد کیا۔ البتہ ناول مراد کا انٹرویو اچھا لگا تھا مستقل سلسلے بھی سارے اچھے تھے۔ کرن کو سالگرہ کی بہت بہت مبارکباد ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (امین)

سپہر اجمش۔ شمد اوپور

"کرن" سے منسلک تمام لوگوں کو میرا سلام قبول ہو۔
 کرن سے ہمارا اڑبڑھ سالہ رشتہ ہے 2009ء میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں فرسٹ ایئر میں تھی کسی بھی رسالے میں میرا پہلا خط ہے۔ اب کی دفعہ کرن نو ماہ کو ملا۔
 کرن کے سارے سلسلے اپنے ہیں پر مجھے "بول کے لب" یہ سلسلہ پسند نہیں پلینز کوئی دوسرا سلسلہ شروع کریں اسے بڑھ کر بورت ہو جاتی ہے سلسلہ وار کہانیوں میں فوزیہ یا سیمین کا ناول زبردست ہے نبیلہ بی کی کہانی میں تو حویلی لازمی ہوتی ہے تو آج تک حویلی نہیں دیکھی نبیلہ عزیز کمال سے اتنی حویلی لے آتی ہیں "گوشہ عافیت" اب پور کرنے لگی ہے اس کو جلدی ختم کریں اب کی دفعہ عمل ناول متاثر نہیں کر سکے نازیہ کنول نازی کا تو عجیب ہی تھا موش افخار کا ناول پھر بھی پسند آیا کوئی سبق تو تھا افسانوں میں "تم میری ہو" جھانگا۔

کئی جہوں جاتے کہاں غائب ہیں پلینز واپس آجائیں ایک زبردست سی کہانی کے ساتھ ہمیں آپ کی خبروں کا انتظار ہے باقی تمام سلسلے زبردست ہیں۔ ایک فرمائش 101 FM انٹرنیشنل کے آر جے احمد بلال 101 اور حیدر آباد کے عامر عقیل کا انٹرویو ضرور شائع کریں اور "یا کاکھر پیارا میں" قلم مصطفیٰ بیچ قلمی کی تصویروں کے انٹرویو کو دے دیں اب اجازت آئندہ ماہ مکمل ہمارے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

انیقہ ماٹا۔ چکوال

سورق اس بار بس ٹھیک ہی تھا۔
 مستقل سلسلوں میں انٹرویوز کے علاوہ دیگر سبھی سلسلے اپنے رہے۔ "نمائے میرے نام" میں کئی ایک نئے نام دیکھنے کو ملے اور "بول کے لب" مجھے اتنا پسند نہیں آیا۔
 تبھی تو تاحال لکھا نہیں۔ خیر دیکھیے ایک شکایات کا بند ٹوٹا ہے۔

افسانے اس بار نہیں پڑھے لہذا تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ "گوشہ عافیت" میں اسی بیچ پر جا پہنچا ہے جس کا تصور ہم پہلے سے کر چکے تھے یہ ضرور ہے کہ حصہ اور وجہ کے لیے دل حد درجہ اداس ہے پر میرا نہیں خیال کہ ان کے ملنے کی کوئی سبیل ہوگی تاہم مختلف ہی اہتمام میں کوئی دوسرا ایرومٹ لے آئے گا۔ اتنی شکر محبت کے بعد کوئی دوسرا حصہ کے لیے ہم قبول نہیں کر سکیں گے۔

سعدیہ راجپوت کا مکمل ناول کچھ زیادہ ہی طویل ہو تا جا رہا ہے۔ میں نے ابھی تک ایک بھی حصہ نہیں پڑھا۔ فرصت کے لمحات تلاشیں گے اور پڑھیں گے۔ آصفہ عزیزین کا ناول مجھے کچھ خاص نہ لگا۔ اگرچہ رتبہ نے ایک شخص کی بدگمانیاں اور کر کے دلوں کے مابین در آئے فاصلے مثالاً کا نیک کام سرانجام دیا بس سو سونگا۔
 موش افخار کافی عرصے کے بعد جلوہ گر ہوئیں۔ ایک ایسے موضوع کو زیر بحث لائیں۔ میں یہ نہیں سمجھ پاتی کہ مرد کی دوسری شادی کو لوگ لانی پر ظلم کیوں گردانتے ہیں؟ مذہب میں کیوں بھی نہ دوسری شادی کی ممانعت ہے تاہم وہ ہے۔ آخر لوگ کیوں ظلم تصور کرتے ہیں۔

زیر بحث ناول میں ہی پہلے تو ولید کی بزدلی پر غصہ آیا۔ ایک مرد با شعور و عقل مند ہے کہتا ہے تو اپنی فیملی سے اتنا بھی کیا ڈرنا کہ۔۔۔ اسما کی موت اگرچہ دل دکھائی مگر ماہا نے بھی جو کیا صحیح کیا۔ میں دوسری شادی کی مخالفت نہیں کرتی مگر ماہا کے دوسلے کو بھی حق بجانب سمجھتی ہوں۔ معاف کرنے کا حوصلہ بھی کم کم ہوتا ہے۔ ویسے اگر ماہا ولید کو معاف کر دیتی تو میں کہتا کہ ولید اسما سے شادی کو مستقبل میں ماضی کی فائن منٹلی تصور کرتا۔ مرکزی خیال سے کردار و مکالمات تک کہانی زبردست تھی۔

نازیہ کنول نازی۔ کے ناول اگرچہ مجھے کچھ پسند نہیں آتے۔ خاصی فلمی سی چوہین ہو کر گئی ہے۔ اگر اس بار ان کا ناول بڑھ کر میں بہت روٹی پیتا نہیں کیا اور کئی میں موی کے دکھ یہ روٹی کہ حبیبو کے مرے پر یا ہر سیرے اندر کی وہ اسی تھی جو ناول کو بڑھنے سے بھرنا رکھ ہوئی۔
 رشتوں کے چکر نے اگرچہ ناول کو سبب مگر اس بار نازیہ مجھے متاثر کر سکیں۔ ویسے موش افخار نازیہ کے ناول میں ممانعت بہت تھی۔ بہر حال دو ناولوں میں ناول اپنے رہے۔

فوزیہ یا سیمین پہلے تو شادی کی مبارک دیکھیے۔ اب ذکر خیر ہو جائے گا اور یہ نہایت خوش اسلوبی اور روانی سے ناول کو نبھاری ہیں اور سب کے کردار اپنے ہیں۔ علاوہ ازیں مزید بصورت و قفا "نوقا" جاری رہے گا۔ مارچ کا مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ کرن کی اور میری ساگرہ اسی مہینے ہے۔ گے ہاتھوں مبارک قبول کیجیے اور مجھے بھی مبارک دیجیے۔ اب اجازت دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔

فوزیہ شمر ہٹ۔ گجرات

مولہ فروری عید میلاد اے دن کرن ملا۔ آج سارا شہر پر رونق تھا۔ ہر زبان پر روپاک کا ورد ہو رہا تھا۔ ساری فضا پر نور اور معطر ہوتی تھی۔ ہر چہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
 سونے سے سہاگہ کرن کا خوشنما شکل مزید خوشی سے دوچار کر گیا۔ دیکھی مسکراہٹ لیے ماڈل صاحبہ بہت پاری لگ رہی تھیں۔ حسب عادت ادارہ اور فہرست کو چیک کیا۔ کون کون سی راسٹرز چلو اور فرزند ہیں۔ چار مکمل ناول اور بنا کسی ہالی آئینہ کے واہ جی اس بار کرن کا مزہ ہی دو ہوا ہو گیا۔

سب سے پہلے حمد باری نے ناول "بول کے لب" سے ایک درخواست ہے کہ سارا ادارہ کے مشورعت خواں "شاہد محمود" کو مطلع کیا جائے۔
 انٹرویوز میں ناول اور ملاقات اپنی رہی۔ وحید مراد ہمارے ایک سب سے خوب صورت اور لکھے ہوئے اداکار تھے۔ جو اب تک ان لوگوں کے دلوں میں راج کر رہے ہیں۔

دو کے چھانے میں نسیم خان کو رحمانہ موصوف کی باتوں میں خود پسندی کا عنصر زیادہ تھا اور کافی ہالہ میں ٹیسی لفظوں میں بھڑکے ہوئے والی نصیحت لگتی کہ نہ پوسٹ۔
 "بول کے لب آزاد ہیں" کافی ایسے موضوع میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ سلسلہ اور کئی دور تک چلے گا اور کیا میں دوبارہ اس میں شرکت کر سکتی ہوں۔

ناول میں سب پہلے "عشق آتش" کو شروع کیا جس کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس بار تو سعدیہ کی لے اور اس کر دیا۔ آنکھیں اشک بار ہوئیں۔ کہانی تو دلچسپ اور گفتار کر چکی ہے۔ اگر بیچ کی ڈیٹ ہو چکی تھی تو پھر نصیر فاروقی میں اس کا ڈر کرنا قابل برداشت کیوں ہے۔ کیوں نور الہدی اور اظہر فاروقی کھل کر اس معاملہ میں بات نہیں کرتے۔ کیوں وجدان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کیا شایان وجدان کا لے پالک بنا ہے تو پھر شایان کیوں لور کو اپنی ماں کہتا ہے پوری قسط میں مانیہ اور شایان کا کہیں ذکر نہیں تھا۔

سعدیہ جی اس تمام حتمی سے روہ انھادیں۔ اب مزید صبر نہیں ہوتا عجیب کشمکش ہے۔ پلینز آئندہ ماہ اس کا اختتام کر دیں۔

"حسرتوں کا شمار کر" مجھے یہ ناول اتنا لگا ہے نہ کہ مایا کا فیصلہ ٹھیک نہیں تھا کیا تھا اگر ولید نے غلطی کر لی تھی

دو واپس تو آگے تھا۔ چلو یا حال۔ سہری اس کی واپسی ہوئی اور کیا گارتی تھی کہ ماہ کو مستقل میں لپیڈ سے بہتر شخص کا ساتھ ملے۔ اکیلے تو زندگی گزارنی نہیں تھی تو ولید کو اپنا بیٹا تھی۔ ولید کی محبت نہ سی اپنی مجھ کو بچا دیتی۔ پورا ناول ہی بہترین تھا۔ گھرا بیٹہ نے سارا مزہ خراب کر دیا۔

"خوشبو کی بشارتیں" بھی ٹھیک ہی تھی معید خان کی خود ساختہ سوچیں اسے اپنے محسنوں سے منظر اور باغی بنا رہی تھیں۔ رتبہ کی مہمانی سے معید خاں احسان فرمائش کھلانے سے پہلے گیا۔ بلاٹ "گوشہ عافیت" و "نشیں صاحبہ" لاڈی ساتھیوں کی محبت میں گرفتار نظر آئیں۔ کیا محبت میں انسان کو کسی لکھا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ صاحب نے پہلے جذبات میں آکر شادی کی اور پھر دیاؤ میں آکر اپنی محبت کا گھاٹھوٹ دیا۔ ایسے جذباتی لوگ اسے ساتھ ساتھ دو سروں کی زندگی مشکل بنا دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ایک بار دو نشیں سے بات تو کرنی چاہیے مرنے تو عورت کو مخلوق سمجھ رکھا ہے جب چاہا محبت جناسی اور جب چاہا تین حرفہ ہاتھ میں کھانا لے۔ اس کہانی کو بھی اب اختتام پذیر ہو جانا چاہیے۔

افسانہ "تم میری ہو" عائشہ نصیر کی تحریر بچکانہ تھی۔ یہاں پر بھی مرد کی اپنی خود غرضی کہ اسے اپنی سے بڑی عمر کی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور اپنی محبت کو پانے کے لیے وہ اس سے شادی کر لیتا ہے عام حالات میں مرد کو سو نقص نظر آتے ہیں۔

"کوئی تھلاؤ کہ۔۔۔" ہاں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں کسی بھی بات کی تصدیق کیے بغیر اس کے فاروڈ کر دی جاتی ہے۔ یہ سوچے مجھے بخیر کہ اس بات کے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ مستقل سلسلے اپنے تھے اس بار تو مسکرائی کرنوں نے حقیقت میں مسکرائے۔ مجبور دیا۔

"یاوں کے در تیجے سے" صائمہ اور۔ سرین خان کی واری اچھی لگی۔ شاعری میں لہجہ حبیب کے نام کی طرح اس کا شعر بھی خوب صورت تھا۔

"نا بے میرے نام میں" حرمت لڑا کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے اور کیا مارچ سالگرہ نہیں میں ناویہ اشمن کے کسی ناول کی امید رکھی جاسکتی ہے اور۔ مستقل سلسلوں میں کوئی نیا سلسلہ شروع کریں دوستوں کے نام پر نام یہ سلسلہ یقیناً کرن کا لطف دینا لگا کر دے گا۔

ماہ نور سعدیہ ڈیرہ اسماعیل خان

پاک سوسائٹی

ڈاٹ کام

اس ماہ کا کرن دس کو ملا اور ٹائٹل کی کیا بات کروں بڑا ہی زبردست اور خوب صورت اب ذرا قسط وار ناول کی طرف آجاتے ہیں لیکن میں نے جو سب سے پہلے پڑھا وہ ناول "گوشہ عافیت" تھا اے اف کتنا زبردست! اس کہانی نے نیا موڑ لیا بہت اچھا لگا پچھلے ماہ اس لیے خط نہیں لکھا تھا کہ دل او اس تھا کہ لاڈلی نے کیوں دل نشین کو طلاق دی اس بار تسلی ہو گئی فوزیہ یا سمین کا "دست کوڑہ کر" پڑھا اچھی قسط تھی پھر سب سے زیادہ یاد دل ناول پڑھا زبردست اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے "عشق آتش" سعدیہ راجپوت بہت خوب - ناول بہت زبردست ہے لیکن بیچ کے ساتھ اتنا براہوں کہ دل ہول اٹھا اور وجدان پر تو کسی بھی انسان کو رونا آجائے کیا دنیا میں لوگوں کو اتنا صبر ہوتا ہے بس پھر ہم نے اس بار تمام مکمل ناول پڑھے کیونکہ اس مرتبہ "کرن" ناول نمبر ہو تھا سب سے زبردست جو ناول لگا وہ نازیہ کنول نازیہ جی کا دل آویز اور حبیبہ کے کردار کی تو کیا بات ہے پھر تمام کرن پڑھا سوائے افسانوں کے وہ پھر کبھی پڑھ لیں گے اور آپ سے میری ایک ریکورڈ ہے کہ "شاہد خان آفریدی" کو دو کا پڑاڑہ میں جگہ دیں ابھی تو پاکستان کی ٹیم ورلڈ کپ کے لیے نئی ہوئی ہے ان شاہد اللہ جب جیت کے آئے کی تب ضرور ضروران کا انٹرویو لیجیے گا اور دعا کریں کہ پاکستان ورلڈ کپ جیت جائے۔

اب اجازت دیں آئندہ ماہ پھر حاضر ہوں گی۔
تحریم بخاری۔ عظمیٰ گڑھ

فروری کا شمار اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل مجھے بہت اچھا لگا۔ حمد باری تعالیٰ اور نعمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر روح کو جو سکون ملا وہ میں بتا نہیں سکتی۔ علول مراد اور جو احمد کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ "بول" کہ لب آزاد ہیں تیرے "میں زویا ایم قادری کی باتیں اچھی لگیں۔ رمشا خالد کا انسانہ "کوئی بتاؤ کہ ہم" دل کے بہت قریب لگا۔ فوزیہ احسان رانا کی "صاف گو" بہت اچھی تھی۔ نازیہ کنول نازی کا ناول "تیرے آسمان تلے" اچھا تھا۔ نازیہ کنول سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ وہ زیادہ مکمل کرنا لکھا کریں۔ اس ماہ کا سب سے اچھا ناول "خوشبو کی بشارتیں" بہت زیادہ اچھا لگا۔ آصف خٹبرن کی بہت اچھی کاوش ہے۔ میں ان کی شخصی بھی تعریف کروں وہ

کم ہے۔ اتنی اچھی منظر کشی کر لی ہیں کہ بدمذہب لو اس میں کھو جاتا ہے۔ صوفی افکار کا ناول "حسرتوں کا شمار کر" بہت زبردست کہانی ہے۔ سلسلے دار تحریریں ابھی میں نے پڑھی نہیں ہیں۔ بالی تو سارا ڈائجسٹ ہو مائی زبردست ہے۔ میں نے اپنی دو تحریریں "رنگ حنا" اور "آرزو خواب" بھیجی ہیں۔ اگر قابل اشاعت ہو تو ضرور شائع کیجیے گا۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ اوائل مارچ کے دنوں میں اس سلسلے میں ہماری گھر میں مہمانوں کی آمد وقت بڑھ گئی ہے۔ وقت ہی نہیں مل رہا۔ شاید یہ میرا آخری خط ہو۔ پتا نہیں شادی کے بعد میں خط لکھ سکوں گی یا نہیں۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ میں آپ سے رابطہ نہیں کر سکتی پلیز میرے افسانے کے بارے میں ضرور بتائیے گا۔ زیادہ تفصیل سے نہیں لکھ سکتی۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشحال اور آباد رکھے۔ (آمین)

سائزہ پرواکرن۔ کوش چھٹہ

فروری کا کرن حسب معمول جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل کو دیکھ کر دل نے دھڑکن لگائی۔ کالی عرصے کے بعد "کرن" کی اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں (وجہ میری شادی ہو چکی ہے) ناول نمبر دیکھ کر دل بے انتہا خوش ہوا۔ "دو کا پڑاڑہ" میں ٹیم خان کے جوابات بہت فضول لگے۔ جو احمد سے گفتگو اچھی رہی۔

پھر ناول "در دل" پڑھا۔ مجھے اس میں آزر بخاری اور دل اور شاہ کا کرکٹ بہت زیادہ پسند ہے۔ "دوست کوڑہ کر" بھی بہت قہقہا ٹنک جا رہا ہے۔ خرم اور نعل کی سرو جنگ آخر کب ختم ہوگی؟ فوزیہ جی پلیز ان دونوں میں فریڈ شپ کروادیں اور "تیرے آسمان تلے" نازیہ کنول نے بہت رومانٹک ناول لکھا ہے اور بہت پیارا بھی۔!

"گوشہ عافیت" کا ذکر کرنا تو میں معمول ہی گئی ویسے احمد نے دل نشین کو طلاق دے کر ہم سب کو دکھی کر دیا۔ مجھے دل نشین اور وجیہ الحسن کا کیل بہت زیادہ پسند ہے مگر شکستہ آلی نے ان دونوں کو جدا کر کے ہمارے دلوں کو اداس کر دیا ہے۔ اب نجانے آگے کیا ہو گا حصہ تو دیکھیں کہ وہ جہنم کو جانے کے لیے حلالہ کے لیے بھی تیار ہے۔